# نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہوتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے۔ ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ۔ ششماہی تین روپیہ
بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

| شمارہ ۱ | فہرست مضامین جولائی ۱۹۳۴ء | جلد ۲۶ |
|---|---|---|

ملاحظات ——— ۲
ترجمہ کی چند اصولی باتیں ——— ۹
سکون کی تلاش ——— طاہرہ دیوی شیرازی ——— ۱۴
عجائب فلکی اور کائنات کی عظمت ——— ۲۲
ایک خط ——— ۲۷
علاج بالنسل ——— نربدا پرشاد ——— ۳۰
مکتوبات نیاز ——— ۳۸
ایک دکھیاری لڑکی ——— حسیب نفیسی ——— ۴۶
جمود ——— آرزو جلیلی ——— ۴۹
بیراگ کا روگ ——— ۵۲
باب الاستفسار ——— ۵۸
باب المراسلۃ والمناظرہ ——— ۶۴
دلگیر اکبرآبادی مرحوم ——— ۷۰
باب الانتقاد ——— ۷۳
منظومات ——— عدم۔ روش۔ مجاز۔ اثر۔ فطرت۔ اختر۔ اصغر۔ تپش۔ راز ——— ۷۵

# نگار



اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

| | | |
|---|---|---|
| جلد ۳۶ | جولائی سنہ ۵۳ء | شمار ۱ |


# ملاحظات

## مُسلمانوں کا یوم النبی

مسلمانوں میں ۱۲؍ ربیع الاول[1] کو وہی اہمیت حاصل ہے جو ہندوؤں کے یہاں جنم اشٹمی کو؛ یعنی جس طرح ان کے یہاں کرشن جی کی ولادت پر خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے، اسی طرح مسلمانوں کی جماعت ولادت نبوی پر جذبات مسرت ظاہر کرتی ہے

لیکن ان دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے اور وہ یہ کہ جنم اشٹمی کے منائے جانے پر ہندوؤں کے اکابر کی طرف سے نہ کوئی تحریک کی جاتی ہے نہ اخباروں میں نشر و اعلان ہوتا ہے، اور یوم النبی کے لئے علماء اسلام کو کافی پروپاگنڈا کرنا پڑتا ہے۔ تاکہ مسلمان اس تقریب کی پذیرائی میں زیادہ جوش و ولولہ سے کام لیں، چنانچہ امسال تمام دنیائے اسلامی

---

[1] حالانکہ ولادت نبوی کی صحیح تاریخ ۹؍ ربیع الاول ہے نہ کہ ۱۲؍ ربیع الاول۔ دسمبر سنہ ۲۲ء کے نگار میں ایک مفصل مضمون اس موضوع پر شائع ہو چکا ہے من شاء فلیرجع الیہ

کے علماء کی طرف سے اعلان شائع کیا گیا اور ہو سکتا ہے کہ اس اعلان کی بنا پر واقعی امسال زیادہ نمود و نمائش سے اس تقریب کو منایا گیا ہو ــــ لیکن آج جبکہ اس مخصوص دن اور مخصوص تاریخ کو گزرے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا، دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس کے اثرات اب تک کچھ باقی ہیں اور کیا مسلمانوں کی عملی زندگی میں کوئی قابل ذکر تغیر پیدا کرنے میں اس کو کامیابی ہوئی ہے ؟

یوم النبی کی تحریک مسلمانوں میں کوئی قدیم تحریک نہیں کیونکہ اس کا پتہ قرون اولیٰ میں کہیں نہیں چلتا - خاص کر لفظ "یوم النبی" تو بالکل مغربی تتبع میں اختیار کیا گیا ہے جو ترجمہ ہے ( Prophet's Day ) کا ورنہ اب سے کچھ زمانہ قبل اس کو "ذکر میلاد" "میلاد النبی" اور عوام میں "مولود شریف" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا ــ لیکن یہ تحریک قدیم ہو یا جدید، اس کا نام 'یوم النبی' قرار دیا جائے یا کچھ اور اس کے مفید ہونے سے بہرحال انکار نہیں ہو سکتا اگر واقعی اس سے ہماری عملی زندگی میں کوئی تغیر پیدا ہو. لیکن سوال یہی ہے کہ کیا کبھی اس سے کوئی فائدہ اس قسم کا مترتب ہوا ہے اور کیا آئندہ کوئی توقع اس کی کی جا سکتی ہے ــ مجھے اس باب میں سخت مایوسی ہے اور میرا یقین ہے کہ اگر مسلمان بجائے سالانہ احتفال و اجتماع کے ہر مہینے اور ہر ہفتہ یوم النبی منائیں تو بھی کوئی فائدہ ان کو نہیں پہونچ سکتا - بلکہ جس اسلوب سے اس تقریب میں اظہار جذبات کیا جاتا ہے وہ بجائے مفید ہونے کے اور نقصان رساں ہے

کسی مذہب میں تہواروں یا خاص خاص تقریبوں کا پیدا ہو جانا، حقیقتاً اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ مذہب اپنے دور انحطاط سے گزر رہا ہے اور اب اس کے پاس سرمایۂ عمل صرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ اپنے اسلاف یا اپنی گزشتہ تاریخ عروج کے بعض واقعات کو کبھی کبھی یاد کر لیا کرے۔ آپ کسی مذہب و قوم کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس کے ابتدائی زمانۂ عروج میں نہ کوئی خاص تہوار تھا، نہ کسی واقعہ کی یاد میں کوئی تقریب منائی جاتی تھی، لیکن جوں جوں اس میں انحطاط پیدا ہوا اس قسم کے مراسم بڑھتے گئے، یہاں تک کہ وہ مجموعۂ روایات سے زیادہ کوئی چیز نہ رہ گیا اور صرف انھیں روایات کا زبانی تحفظ اصل مذہب قرار پایا ــــ جب کوئی قوم اول اول کسی مقصد کو لے کر پورے جوش کے ساتھ اٹھتی ہے تو اس کے سامنے سوائے اقدام و عمل کے اور کوئی چیز نہیں ہوتی لیکن جب وہ یہ سمجھنے لگتی ہے کہ اس کی فتوحات انتہا کو پہونچ گئیں، یا یہ کہ منزل مقصود اس کو حاصل ہو گئی تو اس کے قوا میں اضمحلال، عزائم میں کمزوری اور عملی زندگی میں ضعف پیدا ہونے لگتا ہے، حتیٰ کہ چند دن تک وہ اسی سطح پر قائم رہنے کے بعد پھر نیچے کی طرف گرنے لگتی ہے اور تن آسانیوں کی عادت اسے محسوس نہیں ہونے دیتی کہ وہ کس طرح تیزی سے مائل بہ انحطاط ہے ــــ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں ہر کمال کے لئے زوال ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ جس حالت کو کمال سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ حقیقتاً کمال ہے بھی یا نہیں ــ دنیا میں ترقی و عروج کی انتہا نہیں، تکمیل و ترقی کی راہیں

غیر محدود ہیں، اس لئے کمال کی تعیین محال ہے، اور زوال کمال کے لئے لازم نہیں ہے بلکہ اس احساس کا نتیجہ ہے کہ ہم نے کمال حاصل کر لیا یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ انحطاط نام ہے تعیین منزل کا اور اس منزل تک پہونچ کر یہ سمجھنے کا کہ اب آگے ہم کو بڑھنا نہیں، لیکن اگر کوئی مقصود متعین نہ کیا جائے یا یہ کہ ہر مدعا کی تکمیل کے بعد، دوسرا مدعا پیش نظر رکھا جائے تو کبھی زوال ہو ہی نہیں سکتا

مسلمانوں کی تاریخ میں خیر عہد رسالت کو تو چھوڑیئے کہ وہ تو بالکل ابتدا کا رتھی اور اصولاً اس وقت نہ تعیین منزل کا کوئی سوال پیدا ہو سکتا تھا، نہ تکمیل مدعا کا، لیکن اس کے بعد جب فتوحات وسیع ہوئیں، سلطنت کے حدود میں وسعت پیدا ہوئی۔ تو کیا ہوا ؟ عہد عباسیہ کو عربوں کی فتوحات کا دور زریں کہا جاتا ہے، لیکن کیا اس دور زریں کے معنے یہ نہ تھے کہ جو کچھ ان کو کرنا تھا کر چکے اور کیا اس احساس میں ان کا زوال پنہاں نہ تھا

اسی طرح ترکوں کو لیجئے کہ ان کا انتہائی نقطۂ نظر قسطنطنیہ کو فتح کر لینا تھا اور جب محمد خاں ثانی اس میں کامیاب ہو گیا تو ان کی فتوحات کا بڑھتا ہوا سیلاب اسی جگہ رک گیا اور اسی دن سے ان کا زوال شروع ہو گیا، ورنہ اگر وہ کسی منزل کی تعیین نہ کرتے اور اپنے اقدامات کو برابر اسی طرح جاری رکھتے تو آج سارا یورپ مسلمان ہوتا۔ اور سرزمین مغرب کا کوئی حصہ ایسا نہ رہ جاتا جہاں ہلالی پرچم نہ لہرا رہا ہوتا

الغرض قومیں جب آگے بڑھتے بڑھتے ایک جگہ ٹھیر جاتی ہیں، اس وقت سے ان کا زوال شروع ہو جاتا ہے اور پھر جب وہ انحطاط کے اس دور میں پہونچ جاتی ہیں کہ خود ان میں کوئی قوت عمل باقی نہیں رہ جاتی اور نکبت و ذلت کا احساس شروع ہو جاتا ہے تو وہ اپنے اسلاف کے کارناموں کو فخریہ بیان کرنے لگتے ہیں اور اسی کو ذریعۂ ترقی سمجھتے ہیں

یہ ہے حقیقت قوموں کے تہواروں اور تقریبوں کی اور یہی وہ جذبہ ہے جس کے ماتحت مسلمانوں میں بھی بسلسلۂ "یوم النبی" اظہار مسرت کیا جاتا ہے

اس میں کلام نہیں کہ رسول اللہ کی ذات گرامی جن صفات کی حامل تھی وہ کبھی فراموش کئے جانے کے قابل نہیں اور نہ ہو سکتے ہیں یہاں تک کہ اگر آج تمام مسلمان دنیا سے محو ہو جائیں تو بھی ان کا ذکر کیا جائے گا اور تاریخ کے صفحات ان کے اعتراف سے لبریز نظر آئیں گے، لیکن سوال یہ ہے کہ جس اصول و انداز پر ان کے یوم ولادت کی یاد ہر سال تازہ کی جاتی ہے وہ واقعی ہمارے لئے مفید ہے یا نہیں اور اس وقت تک مسلمانوں کو اس سے کیا فائدہ پہونچا ہے

یہ تقریب آج نہیں بلکہ صدہا سال قبل اس وقت سے منائی جا رہی ہے جب مسلمانوں کی حکومت تھی، لیکن کیا ذکر "میلاد النبی" کے جلسے اس قوم کو انحطاط سے روک سکے اور اب جبکہ زوال کی انتہا ہو چکی ہے کیا یہ پھر اسے ابھارنے کے ضامن ہو سکتے ہیں ؟

تمام عالمِ اسلامی کے علمائے کرام کی طرف سے اعلان شایع ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو "یوم النبی" بعد درجہ جوش و اہتمام سے منانا چاہیئے، چنانچہ اس ارشاد کی تعمیل میں اونچے اونچے دروازے نصب کئے جاتے ہیں، رنگین جھنڈیوں سے در و دیوار کی آرایش ہوتی ہے، بجلی کے قمقمے لٹکائے جاتے ہیں، شیرینی کا انتظام ہوتا ہے، نوجوانوں کے گروہ ہاتھوں میں جھنڈے لئے، سینے پر ریشمی کپڑوں کے بیج لگائے اللہ اکبر کے پُرزور نعرے مارتے ہوئے نکلتے ہیں، اور رات کو جب واعظ اپنا وعظ ختم کر چکتا ہے تو شیرینی لے لے کر لوگ اپنے گھر واپس آتے ہیں، اس حال میں کہ رات بھر وہ اس جنت کا خواب دیکھتے رہتے ہیں جس کا ذکر واعظ نے کیا تھا اور صبح کو جب بیدار ہوتے ہیں تو کاہلی و بیکاری کا وہی جمود ان پر طاری ہوتا ہے جو اس سے قبل طاری تھا اور کسی قسم کا کوئی اضافہ اپنی ہمت و جرأت میں نہیں پاتے

اسلاف پرستی یقیناً اچھی چیز ہے اور قوموں کو اُبھارنے کے لئے یہ ذریعہ بلاشک کارآمد ثابت ہو سکتا ہے، لیکن اسلاف پرستی کا جو مفہوم عام طور پر لیا جاتا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا سکندر کے مرنے کے بعد محض اس کی یاد سلطنت روما کو تباہی سے بچا سکی، کیا سلطان محمد ثانی اور سلیمان اعظم کے کارناموں کا ذکر سلطنت ترکی کو زوال سے بچا سکا، کیا عبدالرحمان کی جرأت و ہمت کی داستانیں ہسپانیہ میں مسلمانوں کی حکومت کو زوال سے روک سکیں ——— اکاسرۂ عجم کی شوکت و جبروت کا ذکر ہر ایرانی کے لب پر تھا لیکن ایران تباہ ہو کر رہا، رام و کرشن کے ولولہ و عزم کی کہانیاں ہمیشہ سے ہندؤں کو یاد تھیں لیکن مسلمانوں نے ان کو مغلوب کر کے چھوڑا، سطوتِ مغلیہ کے آوازہ سے فضا گونج ہی رہی تھی کہ انگریزوں نے آکر تختہ کا تختہ اُلٹ دیا ——— پھر یاد رکھو کہ تم ہر سال کیا معنی اگر ہر مہینے "یوم النبی" منا کر رسول اللہ کی ولادت پر اظہارِ مسرت کرتے رہو گے تو بھی مٹنے سے نہیں بچ سکتے، کیونکہ قوموں کے عروج و زوال کا ہمیشہ ایک ہی فلسفہ رہا ہے اور جب تک کوئی نپولین و ہنی بال پیدا نہ ہو جائے محض ان کی یاد کوئی معنی نہیں رکھتی ——— پھر یہ وقت رستم و سہراب کی داستانیں دُہرانے کا نہیں بلکہ رضا شاہ کے پیدا کرنے کا ہے، باب عالی کی گزشتہ سطوت و جبروت بیان کرنے کا نہیں، بلکہ مصطفٰے کمال کے وجود میں لانے کا ہے، اور اگر روس کی لعنتِ استبداد کو دُور کرنے کے لئے لینن ہی کی ضرورت تھی، اگر اطالیہ کو حضیض سے نکال کر بلندی پر لانے کے لئے کوئی مسولینی ہی درکار تھا، اور جرمنی میں نئی زندگی پیدا کرنے کے لئے ہٹلر کا پیدا ہونا لازم تھا، تو یاد رکھو ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی رُوح پھونکنے کے لئے کسی نہ کسی خالد و عمر، حسین و علی کا ظہور میں آنا ضروری ہے، اور وہ نہ کسی احتفال و اجتماع سے پیدا ہو سکتے ہیں، نہ وعظ و تبلیغ سے، بلکہ اپنے آپ کو طوفان میں ڈال دینے سے، آگ کے اندر کود جانے سے اور ہتھیلی پر سر لے کر نکل پڑنے سے

رسول کی ولادت و سیرۃ کا ذکر کیا جاتا ہے ——— اس رسول کا جس کی زندگی یکسر عمل، سراپا ایثار و قربانی تھی، اس ہستی کا جس میں سوائے صداقت و خلوص کے نمود و نمایش کا کہیں پتہ نہ تھا، اس ذاتِ گرامی کا جو صرف نہ بعد ...

ومحبت کے لئے وضع ہوئی تھی - لیکن حال یہ ہے کہ سوائے قول کے عمل کا کہیں نام نہیں، بجز نمود ونمائش کے صداقت کا کوسوں پتہ نہیں، سوائے خودغرضی وطمع نفس کے ایثار وقربانی سے کوئی واسطہ نہیں ——— یہ پھر خدا معلوم بتائے کہ یہ کیا تماشہ ہے، یہ کس قسم کی یادگار ہے، یہ کس انداز کا اجتماع قومی ہے اور ہمارے علمار کرام، ہمارے قائدین عظام اس سے کس فائدہ کی توقع رکھتے ہیں

اگر اسوۂ رسول کی عظمت کو ہم صرف رنگین جھنڈیوں سے ظاہر کر سکتے ہیں، اگر اس کی پاکیزہ سیرت کے اظہار میں صرف بجلی کے قمقموں کا روشن کرنا کافی ہے، اگر اس کی مقدس تعلیم کا نشر و اعلان محض شیرینی تقسیم کرنے سے پورا ہو سکتا ہے اور اگر ہم اس کے باطنی و اخلاقی علو کو جھنڈے لے کر سڑکوں پر گشت لگانے سے ثابت کر سکتے ہیں، اور اگر اس کی صداقت عمل کی تبلیغ میں ظاہری نمود ونمائش کے علاوہ کسی اور چیز کی ضرورت نہیں، تو بے شک یہ سب کچھ درست ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ لہو ولعب کا مظاہرہ نامناسب نہیں، لیکن اگر خود رسول نے کبھی وہ نہیں کیا جو ہم کر رہے ہیں اور کبھی اس کی اجازت نہیں دی جو ہماری طرف سے ظاہر ہو رہا ہے تو پھر اس کو "یوم النبی" کی یادگار کہنا یقیناً رسول اللہ کی توہین ہے، اسلام کی تذلیل ہے اور مسلمانوں کے اندر اک ایسے جذبہ کی پرورش کرنا ہے جو بت پرستی کی طرف تو منجر ہو سکتا ہے لیکن خدا پرستی سے اسے کوئی تعلق نہیں

یہ تو ہوئی عملی پہلو کی کمزوری یا اس کا فقدان جو یوم النبی کے سلسلہ میں مسلمانوں کی طرف سے ظاہر ہوتا ہے، اب رہ گئی تاریخی یا مذہبی حیثیت جس کو سامنے رکھ کر ہمارے علمار کرام ذکر میلاد فرماتے ہیں، سو اس کا خیال اس سے بھی بدتر ہے - کیونکہ ان کا مقصود رسول اللہ کو ایک انسان کی حیثیت سے پیش کرنا کبھی نہیں ہوتا، بلکہ ایک مافوق الفطرت ہستی کی صورت سے پیش کرنا ہوتا ہے ——— وہ ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے کہ ان کا نور لاکھوں سال قبل سے خدا جانے کہاں کہاں چکر کھاتا پھرتا ہے، وہ جس وقت پیدا ہوتے ہیں تو اکاسرہ کے محل اور صنمکدوں کے بت سرنگوں ہو جاتے ہیں، وہ ابھی عالم طفلی میں ہوتے ہیں کہ فرشتہ ان کا سینہ چاک کر کے آلائش سے پاک کر دیتا ہے، وہ دعوائے نبوت کرتے ہیں تو سنگریزے اس کی شہادت دیتے ہیں، جب آپ چلتے ہیں تو جسم کا سایہ نظر نہیں آتا، اور اگر کبھی جوش نبوت میں انگلی کا اشارہ کر دیتے ہیں تو چاند کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں، پھر میں حیران ہوں کہ جب ذکر میلاد کے سلسلہ میں قولاً وعملاً کوئی بات بھی کام کی نہیں ہوتی تو کیوں کر اس پر ہزاروں روپیہ ضائع کیا جاتا ہے اور کیوں اس طرح کے ظاہری مراسم وشعائر کی طرف متوجہ کر کے ان کے قوائے عمل کو اور ضعیف بنایا جاتا ہے

اس وقت سب سے ضروری امر جس کی طرف اکابر اسلام کو توجہ کرنا ہے، وہ مسلمانوں کی اقتصادی کمزوری ہے، جو نمازیں پڑھنے سے دور ہو سکتی ہے نہ یوم النبی منانے سے بلکہ صرف ایک ایسی تنظیم سے جو ان کی معاشرت و معیشت کو اجتماعی طور پر اپنے ہاتھ میں لے لے ——— اور یہ نہایت آسانی سے ممکن ہے اگر ہمارے یہاں کے علمار واکابر

صرف زکوٰۃ کے مسئلہ پر توجہ کرکے ایک قومی بیت المال قائم کرسکیں۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ ان کی تن آسانیاں اور خود غرضیاں کبھی اس کی اجازت نہ دیں گی اور وہ "یوم النبی" کی تقریب میں مقالاً مزخرفات کا ایک طومار اور عملاً لہو و لعب کا دلچسپ پروگرام تو ضرور پیش کرسکیں گے لیکن کام کی کوئی بات کبھی نہ کریں گے

اس وقت مسلمانوں کی ۸ کروڑ آبادی میں سے اگر ایک کروڑ مسلمان بھی اوسطاً ایک روپیہ سالانہ دینے والے مل جائیں اور یہ رقم ایک جگہ جمع ہوکر قومی اداروں میں صرف ہو تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایک ربع صدی کے اندر کتنا عظیم انقلاب برپا ہوسکتا ہے اور فقر و فاقہ و بیکاری کی وہ لعنت جس میں مسلمانوں کی اکثر تعداد مبتلا نظر آتی ہے کتنی آسانی سے دور ہوسکتی ہے

یوم النبی کی تقریب ہندوستان کے ہر گاؤں، ہر قصبہ، اور شہر کے ہر ہر محلہ میں منائی جاتی ہے اور اس لئے اس سے بہتر کوئی موقعہ عام تنظیم کے لئے نہیں ہوسکتا۔ ہر محلہ میں ایک ایک کمیٹی چند آدمیوں کی بنادی جائے جو ماہوار وصولی زکوٰۃ کے ذمہ دار ہوں اور ان کمیٹیوں کا تعلق شہر کی صدر کمیٹی سے ہو۔ اسی طرح شہروں کی کمیٹیاں صوبہ کی مرکزی کمیٹی سے متعلق ہوں اور صوبوں کی کمیٹیاں بیت المال عمومی سے وابستہ ہوں جو سارے ملک کا ایک ہوگا ——— اس کا سالانہ جلسہ ہر جگہ یوم النبی کی تقریب میں منعقد کیا جائے اور رپورٹ پیش کی جائے کہ سب کمیٹیوں نے سال بھر میں کیا کام کیا اور یہ تمام رپورٹیں بیت المال عمومی کے صدر کے پاس جائیں گی جو ایک بورڈ کے مشورہ سے ہدایات جاری کرے گا۔ ہر محلہ کے مستحقین امداد کی فہرست باقاعدہ مرتب کی جائے اور ایک خاص حد تک شہر کی کمیٹی کو خرچ و امداد کے اختیارات دیئے جائیں

الغرض یہ اور اسی طرح کے بہت سی صورتیں اس سلسلہ میں ایسی پیدا ہوسکتی ہیں جو مسلمانوں کے بہت سے نادار طلبہ کو تعلیم دلانے میں مدد دے سکتی ہیں۔ اور خدا جانے کتنے صنعتی مدارس اور تجارتی ادارے قائم کرکے لاکھوں بیکار مسلمانوں کو کام میں لگایا جاسکتا ہے۔ مگر ہمارے اکابر کو کیا غرض ہے کہ وہ اس طرف توجہ کریں اور ہمارے علمار کرام کو کیا پڑی ہے کہ وہ یہ دردسر مول لیں، جبکہ ان کی زندگی یوں ہی لطف و مسرت سے بسر ہو رہی ہے

سُنا تھا کہ صوبۂ بہار میں امارت شرعیہ قائم ہوئی تھی اور غالباً اب بھی باوجود زلزلہ کی تباہکاریوں کے صرف اس لئے باقی ہے کہ مسجدوں کی تعمیر و مرمت کے لئے چندہ فراہم کرسکے، لیکن ہمیں نہیں معلوم کہ سوائے مسائل شرعیہ بتانے اور جواز و عدم جواز کا فتویٰ دینے کے کوئی کام اس نے اصلاح قومی کا کیا ہو، یا مسلمانوں کی اقتصادی حالت پر کبھی غور کرنے کی توفیق اس کو ہوئی ہو۔ پھر جب ہمارے یہاں کے اکابر مذہب کی ذہنیت کا یہ عالم ہو اور ان کا فرض اس سے زیادہ اور کچھ نہ ہو کہ جب کنویں میں چوہا یا بلی گر جائے تو وہ یہ بتادیں کہ کتنے

ڈوال پانی نکالنے سے وہ پاک ہوجاتا ہے، تو اپنے مستقبل کے متعلق خاک کوئی توقع قائم ہوسکتی ہے اور پامال و فنا ہونے سے ہم کو کون سی قوت محفوظ رکھ سکتی ہے

---

جنوری ۱۹۳۶ء کے نگار کی تیاریاں ابھی سے ہو رہی ہیں۔ یعنی ملک کے ارباب قلم کو ابھی سے متوجہ کیا جا رہا ہے اور اس وقت تک جتنے خطوط موصول ہوئے ہیں اُن کو دیکھ کر ہم کہ سکتے ہیں کہ غالباً ہمیں اپنے مساعی کے نامشکور رہنے کی شکایت نہ کرنا پڑے۔ اور ہم اپنے ارادہ کے مطابق اس کو ہر نوع بہترین تکمیل کے ساتھ پیش کر سکیں

دہلی و لکھنؤ اسکول کی شاعری کے متعلق اس سے قبل بارہا لوگوں نے لکھا ہے، لیکن یکجائی طور پر اتنا بہتر مجموعۂ تنقید غالباً آپ کو کہیں نہ مل سکے گا۔ دور نہ اتنے متنوع مباحث پر اس سلسلہ میں رائے زنی کی گئی ہو

ہم چاہتے ہیں کہ اس موضوع پر نگار کا یہ نمبر "لفظ آخر ہیں" کی حیثیت سے شائع ہو، لیکن ظاہر ہے کہ اس میں صرف اسی وقت کامیابی ہو سکتی ہے جب ملک کے تمام قابل ذکر اہل قلم، مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے تمام مسائل پر روشنی ڈالیں۔ اور ہمیں اُمید ہے کہ ہم ان کو اس طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوں گے

ضخامت کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا، اور نہ ہو سکتا ہے کیونکہ اگر بہتر مضامین ہم کو موصول ہوتے رہے تو ہم صفحات بڑھاتے جائیں گے خواہ اس کی تعداد سیکڑوں تک پہونچ جائے

---

یہ خبر غالباً مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ ہمارے عزیز دوست مجنوں گورکھپوری نے ایوان اشاعت میں پھر رُوح پھونکی ہے اور کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ایوان کا اجراء بھی غالباً بہت جلد ہونے والا ہے

اس مرتبہ انھوں نے اپنے یہاں کے قواعد میں کچھ تبدیلیاں کر دی ہیں تاکہ لوگ آسانی سے مستفید ہو سکیں اس لئے ہمیں امید ہے کہ اہل ذوق جناب مجنوں سے جدید قواعد طلب کر کے اس ادارۂ علم و ادب کی ہر ممکن خدمت انجام دیں گے

---

# ترجمہ کے متعلق چند اُصولی باتیں

چونکہ اُردو زبان ابھی تک دَورِ تراجم سے نہیں گزری ہے، اس لئے یہ بحث کبھی نہ کبھی ضرور دیکھنے میں آجاتی ہے کہ غیر زبانوں کے الفاظ کا ترجمہ کس اصول سے کیا جائے ——— کوئی کہتا ہے کہ ٹھیٹ ہندی کے الفاظ استعمال کئے جائیں اور کوئی عربی و فارسی سے مدد لینا ضروری سمجھتا ہے ——— اس میں شک نہیں کہ جس حد تک صرف معمولی قصے کہانی کی کتابوں کا تعلق ہے۔ آپ بآسانی ہندی بھاشا سے کام نکال سکتے ہیں، لیکن جس وقت سوال علمی کتابوں کا آئے گا تو آپ مجبور ہوں گے کہ یا تو عربی فارسی سے مدد لیں یا سنسکرت سے، کیونکہ اُردو زبان معمولی روز کی گفتگو کے لئے ایجاد ہوئی تھی اور اس میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ مطالب عالیہ یا مصطلحات علمیہ کے لئے الفاظ پیش کر سکے، اس لئے جب غیر زبانوں کے ترجمہ کی ضرورت ہوتی ہے تو اُردو داں طبقہ پریشان ہو جاتا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرے

ہر چند بعض کتابیں مصطلحات علمیہ کی لکھی جا چکی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک کوئی اصولی گفتگو اس موضوع پر نہیں ہوئی اور نہ کوئی ایسا فیصلہ ہو سکا جس کو سامنے رکھ کر ہم ترجمہ کی دشواریوں کو دُور کر سکیں

انجمن ترقی اُردو اور جامعۂ عثمانیہ کی خدمات اس باب میں یقیناً قابل قدر ہیں اور اس وقت تک وہاں سے متعدد علوم و فنون کی کتابوں کا ترجمہ اردو زبان میں ہو چکا ہے، لیکن افسوس ہے کہ تمام ترجمے کسی ایک اصول کے ماتحت نہیں کئے گئے اور ارباب قلم کی وہ تشویش جو اصول سے متعلق تھی ہنوز باقی ہے

انجمن ترقی نے جو لغت مصطلحات کا مرتب کیا ہے وہ ناقص و نامکمل تو خیر ہے ہی، افسوس یہ ہے کہ جتنا کچھ اس میں ہے وہ بھی کسی اصول کے ماتحت نہیں ہے، کسی جگہ تو آپ دیکھیں گے کہ انھوں نے خالص ہندی بلکہ سنسکرت کے الفاظ لے لئے ہیں اور کسی جگہ عربی کے ثقیل مصطلحات لینے میں بھی دریغ نہیں کیا۔ یہ امر طے شدہ ہے کہ اُردو علمی کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لئے ہم کو غیر زبانوں کے الفاظ لینا ضروری ہیں، اس لئے اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ الفاظ کس زبان سے لئے جائیں، عربی سے یا سنسکرت سے۔

سنسکرت سے مصطلحات مستعار لینا گناہ نہیں لیکن چونکہ ہندوستان کی اکثر آبادی کو اس زبان سے تعلق نہیں رہا ہے۔ اور عربی سے وہ بڑی حد تک مانوس ہیں یہاں تک کہ دیہاتیوں کی زبان میں بھی کثرت سے عربی کے الفاظ پائے جاتے ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ عربی سے مدد نہ لی جائے۔ پھر اسی کے ساتھ جب آپ تصریفی آسانیوں کو دیکھیں گے تو لامحالہ سنسکرت پر عربی کو ترجیح دی جائے گی، اور یوں بھی اس وقت تک علوم و فنون کی جتنی کتابیں عربی میں آچکی ہیں، سنسکرت یا بھاشا میں منتقل نہیں ہو سکیں

بہرحال چونکہ ترجمہ کا مسئلہ ایک اہم مسئلہ ہے اور میں نے ہمیشہ عربی سے مدد لینے کو مرجح سمجھا ہے اس لئے آج کی صحبت میں مختصراً بتانا چاہتا ہوں کہ خود عربی میں ترجمہ کے کیا اصول ہیں، ممکن ہے کسی حد تک مفید ثابت ہوں

پہلا اصول تو یہ ہے کہ جب تک انھیں عربی الفاظ ملتے ہیں وہ عجمی الفاظ کا ترجمہ اپنی ہی زبان کے مترادف الفاظ میں کرتے ہیں۔ البتہ وہ عربی الفاظ میں اُن تمام الفاظ کو شامل کرتے ہیں جو اُن کے لغت و ادب میں اوزان عربیہ پر جاری ہیں خواہ اُن کی اصل کچھ ہو ــــــ مثلاً قلم کہ دراصل یونانی لفظ ہے لیکن چونکہ اُن کے لغت میں رائج ہے اس لئے اوسے وہ عربی سمجھتے ہیں، یا ابریق کہ فارسی الاصل ہے، یا قیس کہ سریانی کا لفظ ہے یا سلطان کہ قبطی الاصل ہے یا مشکاۃ کہ حبشی الاصل ہے سب عربی کے الفاظ سمجھے جاتے ہیں۔ پھر وہ اوزان عربیہ کا بھی زیادہ لحاظ نہیں کرتے بلکہ زیادہ تر استعمال و رواج کو دیکھتے ہیں اور اسی لئے جند بیدستر، سالامندرا اور قنطاریون ایسے الفاظ بھی اُن کے نزدیک عربی کے الفاظ ہیں

اس قاعدہ میں ان کے یہاں بہت کم استثنائی مثالیں مل سکیں گی اور افعال میں تو بالکل نہیں کیونکہ وہ غیر زبان کے افعال کبھی استعمال نہیں کرتے ــــــ اسی طرح حروف میں بھی کوئی مستثنیٰ نہیں ہے بجز ( de ) فرانسیسی ( of ) انگریزی اور ( Von ) جرمنی کے، کہ یہ سب حروف اضافی ہیں اور عربی میں ان کی ضرورت نہیں لیکن صرف اس لئے کہ التباس پیدا نہ ہو اور لوگ آسانی سے سمجھ سکیں، کیونکہ اگر بجائے پرنس آف ویلس کے پرنس ویلس لکھیں تو ممکن ہے لوگوں کو سمجھنے میں زحمت ہو

اسماء میں بیشک شواذ کثرت سے پائے جاتے ہیں اور بعض اعجمی الفاظ اس طرح داخل ہو ہیں کہ اگر ان کا ترجمہ کیا جائے تو اصل مفہوم پوری طرح واضح نہیں ہو سکتا مثلاً لفظ پرنس کو لیجئے، کہ اس کا ترجمہ عربی میں لفظ امیر سے کیا جاتا ہے، لیکن پرنس آف ویلس کا ترجمہ امیر ویلس یا امیر آف ویلس نہیں کریں گے کیونکہ اس طرح معنی پر صریح دلالت نہیں ہوتی۔ چونکہ ترجمہ کا اصل مقصود یہ ہے کہ کم سے کم..... وقت اور الفاظ میں سامع ہمارے مدعا کو سمجھ سکے اس لئے عجمی الفاظ بجنسہ لے لینے میں وہ کبھی احتراز نہیں کرتے اگر ضرورت اس کی ناشی ہوتی ہے ــــــ اب سے بہت پہلے ابن بشیر، ابن سینا اور ابن بیطار بھی ایسے اعجمی الفاظ کو جو کثرت سے رائج

ہو گئے تھے اور جو اپنے مفہوم کو زیادہ آسانی کے ساتھ ادا کرسکتے تھے ۔ لے لیتے تھے اور اس کا ترجمہ عربی میں نہ کرتے تھے لیکن اگر کسی التباس کا اندیشہ نہیں ہوتا تو بیشک عربی میں ترجمہ کرتے تھے اور اب بھی یہی دستور ہے ۔ چنانچہ " پرنسات اروبا " کبھی نہیں لکھیں گے بلکہ " امراء اروبا " لکھیں گے

الغرض ان کا مقصود ترجمہ سے یہ ہوتا ہے کہ اصل مدعا فوراً سمجھ لیا جائے اور اس غرض کے لئے وہ عجمی الفاظ لینے میں کبھی تامل نہیں کرتے مثلاً ( Rheumatism ) کو لیجئے کہ اب عربی میں زیادہ تر اس کو " روماتزم " کہتے ہیں حالانکہ اس کے لئے عربی مرادف لفظ " داء المفاصل " یا " وجع المفاصل " موجود ہے لیکن چونکہ داء المفاصل سے عام طور پر ہاتھ پاؤں کے جوڑوں کا درد سمجھ میں آتا ہے اور پیٹھ کی طرف خیال نہیں جاتا اس لئے انھوں نے روماتزم جوں کا توں اپنے یہاں لے لیا۔ اسی مصلحت سے وہ بجائے توتیا کے زنک اور بجائے نشادر کے امونیا لکھتے ہیں

دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی عجمی لفظ کا صحیح مترادف لفظ عربی میں نہیں ملتا ہے تو پھر یہ جستجو کی جاتی ہے کہ قریب مفہوم کس لفظ سے ادا ہو سکتا ہے اور اگر کوئی لفظ ایسا مل گیا تو اسے اختیار کر لیتے ہیں ——— مثلاً انگریزی لفظ " Mercenaries " ہے ۔ اس سے مراد وہ افواج ہیں جو دوسرے ممالک سے مستعار لی جاتی ہیں ۔ اب انھوں نے سوچا کہ یہ رسم یقیناً عربوں میں بھی رہی ہوگی ۔ اور ضرور اس کے لئے کوئی لفظ استعمال کرتے ہوں گے ، چنانچہ جستجو سے ان میں لفظ " مسترزقہ " ملا جو ایسی فوجوں کے لئے استعمال ہوتا تھا اور وہ انھوں نے اختیار کر لیا ——— اسی طرح ایک اور انگریزی لفظ " Tributory " ہے جس سے مراد وہ چھوٹی ندی ہے جو کسی دریا میں جاکر گرتی ہے ، اس کے لئے جب انھوں نے قدیم سفرنامے اپنے یہاں کے دیکھے تو معلوم ہوا کہ اس کے لئے لفظ ناصر استعمال کیا گیا ہے جس کی جمع نواصر آتی ہے ، اس لئے انھوں نے اس کو اختیار کر لیا ——— اگر کوئی ایسا عجمی یا عامی لفظ ہوتا ہے جس کی عربی زیادہ رائج نہیں ہے تو بدستور وہی لفظ باقی رکھا جاتا ہے مثلاً مصر میں لفظ لقادی کثرت سے مستعمل ہے اور عربی لفظ بذار کوئی استعمال نہیں کرتا ، اسی طرح مذبح کو سلاخ بلدی کہنے کا رواج ہے اور زبل کوئی نہیں کہتا ، بابل کو بجائے جسر کہنے کے کبری کہتے ہیں اور ڈاک کو بجائے برید کے بوسطہ ، تو انھوں نے انھیں رواجی الفاظ کو لے لیا ، کیونکہ وہ زیادہ قریب الفہم ہیں اور عام و خاص سب انھیں آسانی سے سمجھ لیتے ہیں

تیسرا قاعدہ عجمی ناموں کے متعلق ہے اور وہ یہ کہ جو نام جس طرح سے عربی میں رائج ہیں ان کو بدستور اسی حال پر رکھا گیا خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید ، مثلاً ابراہیم ، یوسف ، المانیا ، امیرکا وغیرہ اور جو نام نئے آتے ہیں ان کو تلفظ کے لحاظ سے لکھتے ہیں ——— شہروں کے بعض نام ایسے ہیں جو زمانہ قدیم سے عربی میں چلے

آرہے ہیں جیسے وینس کے لئے بندقیہ، سسلی کے لئے صقلیہ سو اس کے لئے انھوں نے یہ کیا ہے کہ جب وہ کسی واقعۂ تاریخی کا ذکر کریں گے تو وہی بندقیہ و صقلیہ استعمال کریں گے، لیکن جب زراعت وصناعت علمیہ کے متعلق کچھ لکھنا ہوگا تو وہ وینس و سسلی ہی لکھیں گے، کیونکہ اہل حرفت و پیشہ میں یہی زیادہ رائج ہیں

بعض نام ایسے ہیں جو فی الاصل عربی ہیں لیکن اہل مغرب نے ان کی صورت میں تبدیلی پیدا کردی ہے، سو ان کو اسی اصلی صورت میں لکھا جاتا ہے۔ اور اہل افرنج کے تصرفات کو قبول نہیں کیا جاتا۔ مثلاً قاہرہ، قرطبہ، اشبیلیہ کہ اس کو کیرو۔ کارڈووا اور سیول وہ کبھی نہ لکھیں گے

چوتھا قاعدہ، الفاظ جدیدہ کے ترجمہ کرنے کا یہ ہے کہ اگر انھیں کوئی لفظ عربی کا ایسا مل جاتا ہے جو پہلے سے اس معنی میں رائج ہے تو پھر وہ اسی کو اختیار کرلیتے ہیں مثلاً اسکجبین، ہدروجین، نیتروجین اور فقنفور وغیرہ بلکہ اسی سے افعال بھی بنالیتے ہیں مثلاً مغنطیس سے انھوں نے مغنط فعل بنایا اور کہربا سے کہرب۔ لیکن اگر کوئی لفظ رائج شدہ انھیں نہیں ملتا تو وہ تھوڑی تبدیلی کے ساتھ نئے لفظ کو اپنی زبان میں لے لیتے ہیں جیسے تلغون، فونوغراف، مکروفون، اتوموبیل اور کبھی کبھی کوئی دوسرا عربی لفظ بھی گھڑ لیتے ہیں جیسے اتوموبیل کے لئے سیارہ کہ اب عام طور پر یہی مستعمل ہے

اول اول جب بیروت میں بائسکل آئی تو اس کا ایک پہیہ بہت بڑا تھا، دوسرا بہت چھوٹا اور سوار ہونے میں بڑی زحمت ہوتی تھی، لوگوں نے سمجھ لیا کہ یہ ٹرائسکل (تین پہیوں والی گاڑی) کے مقابلہ میں یہ چلنے والی چیز نہیں ہے اس لئے انھوں نے لفظ بائسکل اختیار کرنے سے احتراز کیا اور دراجہ کا لفظ اختراع کیا، بعد کو جب دو پہیوں والی گاڑی کے لئے بائسکل اور تین پہیوں والی کے لئے ٹرائسکل کا لفظ وضع ہوا تو اہل مصر نے دراجہ کو چھوڑ کر عجلہ کا لفظ وضع کیا جو دونوں پر حاوی تھا

مصطلحات علمی میں چونکہ تعریب کا بہت کم موقع ہے اور ذرا ذرا سے تغیر سے معنے میں بہت اختلاف پیدا ہوجاتا ہے۔ اس لئے انھوں نے اس باب میں بھی علماء کا تتبع کیا اور جوں کا توں لے لیا۔

اب معنی کے لحاظ سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یا تو وہ حقیقی ہوں یا مجازی، اور اہل عرب کے نزدیک مالوف ہوں گے یا غیر مالوف۔ پس اگر وہ حقیقی ہیں اور مالوف بھی ہیں (مثلاً گھوڑے پر چڑھنے کو وہ رکوب کہتے ہیں اور شراب پینے کو شرب) تو اس قبیل کے معنے جہاں جہاں آئیں گے وہ یہی افعال استعمال کریں گے۔ اگر معنی حقیقی ہیں اور غیر مالوف تو ترجمہ لفظی کرتے ہیں۔ یا قریب قریب لفظی کے مثلاً بندوق سر کرنے کے لئے وہ لفظ اطلاق استعمال کرتے ہیں اور رمی وغیرہ کے لئے رمی

اگر معنی مجازی ہوتے ہیں اور مالوف تو بھی کوئی دقت نہیں ہوتی۔ اور اُسے اختیار کرلیتے ہیں جیسے فتنہ

جگانے کے لئے " ایقاظ الفتنہ "

اگر معنی مجازی ہوتے ہیں اور غیر مالوف تو وہ اس قبیل کے استعارات کو اپنی زبان میں تلاش کرتے ہیں اگر قریب قریب اس کے مل گئے تو انھیں لے لیتے ہیں ورنہ پھر اس غیر زبان کے استعارہ کو استعمال کرنے لگتے ہیں ـــــــ الغرض اہل عرب کے تمام اصول ترجمہ کے متعلق آسانی کے خیال پر قائم کئے گئے ہیں اور وہ دوسری زبان کے الفاظ لینے میں بھی تامل نہیں کرتے، اس لئے اگر اردو میں بھی انھیں اصول پر کار بند ہوں تو کیا حرج ہے، یعنی غیر زبان کے وہ الفاظ جو رائج ہو چکے ہیں ان کو جوں کا توں رہنے دیں اور مصطلحات علمیہ یا دوسرے بلند مفہوم کے الفاظ کا ترجمہ کرنے میں وہ اپنی زبان میں جستجو کریں اگر کوئی لفظ پورے معنی پر حاوی مل جائے تو لے لیں۔ اور اگر کسی غیر زبان سے استعارہ کی ضرورت ہے تو عربی فارسی سے مدد لیں

ہر چند اس صورت میں عربی فارسی کا علم ضروری ہوگا۔ اور ہر شخص ترجمہ نہ کر سکے گا، لیکن اگر سنسکرت یا بھاشا کے ثقیل الفاظ لئے گئے تو اُن کے لئے سنسکرت دانی کی ضرورت ہوگی، اور یہ امر ظاہر ہے کہ ہم لوگوں کے لئے فارسی عربی کا سیکھنا اتنا دشوار نہیں ہے جتنا سنسکرت کا ـــــــ

# سکون کی جستجو

طاہرہ دیوی شیرازی کا یہ دوسرا افسانہ ہے جو نگار میں شایع ہو رہا ہے، آپ نسباً ہندو اور ازدواجاً مسلمان ہیں، لیکن اعتقاد کے لحاظ سے بالکل میرے خیالات کی ہمنوا ہیں

یہ افسانہ، فن کے لحاظ سے اُردو میں اس ارتقائی درجہ کی چیز ہے، جہاں مردوں کا دماغ بھی مشکل ہی سے پہونچ سکتا ہے چہ جائیکہ عورتیں

طاہرہ دیوی نہ صرف فارسی بلکہ فرانسیسی زبان کی بھی ماہر ہیں۔ اور غالباً یہیں سے یہ معمہ حل ہوتا ہے کہ اُن کی افسانہ نگاری میں یہ رنگ کہاں سے آیا ——

زبان کی صفائی و شگفتگی کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بنگال کی ایک ہندو خاتون اتنی صاف و صحیح اُردو لکھنے میں کیونکر کامیاب ہو سکیں،

اُمید ہے کہ نگار میں اُن کے افسانے برابر شایع ہوتے رہیں گے۔ اور کسی آیندہ اشاعت میں ہم ان کی تصویر بھی پیش کر سکیں گے ——

نیاز

گلفام کی بابت سب کو یقین ہو چلا تھا کہ اب اس کی زندگی کے دن پورے ہو گئے ہیں۔ اور اس دنیا میں وہ صرف چند دن کا مہمان ہے۔ اصطبل میں تھان کے سامنے لیٹے لیٹے اس کو کامل ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ مالک بھی اس کی خراب حالت دیکھتے دیکھتے تنگ آگیا تھا۔ کئی بار اس نے ارادہ کیا کہ گولی کا نشانہ بنا کر اس کی تکلیفوں کو ختم کردے۔ مگر دیرینہ رفاقت کا احساس اسے ہر مرتبہ باز رکھتا تھا۔ وہ روز اس خیال سے خاموش ہو جاتا کہ آج نہیں تو کل ضرور مر جائے گا۔ مرتے ہوئے کو مارنے سے کیا فائدہ۔ اس کی چاروں ٹانگیں بیکار ہو چکی تھیں۔ رانوں تک کا گوشت سڑ چکا تھا۔ جب ان میں کیڑے کلبلاتے تو درد کی شدت سے وہ بھیانک آواز سے ہنہنانے لگتا۔ اکثر رات کے وقت اس کے کراہنے کی آواز سے سوتے ہوئے لوگوں کی نیند خراب ہو جاتی مالک جھنجھلا کر پستول لے کر اٹھتا مگر طویلہ تک جا کر رہ جاتا۔ اسے اندر جاتے ہوئے بھی کراہت معلوم ہوتی تھی۔ وہاں کی تمام

فضا زخموں کی عفونت سے ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ وہ صرف جھانک کر دیکھتا اور واپس لوٹ آتا۔ دل ہی دل میں رائے قائم کرتا کہ صبح تک ضرور مر جائے گا

گھر کے پلے ہوئے شکاری کتے اس کے پاس آتے، زخموں کو سونگھتے، اور اُن پر پیشاب کر کے غریب بے زبان جانور کو اور زیادہ تکلیف پہونچا جاتے۔ کبھی کبھی بکرے کے سینگ بھی اس کی مجروح کھال پر عمل جراحی کی مشق کرتے۔ مگر وہ انتقام لینے سے قاصر تھا۔ رات کے وقت چوہے نکل کر اس کے کان کاٹتے، گردن پر چڑھتے۔ مگر اس میں اتنی بھی طاقت نہ تھی کہ دُم ہلا کر ان کو بھگا دیتا۔ وہ خاموش لیٹا ہوا اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں پوری کر رہا تھا۔ مہترانی بھی اس جگہ کو صاف کرتے وقت ناک بھوں چڑھاتی، وہ کوستی کہ یہ کم بخت مر کیوں نہیں جاتا کہ پاپ کٹے۔ وہ لید اٹھانے سے پہلے ایک لات اس کی پیٹھ پر جڑ دیتی تھی۔ دوسرے گھوڑوں سے بچی ہوئی گھاس اسے کھانے کے لئے ملتی۔ اور وہ بھی بہت قلیل مقدار میں وہ اسے بھی نہ کھا سکتا۔ طویل بیماری سے اس کی بھوک پیاس بند ہو گئی تھی۔ اس کے لئے تمام دنیا ایک اصطبل میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک ہی حالت میں لیٹے لیٹے جب اعضاء تھک جاتے، اور بدن میں شدید درد ہونے لگتا تو وہ کوشش کر کے زیادہ سے زیادہ کروٹ بدل لیتا، تاکہ عارضی طور پر کچھ سکون حاصل ہو جائے اور بس۔ قرب و جوار کے شریر بچے دور کھڑے ہو کر اسے پتھر اور مٹی کے ڈھیلے مارتے۔ بعض بے رحم لڑکے پچکاریوں میں سرد پانی بھر بھر کر اس کی طرف پھینکتے۔ جس سے اس کے زخموں میں مرچیں سی لگنے لگتیں۔ وہ درد بھری آواز سے ہنہناتا اور خاموش ہو جاتا۔ بچے خوش ہو کر تالیاں بجاتے اور ہنستے ہوئے چلے جاتے۔ اس کی بے بسی کی حالت پر کسی کو رحم نہ آتا تھا

موسم سرما کی ایک رات تھی نصف سے زیادہ حصہ گذر چکا تھا۔ اس کے زخموں کی تکلیف حد سے زیادہ بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ اس کے دل میں تمام مصائب و آلام کے خلاف جہاد کرنے کا جذبہ پیدا ہوا اپنی تمام پس ماندہ قوتوں کو جمع کر کے اس نے ایک آخری کوشش کی اور کھڑے ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ مگر اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ جسم کا ایک ایک حصہ بید کی طرح کانپ رہا تھا۔ اس کا بھاری جسم ان نحیف ٹانگوں کے لئے ایک بارِ گراں تھا۔ مگر پوری ہمت سے کام لے کر اس نے توازن کو قائم رکھا

سب سے پہلے اس کی نظر ناند پر پڑی جس میں کئی دن کی سوکھی ہوئی گھاس کا تھوڑا سا ڈھیر پڑا تھا۔ اس کے سینہ پر سانپ سا لوٹ گیا، جب اس نے خیال کیا کہ مالک اب اس کی خوراک کی بھی پروا نہیں کرتا۔ اس کے سامنے وہ منظر آگیا۔ جب گھوڑ دوڑ کے میدان میں پہلی بار وہ اول نمبر آیا تھا۔ واپسی کے وقت ایک عروس نو کی طرح اس کی گردن گلاب کے گجروں سے لدی ہوئی تھی۔ اس روز خود مالک نے اپنے ہاتھوں سے اس کی مالش کی تھی۔ اور کئی روز تک صبح و شام بالٹی بھر کر دودھ جلیبیاں اسے کھلائی گئی تھیں۔ اس نے تھوڑی دیر کے لئے خیال کیا کہ انسان بہت قدر ناشناس اور خود غرض ہے۔ وہ پھولوں سے لطف اندوز ہو لینے کے بعد انھیں مسل کر پھینک دیتا ہے۔ مگر جلدی ہی اس نے اپنی

راٹے تبدیل کرلی۔ کہ شاید دنیا والوں کا یہی دستور ہو۔ کہ ہر چیز کو برت لینے کے بعد نظر سے گرا دیا جائے
پھر اس کی نگاہ لکڑی کے کھونٹے پر پڑی جس کے ساتھ کبھی آہنی زنجیروں کے ذریعہ اس کو باندھا جاتا تھا۔ مگر اب وہاں سن کی معمولی رسی بھی نہیں تھی۔ کیونکہ کسی شخص کو یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ گلفام میں چپکے سے بھاگ جانے کی ہمت ہے۔ اپنی اس بے بسی کی حالت پر اس کے آنسو نکل پڑے۔ اتنے ہی میں ایک چوہے نے بل سے سر نکال کر اپنے تیز دانت دکھائے۔ گویا وہ اسے کاٹ کھانے کی دھمکی دے رہا ہے۔ گلفام نے چاہا کہ سُم کی ایک ضرب سے اس چھوٹے سے جانور کی ہڈی پسلی ایک کردے۔ مگر فوراً رک گیا کہ مبادا اس کشمکش میں جسمانی توازن بگڑ جائے۔ اور دوبارہ اسی جگہ گر پڑے جہاں کئی دن سے بے یار و مددگار پڑا تھا۔ اس نے آخری بار اس چار دیواری پر حسرت کی نگاہ ڈالی جس کے اندر زندگی کا بیشتر حصہ گذارا تھا۔ اور لرزتے ہوئے پاؤں کو جنبش دے کر چلنے لگا۔ اس کے دونوں کولھے نجاست میں لتھڑے ہوئے تھے اور جگہ جگہ جسم پر مٹی جم کر خشک ہوگئی تھی
اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے

طویلہ سے نکل کر وہ سائیس کی کوٹھری کے قریب سے گذرا۔ جو دروازہ بند کئے دنیا و مافیہا سے بے خبر گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ رک کر ہنہنایا گویا اپنے ان داتا کو بھی آخری بار الوداع کہہ رہا ہے۔ اسے یقین تھا کہ اب میں زندہ واپس نہیں آؤں گا۔

اس نے آسمان کی طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ چاند اپنے پورے شباب پر تھا۔ ستارے جگمگا رہے تھے۔ موسم سرما میں چلنے والی ہوا کے جھونکے اعضا کو مفلوج کر دینے کی حد تک سرد تھے۔ اور اس کا جسم ٹھٹھر کر رہ جاتا۔ اگر زندہ رہنے کی آخری کشمکش کے جوش نے اس کے اندر حرارت نہ پیدا کر دی ہوتی۔ چاندنی رات میں اس سنسان مقام پر کھڑے ہو کر اس نے تصور کی آنکھ سے اپنے عہدِ شباب کو دیکھا۔ ایک دن وہ جوان تھا اور چست و چالاک۔ اس کی رگوں میں تازہ خون دوڑتا تھا۔ اس کے جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مگر سریع الزوال۔ چار ہی قدم چلنے سے اس کا سانس پھولنا شروع ہوگیا تھا۔ وہ باغیچہ میں سے گذرا۔ جہاں اس کے مالک نے مختلف الالوان پھولوں کے پودے لگا رکھے تھے۔ اس نے چاہا کہ اپنے سموں سے سب کو روند کر فنا کردے۔ اور اس طرح اپنے جوشِ انتقام کو سرد کرلے " مگر مجھے کیا فائدہ ؟" اس سوال کے پیدا ہوتے ہی اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا

باغیچہ کے ایک کونے میں مالی کی کٹیا تھی۔ وہ رک گیا۔ اور پھونس کی دیوار کے قریب اپنی آنکھ لگا کر ایک روزن سے جھانکا کہ بوڑھا بے خبر سو رہا ہے۔ اس نے ارادہ کیا کہ اسے بیدار کر کے کہے۔ کہ " اے بندہ روپے کے ملازم! اب تو مجھے ہری ہری گھاس نہیں دیتا۔ میں مالک سے تیری شکایت کردوں گا۔" مگر خود اسی کے قلب سے ایک درد بھری صدا نکلی۔ کہ " اے بے وقوف خود تیرا مالک تیری فکر نہیں کرتا۔ اسے تیری پروا نہیں۔ وہ تو چاہتا ہے کہ تو کل کا مرتا آج

ہو جائے۔ وہ تیری فریاد کو کن کانوں سے سنے گا؟"

چند قدم چلنے کے بعد باغیچہ کی حد ختم ہو گئی۔ خاردار تاروں کی باڑھ لگی ہوئی تھی۔ وہ رک گیا۔ تار زیادہ اونچے نہیں تھے۔ مشکل سے ڈیڑھ فٹ ہوں گے۔ کھیل کے میدان میں وہ چار چار فٹ بلند جنگلے آسانی سے چھلانگ مار جاتا تھا۔ مگر اب ٹانگوں میں سکت باقی نہیں تھی۔ چھلانگ لگانا تو درکنار راستہ چلنا بھی دوبھر تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر جسم کمزور کیوں ہو جاتا ہے؟ بدن کی طاقت کہاں چلی جاتی ہے؟۔ مگر یہ ایک مشکل مسئلہ تھا۔ جس کو سمجھنے سے اس کی عقل حیوانی قاصر تھی۔ اس نے مناسب نہ سمجھا کہ ایک ہی جگہ زیادہ دیر تک کھڑا رہے۔ اس خیال سے کہ کہیں جسم کی تھوڑی بہت گرمی زائل ہو کر سردی کا احساس پیدا نہ کر دے۔ وہ پھر چل پڑا۔ حالانکہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی کمزور ٹانگیں اس کو کہاں لئے جا رہی ہیں۔ کوئی مخصوص منزلِ مقصود اس کی نظر کے سامنے نہیں تھی۔ وہ کارواں سے الگ ہو کر بھٹکنے والے مسافر کی طرح تھا۔ جس کا ہر قدم لاعلمی کی حالت میں کبھی منزل کی طرف اٹھ جاتا ہے اور کبھی منزل سے دور

وہ جنگلے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا کہ شاید کہیں یہ سلسلہ ختم ہو جائے یا ایسا مقام آ جائے جس کو عبور کر لینا اس کے امکان میں ہو۔ وہ چلا جا رہا تھا۔ اور بے خبر تھا کہ کائناتِ عالم کا ہر ذرّہ اس کے تاثراتِ قلب کا دقیق مطالعہ کر کے اس کے ساتھ ہم آہنگ ہو جانا چاہتا ہے۔ اس نے محسوس نہ کیا کہ ہر شے کا غیر مرئی دل جذباتِ ہمدردی سے مغلوب ہو کر اس کے لئے دھڑک رہا ہے

اتفاقاً ایک جگہ تار ٹوٹ جانے سے باڑھ میں ایسی جگہ بن گئی تھی جہاں سے گذر کر باغیچے سے باہر نکل جانا اس کے لئے آسان تھا۔ وہ خوش ہوا کہ اب آزادی کی فضا میں پہونچ کر سانس لوں گا۔ مگر عین اس وقت جنگل کی طرف سے کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ وہ سہم کر کھڑا ہو گیا۔ افشائے راز کے خوف سے اس کا تمام جسم لرزنے لگا۔ اس نے زمین کی طرف دیکھا۔ جس کی سطح پر پڑنے والا سایہ بھی کانپ رہا تھا۔ پھر اس کی نگاہ آسمان کی طرف اٹھی چاند پوری طرح روشنی پھیلا رہا تھا۔ اس نے آرزو کی کہ کاش آج کے دن یہ قندیل فلک گل ہو جاتی تو بہتر تھا۔ مگر کسی کی آرزو کے مطابق نوامیسِ فطرت میں تغیر نہیں ہوتا۔ اس کے قوانین اٹل ہیں۔ اسے یقین ہو گیا کہ کتے کی آواز سے تمام چوکیدار بیدار ہو جائیں گے۔ اور سمجھیں گے کہ کوئی چور بنگلہ کی حدود میں گھس آیا ہے۔ بے شک وہ بھی چور تھا۔ کیونکہ اس کا دل چور تھا۔ اس نے اپنی ضمیر کی آواز صاف طور پر سنی۔ وہ چوروں کی طرح دبے پاؤں اپنے مالک کے گھر سے فرار ہو رہا تھا۔ لازمی بات تھی کہ چاندنی کی روشنی میں چوکیدار اس کو باڑھ کے قریب کھڑا دیکھ لیں گے۔ اور پکڑ کر واپس لے جائیں گے۔ تیز دوڑ جانے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اس نے گذشتہ واقعات پر غور کر کے سوچا کہ کیا دوبارہ اس مسموم فضا میں زندگی بسر کرنی پڑے گی۔ جہاں رہتے رہتے اس کی طبیعت اکتا چکی ہے ——— پھر وہی زندگی؟

جس سے مر جانا بہتر ہے

اس نے بنگلہ کی طرف دیکھا۔ کوئی چیز سایہ کی طرح حرکت کر رہی تھی۔ ایک چوکیدار بیدار ہو چکا تھا۔ اس نے ابھی طرح پہچان لیا۔ یکایک روشنی نمودار ہوئی۔ اور سب طرف چکر لگا کے اس کے جسم پر پڑنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے انتہائے یاس میں اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن جب خلافِ توقع چند لمحے تک کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی تو اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ روشنی مفقود ہو چکی تھی۔ اور صرف ایک کتا اس کے قریب کھڑا دم ہلا رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا۔ کہ چوکیدار نے ارادتاً اس کی طرف سے لاپرواہی اختیار کر لی ہے۔ وہ چاہتا ہے۔ کہ یہ بلا کسی طرح دور ہو جائے۔ زخموں کی افراط کے باعث گلقام کی کھال بھی اس لائق نہیں تھی۔ کہ اس سے فائدہ حاصل کیا جائے۔ پھر اسے کون پکڑتا۔ اس خطرناک مستقبل سے بچ جانا ہی اس کے لئے باعثِ مسرت بن سکتا تھا۔ مگر اس امر کا احساس کہ اب اس کی ہستی کو ایک بیکار شے تصور کر کے نظر سے گرا دیا گیا ہے۔ اس کے لئے سوہانِ روح بن گیا۔ اب اس کی ٹانگوں میں کوئی تکلیف باقی نہیں رہی۔ اس کے زخموں کی چیپک بند ہو گئی۔ اصطبل کی مسموم فضا کا خیال بھی اس کے ذہن سے زائل ہو گیا۔ مگر اس کی روح کو ایک ایسی اذیت پہونچنے لگی، جو دنیا کے تمام مصائب و آلام سے زیادہ شدید ہوتی ہے۔ اس کے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ کوئی آئے اور اس کو دوبارہ لے جا کر اسی گندی اور بدبو دار فضا میں ہمیشہ کے لئے قید کر دے۔ یہ بہتر ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ دنیا کی کوئی ہستی اس کو نظرِ حقارت سے دیکھے۔ وہ کھڑا دیکھتا رہا۔ کہ اب کوئی آتا ہے۔ اب کوئی آتا ہے۔ مگر نہیں۔ کسی کو آنا تھا۔ نہ آیا۔ اس کی امیدیں پامال ہو گئیں۔ فضا میں کسی کا سایہ حرکت پذیر نہ ہوا۔ وہ خود اپنی ٹانگوں سے چل کر واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی خودداری مانع تھی۔ ترک کئے ہوئے راستہ پر خود اپنی ہی مرضی سے گامزن ہو کر ہار مان لینا اس کی شان کے خلاف تھا۔ اس کے پندار میں وہ ایک ایسا اعترافِ جرم تھا۔ جس کا عملی پہلو بذاتِ خود ایک زبردست جرم ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنی ہستی کو اور زیادہ گناہ آلودہ کرے۔ اسلئے بادلِ ناخواستہ وہ آگے بڑھ جانے کے لئے مڑا مگر عین اس وقت اس کی نگاہ کتے پر پڑی۔ حالانکہ وہ کافی دیر سے اس کے قریب کھڑا دم ہلا رہا تھا۔ وہ پھر ٹھٹھک گیا۔ اس نے پہچان لیا۔ وہ موتی تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے دوست رہ چکے تھے۔ اس وقت اس کا دماغ۔ جس کا توازن حوادثِ زندگی سے بگڑ چکا تھا۔ یہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ کہ یہ دیرینہ دوست مصیبت کے وقت بھی کام آتا ہے یا نہیں۔ ایسی صورت میں کہ خود اس کے قوا اس کے احکام سے انحراف کرنے لگے تھے۔ یہ کس طرح توقع کی جا سکتی تھی کہ ایک غیر جنس ہستی اس کا ساتھ دے گی۔ اس نے سوچا۔ "کاش! میرا وجود ازلی تخلیق کی ساعتوں کا رہینِ منت نہ بنتا۔ میری ماں مجھ کو جننے سے قبل مر جاتی"

اس نے اپنی گردن جھکا کر تھوتھنی موتی کے قریب کی۔ گویا وہ اس کے کان میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر نطق سے محروم ہونے کے باعث کچھ بول نہ سکا۔ اور اس مجبوری کے عالم میں اس کے تمام جذبات "معنیٔ بےلفظ" بن کر رہ گئے

موتی جھکا۔ اور گلفام کے زخموں کو چاٹنے لگا۔ اس بے زبان کے پاس بھی اظہارِ ہمدردی کے لئے اس سے زیادہ بہتر ذریعہ نہیں تھا۔ محبت بھرے دل کی بعض باتیں زبان سے ادا نہیں کی جا سکتیں۔ اور شرمندۂ الفاظ بنے بغیر حساس قلب کے کانوں سے سن لینی ممکن ہیں۔ وہ ایک دوسرے کا مطلب سمجھ گئے۔ موتی نے راہبری کی اور مظلوم و بیکس گلفام اس کے ساتھ ہو گیا

صبح کی سپیدی نمودار ہونے سے قبل وہ بمشکل ایک فرلانگ گئے ہوں گے۔ کہ گلفام کے لئے آگے قدم اٹھانا دوبھر ہو گیا۔ اس کا سانس بہت تیزی سے چل رہا تھا۔ تمام جسم میں تھرتھری پیدا ہو گئی تھی۔ ٹانگوں پر کافی دیر زیادہ زور پڑنے کے باعث زخموں کے اندر سے خون رِسنا شروع ہو گیا تھا۔ اور اس طرح اس کی رگوں میں سے نکلے ہوئے عزیز خون نے زمین پر ایسے نقوش پیدا کر دیئے۔ کہ اگر کوئی تعاقب کرنا چاہے۔ تو آسانی سے سراغ ملتا چلا جائے۔ اس نے حسرت سے اپنی ٹانگوں کو دیکھا۔ ان ٹانگوں کو جن کی طاقت اس کو کھیل کے میدان میں کامیاب بنا دیتی تھی۔ مگر آج اس کے جسم زار کو بھی گھسیٹنے سے معذور تھیں۔ اپنی عظمت گذشتہ کا خیال کر کے وہ رونے لگا۔ اس کی کمر سینکڑوں زخموں سے داغدار تھی۔ اور جگہ جگہ نجاست لتھڑی ہوئی تھی۔ حالانکہ کچھ عرصہ قبل اس پر بندے کس کر سواری لینا انسان کے لئے باعثِ فخر تھا

دو روز سے پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں پیا تھا۔ اس کے حلق میں کانٹے پڑنے لگے۔ کچھ نہ کھانے کی وجہ سے نقاہت بڑھ رہی تھی۔ زخموں کی تکلیف سے جسم نڈھال تھا زندہ رہنے کی تمنا میں مزید کشمکش کرنا اس کی طاقت سے باہر ہو گیا اس کی ٹانگیں لڑکھڑائیں۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ وہ گر پڑا۔ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ زمین بالکل پتھریلی تھی۔ چھوٹے چھوٹے سنگریزے اس کے زخموں میں گھس گئے۔ وہ تکلیف سے بلبلا اٹھا۔ مگر کوئی نہیں تھا جو ایک چمکاری دے کر اس کے درد میں کمی کرنے کوشش کرتا۔ اس نے دو چار لاتیں ماریں کہ شاید اس طرح بچاؤ کی کوئی صورت نکل آئے۔ مگر الٹا اثر ہوا۔ قریب کی خاردار جھاڑیاں اس کے زخموں پر نشتر زنی کرنے لگیں۔ آخر کار بے حال ہو کر وہ خاموش لیٹ گیا۔ اس کی گردن کی رگیں پھولنے لگیں۔ اور پسلیوں سے لگا ہوا پیٹ لوہار کی دھونکنی کی طرح زور زور چلنے لگا۔ اس کا سانس اکھڑ گیا۔ دونوں نتھنے خون آلود جھاگ سے بھر گئے۔ اس کا ہنہنانا بھی ایک بھیانک شور میں تبدیل ہو رہا تھا۔ اس کے کراہنے کی آواز سن کر کس کے دل میں رحم پیدا ہوتا۔ جب کہ وہاں کوئی متنفس موجود نہیں تھا۔ اس کی تمام گریہ وزاری صدا بصحرا تھی۔ اس کی آہ و بکا کو صرف ان جنگلی طیور نے سنا جو قریب کے ایک پرانے درخت پر اپنے گھونسلوں میں چھپائے بیٹھے تھے۔ مگر اس سے پہلے ہی سے قبل اس کی بے جا اور غیر متوقع مداخلت کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوئے اڑ چکے تھے۔ صرف اسی مرنے والے کی جانکنی کی آہیں خاموش فضا کے طلسمِ سکوت کو توڑ رہی تھیں۔ یا کبھی کبھی موتی کے بھونکنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ جو انتہائی بے چینی کے ساتھ اپنے قریب الموت رفیق کے جسم زار پر تھوتھنی رگڑ رگڑ کر اظہارِ ہمدردی کر رہا تھا

وہ بار بار اس کی ایال اپنے منہ میں پکڑ کر گھسیٹتا۔ اس کے سموں پر اپنے پنجے مارتا۔ مگر مرنے والا گلفام نہیں سمجھ سکا کہ اس کا دوست اسے کہاں چلنے کے لئے آمادہ کر رہا ہے۔ اگر موتی میں سمجھ ہوتی اور اس کی پتلی ٹانگیں اس بارِ گراں کی حامل بننے کی اہل ہو سکتیں تو وہ یقیناً گلفام کو اپنی کمر پر لاد کر ایک ایسی فضا میں لے جاتا جہاں کوئی اس کے زخموں کو مندمل کر دیتا۔ وہ اس کو انسانوں کی دنیا سے نکال کر معصوم فرشتوں کی نگری میں پہونچا دیتا جس جگہ ہر دھڑکنے والے دل میں سچی اور بے لوث محبت کا دریا لہریں مارتا ہے۔ جس مقام پر سانس لینے والا ہر متنفس پژمردہ پھولوں کی بھی اتنی ہی قدر کرتا ہے جتنی ان کی حالتِ شگفتگی میں ــــ

سورج کافی طلوع ہو چکا تھا۔ کسان جھونپڑوں سے نکل کر کھیتوں کی طرف جانے شروع ہو گئے ــــ مویشیوں کی گردنوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی صدا سنائی دینے لگی۔ کسی دور کے کھیت سے درانتی کی آواز بھی سنائی دی۔ شاید چنے کی فصل تیار ہو گئی تھی۔ گلفام زمین پر سم رگڑنے لگا۔ اس نے زور سے لاتیں چلائیں۔ ہنہنانے کی ناکام کوشش کی۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی دیہاتی کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لے۔ یہ لوگ بہت نیک اور ہمدرد ہوتے ہیں۔ مگر اس کی فریاد کسی کے کان تک نہ پہونچی۔ موتی بھی اپنے دوست کا منشاء سمجھ کر چلانے لگا۔ وہ اتنی زور سے بھونکا کہ قرب وجوار کے دوسرے کتے بھی اس کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئے۔ کتوں کی فطرت ہے کہ اپنے ہم جنس کی آواز سن کر خواہ مخواہ چلانے لگتے ہیں۔ گویا انھیں بھی اس کے ساتھ ہمدردی ہے۔ مگر کتوں کی زبان کو بھی کسان نہ سمجھ سکے۔ کھیت پک چکے تھے اس لئے وہ اپنے کام میں پورے انہماک کے ساتھ غرق تھے

گلفام اپنے خیالات میں محو ہو گیا۔ ایک خواب بیداری کے عالم میں کوٹھی کا منظر اس کی نگاہ کے سامنے تھا۔ تخئیل کی آنکھ سے اس نے دیکھا کہ مالک اور گھر کے دوسرے لوگ بیدار ہو گئے ہیں۔ ملازم اپنے فرائض کی انجام دہی میں کمربستہ ہیں سائیس سے گلفام کی حالت دریافت کی جا رہی ہے۔ وہ اطلاع دیتا ہے کہ رات کے سکوت میں وہ کہیں بھاگ گیا۔ مالک "خس کم جہاں پاک" کہہ کر قہقہہ لگاتا ہے۔ اور سائیس کو ہدایت کرتا ہے کہ بہت جلد مہترانی کو بلا کر اصطبل صاف کرائے اور اس میں گندھک روشن کر دے۔ سفیدی کرانے کا بھی حکم دیا جاتا ہے۔ گلفام چونک پڑا۔ اس کے زخمی سینہ سے ایک آہِ سرد نکلی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے آسمان کی طرف آنکھیں اٹھائیں اور بادل کی چادروں میں موت کے فرشتوں کو تلاش کرنے لگا۔ وہ زندگی سے تنگ آ گیا تھا۔ اسے مر جانے کی آرزو تھی

موتی بھاگ کر قریب کے ٹیلے پر چڑھ گیا۔ اور وہاں کھڑے ہو کر خوب چلایا۔ مگر بے سود۔ اس بستی کے تمام لوگ کم از کم اس دن کے لئے بہرے ہو گئے تھے۔ اس کی فریاد کو نہ سن سکے۔ وہ جلدی ہی واپس آ گیا۔ اس خیال سے کہ تنہائی کے ناخوشگوار لمحات میں مرنے والے دوست کو کوئی غیر معمولی صدمہ نہ پہونچ جائے۔ اس نے دیکھا کہ گلفام کے سر پر مکھیاں بھنکنے لگی تھیں۔ اس کی زبان جبڑے کے باہر لٹک رہی تھی۔ آنکھیں کھلی ہوئی مگر بے نور تھیں مکھیاں زخموں پر بیٹھتیں تو

بدن میں تھرتھری پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اب اس کا جسم بے حس ہو چکا تھا

اس کی روح کبھی کی نکل چکی تھی۔ مگر توتی کو یقین نہ آیا۔ کہ گلفام مر گیا ہے۔ وہ سمجھا کہ انتہائی کمزوری کے باعث غنودگی طاری ہو گئی ہے۔ اس لئے وہ خود بھی خاموش ہو کر زمین پر نیچے نکا کر بیٹھ گیا۔ اور ایک فلسفی کی طرح زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگا

کائناتِ عالم کی تخلیق سے خدا کا منشائے حقیقی کیا ہے ؟ انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ کس وجہ سے دیا گیا ؟ دیگر حیوانات نطق سے کیوں محروم رکھے گئے ؟ مسرت و انبساط کے ساتھ مصائب و آلام کو وابستہ کر کے زندگی کو تباہ کر دینا کس مصلحت کی بنا پر ہے ؟۔ ایسی ہستیوں کو موت جلد کیوں نہیں آجاتی جو اپنی زندگی سے بیزار ہوں ؟

یہ تھے وہ سوالات جو یکے بعد دیگرے توتی کے دل میں پیدا ہوئے مگر اس کی عقل نارسا کسی ایک امر کی بھی عقدہ کشائی نہ کر سکی۔ حتیٰ کہ آفتاب غروب ہونے کے قریب ہو گیا۔ اور گلفام کو ہوش نہ آیا۔ کیونکہ وہ ابدی نیند سو رہا تھا ——

طاہرہ دہلوی (شیرازی)

# غرائب فلکی اور کائنات کی عظمت

ہم کرۂ ارض کے باشندے جب کسی مسافت کو ناپنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے اِنچ، گز، میل وغیرہ سے کام لیتے ہیں، مثلاً زمین کے قطر کی ناپ ۸ ہزار میل بتاتے ہیں، اُس کا محیط ۲۵ ہزار میل ظاہر کرتے ہیں۔ اور سورج کا فاصلہ زمین سے ۹ کرور ۳۰ لاکھ میل کہتے ہیں، لیکن اگر جسم یا مسافت بہت زیادہ گھٹ بڑھ جاتی ہے تو اس کے لئے موجودہ ناپ تول کے آلات بالکل ناکافی ثابت ہوتے ہیں

مثلاً اگر ہم چاہیں کہ روشنی کی ایک موج کو ناپیں تو اس کے لئے سنٹیمیٹر کی ناپ بھی بہت بڑی ہے کیونکہ یہ موج اتنی چھوٹی ہے کہ اس کا خیال بھی دشوار ہے۔ چنانچہ اس کی ناپ کے لئے علماء نے ایک اصطلاح میکرون کی ایجاد کی جو ملی میٹر کا ہزارواں حصّہ ہے

اس کے بعد جب سوال پیدا ہوا۔ ایکس شعاعوں کا تو میکرون بھی بڑا مقیاس ثابت ہوا اور اس کے لئے انگسٹرم کی اصطلاح وضع کی گئی جس کے معنے ہیں ایک انچ کا ایک اربواں حصّہ، اور ہندسوں میں اس طرح ظاہر کر سکتے ہیں $\frac{1}{1000000000}$ انچ۔ یہ تو حال ہوا چھوٹے چھوٹے اجسام کی پیمائش کا۔ لیکن اب دور کی مسافتوں کو لیجئے، کہ اگر وہ بہت زیادہ بڑھ جائے تو میل وغیرہ سب بیکار ہو جاتے ہیں۔ مثلاً آپ ایک ستارہ الفا قنطوروس کو لیجئے جو ہمارے نظام شمسی سے قریب ترین واقع ہونے والا ستارہ ہے لیکن اس کا بُعد زمین سے، آفتاب اور زمین کے بُعد کا تین لاکھ گنا ہے یعنی اگر ہندسوں میں اسے ظاہر کریں تو ۲۳ کھرب میل ہوں گے۔ اسی لئے علم ہیئت میں ان فاصلوں کے ناپنے کے لئے روشنی کی رفتار کو مقیاس قرار دیا ہے۔ یعنی جب ایک ستارہ کا فاصلہ دوسرے ستارہ سے ظاہر کرنا ہوتا ہے تو یوں کہتے ہیں کہ یہاں سے وہاں تک روشنی اتنی دیر میں پہونچتی ہے، چنانچہ ابھی جس ستارہ (الفا قنطوروس) کا ذکر کیا ہے اُس کا بعد زمین سے ساڑھے تین سال نوری ہے

---

سلہ ملی میٹر، ہزارواں حصّہ ہے میٹر کا اور میٹر ساڑھے تین فٹ سے کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے میکرون برابر ہوا ۰۰۰۰۳۹۳۷۰۷۹۴۳ ء انچ کے

یعنی وہاں کی روشنی زمین تک ساڑھے تین سال میں پہونچتی ہے ، اسی طرح ایک اور ستارہ (شعریٰ) ہے جو زمین سے دس نوری سال کے فاصلہ پر واقع ہے ، قطب تارہ ۲۰۰ نوری سال کے فاصلہ پر ہے اور سدیم الجبار ۵۰۰ نوری سال کے فاصلہ پر

اگر ہم آفتاب کو مرکز قرار دیکر اس کے گرد ایک دائرہ کھینچیں جس کا قطر ہزار نوری سال کا ہو تو اس دائرہ میں وہ تمام ستارے آجائیں گے جو ہمیں آنکھ سے نظر آتے ہیں ، لیکن اگر ہم اس دائرہ کو اتنی دُور پر کھینچیں کہ اس کا قطر ۲۵ ہزار نوری سال ہو تو اس میں وہ تمام ستارے آجائیں جو ہمارے نظام کہکشاں میں شامل ہیں ، لیکن کیا اس طرح ہم فضا کے تمام ستاروں کا احاطہ کر سکیں گے - ہرگز نہیں ، کیونکہ ہمارے نظام کہکشاں کے علاوہ خدا جانے اور کتنے کہکشانی نظام پائے جاتے ہیں جن کا بُعد ایک دوسرے سے لاکھوں نوری سال کا ہے اور جن میں سے ہر ایک نظام فضا کے سمندر میں بجائے خود ایک جزیرہ کی طرح قائم ہے

اگر ان تمام فضائی جزیروں کا بُعد ایک دوسرے سے ظاہر کیا جائے تو اس کے لئے نوری سال کا مقیاس بھی ناکافی ثابت ہوتا ہے ، چنانچہ علماء نے اس کے لئے ایک اور مقیاس قایم کیا جس کی اکائی اوّل اوّل ایک ہزار نوری سال مقرر کی گئی تھی لیکن اب وہ ۱۰ لاکھ نوری سال تک پہونچ گئی ہے چنانچہ ستاروں کا وہ مجموعہ جس کا علمی نام C. G. ۱۷ ہے سات لاکھ نوری سال کے فاصلہ پر واقع ہے اور بعض سدیم ۱۰ لاکھ نوری سال کے بُعد پر ہیں

" مراۃ المسلسلۃ " سدیم کے متعلق ہیئت دانوں نے تحقیق کی ہے کہ اس کے قطر کی لمبائی ۵۰ ہزار نوری سال کی ہے اور اس کے اندر کروروں ستارے ہیں جن میں سے اکثر علیحدہ نظر نہیں آسکتے ہیں اور جو نظر آتے ہیں وہ نور و روشنی میں ہمارے سورج سے ہزاروں گنا زاید ہیں - اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر ہم اپنے سورج کو ۱۰ لاکھ نوری سال کے فاصلہ پر اٹھا کر رکھ دیں تو ہم اس کی عکسی تصویر نہیں لے سکتے ، لیکن ان ستاروں کی تصویر باوجود اس قدر بُعد کے لی جا سکتی ہے

اسی سدیم میں جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے ۱۸۸۵ء میں اوّل اوّل بعض ایسے ستارے دریافت ہوئے - جو ہمارے آفتاب سے سو لاکھ گنا زیادہ روشن ہیں اور جس سے ہر سکنڈ میں کھرب اندر کھرب ٹن مادہ ہر وقت خارج ہوتا رہتا ہے - اور یہ حساب جدید مذہب اضافیتہ کے قواعد کی رُو سے لگایا گیا ہے

الغرض عالم میں بہت سی کائنات ہیں جن کا حال ہمیں اس وقت تک بہت کم معلوم ہو سکا ہے - پروفیسر لیول

---

۱؎ روشنی کی رفتار ۱۸۶۱۷۳ میل فی سکنڈ ہے

۲؎ سدیم ترجمہ ہے ( Nebula ) کا یعنی کسی کرہ کا بالکل ابتدائی دخانی حالت میں پایا جانا

نے ویسدگاو وِلسن میں بیٹھ کر جو تحقیق کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ " مرأۃ المسلسلۃ " کا سدیم ۲۰۰ میل فی سکنڈ کی رفتار سے ہماری طرف بڑھتا آرہا ہے۔ اور مجلاّن کا سدیم ۱۷۰ میل فی سکنڈ کے حساب سے دور ہوتا جارہا ہے، بعض سدیم اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ دور ہوتے جارہے ہیں، چنانچہ سدیم سوکبی ۱۱۰۰ میل فی سکنڈ کے حساب سے دور ہورہا ہے۔ اور وہ کہکشاں جس میں ہمارا نظام شمسی داخل ہے۔ ان چکردار سدیموں کے درمیان ۲۷۰ میل فی سکنڈ کے حساب سے حرکت کر رہی ہے

فضا میں علاوہ چکردار سدیموں کے اور بہت سے سدیم ایسے ہیں جنھوں نے کوئی شکل خاص اختیار نہیں کی ہے یا زیادہ سے زیادہ یوں کہنا چاہئے کہ بُعد کی وجہ سے دوربین سے ان کی شکل سمجھ میں نہیں آئی، گویا بے شمار کائنات ہیں جو طیار ہورہی ہیں اور " دورِ تکوّن " میں پائی جاتی ہیں

فضا کی وسعت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے اگر ہمارے نظام کہکشانی کو جس میں ۵۰ ہزار ملین ستارے پائے جاتے ہیں تباہ کردیا جائے تو فضا میں اتنا خلا بھی محسوس نہ کیا جائے جتنا دریا میں ایک قطرہ کے نکال لینے سے محسوس ہوسکتا ہے

ہمارا نظام کہکشانی جس کا قطر ۵۰ ہزار نوری سال کا ہے، یوں سمجھ لو کہ فضا کی وسعت کے مقابلہ میں مسور کی دال کے برابر ہے جس کے علاوہ خدا جانے اور کتنی کائنات فضا میں پائی جاتی ہیں، اس وقت تک ہمیں علاوہ اپنے نظام کہکشانی کے مجلاّن کے کائنات کا علم ہوا ہے جو ۲ لاکھ نوری سال کے فاصلہ پر واقع ہو اور ایک کائنات کا تھوڑا سا حال معلوم ہوا ہے۔ جو ۷ لاکھ نوری سال کے بُعد پر پائی جاتی ہے۔ اسی طرح کچھ اور سدیموں کا حال معلوم ہوسکا جو دس دس لاکھ نوری سال دُور واقع ہوئے ہیں، لیکن فضا کی وسعت اور زمان و مکانی کی لانہایت کا یہ عالم ہے کہ یہ جو کچھ ہمیں معلوم ہوا ہے وہ صرف اتنا ہے جیسے ریگزارِ صحرا میں سے دوچار ریگ کے ذرّوں کا حال معلوم ہو جائے۔

---

زمین ایک کرہ ہے جو فضا میں معلق ہے اور اس کی دو گردشیں ہیں، ایک خود اپنے محور پر اور دوسری آفتاب کے گرد، اپنے محور کے گرد ۲۴ گھنٹے میں اس کی گردش پوری ہوجاتی ہے۔ اور اس طرح رات اور دن پیدا ہوتے ہیں، سورج کے گرد تقریباً ۳۶۵ ¼ دن میں اس کی گردش پوری ہوتی ہے اور اس سے سال و فصل کا

---

لہ یعنی چکردار سدیم۔ جب مادہ دخانی کیفیت میں آکر گردش کرتا ہے تو بعض مرتبہ اس کی صورت کمانی کی طرح ہوجاتی ہے اور اسی کو سوکبی سدیم یا چکردار سدیم کہتے ہیں

حساب ہوتا ہے،

کرۂ ارض کا محیط ۲۴ ہزار میل کا ہے یعنی اگر ہم ۸۰۰ میل روزانہ کے حساب سے سفر کریں تو پورے ایک مہینے میں اس کے چاروں طرف گھوم سکتے ہیں، لیکن سورج کو دیکھتے ہوئے ہماری زمین کی کوئی حقیقت نہیں ہے، کیونکہ سورج کا قطر ۸۶۶۰۰۰ میل ہے یعنی زمین سے ۱۳۳۱۰۰۰ و و گنا زیادہ بڑا ہے، لیکن اس کا مادہ بہت لطیف ہے اس لئے اس کی دبازت بہ نسبت زمین کے ۳۳۳۴۰۰ گنا زیادہ ہے، یعنی اگر اس کے مادہ کو کثیف کر کے کرُے طیار کئے جائیں تو ۳۳۳۴۰۰ کرۂ ارض بن سکتے ہیں

اس سے ظاہر ہے کہ آفتاب کتنا عظیم الشان کرہ ہے اور اس کی عظمت کے خیال سے واقعی عقل حیران رہ جاتی ہے، لیکن کائنات کی وسعت کے لحاظ سے آفتاب بھی نہایت حقیر کرہ ہے اور دور کروں کو دیکھتے ہوئے اس کی بھی وہی حیثیت ہے جو زمین کی اس کے مقابلہ میں ہے

وہ تارے جو خالی آنکھ سے ہم کو نظر آتے ہیں ۶۰۰۰ ہیں، لیکن دُوربینوں کے ذریعہ سے جو عکسی تصویریں لی گئی ہیں اُن سے ۲۲۴۰۰۰۰۰۰ تارے اور دریافت ہوئے ہیں، لیکن یہ شمار ہماری فضا کے تاروں کا نہیں ہے بلکہ صرف اس کہکشاں کے تاروں کا ہے جس کے نظام سے ہمارا نظام شمسی بھی وابستہ ہے

رات کو آسمان پر جو کہکشاں نظر آتی ہے اُسی سے ہمارا نظام شمسی متعلق ہے اور اُسی کے تاروں کی اتنی تعداد بتائی جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ رات کو تاروں کی کثرت سے مسلسل روشن سڑک سی نظر آتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تارے نہایت بیچ بیچ واقع ہوئے ہیں لیکن وہ ایک دوسرے سے بہت دُور واقع ہوئے ہیں اور اس دُوری کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ اگر آپ یورپ، ایشیا اور افریقہ میں ہر جگہ دس دس مکھیاں لے کر اُڑا دیں تو جو نسبت دُوری کی ان کے درمیان ہوگی وہی ان تاروں کے درمیان ہے

یہ حال ہے صرف ہماری کہکشاں کی وسعت کا۔ وہ گیتیں اور کہکشائیں جن کا کوئی شمار نہیں اور وہ لا تعداد کرُے جو دخانی و گیسی حالت میں پائے جاتے ہیں، سو اُن کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے جبکہ ان کی روشنی لاکھوں سال کے بعد ہم تک پہونچتی ہے

صرف ایک ڈاکٹر ہبل نے جو عکسی تصویریں۔ دُوربین کے ذریعہ سے لی ہیں اُن سے ۲۰ لاکھ دخانی کرُوں کے وجود کا پتہ چلتا ہے جن کی روشنی ۱۴۰۰۰۰۰۰۰ سال میں ہم تک پہونچتی ہے۔ اور یہ کرُے ایک دوسرے سے اتنی دور واقع ہوئے ہیں کہ ایک کی روشنی دوسرے تک ۱۸۰۰۰۰۰ سال میں پہونچتی ہے، اور ان کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ ہر ایک کرُہ سے ۲۰ لاکھ سورج ہمارے سورج کی طرح بن سکتے ہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ ڈاکٹر ہبل نے جو یہ ۲۰ لاکھ دُخانی کرُے اس عظمت و شان کے دریافت کئے ہیں وہ صرف ایک جھنڈے سے متعلق

ہیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ اس طرح کے کتنے جھنڈ فضا میں پائے جاتے ہیں، اور ان کے درمیان باہم کتنے کرور نوری سال کا فصل پایا جاتا ہے

پھر کائنات کا یہ تمام نظام خواہ خدا کا قائم کیا ہوا ہو یا از خود قایم ہوگیا ہو، اس بات کا ضرور ہم کو یقین دلاتا ہے کہ اس وسیع فضا میں ہمارا کرۂ ارض نہایت ہی حقیر کرہ ہے اور انسان جو اپنے آپ کو اتنا اہم سمجھتا ہے وہ خس و خاشاک سے بھی کم حیثیت رکھتا ہے، اس لئے کیا کوئی شخص اس کا یقین کرسکتا ہے کہ جس خدا نے اتنی وسیع فضا پیدا کرکے اسمیں لاتعداد و بے شمار نظام کہکشانی طیار کئے ہوں وہ حقیر و ذلیل انسان کے فنا کرنے کے بعد اس سے محاسبۂ اعمال کرے گا، اس کو دوزخ میں ڈالے گا اور اُس سے اپنی برہمی کا اظہار کرے گا

میں نہیں سمجھتا کہ اس عقیدہ سے زیادہ کوئی اور توہین خدا کی ہوسکتی ہے

---

# مجموعۂ استفسار و جواب

کی کتابت ہونے کے بعد یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس کی ضخامت کم از کم ڈیڑھ ہزار صفحات تک پہونچ جائے گی۔ اور یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ایک ہی جلد میں اسے شایع کیا جائے

اس لئے تین جلدوں میں اس کو پورا کیا جائے گا۔ اور ہر جلد کی قیمت چار روپیہ ہوگی۔ پہلی جلد اس سال کے اخیر تک شایع ہوجائے گی اور باقی دو جلدیں سال آیندہ میں شایع ہوسکیں گی ــــ اب براہِ کرم کوئی صاحب عبہ کا منی آرڈر بھیج کر اس کے حاصل کرنے کی کوشش نہ فرمائیں۔ اس وقت تک جن حضرات کی رقم وصول ہوگئی ہے ان کو پہلی جلد بعد اشاعت بھیجدی جائے گی۔ تینوں جلدیں اپنی اپنی جگہ بالکل مکمل چیز ہوں گی

پہلی جلد مکمل ہونے کے بعد اس کی فہرست نگار میں شائع کردی جائے گی تاکہ ناظرین کو اندازہ ہوجائے کہ اس میں کون کون سے مباحث آگئے ہیں

جو حضرات ابھی سے صرف خط بھیجکر اپنا نام درج کرالیں گے اُنکے ساتھ محصولڈاک کی رعایت ضرور کی جائے گی

منیجر نگار لکھنؤ

# ایک خط

## جو مکتوب الیہ تک کبھی نہ پہونچ سکا

اتنا قاتل خط اور اسقدر طویل ! تمھارا مقصود صرف یہ کہنا تھا کہ آیندہ میں تمھیں کوئی خط نہ لکھوں، پھر یہ پورے چھ صفحے کیوں ؟ شاید اس لئے کہ دفعۃً ایسا کہتے تم کو حجاب آتا تھا ؟ یا یہ کہ جو کچھ تم اپنی تمام عمر میں مجھ سے رفتہ رفتہ کہتیں وہ سب ایک ہی بار کہہ دینا چاہا ــــ نہیں یہ کچھ نہیں ــــ میں سمجھتا ہوں کہ تم نے مجھے نہایت آہستہ آہستہ ذبح کرنا پسند کیا یعنی اس طرح کہ حلق پر چھری بھی چل رہی ہے، تم مسکرا مسکرا کر باتیں بھی کرتی جا رہی ہو اور میں تمھاری شیریں گفتگو میں محو ہوں کہ دفعۃً ہاتھ شہ رگ کے پاس پہونچ جاتا ہے، یعنی تمھارا خط ختم ہو جاتا ہے اور اس حکم کے ساتھ کہ آیندہ تمھیں کوئی تحریر نہ بھیجوں ــــ بظاہر میں نے ایسا محسوس کیا جیسے کوئی نہایت قیمتی چینی کی قاب دفعۃً ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر جائے اور تھوڑی دیر کے لئے دل و دماغ دونوں معطل سے نظر آنے لگیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ خط لکھنے سے باز رکھ کر تم نے عمر میں پہلی مرتبہ مجھے اس کا موقعہ دیا کہ جو کچھ کہنا ہے آزادی سے کہوں اور اپنے دل کی ہر وہ بات جو اس وقت تک تم پر ظاہر نہ کر سکا تھا، کہہ ڈالوں، کیونکہ اب مجھے کیا ڈر ہے، تم سُن نہ سکوگی اور دنیا سنتی ہے تو سنے ــــ اچھا تو شروع سے کیوں نہ چلیں ــــ ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمھارا خدا بادشاہ . . . . . . !

تمھاری سب سے پہلی تحریر جب میرے ہاتھوں تک پہونچی تو میں نے سوچا کہ اگر تحریر کے یہی الفاظ میں تمھاری زبان سے سنتا تو کتنا اچھا ہوتا، یعنی اگر تم میرے سامنے بے حجابانہ آکر باتیں کرتیں تو کس قدر لطف آتا ــــ تمھیں خبر نہیں لیکن یہ سب کچھ ہو کر رہا ــــ میں نے تمھاری تحریر کے ایک ایک لفظ کو سمجھ کر حرفوں کی ایک ایک کشش کو دیکھ کر کاغذ کے رنگ اور اس کی عطریت سے مدد لے کر ذہن نے تمھاری ایک تصویر کھینچی، کاغذ پر نہیں، قلب پر، دماغ کے اس پردہ پر جو صرف نغمہ و خوشبو کے نقش کے لئے مخصوص ہے اور میں اس سے کھیلنے لگا ــــ تو کیا

میں بتا ہی دوں کہ اُس تصویر کے خط و خال کیا تھے، یعنی تم کو میں نے تمھاری تحریر کے اندر کیونکر چھپا ہوا پایا ـــــ معاف کرنا ممکن ہے کوئی بات حقیقت کے خلاف یا تمھارے ذوق کے منافی ہو ـــــ لیکن جب یہ تحریر تم تک پہونچ ہی نہیں سکتی تو پھر یہ خیال کیوں ـــــ اچھا تو سنو، اِسے سارا یا سنو، دنیا پسند کرے یا نہ کرے لیکن مجھے تو اسقدر عزیز ہے کہ اگر تم واقعی ایسی نہ نکلیں تو مجھے افسوس ہوگا ـــــ معلوم نہیں کیوں لیکن تمھاری تحریر سے یہ یقین مجھے ضرور ہوگیا کہ تمھارا رنگ ذرا سانولا ہے، کھلتا ہوا سانولا - یعنی وہ رنگ جو کیفیات سے شروع ہوتا ہے - اور کیفیات ہی پر ختم ـــــ جو بہ نسبت باصرہ کے لامسہ اور ذائقہ سے زیادہ تعلق رکھتا ہے - اور جس کو دیکھ کر بے اختیار اونگلیوں میں اضطراب اور ہونٹوں میں ارتعاش سا محسوس ہونے لگتا ہے ـــــ معاف کرنا - میرے ہاتھوں نے بھی تم کو چھوا، میرے ہونٹوں نے بھی تمھارے اُن ملیح ہونٹوں کو مس کیا جو ریشم کی طرح نرم اور پنکھڑی کی طرح نازک تھے ہر چند صحت کے لحاظ سے میں نے تم کو نحیف و کمزور پایا، لیکن جسم کا چھریرا پن، اعضاء کا لوچ دل میں سمایا جا رہا تھا، اور تناسب اعضاء سے زیادہ قامت کی رعنائی قیامت ڈھا رہی تھی

تمھارے بال بہت سیاہ تو نہیں ہیں لیکن ان میں خاص قسم کی چمک ضرور پائی جاتی ہے، اور تھوڑا سا گھونگھر کنپٹی کے پاس سے شروع ہوتا ہے ـــــ پیشانی بہت فراخ ہے اور اس میں ایک نیلگوں رگ اُبھری ہوئی مانگ تک پہونچ گئی ہے - بھویں جو کافی چوڑی ہیں ایک نہایت ہلکے خط کے ساتھ ایک دوسری سے ملی ہوئی ہیں رنگ کے بعد سب سے زیادہ تباہکن چیز تمھاری آنکھیں ہیں، جو ہر وقت کسی خیال میں مستغرق رہتی ہیں اور جن کو ایک بار دیکھ لینا گویا کسی نہایت عمیق چشمہ کے اندر ڈوبتے چلے جانا ہے

چہرہ کتابی تو نہیں ہے لیکن ٹھوڑی کی ساخت نے اس میں یہ کیفیت پیدا کر دی ہے، گردن اور اعضاء کا تناسب یکساں طور پر نمایاں ہے - اور رفتار جس سے غیر معمولی سنجیدگی ظاہر ہوتی ہے، ساری کے اندر جسم کے اُس لوچ کو پوری طرح ظاہر ہونے نہیں دیتی، جو اگر تموج کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے تو تم ایک خوبصورت ناگن کی طرح سامنے سے راستہ کاٹتی ہوئی گزر جاؤ ـــــ عمر کی نسبت تم خود ظاہر کر چکی تھیں کہ وہ ۲۰ سے کم اور پندرہ سے زیادہ ہے ـــــ الغرض یہ تھی تمھاری تصویر جو میں نے تمھاری اوّلین تحریر کو دیکھ کر اپنے قلب پر مرتسم کی تھی، لیکن تمھاری بلند فطرت اور غیر معمولی ذہانت تو تمام قیاسات سے بلند ایک ایسی زبردست حقیقت تھی کہ جس کو اگر میں شروع ہی سے نظر انداز نہ کر دیتا تو شاید اس سے قبل ہی تم کو یہ لکھ دینا پڑتا کہ " آیندہ میرے نام کوئی خط نہ بھیجا جائے "

میں چاہتا تھا کہ تم مجھ سے اور زیادہ بے تکلف ہو جاؤ، اور میں تم کو کسی ایسے لفظ سے مخاطب کر سکوں جو تمھاری پیشانی پر ہلکا سا خم پیدا کر سکے، لیکن اچھا ہوا کہ اس منزل تک پہونچنے سے قبل ہی، یہ بساط اُلٹ

دی گئی اور تم نے اپنی زندگی کی اس تلخ حقیقت کو سمجھ لیا۔ کہ اگر عورت اس کے سمجھنے پر مجبور نہ ہو تو خدائی کا دعویٰ بھی اس کے لئے کوئی بڑی چیز نہیں

ہر چند میں تم کو دنیا میں آزاد، انسانی دسترس سے دُور کسی آسمانی دیوی کی طرح بلند دیکھنا چاہتا تھا، لیکن میری یہ تمنا پوری نہ ہوئی اور تمہاری زندگی کا وہ دَور جب تمہارا جسم تمہاری روح کے اندر محوِ خواب تھا، بہت جلد ختم ہو گیا

پھر بتاؤ کہ اب تمہاری رومان آفرینیوں کا کیا عالم ہے، تمہاری محبت کی وہ اثیری فضا کیا ہو گئی جہاں مرد کی پروازِ خیال کو بھی تم تھکا کر گرا دینا چاہتی تھیں ۔۔۔ مگر میں یہ کیوں پوچھ رہا ہوں، مجھے کیا حق حاصل ہے اور اگر تم جواب بھی دو تو مجھ سے کہنے کے لئے الفاظ کہاں سے لاؤ گی، اور کہو گی بھی تو کلیجہ پر ہاتھ کون رکھے گا،

تمہارے اس پچھلے خط میں، سب سے زیادہ تڑپا دینے والی خبر اگر کوئی تھی تو صرف یہی کہ تمہارے جسم کے ساتھ تمہاری روح کا سودا ابھی نہیں ہوا، مجھے اس خبر سے خوش ہونا چاہئے تھا، لیکن باور کرو کہ میں یہ سنکر بہت ملول ہوا اور دیر تک سوچتا رہا کہ تم کتنی گھبراتی ہو گی ۔۔۔ میں تو اب تسکین کے الفاظ بھی تم تک نہیں پہونچا سکتا، کیا کروں مجبور ہوں، اچھا تو اب میں اپنی تسکین کی چیزیں بھی اپنے سے جدا کئے دیتا ہوں اور تمہارے وہ تمام خطوط جن کو میں نے اس وقت تک حرزِ جاں بنا کر رکھا تھا۔ نذرِ آتش کرتا ہوں

اے عزت و شرافت کی دیوی ! میری یہ قربانی قبول کرے

# اولی الالباب سے خطاب

# علاج بالغسل

## (تاریخ)

یہاں لکھنؤ میں ایک صاحب نربدا پرشاد صاحب سریواستوا ہیں، جن سے بالکل اتفاقیہ ملاقات ہوگئی۔ چونکہ مجھے بھی اس علاج کا کئی بار مفید تجربہ ہو چکا ہے اس لئے مجھے موصوف کی گفتگو سے بہت دلچسپی پیدا ہوئی اور میں نے انھیں آمادہ کیا کہ اُردو میں اپنے تجربات کو قلمبند کردیں۔ چنانچہ میں شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری خواہش پوری کی اور اس طرح اس مضمون کا پہلا حصہ اس ماہ کی اشاعت میں درج کیا جاتا ہے۔

مسٹر نربدا پرشاد کے مسودات دیکھ کر مجھے حیرت ہوگئی کہ انھوں نے کس محنت شاقہ سے کام لیکر اس طریق علاج کا نہ صرف مطالعہ کیا ہے بلکہ اس میں بعض نئی اختراعات سے بھی کام لیا ہے۔ موصوف نے بڑے بڑے معرکہ کے علاج کئے ہیں اور اگر کوئی صاحب اُن کا مشورہ حاصل کرنا چاہیں تو ۲۳۱ احاطہ آغا تراب خاں لکھنؤ کے پتہ سے خط و کتابت کر سکتے ہیں

(اڈیٹر)

---

علاج بالغسل کی تاریخ میں مسٹر لوئی کوہنی کا نام زریں حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے نہ اس لئے کہ وہ اس کے موجد ہیں۔ بلکہ صرف اس لئے کہ انھوں نے اس میں بہت مفید اضافہ کیا اور چہرہ کو دیکھ کر تشخیص مرض کا بالکل جدید نظریہ پیش کیا

پانی کے ذریعہ سے امراض دور کرنے کا طریقہ زمانۂ قدیم ہی میں معلوم ہو چکا تھا اور غالباً یہ ایجاد انسان کے عہد وحشت کی پہلی ایجادوں میں سے ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسیریا، قدیم مصر، ہندوستان،

ایران اور یونان میں اس علاج کا رواج پایا جاتا تھا۔ ہندوؤں کی معاشرت و مذہب میں پانی کا کثیر استعمال اور دریاؤں کا احترام وغیرہ سب اس کی یادگار ہیں

مسیح سے کئی صدی قبل چین کی قدیم تاریخ سے اس کا وہاں رائج ہونا پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک بار وہاں کے کسی معالج نے ایک عورت کا علاج برف کے پانی سے کیا تھا۔ یعنی نہایت سرد پانی سے سینکنے کے بعد خشک کپڑا اس کے چاروں طرف لپیٹ دیا تھا۔ چنانچہ زمانۂ موجودہ میں بھی پانی سے بھگوئی ہوئی ایک چادر لپیٹ کر اوپر سے خشک کمل لپیٹنا اس طریق علاج میں رائج ہے

جاپان میں ٹوکیو سے جو اوس کا صدر مقام ہے ایک میڈیکل جرنل نکلتا تھا۔ سنہ ۱۸۱۱ء کے اس جرنل میں وہاں تقریباً ۸۰۰ سو برس پہلے ٹھنڈے غسلوں سے علاج کیا جاتا تحریر تھا۔ تقریباً چار سو برس گذرے ہوں گے کہ ڈاکٹر "ناکاگامی" (Dr. Naca Gama) نے ٹھنڈے غسلوں کے خواص کے متعلق ایک چھوٹی سی کتاب شائع کی تھی۔ اوس میں اونھوں نے دمہ۔ امراض اطفال۔ ہسٹریا اور دیوانگی وغیرہ میں ان غسلوں کی بڑی سفارش کی تھی

قدیم اسپارٹا میں ان غسلوں کے لئے خاص قانون مقرر تھا۔ اور اہل روما میں بھی ان غسلوں کی طرف بڑی توجہ کی جاتی تھی۔ روما کے غسل خانے اتنے وسیع ہوتے تھے کہ ان میں ہزاروں آدمی نہا سکتے تھے۔ اور ان میں علاوہ ٹھنڈے اور گرم غسل کے بھاپ اور گرم ہوا کے ذریعہ سے بھی غسلوں کا انتظام رہتا تھا۔ وہ لوگ بالوں کے کھولنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کیا کرتے تھے

ہپوکرسٹیس (Hippocretes) پانی کے خواص کا بڑا ماہر تھا۔ اور بخار، پھوڑا، پھنسی، اور تقریباً تمام امراض میں ٹھنڈے اور گرم دونوں قسم کے غسل سے علاج کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ سرد پانی سے غسل کرنے کے بعد جسم جلد گرمی حاصل کر لیتا ہے اور گرم بنا رہتا ہے لیکن گرم پانی کا اثر اس کے خلاف ہوتا ہے۔ اوس کا یہ بھی اصول تھا کہ سرد پانی کا غسل تھوڑی دیر ہونا چاہئے اور اوس کے بعد بدن ملنا چاہئے

اسلیپیڈس (Asclepiades) ٹھنڈے اور گرم غسل کے علاوہ پٹیاں بھی استعمال کرتا تھا۔ اوس کے شاگرد اینٹونیس (Antonius) نے اس علاج میں بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ شہنشاہ آگسٹس (Augustus) کا زکام کہنہ اوسی کے ٹھنڈے غسلوں سے اچھا ہوا تھا۔ شہنشاہ مذکور کا بھتیجہ نیپلیس (Naples) میں بیئی (Baiae) کے گرم غسلخانہ میں علاج کے لئے گیا تھا۔ انیٹونیس (Antonius) کے علاج غسل سے شاعر ہوریس (Horace) کو شفا ہوئی تھی

پیسٹرنیپ (Pastor Kneipp) قدیم بیوریا کے ڈاکٹر اپنے علاج میں پٹیوں وغیرہ کا بھی استعمال کرتے تھے

پلنی (Pliny) کے بیان کے مطابق پانچ سو برس تک یہ طریق علاج روم میں بکثرت رائج رہا سیلس (Selcus) اور دوسرے مشہور معالج اپنی تصنیفات میں غسلوں کی بڑی تعریف کر گئے ہیں۔ سیلس (Selcus) نے اسے کامل طریق علاج بتایا اور اس کے ساتھ ورزش اور مالش وغیرہ بھی شامل کی

عرب کے اطباء نے بھی اس طرف خاص توجہ کی چنانچہ چیچک اور بخار کے بارے میں جو غسل وہ تحریر کر گئے ہیں اس وقت تک اون میں اضافہ نہ ہو سکا

رہیزیز (Rhazes) لکھتا ہے کہ بخار کو کم کرنے کے لئے جلدی جلدی ٹھنڈا پانی پینا مفید ہے بوعلی سینا (Avicina) قبض دور کرنے کے لئے ٹھنڈے پانی کی سفارش کرتا تھا۔ لوائیس (Lyons) کے رہنے والے مسٹر بارا (Bara) نے گھلی ہوئی برف پینے اور پانی سے بھرے ہوئے برتنوں کو پیال اور تنکے وغیرہ سے ڈھک کر ان کو ٹھنڈا رکھنے کی طرف توجہ دلائی تھی۔ اوس نے ۱۷۲۶ء میں ایک کتاب شائع کی۔ جس میں کہ اس نے جملہ امراض کہنہ و امراض متعدیہ مثلاً طاعون و دق وغیرہ میں اس علاج کی سفارش کی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ ٹھنڈا پانی بہترین دوا ہے

اٹلی کے طبیب لنزائن (Lanzine) نے اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں پانی کے اندرونی استعمال اور اس کے ذریعہ سے تپ دور کرنے کے باب میں ایک عمدہ کتاب مرتب کی تھی۔ فرا برنیرڈینو (Fra Bernendino) کا نام ہی ٹھنڈے پانی کا ڈاکٹر ہو گیا تھا۔ وہ بدہضمی، عصبی امراض، اور سیلان الدم کا علاج برف سے کرتا تھا

جان وسلی ایم۔ اے (John Wesley M.A.) نے ۱۷۴۷ء میں ایک کتاب شائع کی جس کا نام پریمیٹیو فزیک (Primitive Physic) تھا۔ اس کتاب میں پانی کے استعمال سے امراض دور کرنے کی جو تدابیر بتائی ہیں۔ اون سے ظاہر ہوتا ہے کہ پانی کی صحت بخش خصوصیات اوس وقت بھی معلوم تھیں وہ لکھتا ہے کہ

(۱) میعادی بخار میں جاڑا معلوم ہونے سے پہلے ٹھنڈے پانی سے غسل کرنا، اور ٹھنڈا پانی پینے کے بعد اوڑھکر لیٹ رہنا۔ فرانس اور جرمنی میں اب بھی رائج ہے

(۲) معمولی بخار میں کم اور زود ہضم غذا کھانا، اگر زیادہ کمزوری نہ ہو اور ضعیفی بھی نہ ہو تو ٹھنڈے پانی سے غسل کرنا

اور جاڑا معلوم ہونے سے قبل اوڑھ کر لیٹ جاتا اور تھوڑا تھوڑا وقفہ دے کر لیموں ڈال کر پانی پینا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں رائج تھا۔ اور جب کونین وغیرہ ناکامیاب ہوتی تھیں تو اس سے فائدہ ہوتا تھا

(۳) مرگی میں بھی ٹھنڈے پانی سے غسل کرنا اور سرد پانی پینا مفید ہے

(۴) دمہ میں روزانہ صبح ٹھنڈا پانی پینا۔ پھر فوراً ہی ٹھنڈے پانی سے سر دھو ڈالنا۔ اور ہفتہ میں ایک بار ٹھنڈے پانی سے غسل کرنا مفید ہے۔ فوری رفع تکلیف کے لئے تھوڑا گرم پانی پی کر قے کر ڈالنا کار آمد ثابت ہوا ہے

(۵) خشک دمہ کے لئے ہفتہ میں تین بار ٹھنڈے پانی سے غسل کرنا از بس سود مند ہے

(۶) چوٹ کا آماس روکنے کے لئے، فوراً پانچ چھ تہ کپڑا کر کے اوسے ٹھنڈے پانی میں بھگو کر لپیٹنا۔ اور جب گرم ہو جائے تو پھر ٹھنڈے پانی میں بھگو کر لپیٹنا مفید ہے

(۷) چوٹ سے اگر آماس پیدا ہو جائے۔ آدھ گھنٹہ تک صبح و شام گرم پانی میں کپڑا بھگو کر سینکنا فائدہ مند ہے

(۸) آگ سے جل جانے کی حالت میں۔ جلے ہوئے حصہ کو ٹھنڈے پانی میں ایک گھنٹہ سے لے کر چار پانچ گھنٹہ تک ڈبوئے رکھنا فائدہ پہونچاتا ہے

کلین (Cullen) نے بھی پانی کے استعمال پر ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ ڈاکٹر ڈارون (Dr. Darwin) کے اصول پر کام کرتے تھے۔ وہ جاڑا لگنے پر گرمی پہونچاتے تھے۔ اور گرم ہو جانے پر ٹھنڈک پہونچاتے تھے

سر جان فلائر (Sir John Flayer) نے سترہویں صدی کے آخر میں پانی سے بھیگی ہوئی چادر لپیٹ کر علاج کرنے کا ذکر کیا ہے، اوس نے لکھا ہے کہ انگلینڈ میں بھی لوگ اس کے عادی تھے لیکن اوس کی شکل کچھ اور تھی

سر جان سنکلیر (Sir John Sinclair) نے بھی اس پر ایک کتاب لکھی تھی

پندرہویں صدی میں اٹلی کے طبیب سیوانرولا (Savonarola) بریزی (Bairizzi) اور بیکیو (Baccio) ٹھنڈے پانی کا بکثرت استعمال کرتے تھے

اوس وقت اسپین اور جرمنی میں اس کا بڑا رواج تھا۔ سترہویں صدی میں سپٹلا (Septala) درد سر اور لوہ لگ جانے میں ٹھنڈے پانی سے کام لیتا تھا۔ بلجیم (Belgium) کے طبیب ہرمین (Herman) ٹھنڈے پانی سے کل امراض اچھے کرتے تھے

سر جان فلائر (Sir John Flayer) مذکور نے ۱۶۹۰ء میں غسلوا کا پورا حال لکھا

انھوں نے لچفیلڈ ( Lichfield ) واقع انگلینڈ ( England ) میں ایک پانی کا شفاخانہ بھی کھولا۔ جس میں گرم و سرد غسل اور خشک لپیٹ کا باقاعدہ انتظام تھا

اوس کے بعد ۱۷۲۳ء میں جان ہینکاک ( Hancock ) نے بھی غسل پر ایک کتاب لکھی وہ مریض کو زیادہ پانی پلاکر اور کمبل میں لپیٹ کر پسینہ لاکر علاج کرتے تھے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ لال بخار میں ٹھنڈا پانی پینا بہت مفید ہے

سر جان چارڈن ( Sir John Chardin ) اٹھارہویں صدی کے ایک مشہور انگریزی سیاح تھے، وہ ایران پہونچ کر میعادی بخار میں مبتلا ہوئے۔ اون کے ساتھ ایک فرانسیسی سرجن بھی تھے جو اون کی نازک حالت دیکھ کر گھبرا گئے۔ اونھوں نے فوراً ایک ایرانی طبیب بلایا۔ اس نے مریض کو پانچ فاقہ کرائے۔ اور فاقہ کی حالت میں برف سے ٹھنڈا کیا ہوا پانی کثرت سے پینے کو دیا۔ اسی کے ساتھ پانی سے بھیگی ہوئی چٹائی میں لپیٹ دیا۔ اور اسے پانی سے تر رکھا۔ جس سے دو ہی دن میں بخار غائب ہوگیا

اٹھارہویں صدی کے آخر میں کری اور جیکسن ( Currie & Jackson ) دو مشہور انگریزی طبیب ہوئے ہیں۔ اونھوں نے اس کی بڑی چھان بین کی۔ اور اچھی کامیابی حاصل کی اونھوں نے اس پر کتابیں بھی لکھیں

۱۷۹۹ء میں آسٹریا ( Austria ) کے گریفن برگ ( Grafenburg ) میں ایک چھوٹے سے گاؤں سلیسیا ( Silesia ) میں ونسنٹ پرسنیز ( Vincent Priessnitz ) کی پیدائش ہوئی۔ چونکہ یہ گاؤں کے رہنے والے تھے انگریزی کتابوں میں ان کے لئے صاف صاف گنوار لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ للذا ناظرین بھی اونھیں گنوار ہی سمجھ لیں یہی گنوار آدمی تھا جس کو پانی کے علاج کی دُھن سوار ہوئی اور اوس نے اوس میں کافی تجربہ حاصل کیا

یہاں پر یہ بھی بتلا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پرسنیز ( Priessnitz ) کو ایسی کیا مصیبت پڑی تھی جس کی وجہ سے وہ پانی کی خوبیاں آزمانے پر مجبور ہوئے۔ اس کا واقعہ یوں ہے کہ جب اون کی عمر صرف سترہ برس کی تھی۔ ایک حادثہ سے ان کے جسم میں کئی جگہ چوٹ آئی۔ اور دو پسلیاں بھی ٹوٹ گئیں۔ موجودہ طبیبوں نے صحت ہونے سے پورا جواب دے دیا۔ چونکہ اونھیں اپنے مویشیوں کا علاج کرنے میں پانی سے اکثر کام لینا پڑتا تھا۔ اس لئے اونھوں نے وہی طریقۂ عمل اپنے اوپر بھی استعمال کیا یعنی چوٹ کھائی ہوئی جگہوں کو بھیگے ہوئے کپڑے سے ڈھک دیا۔ اور اونھیں برابر تر رکھا۔ تھوڑے عرصہ میں اوسے پوری صحت حاصل ہوگئی۔ اس حیرت انگیز کامیابی کو سنکر لوگ اون کے پاس دُور دُور سے آنے لگے

اوران کا تمام وقت مریضوں کی تیمارداری میں گذرنے لگا۔ اُن کے اس کام سے خوش ہو کر حکومت آسٹریا نے اون کو سند عطا کی اور اس کے بعد فرانس کے فوجی علاج میں بھی پانی سے کام لیا جانے لگا۔ فرانس گورنمنٹ نے اپنے آدمی ان کے پاس یہ علاج سیکھنے کے لئے بھیجے اور اوسے اپنے یہاں رائج کیا۔ اس کے بعد مسٹر فلوری (Mr. Fleury) نے ایک بہت عمدہ باقاعدہ پانی کے علاج پر کتاب لکھی۔ یہ کتاب ۱۸۵۰ء میں شایع ہوئی۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے باقاعدہ تحقیق کرکے اپنے تجربات قلمبند کئے

امریکہ میں بھی زمانہ قدیم سے اس طریق علاج کا رواج چلا آتا تھا۔ چنانچہ فلیڈیلفیا (Philadelphia) میں ڈاکٹر بنجمن رش (Benjamin Rush) گٹھیا۔ چیچک خسرہ زرد بخار و دیگر بیماریوں کا علاج ٹھنڈے پانی سے کرتے تھے۔ ۱۷۹۴ء میں اونھوں نے بخار میں برف کی تھیلی سر پر رکھنا ایجاد کی۔ اوس میں اونھیں بڑی کامیابی ہوئی

ڈاکٹر بارڈ (Dr Bard) اور ڈاکٹر ہوسک (Dr: Hosack) دونوں نے نیویارک (New York) کے اسپتال میں ۱۷۹۵ء سے ٹھنڈے پانی کا استعمال شروع کیا۔ مسٹر کری (Mr: Curry) کی کتاب اوس کے تین چار سال بعد امریکہ پہونچی۔

۱۷۹۹ء میں آگسٹا (Augusta) کے پیٹر ایڈس (Peter Edes) نے اوس کتاب میں اپنے تجربات ملاکر دوسری کتاب مرتب کی۔ ایک دوسرے امریکن مصنف نے ۱۸۰۰ء میں سوجن کے لئے اور فاسد مادہ سے بھرے ہوئے مقام پر گیلی پٹی باندھنا ایجاد کیا

گوتم بدھ نے ایک مرتبہ مگدھ دیش میں اپنے ایک شاگرد سے کہا تھا کہ گیلی مٹی اور گوبر سے سانپ کا زہر دور کیا جاسکتا ہے۔ پانی کی طرح مٹی کا اثر بھی ہزاروں برس پہلے معلوم کرلیا گیا تھا۔ جس کے ہزارہا ثبوت ہیں

پانی کی عجیب و غریب فوقیت معلوم کرنے کے بارے میں ورجینیہ (Virginia) کے ہنری ولسن لاکیٹ (Henry Wilson Locket) کے تجربات قابل تعریف ہیں۔ اون کے تجربات ۱۸۰۱ء میں شایع ہوئے تھے۔ وہ ایک کتاب کی صورت میں پنسلوینیہ Pennyslovania کی یونیورسٹی میں پیش ہوئے تھے۔ وہاں سے اونھیں ڈاکٹر آف میڈیسن (Doctor of medicine) کی ڈگری عطا ہوئی تھی

ویدوں میں سے ایک اجوروید بھی ہے اور اس میں بھاپ کے ذریعہ سے علاج کرنے کا حال بتایا گیا ہے

ڈاکٹر لاکٹ (Dr Lockette) کے تجربات سے متاثر ہوکر ڈاکٹر دووڈیٹ (Dwight)

نے بہت سے کامیاب علاج اسی طرح کئے۔ اس کے بعد فلیڈیلفیہ (Philadelphia) کے ڈاکٹر جان بل (John Bull) نے اس میں اور ترقی کی اور ایک دوسری کتاب موسومہ باتھس (Baths) مرتب کی۔ یہ کتاب انگریزی میں اب تک موجود ہے

انیسویں صدی کے نصف حصہ میں لیبرمیسٹر (Liebermeister) برانڈ (Brand) زیمیسن (Ziemssen) باشندگان جرمن اور ونٹرنٹز (Winternitz) باشندہ ویانا (Vienna) نے فلیوری (Flury) کی تصنیفات پر نظر ثانی کی امداد سے زیادہ مرتب شکل میں پیش کیا

ہندوستان میں سب سے پہلے پنڈت شاستری نے مہاراجہ جے پور کا علاج کیا تھا۔ وہاں سے اونھیں قریب تین لاکھ روپیہ عطا ہوا تھا۔ اونھوں نے ڈیڑھ لاکھ روپیہ صرف کرکے راجپورا میں پہلا قدرتی صحت گاہ (Nature cure clinic) کھولا۔ اوس میں اونھیں کافی کامیابی بھی ہوئی تھی۔ لیکن اس کے تین ہی برس بعد وہ انتقال کر گئے۔

پنڈت کرشن سروپ سوتی۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی وکیل مرادآباد نے ہر مسٹر کوہنے کی مرتبہ کتاب دی نیو سائنس آف ہیلنگ (The new science of healing) کا ترجمہ اُردو و ہندی میں کیا لوگوں کی کافی امداد کی۔ دو تین سال ہوئے انتقال کر گئے

مسٹر جوا جی کرشنا راؤ ساکن مدراس نے بھی اس کے لوگوں کو کافی فائدہ پہونچایا

مہاتما گاندھی نے بھی اسے قبول کیا۔ اور وہ اس کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سنڈلیر ایم ڈی (Dr. Lind Lair M.D) کو جب اونھوں نے خط لکھا تھا۔ تو اس کی بڑی تعریف کی تھی

پہاڑوں کے بعض وحشی قبائل میں دستور ہے کہ جب اون کے یہاں کوئی شخص بیمار پڑ جاتا ہے تو شام کو گاؤں بھر میں سب کو خبر کر دی جاتی ہے۔ صبح یا دوپہر کو جیسا وہ لوگ آپس میں طے کریں سب لوگ اپنے اپنے یہاں سے ایک ایک گھڑا تازے پانی سے بھر کر مریض کے گھر جاتے ہیں۔ گھر والے مریض کو لاکر ایک پرنالے کے نیچے برہنہ بٹھلا دیتے ہیں اور اوسے پکڑے رہتے ہیں۔ گاؤں والے ایک ایک کرکے دھار باندھ کر گھڑے کا پانی اوس کے سر پر ڈال کر چلے جاتے ہیں۔ اگر ضرورت ہوتی ہے تو دوسرا گھڑا پھر بھر لاتے ہیں۔ وہ لوگ مریض کے رونے چلانے کی پرواہ نہیں کرتے۔ جب اون کے اندازے کے مطابق پانی گر چکتا ہے تو مریض کو خوب پونچھ کر رضائی وغیرہ میں لپیٹ کر لٹا دیتے ہیں۔ مریض کو پسینہ آجاتا ہے۔ اور وہ اچھا ہو جاتا ہے۔ پسینہ لانے کے لئے جنگل کی کچھ پتیاں ڈال کر پانی کو گرم کرتے ہیں۔ ایسی بھاپ کا ذکر آیورویدک و حکمت کے گرنتھوں میں بھی ہے

اتنے بیان سے ناظرین پر غالباً یہ امر واضح ہوگیا ہوگا کہ پانی اور مٹی کا علاج نہایت قدیم علاج ہے اور اس کے فوائد سے انکار نہیں ہو سکتا، لیکن چونکہ یہ فن عہدِ وسطیٰ میں مٹ چکا تھا۔ اس لئے اب وہ لوگوں کو بالکل نئی چیز معلوم ہوتا ہے

میں نے چونکہ اپنی عمر کا بڑا حصہ اس طریقِ علاج کی تفتیش و تحقیق میں صرف کیا ہے اور دُنیا میں پھر اس طرف لوگوں کو توجہ ہو چلی ہے۔ اس لئے میں نے جسارت کی کہ جو کچھ اس باب میں میری معلومات ہیں انھیں قلمبند کر دوں، ممکن ہے میری یہ خدمت اب یا آئندہ کسی وقت کارآمد ثابت ہو

یہاں تک جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ تاریخی نقطۂ نظر سے تھا آیندہ میں اس کے اصول اور طریقِ علاج پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے خود اپنے ذاتی تجربات بھی پیش کروں گا

نربدا پرشاد (سریواستوا)

---

# مکتوبات نیاز

نیاز نوازا

دنیائے شاعری میں تو یہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ ذرا سی لغزشِ پا انسان کو خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچا دیتی ہے اور اسی لئے نہایت ہی شوق و ولولہ کے ساتھ یہ تمنا بھی کی جاتی ہے کہ

من ویک لغزشِ پائے تو وقطعِ منازلہا

لیکن اس "دو اور دو چار" کی دنیا میں کسی غلطی کا زندگی کی کسی "حقیقت" میں تبدیل ہو جانا شاذ و نادر ہی کبھی دیکھا جاتا ہے —— اگر اجازت ہو تو اپنی اس غلطی کو بھی انھیں "نوادر" میں شمار کر دوں۔ ممکن ہے "اظہارِ تشکر" والی خاتون پر آپ کو برہمی ہو، لیکن کم از کم میں تو ان کا از بس ممنون ہوں کہ "آگ کی جستجو میں جانا اور پیمبری لے کر پلٹنا" موسیٰ کے بعد سے اس وقت تک تو کبھی دیکھا نہیں گیا

---

آپ کا خط پڑھنے کے بعد دو متضاد کیفیتیں مجھ پر طاری ہوئیں، ایک مسرت و انبساط کی دوسری تاسف و برہمی کی —— وہ اس لئے کہ آپ کی تحریر میں مجکو وہ سب کچھ نظر آیا جو کسی ہستی کو ادبی دنیا میں "پرستیدۂ عالم" بنا سکتا ہے اور یہ اس لئے کہ میں کیوں اس وقت تک آپ سے بے خبر رہا۔ اور آپ کی ان بیش بہا فطری ودیعتوں کو کیوں نہ بروئے کار لا سکا

مجھے ایک زمانہ سے تمنا ہے کہ نگار کسی ایسی خاتون کو پیش کر سکے جو دنیائے ادب میں عورتوں کے لئے صحیح نمونہ بن سکے، لیکن اس وقت تک کامیاب نہ ہو سکا —— ایک اور صرف ایک ملیں بھی تو "موج کوثر و تسنیم" والی کہ "خرابِ محبت" ہونے کی وجہ سے شاعری میں تو یقیناً ان کا جواب نہیں، لیکن یوں وہ ایک پتھر کی دیوی ہیں جس کے سامنے سر تو پھوڑا جا سکتا ہے لیکن زبان نہیں ہلائی جا سکتی ——

بہر حال آپ کی تحریر پڑھنے کے بعد میری یہ دیرینہ تمنا پھر از سرِ نو زندہ ہو گئی ہے۔ اور کس قدر جی چاہتا ہے کہ آپ اور آپ کی ادبیت نگار کے لئے مخصوص ہو جائے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس وقت تک آپ نے کیا لکھا

اور کہاں لکھا، لیکن یہ سمجھتا ہوں کہ آپ نے جو کچھ لکھا ہوگا - خوب لکھا ہوگا یا خوب لکھنے کے تمام آثار اس میں پائے جاتے ہوں گے - اس لئے اگر کوئی حرج نہ ہو تو مجھے اپنے تمام ادبی مشاغل اور انہاک ذوق سے بے خبر نہ رکھئے، اور کوئی مقالہ لکھ کر میرے پاس بھیج دیجئے تاکہ میں پورا اندازہ کرکے آپ کو صحیح مشورہ دے سکوں

.... میں گیارہ سال تک رہنے کی وجہ سے مجھے وہاں کی ہر چیز سے اُلفت ہے، اس لئے یہ معلوم کرکے کہ آپ کا تعلق اسی سرزمین سے ہے، یوں بھی ایک خاص کشش آپ میں پاتا ہوں - اور متمنی ہوں کہ اس حد تک ضرور آپ مجھ سے بے تکلف ہو جائیے کہ اس بُعد مکانی کو میں اپنے تصور و خیال کی مدد سے دور کر سکوں

نیاز

---

رسیا،

کہو کب مرزاپور سے واپس آئے اور ساون کی مست دسیاہ راتوں میں کس کس کے ساتھ جھولا جھولے، کہاں کہاں "کجری" سنی ---- حقیقت یہ ہے کہ تم سے بے حس بھی کم دیکھنے میں آتے ہیں، غضب خدا کا اس دلکش دیس میں پورب کی نازک، البیلی، پھریری، سبزہ رنگ صحبتوں کو چھوڑ کر علی گڈھ آ جاؤ - سچ ہے، تم کیا کرو،

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

اچھا تو اس کی سزا سنئے ---- - آپ کو معلوم ہے کہ سید صاحب کو میں نے لکھ دیا تھا کہ اس زمانہ میں آپ کو فرصت نہ ہوگی، لیکن چونکہ آپ وہاں سے قبل از وقت واپس آ گئے ہیں، اس لئے اب آمادہ ہو جائیے - اور جس طرح ممکن ہو ان کی کوششوں کو کامیاب بنائیے

ہر چند میں جانتا ہوں کہ ہزاروں عذر آپ کی طرف سے پیش ہوں گے، لیکن یہ آپ بھی خوب جانتے ہیں کہ میں ایک ماننے والا نہیں ---- پھر وقت ضایع کرنے سے فائدہ ؟

میں انھیں خط لکھ رہا ہوں، دو چار دن میں آپ کے سر پر مسلط ہو جائیں گے    نیاز

---

سنئے صاحب

آپ لاکھ میرے دوست سہی، لیکن بہرحال دشمنی اُن سے بھی تو نہیں ہے، اس لئے معاملہ اگر بالکل "سخن گسترانہ" آپڑا ہے، تو میں کیوں کسی کی خودداری کو صدمہ پہونچاؤں

میں زیادتی و یادتی کچھ نہیں جانتا، میرے سامنے تو صرف "ادا" ہوا کرتی ہے، خواہ وہ کتنی ہی سرکشانہ کیوں نہ ہو، میں شیطان سے صرف اس لئے محبت رکھتا ہوں کہ اس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا، پھر

تمھیں انصاف کرو کہ میں انھیں کیونکر مجبور کرسکتا ہوں کہ وہ وہاں جاکر معذرت پیش کردیں۔ اور کیوں کریں، جبکہ واقعی ابتدا ان کی طرف سے نہیں ہوئی، آپ اُن کی غربت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائیے۔ دنیا میں مفلس و نادار ہونا کوئی عیب نہیں، اگر فاقہ کرکرکے مرجانے کی داستان میں کوئی ٹکڑا دستِ سوال پھیلانے کا نہ ہو۔ مانا کہ آپ کے چچا جاہ و ثروت والے ہیں، رئیس ہیں، حکام رس ہیں، شہر میں خاص اثر رکھتے ہیں، لیکن میرے عزیز دوست، عزت کا سودا یوں نہیں ہوا کرتا، میرزا صاحب غریب ہیں، بیکس و محتاج ہیں، لیکن بتائیے اگر کبھی ایک پیسہ کا احسان آپ کے چچا کا انھوں نے لیا ہو۔ پھر میاں، تمھیں تو ایسے شخص کی عزت کرنا چاہئے اور فخر کرنا چاہیے کہ تمھارے محلہ میں ایک آدمی تو اس آن بان کا ہے۔ معاف کرنا، میں تمھیں سے پوچھتا ہوں کہ تمھارے چچا کا بھری محفل میں میرزا صاحب کی طرف اشارہ کرکے یہ کہنا کہ" وہ میرے پاس کیوں آنے لگے، بڑے آدمی ہیں" کیا معنی رکھتا تھا اور اگر اس پر انھوں نے یہ کہدیا کہ" میں اگر بڑا آدمی ہوتا تو خود چھوٹوں کے پاس جایا کرتا" تو کیا برا کیا۔ بیشک اس فقرہ میں طعن ہے اور سخت طعن ہے، لیکن کیا تمھارے چچا نے پہلے اُن کو چھوٹا آدمی نہیں کہا اور وہ بھی صرف اس لئے کہ بیچارے غریب ہیں ——— بہرحال میں قیامت تک اُن سے معذرت کے لئے اصرار نہ کروں گا اور کروں بھی تو کیا فائدہ مجھے معلوم ہے کہ وہ کبھی راضی نہ ہوں گے۔

۔ میری رائے تو یہی ہے کہ اس معاملہ کو آگے نہ بڑھنے دو اور اپنے چچا کو سمجھادو، میرزا صاحب کا تباہ کردینا مشکل نہیں، لیکن شاید یہ کوئی قابلِ عزت کارنامہ تم لوگوں کا نہ ہوگا

نیاز

---

" مبارک، مبارک " ——— تو میں زبان سے لاکھ بار کہدوں، لیکن دل کو کیا کروں کہ وہ زبان کا ہم نوا نہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ آپ بیٹے کی شادی کررہے ہیں یا اس کی دستاربندی کا جلسہ ہے کہ سوائے مولویوں اور واعظوں کے کسی دوسرے کو شرکت کی اجازت ہی نہیں۔ تم کہوگے کہ اجازت کیوں نہیں، شہر میں کون ہے جو مدعو نہیں کیا گیا

ہاں، ہاں صاحب فہرست میں نے بھی دیکھی ہے، تقریب کا پروگرام میری نگاہ سے بھی گزرچکا ہے، لیکن مجھے تو اس میں نہ پٹنہ کی زہرہ جان کا نام کسی جگہ نظر آیا نہ کلکتہ کی گوہر جان کا، نہ کہیں آتشبازی کا ذکر ہے نہ طبل و شہنائی کا

یہ آپ کے بیٹے کی شادی ہورہی ہے یا کراماً کاتبین کی کہ ادھر کسی گناہ کا نام آیا اور وہ شادی کے جلسہ سے اٹھ کر بھاگ کھڑا ہوا ——— سنئے، یہ مولوی لوگ جو شادی کی تقریبوں میں ناچ گانے کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس سے مدعا درستی اخلاق نہیں ہوتا بلکہ صرف یہ کہ مدرسہ و مسجد کے نام سے ان کو لذت کام و دہن کا سامان میسر آجائے گا،

پھر میں یہ نہیں کہتا کہ مولویوں کو زندہ رہنے کا حق حاصل نہیں، ضرور ہے، لیکن یہ سمجھ لو کہ جس طرح مولانا سعید الدین صاحب کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے، اسی طرح شیریں جان کو بھی ہے یعنی اگر مسجد میں اذان دینے کے لئے ان کی ضرورت ہے، تو روح کی خستگی دُور کرنے کے لئے یہ بھی کم ضروری نہیں —— بہرحال میں تیترباً ہوتا نہیں، کیونکہ یہ میر، گھر نہیں کیا کم ویرانی ہے کہ وہاں شادی میں شرکت کروں

---

مہربان بندہ

آپ نے ایک ایسے مسئلہ میں مجھ سے مشورہ طلب کیا ہے کہ اس کی موافقت و مخالفت دونوں میں لوگوں کے پاس کافی دلائل موجود ہیں —— میں خود کوئی رائے اس وقت تک اس لئے قائم نہیں کر سکا کہ یہ خوش نصیبی ابھی تک حاصل نہیں ہوئی۔ ایک بیوی کے مرجانے کے بعد، دوسری شادی کرنا ظاہر ہے کوئی شرعی گناہ تو ہے نہیں، لیکن اخلاقی و معاشرتی معصیت ضرور ہے اگر کسی کے حالات اس کے مقتضی نہیں۔ وہ لوگ جو نظرتاً اہلی زندگی کے اہل نہیں ہیں یعنی جو حقوق زناشوئی کی طرف سے بے پرواہ ہیں، ان کا تو خیر سوال ہی نہیں، لیکن آپ ایسے لوگوں کے لئے جو زندگی صرف اپنے لئے بسر نہیں کرتے، یقیناً مسئلہ غور طلب ہے۔

اگر آپ کی بیوی کوئی اولاد نہ چھوڑ جاتیں تو بھی کوئی جھگڑے کی بات نہ تھی، لیکن جبکہ ایک چھوڑ ماشاء اللہ تین اولاد آپ کی موجود ہیں، عقد ثانی کے مسئلہ پر ایسی آسانی سے رائے زنی نہیں ہو سکتی۔ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ محض بچوں ہی کی وجہ سے دوسری شادی ضروری ہو جاتی ہے اور کبھی اطفال ہی کی وجہ سے عقد ثانی حرام ہو جاتا ہے مجھے جہاں تک معلوم ہے آپ کی بڑی بچی اچھی طرح گھر سنبھال سکتی ہے۔ اس لئے انتظامِ خانہ داری کا سوال کوئی اہل پیدا نہیں ہوتا، جب اس کی شادی ہوگی تو اس وقت تک آپ کی بہو گھر میں آجائے گی اور دوسری بچی اس بار کے اٹھانے کے قابل بن جائے گی۔ اس لئے اب سوال صرف آپ کی ذات کا رہ جاتا ہے، سو مجھے معلوم ہے کہ اس باب میں آپ ہمیشہ بہت محتاط رہے ہیں اور یہ جذبہ کبھی آپ پر غالب نہیں ہوا

عمر طبیعی تک پہونچنے کے لئے زیادہ زمانہ درکار نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ چند بیس سال، پھر آپ کیوں بچوں میں گرفتار رہا ہیں اور علائق بڑھا کر اپنے سکون کو ضائع کریں —— لیکن اگر کسی خاص سبب کی بنا پر مجبور ہی ہو جائیں تو پھر کوئی سن رسیدہ بیوہ تلاش کیجئے جس کے کوئی اولاد نہ ہو

---

ادھر آؤ، تمہارا منہ چوم لوں، واللہ کیا بشارت سنائی ہے۔ دل خوش ہو گیا۔ کیا کروں بے بال و پر ہوں، ورنہ خود وہاں پہونچتا۔ اور اتنی دور سے تمہیں بھیجتا کہ یا تمہارا دم نکل جاتا یا میرا مقصد کے لئے مفصل سناؤ کہ یہ سب

کچھ جواکچھ نہ کہو، یہ محال کو ممکن بنانے والا ولی کون تھا، ذرا میں بھی تو اُس کا نام سنوں۔ معاذاللہ جس وقت گزشتہ زمانہ کا خیال آجاتا ہے تو کلیجہ کانپ اٹھتا ہے، کس بلا کا کرب تھا، کس قیامت کی تکلیف تھی اور واقعہ یہ ہے کہ مجھے کوئی امید کامیابی کی نہ تھی اور ڈرتا تھا کہ خدا جانے کس دن کیا خبر سننے میں آئے بارے شکر ہے کہ وہ دور ختم ہوگیا اور تمہاری تحریر پڑھکر جان میں جان آئی۔

ہائے کتنا جی چاہتا ہے کہ صبح ہجراں میں دم توڑنے والوں کو، شام وصال کی زندگی کا مژدہ خود آکر سناؤں اور خود اپنی آنکھوں سے دیکھوں کہ وصل و فراق کی بیتا بیوں میں کیا فرق ہوتا ہے، لیکن کیا کروں سخت مجبور ہوں۔ بہرحال ان کے پاس جاؤ میری طرف سے ایک کے لب اور دوسرے کی پیشانی چوم کر یہ خط دکھا دو —— پھر جو کچھ وہ کہیں۔ کہیں گے کیا صرف مسکرا دیں گے —— مجھے تو۔ نہیں بلکہ خود ہی آکر سنا دیا۔

---

کیسا کلیات، کہاں کا مجموعۂ نظم؟ کچھ پاگل ہو گئے ہو —— تمہارے حسن ظن کی تسکین کے لئے میں ملک میں رسوا ہو جاؤں، یہ کہاں کی دانشمندی ہے۔ اوّل تو میرے پاس مجموعہ موجود نہیں اور اگر کوشش کرکے متفرق نظمیں یکجا کرلی جائیں تو بھی ان کی اشاعت کی کیا صورت ہے —— میں جب شاعر تھا تو بدقسمتی سے بُرے بھلے کی تمیز نہ تھی، اب جو اس کا سلیقہ آیا تو دنیا کی شاعری نگاہوں سے گر گئی، خود میرا کیا ذکر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اول اول میں نے بہت جھک مارا اور دنیا نے اس کی داد بھی کافی دی لیکن باور کرو حقیقی شاعر میں کبھی نہیں تھا۔ ذوق شعر و سخن ضرور رکھتا تھا، سو اس میں بیشک غیر معمولی ترقی محسوس کرتا ہوں۔ یہاں تک کہ اب صرف نقاد ہو کر رہ گیا ہوں اور اپنی گرہ میں کچھ ہو یا نہ ہو۔ لیکن دوسروں کے زر عیار کو فوراً پہچان لیتا ہوں

تمہیں یاد ہے وہ زمانہ جب صرف فارسی کی غزلیں لکھنے کا دورہ مجھ پر پڑا تھا، اُس وقت تو میں نے غور نہیں کیا تھا، لیکن اب کہتا ہوں کہ فارسی کی طرف میں نے صرف اسی لئے توجہ کی تھی کہ اپنی اردو شاعری کی طرف سے مطمئن نہ تھا۔ آخر وہ دور بھی ختم ہو گیا۔ اور اب شاعری کے لحاظ سے میں اسی منزل میں ہوں جس کا ذکر میر نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ

القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

میرے مرنے کے بعد تمہیں اختیار ہے، اپنی زندگی میں کبھی اس کی اجازت نہ دوں گا

---

کرمفرمائے بندہ

گرامی نامہ جس کو پند نامۂ فرید الدین عطا کہنا زیادہ موزوں ہے، ملا۔ آپ نے جس محبت و خلوص کے ساتھ مجھے امر خاص سے باز رکھنے کا مشورہ دیا ہے، اس کا شکریہ نہ ادا کرنا ظلم ہے، لیکن معاف فرمائیے۔ آپ کا یہ خیال کہ تنہا میں اس کا ذمہ دار ہوں درست نہیں

در خرابات نہ بدمستی خراب
بادہ پنداری کہ تنہا می زنم

میں تو اس کوچہ میں اس وقت تک قدم نہیں رکھتا، جب تک مولانا اور ان کے برادر زادۂ ارجمند میرے لئے خضر و الیاس کا کام نہ دیں، پھر یہ آپ مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں، اُن سے باز پرس کیجئے، ان سے دریافت فرمائیے کہ اصل معاملہ کیا ہے

حضرت! یہ آپ کہ کیا رہے ہیں، کس خیال میں ہیں۔ یہ سوء ظن اور میرے متعلق! آہ۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
شاید کہ تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

آپ کو معلوم نہیں کہ جس طرح ہر صدی میں ایک مجدد پیدا ہوا کرتا ہے، اسی طرح ہر سو سال کے بعد ایک رند پیدا ہوتا ہے، سو اس کا حال تو آپ کو معلوم ہوگا، در ممکن ہے کہ وہ آپ ہی ہوں۔ لیکن اس صدی کے رند کی بابت مجھ سے پوچھئے کہ کون ہے؟ ہر چند خود ستائی ہوگی لیکن آپ اصرار کریں گے تو صاف صاف کہنا ہی پڑے گا——

پھر آپ ہی غور فرمائیے کہ آپ کا یہ تمام "دفتر تدبیر و مصلحت" کیا کام دے سکتا ہے اور آپ کی تجدداؔ ترشیاں اس نشہ کو کیا اتار سکتی ہیں، جہاں اگر کبھی ترکِ معصیت کا خیال بھی ذہن میں آگیا تو اس کا کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے

نالہ از بہر رہائی نہ کند مرغ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نبود

نمازیں پڑھتے رہئے، اور فرشتے بنے رہئے۔ ہم لوگوں کو چھیڑنے سے فائدہ کہ اگر آدمی سے ایک سانس بھی آپ کے سامنے لیں تو بادۂ دوشینہ کی بُو سے آپ کو بھاگتے راہ نہ ملے گی —— ہم لوگ رند ہیں رند، سنا آپ نے؟

[redacted]



کیا پوچھتے ہو کس عالم میں وہاں سے واپس آیا۔ تم سے میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مجھے وہاں نہ بھیجو، لیکن اگر میں وہاں ہلاک ہو گیا تو کیا کرو گے۔ تم نے کہا "تمہیں اس کا ذمہ دار میں ہوں" سو آؤ، اب اپنی ذمہ داری کو پورا کرو، کیونکہ جس بات کا اندیشہ تھا وہ ہو کر رہی یعنی انھوں نے مجھے خوب تباہ کیا

مجھ میں ہمت کہاں کہ تفصیل بتاؤں، خدا کے لئے تمھیں میری طرف سے شکریہ ادا کر دو۔ اور کہہ دو کہ جب تک زندہ ہوں کبھی اس طرف کا رخ بھی نہ کروں گا

یہ جانتے ہوئے کہ میں اس باب میں کس قدر خود سر و آزاد ہوں، تم نے ان لوگوں میں بھیجا جو میری سانس کو بھی آزاد نہیں دیکھ سکتے تھے۔ مہمان نوازی اور خاطر و مدارات کی بھی ایک حد ہوتی ہے نہ یہ کہ انسان کو خود اپنے آپ سے شرم آنے لگے، اچھا کیا تم نے جلد واپس بلا لیا ورنہ میں تو عزم کر چکا تھا کہ اس ہفتہ سنکھیا کھا کر جان دیدوں گا۔ اور وصیت کر جاؤں گا کہ خبردار جو کسی نے میری لاش کو ہاتھ لگایا ہو، سڑک پر ڈال کر سگان بازاری کے سپرد کر دی جائے، کیونکہ ان سے انتقام کی صورت اگر کوئی تھی تو صرف یہی۔ حقیقت یہ ہے کہ عجیب لوگ ہیں اور تم ان سے زیادہ عجیب ہو کر جانے سے قبل مجھے آگاہ نہ کیا، ورنہ یہاں سے طیار ہو کر جاتا، اور کچھ نہیں تو کم از کم "ستیاگرہ" تو کر سکتا

---

اسے،

یہ کون رقیب تھا جو کل صبح تمھاری محفل میں مجھے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ وہی گورے گورے خوبصورت سے نوجوان۔ آنکھوں میں سرمہ اور منہ میں پان! تم نے تعارف کرایا نہیں۔ میں نے تو جسارت کی نہیں یہ وہی صاحب تو نہیں ہیں جن کا ذکر تم نے جمیل میاں سے کیا تھا۔ کہ نہایت اچھے شاعر، بڑے ماہر طبیب اور زبردست اہل دل صوفی ہیں، گاتے بھی خوب ہیں اور محفل میں حال بھی نہایت دلچسپ لاتے ہیں

یہ تم نے کیا غضب کیا کہ مجھ سے بولو یا بات تھیں۔ میں ایسے سوانگ بھرنے والوں کا لاکھ مخالف سہی، لیکن تمھارے مہمان ہیں، شعر سنکر داد دیتا، نبض دکھا کر نسخہ تجویز کراتا، سامنے بیٹھ کر توجہ لیتا، گانا سنتا، محفل میں ان کے ساتھ رقص کرتا اور باور کرو جو شروع سے اخیر تک کسی ایک بات میں بھی تصنع ہوتا

صورت، تو مجھے بھی اچھی معلوم ہوئی، سیرت کا حال ابھی تک معلوم نہیں۔ اگر کوئی حرج نہ ہو اور تمھارے مصالح اجازت دیں تو کل شام کو انھیں غریب خانہ پر تکلیف دوں اور قوالی کا انتظام کروں، کھانا بھی یہیں کھالیں گے اور جن لوگوں کو بلانا مناسب ہوا۔ ان کی فہرست تمھیں مرتب کر دو تو اچھا ہے

---

صدیقی العزیز

کل شام کو محبت نامہ ملا، مگر اس حال میں کہ پندرہ دن سے صاحب فراش ہوں، اور کروٹ بھی دوسرے کے سہارے سے لیتا ہوں، افسوس ہے کہ میں اس وقت کسی خدمت کے قابل نہیں، آپ اگر دعا کے قابل ہیں تو اسے کر دیجئے، دوا کی طرف سے تو میں مایوس ہو چکا ہوں

ایک عجیب قسم کا درد حوالی قلب سے اٹھ کر تمام رگ و پے میں دوڑ جاتا ہے۔ اور ۲۴ گھنٹے کے لئے بالکل بیکار کر جاتا ہے، اطبا کا خیال ہے کہ وجع القلب ہے، ڈاکٹر اس کو ریاحی درد بتاتے ہیں، بہر حال یہ تو ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں۔ اصل چیز کیا ہے، اس کی خبر کسی کو نہیں ——— کل سے خود اپنا علاج شروع کروں گا، وہی ہومیوپیتھی جس کے آپ مخالف ہیں۔ اور میں حد درجہ موافق۔ علامات کے لحاظ سے میں نے (Cactus ?) تجویز کیا ہے، اور امید ہے کہ اس سے فائدہ ہو ——— آپ بھی یاد رکھئے، شاید یہ کبھی کام آئے

یہ خط میں ایک اور صاحب سے لکھوا رہا ہوں کیونکہ آپ جواب کے منتظر ہوں گے

---

## نگار کے گزشتہ سالوں کے پرچے

حسب ذیل قیمت پر مع محصول مل سکتے ہیں

| | | | | | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| ستمبر ء | ۴ر | جون ء | ۴ر | جون ء | ۸ر | اکتوبر ء | ۳ر | ستمبر ء | ۴ر |
| اکتوبر " | ۴ر | اکتوبر " | ۴ر | مارچ ء | ۸ر | نومبر " | ۳ر | اکتوبر " | ۴ر |
| جنوری ء | ۴ر | نومبر " | ۴ر | مئی " | ۴ر | دسمبر " | ۳ر | نومبر " | ۴ر |
| فروری " | ۴ر | دسمبر " | عہ | | | جنوری ء | ۱۲ر | دسمبر | ۴ر |
| مارچ " | ۴ر | مارچ ء | ۴ر | ستمبر | ۴ر | فروری " | ۴ر | جنوری ء | عہ |
| اپریل | ۴ر | اپریل " | ۴ر | اکتوبر | ۴ر | مارچ " | ۴ر | فروری " | ۸ر |
| مئی | ۴ر | مئی " | ۴ر | نومبر | ۴ر | اپریل " | ۸ر | مارچ " | ۸ر |
| جون | ۴ر | جون " | ۴ر | دسمبر | ۴ر | مئی " | ۴ر | اپریل " | ۸ر |
| اگست | ۴ر | دسمبر ء | ۴ر | جولائی ء | ۴ر | جون " | ۴ر | مئی " | ۸ر |
| جنوری ء | ۴ر | فروری ء | ۸ر | اگست | ۳ر | جولائی " | ۴ر | جون " | ۸ر |
| مئی " | ۴ر | مارچ | ۸ر | ستمبر | ۴ر | اگست " | ۴ر | | |

منیجر نگار لکھنؤ

# ایک دُکھیاری لڑکی

بلا کی سردی پڑ رہی تھی، اور برف باری کا یہ عالم تھا کہ شاید آج کے بعد پھر کبھی ایسی دیکھنے میں نہ آئے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ سال کی آخری شام تھی، اُس سردی اور تاریکی میں ایک غریب چھوٹی بچی ننگے سر ابھی تک وہ مکان سے چلتے وقت سلیپر پہنے تھی، لیکن چونکہ وہ اس کی ماں کی تھیں، اس لئے ڈھیلی تھیں اور اس کے پاؤں سے جب وہ سڑک پر دو گاڑیوں سے بچنے کی کوشش میں تیز دوڑ رہی تھی، گر پڑی تھیں، ان میں سے ایک کہیں غائب ہو گئی تھی دوسری ایک شریر لڑکا اٹھا کر بھاگ گیا تھا،

چھوٹی بچی ابھی تک چل رہی تھی، اس کے پاؤں سردی کی وجہ سے نیلے ہو رہے تھے، وہ اپنے بوسیدہ کرتے میں دیا سلائیوں کا ایک بکس لئے ہوئے تھی اور چند اس کے ہاتھ میں تھیں، صبح سے اس وقت تک کسی نے ایک دیا سلائی کی ڈبیہ بھی نہ خریدی تھی، اس بیچاری کو ایک پیسہ بھی نہ ملا تھا، بھوک اور سردی کی وجہ سے وہ کانپتی ہوئی چلی جا رہی تھی

برف کے گالے اس کے گھونگھر والے بالوں پر جو اس کے کندھوں تک آتے تھے، جمے جا رہے تھے، آخر کار تھک کر وہ دو مکانوں کی دیواروں کے ملنے سے جو ایک گوشہ نکل آتا ہے، وہیں بیٹھ گئی، اپنے پاؤں سمیٹ لئے اور انھیں گرم کرنے کی کوشش کرنے لگی، گھر جانے کی وہ ہمت نہ کر سکتی تھی، اس نے ابھی تک کوئی دیا سلائی نہ بیچی تھی، اس کو ایک پیسہ بھی نہ ملا تھا، اور بلاشبہ اس کا باپ اسے مارتا، اس کے علاوہ گھر میں بھی اتنی ہی سردی تھی جتنی کہ سڑک پر کیونکہ وہ کوٹھے پر رہتی تھی، اور ہر چند چھت کے بڑے بڑے سوراخ گھاس پھوس سے بند کر دئے گئے تھے۔ لیکن پھر بھی سرد ہوا سنسناتی ہوئی اندر آتی تھی، اس کے ہاتھ ٹھٹھر گئے تھے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دیا سلائی کی ایک تیلی نکالی، اور قریب کی دیوار سے رگڑی اُس سے ایسی صاف اور گرم روشنی پیدا ہوئی جیسی کوئی چھوٹی شمع روشن ہو، اس نے اپنے ہاتھ لو پر رکھ دے، عجیب دلکش روشنی تھی۔ اس چھوٹی بچی

کو ایسا معلوم ہوا۔ جیسے وہ ایک بڑے چولھے کے سامنے بیٹھی ہوئی ہے۔ دیا سلائی اتنی خوبصورتی سے جل رہی تھی کہ اس بچی نے اپنے پاؤں بھی گرم کرنے کے لئے پھیلا دیے ——— مگر ایک لمحہ میں دیا سلائی بجھ گئی، وہ گرم چولھا غائب ہوگیا اور چھوٹی بچی اپنے ہاتھ میں دیا سلائی کی جلی ہوئی تیلی لئے ہوئے جہاں بیٹھی تھی وہیں بیٹھی رہی

اس نے دوسری تیلی جلائی، اور پھر روشنی ہوئی جہاں کہیں اس کی روشنی پڑتی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ دیوار کا پردہ اٹھ گیا ہے، اور وہ کمرہ کے اندر دیکھ سکتی ہے، اس نے دیکھا کہ کمرہ میں ایک میز رکھی ہوئی ہے، اس پر ایک سفید میز پوش پڑا ہے اور اس پر چینی کی تھالیں سجی ہوئی ہیں، سیب، اور سوکھے پھل بہت اہتمام کے ساتھ میز کے ایک طرف رکھے ہیں۔ اور ایک قاب میں بھنی ہوئی مرغی سے دھواں نکل رہا ہے، سب سے زیادہ دلفریب منظر یہ تھا کہ "مرغ مسلم" جس کے پیٹ میں چھری اور کانٹے لگے ہوئے تھے۔ قاب سے ایک کر سیدھا اس کے پاس چلا آیا۔ مگر شعلہ بجھ گیا۔ اور موٹی سخت دیوار پھر اس کے سامنے آگئی

اس نے تیسری دیا سلائی جلائی، شعلہ پھر پیدا ہوا، اور اس مرتبہ وہ ایک بہت خوبصورت کرسمس کے درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی تھی، یہ اس درخت سے جس کو اس نے گذشتہ کرسمس کی شام کو ایک امیر سوداگر کے گھر میں کھڑکی کے شیشوں سے جھانک کر دیکھا تھا۔ کہیں زیادہ بڑا اور کہیں زیادہ سجا ہوا تھا، ہزاروں شمعیں جل رہی تھیں، اور چھوٹی چھوٹی تصویریں جیسی اس نے دوکانوں میں دیکھی تھیں، درخت پر سے جھانکتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ لڑکی نے اپنے ہاتھ ان کی طرف پھیلا دئیے، اور دیا سلائی بجھ گئی، کرسمس کی شمعیں اونچی ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ وہ آسمان پر ستاروں کی مانند جھلملاتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں ان میں سے ایک گر پڑی اور اسکے پیچھے روشنی آسمان پر دور تک تیر شہاب کی طرح جاتی ہوئی معلوم ہوئی

اب کسی کی روح پرواز کر رہی ہے" چھوٹی لڑکی نے آہستہ سے کہا، یہ خیال اسے اپنی دادی کی وجہ سے پیدا ہوا۔ وہ دادی جس نے اس پر ہمیشہ شفقت و مہربانی کی۔ اور جو اب مر چکی تھی، اس نے کہا تھا کہ جب کوئی ستارہ ٹوٹتا ہے تو کوئی روح خدا کے حضور میں پرواز کرتی ہے۔ اس نے دوسری دیا سلائی جلائی، روشنی اس کے چاروں طرف پھیلی اور اس کی چمک میں اس نے اپنی دادی کو دیکھا جو اسی طرح نیک اور مہربان لیکن کہیں زیادہ مسرور نظر آتی تھی

اس نے کہا " دادی، مجھے اپنے پاس بلالو۔ میں جانتی ہوں کہ تم مجھے دیا سلائی کے بجھتے ہی چھوڑ دوگی اور اسی طرح سے غائب ہو جاؤگی جیسے کہ گرم چولھا، سال نو کی دعوت اور کرسمس کا خوبصورت درخت" اس نے جلدی جلدی اپنی تمام دیا سلائیاں جلا ڈالیں کہ کہیں اس کی دادی چلی نہ جائیں۔ دیا سلائیاں اس آب و تاب سے جلیں کہ دوپہر کی روشنی ان کے سامنے ماند ہوگئی، اس سے قبل کبھی دادی اتنی لمبی اور شاندار،

اتنی خوبصورت اور مہربان نہ دکھائی دی تھیں۔ اس نے چھوٹی بچی کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور دونوں خوش خوش اڑتی چلی گئیں، وہ زمین سے دُور اور بہت دُور اُڑ گئیں، یہاں تک کہ وہ اس جگہ پہونچ گئیں جہاں سردی، بھوک اور تمام تکلیفوں کا وجود نہیں

لوگوں نے صبح کو جب سردی پڑ رہی تھی چھوٹی بچی کو دیوار کے گوشہ میں دیکھا، اس کے گالوں پر چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، اور وہ سال کی آخری شب میں ٹھٹھر کر مر چکی تھی، نئے سال کا آفتاب اپنی نرم نرم کرنوں کے ساتھ اس پر چمک رہا تھا لیکن وہ سکون اور سکوت کی حالت میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے دامن میں دیا سلائیاں تھیں، ان میں سے ایک بنڈل پورا جل چکا تھا

"بیچاری اپنے آپ کو گرم کرنے کی کوشش کر رہی تھی" کچھ لوگوں نے اس کو دیکھ کر کہا، لیکن کسی کو اس کے خواب شیریں کا پتہ نہ چلا، اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ وہ اور اس کی دادی دونوں کیسے لطف کے ساتھ نئے سال کی خوشی منا رہی ہیں

(ماخوذ)

حسیب (نفیسی)

---

# جمود

سائنس کی اصطلاح میں "جمود" ( Inertia ) مادّہ کی وہ خاصیت ہے جو اُسے خود بخود حرکت کرنے سے روکتی ہے یعنے اگر کوئی شے ساکن ہے تو، جب تک ہم اُس کو کسی ذریعہ سے متحرک نہ کر دیں، وہ ساکن ہی رہے گی - مثلاً اگر آپ کی جیب میں گھڑی ہو تو وہ جیب ہی میں رہے گی - جب تک آپ اُس کو جیب سے نکال کر کسی دوسری جگہ نہ رکھ دیں - کسی قسم کی گاڑی اس وقت تک نہیں چلے گی جب تک ہم اس میں گھوڑا نہ جوت دیں یا انجن نہ لگا دیں - گھوڑا یا انجن اُس "**خارجی طاقت**" کا منبع ہے جو گاڑی کو متحرک کرتی ہے غرض کسی ساکن شے کو متحرک کرنے کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ اُس پر کسی "**خارجی طاقت**" کا اثر ڈالا جائے اسی طرح اگر کوئی شے کسی وجہ سے متحرک ہو گئی تو وہ قیامت تک نہ رُکے گی - جب تک خارجی طاقتیں اس کو روک نہ دیں - یہ نظریہ تو آپ کو عجیب و غریب، بلکہ مہمل معلوم ہوگا - آپ کہیں گے کہ جب ہم کسی چیز کو متحرک کر دیتے ہیں تو وہ تھوڑی دیر کے بعد خود ہی ساکن ہو جاتی ہے - مثلاً گیند کو اچھالتے ہیں تو وہ زمین پر گر جاتا ہے، اور گولی کو زمین پر لڑھکا دیتے ہیں تو وہ بھی تھوڑے فاصلہ تک جانے کے بعد رُک جاتی ہے - تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جب ہم کسی شے کو متحرک کر دیں تو وہ کبھی رُکے ہی نہیں ؟

مگر آپ نے اس مسئلہ پر کافی غور نہیں کیا - گولی "**خود ہی**" نہیں رُکتی - گیند "**آپ ہی آپ**" زمین پر نہیں گر جاتا - گیند کو زمین کی کشش ثقل اپنی طرف کھینچتی ہے - گولی ہوا کی مدافعت اور سطح زمین کی رگڑ سے رک جاتی ہے - اگر کشش ثقل نہ ہوتی تو گیند زمین پر نہ گرتا - اور سیدھا اڑتا ہوا نہیں معلوم کہاں چلا جاتا - زمین کی سطح بالکل چکنی ہوتی اور ناہمواری کا نام و نشان بھی نہ رہتا تو گولی برابر چلتی رہتی اور نہ معلوم کہاں تک چلی جاتی ---- اگر سنگ مرمر کا ہموار فرش ہو اور اُس پر شیشے یا پتھر کی گولی لڑھکا دی جائے تو بہت دُور تک تیری سے چلی جاتی ہے - یہ عام تجربہ کی بات ہے کہ جس قدر سطح ناہموار ہوگی اسی قدر جلد گولی رک جائے گی - سطح زمین کی "ناہمواری" ایک "**طاقت**" ہے، جو گولی کی رفتار کو سست کر کے بالآخر اُسے ساکن کر دیتی ہے - اس لئے،

کسی خارجی طاقت کا دباؤ ڈالے بغیر. نہ کوئی متحرک شے رُکے گی اور نہ کوئی ساکن شے متحرک ہوسکے گی - یہ ہے " جمود " کا علمی ( Scientific ) مفہوم

" جمود " کا یہ نظریہ سر اسحق نیوٹن نے پیش کیا تھا - اُس نے " حرکت " کے متعلق تین قوانین بیان کئے تھے - اِن میں سے پہلا قانون ' جمود ' کی تعریف میں ہے - دوسرے قانون میں " طاقت " کو ناپنے کا معیار قائم کیا گیا ہے - اس مضمون میں، میرا مقصد پہلے قانون کی تشریح کرنا ہے

" جمود " کے مندرجۂ بالا مفہوم پر غور کرنے سے واضح ہوگا کہ اس کا تعلق اشیا کے " وزن " سے کچھ نہ کچھ ضرور ہے - وزنی اشیا کو متحرک کرنے کے لئے زیادہ طاقت کی ضرورت ہوتی ہے - مٹی کے چھوٹے سے ڈھیلے کو ہم آسانی سے اٹھا کر بہت دُور پھینک دے سکتے ہیں - لیکن اگر اسی مٹی کی بہت بڑی چٹان ہو تو شاید دو باتیں آدمیوں کی طاقت بھی اُس کو اپنی جگہ سے ہٹا دینے میں کامیاب نہ ہو - جس شے کا جتنا وزن زیادہ ہے، اتنا ہی جمود بھی زیادہ ہے - ایک " لحیم شحیم " شخص کا جمود، ایک پتلے دُبلے آدمی کے جمود سے بڑھ کر ہے---- موٹے آدمیوں کے " فطری تساہل " کا باعث ان کا وزن یا " حجم " ہے

نیوٹن کے خیال میں جمود مادہ کی ایک خاصیت ہے - مگر میرا خیال ہے کہ غیر مادی اشیا میں بھی جمود ہے - مثلاً شاعروں اور مصنفوں کو خیالات کا جمود ہوا کرتا ہے - جب تک اُن کے جذبات کسی وجہ سے نہ اُبھر آئیں وہ کچھ کہتے یا لکھتے نہیں - پھر اگر کسی شاعر کے جذبات میں ذرا سی بھی جنبش ہوئی تو وہ مسلسل " بکتا " رہتا ہے جب تک کوئی خارجی اثر اس کے جذبات کو درہم برہم نہ کردے

" طاقت " اور " جمود " میں گہرا تعلق ہے - " طاقت " عموماً " جمود " کی دشمن ہوتی ہے - ان دونوں کے باہمی ربط کے راز سربستہ کو علم ریاضی کی زبان میں محض چند حروف اور ہندسوں کے ذریعہ بیان کیا جاسکتا ہے - اس موضوع پر بحث کرنے کے قبل جمود اور وزن کے تعلق کو واضح کردینا بہتر ہوگا - جمود کے دو پہلو ہیں متحرک اشیا کا جمود اور ساکن اشیا کا جمود - یہ تو ہم سمجھتے ہیں کہ متحرک شے کو روکنے کے لئے طاقت کی ضرورت ہے - اگر متحرک شے کی رفتار تیز ہے تو زیادہ طاقت درکار ہوگی - اس لئے متحرک اشیار کا جمود ان کی رفتار پر بھی منحصر ہے - کسی متحرک شے کے وزن اور رفتار کو ضرب دینے سے جو عدد حاصل ہوتا ہے اُس کو اُس شے کا " معیارِ حرکت " ( Momentum ) کہتے ہیں

اگر وزن کے لئے " و " لکھیں، اور رفتار کے لئے " ر " تو ' معیارِ حرکت = ر×
یعنے انگریزی میں یوں سمجھئے کہ

Momentum = M×V, (Mass × Vilocity)

اب سے "معیارِ حرکت" کا اصطلاحی نام "رَو" ہوگا۔ اس اختصار سے بڑی سہولت ہوگی اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس متحرک شے کا "رَو" زیادہ ہے اس کا جمود بھی زیادہ ہے۔ ساکن اشیاء میں "رَو" نہیں ہے۔ لیکن ساکن اشیا کو حرکت میں لانے کے لئے اُن میں "رو" پیدا کرنے کی ضرورت ہے "و" یعنے وزن تو ہر شے کا کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ جب ہم کسی ساکن شے کو مقررہ رفتار "ر" سے متحرک کردیں تو اس نے "رَو" حاصل کرلیا۔ اب اُس کو ساکن کرنے کے لئے، مخصوص "مقدار" میں "**طاقت**" کی ضرورت ہوگی جو "رَو" کے اثر کو بالکل زائل کردے یعنے "ر" کو صفر بنادے

"رَو" اور "**طاقت**" کے تعلقات پر آئندہ اظہار خیال کروں گا

آرزو (جلیلی)

---

# آئندہ جنوری ۳۵ء کا نگار

## تنقید و تحقیق کا ایک بے بہا سرمایہ ہوگا

لکھنؤ اور دہلی اسکول کی شاعری پر مکمل بحث مُلک کے بہترین اہلِ قلم کی کاوشوں کا مجموعہ، اس موضوع پر بالکل آخری لفظ —— ضخامت خدا جانے کتنی ہوجائے ——

# نگار کی خریداری جاری رکھیے

تاکہ یہ مجموعہ آپ کو مفت مل جائے ——

منیجر نگار لکھنؤ

# بیراگ کا بروگ

(مسلسل)

## (۵)

اس میں شک نہیں کہ کملا کی رگوں میں ایک پشت نہیں سیکڑوں پشت سے راجپوت خون دوڑ رہا تھا جو حکومت و فرمانروائی کے لئے مخصوص ہے، اور خود اس کی اتنی عمر اسی احساس میں بسر ہوئی تھی کہ راجکماریوں کی زبان سے جو لفظ نکلے وہ پورا ہونے کے لئے ہے اور جو تمنا ان کے دل میں پیدا ہو، اس کا کامیاب ہونا ضروری ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ کملا کی حقیقی مسرت کبھی اس ساعت سے وابستہ نہ ہوتی، جب وہ تعمیل حکم میں لوگوں کو سرنگوں دیکھتی تھی، بلکہ وہ اس وقت خوش ہوتی تھی۔ جب اس کا فرمان سنکر کبھی کوئی اتنا ہی کہہ دیتا کہ "کیا راجکماری ابھی؟"

وہ فطرت کی طرف سے ایک ایسا وسیع دماغ لائی تھی جس کے سامنے اس کو ساری دنیا کی بساط مملکت بھی تنگ نظر آتی تھی چہ جائیکہ رتن گڈھ کی سرزمین جو چند ہزار مربع میل سے زیادہ نہ تھی وہ کہا کرتی تھی۔ اور کبھی کیا تھی، دل میں سوچا کرتی تھی کہ کسی راجہ کے یہاں پیدا ہونا گویا قفس کے اندر پیدا ہونا ہے اور قفس خواہ لوہے کا ہو یا سونے کی تیلیوں کا بہرحال قفس ہے

اس کی طبیعت بہت آزاد واقع ہوئی تھی اور ہر چیز کا مطالعہ وہ بہت قریب سے کرنا چاہتی تھی اس لئے وہ گھبرا اٹھتی جب اسے معلوم ہوتا کہ راجہ کے یہاں پیدا ہونا۔ گویا ہر اس چیز سے دُور رہنا ہے جسے تمام انسانوں کے لئے قدرت کی نوازش عام کہتے ہیں

وہ سوچا کرتی کہ انسان کے بقارِ حیات کے لئے جو شرائط ضروری ہیں وہ راجہ اور پرجا دونوں کے لئے یکساں ہیں، پھر ان دونوں میں تفاوت کیسا، فرق مراتب کیوں کیا اس لئے کہ ایک کا دماغ دوسرے سے زیادہ

ترقی یافتہ ہے، مگر اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جو حکمران ہے وہ سب سے زیادہ احمق و جاہل ہے، تو کیا اس لئے کہ ایک دوسرے سے زیادہ بہادر و جری ہے، لیکن کیا حکومتوں کا قیام اس تلوار پر منحصر ہے جو بادشاہ کے پہلو میں نظر آتی ہے یا اُس تلوار پر جو ایک معمولی سپاہی کے کمر میں لٹک رہی ہے ——— ظاہر ہے کہ یہ امتیاز صرف اتفاقات کا نتیجہ ہے جسے خود انسان کی گمراہیوں نے پیدا کیا ہے اور جو فطرت کے نزدیک کبھی پسندیدہ نہیں ہو سکتا۔

وہ چاندنی راتوں میں چاند کو دیکھتی۔ اور بیتاب ہو جاتی کہ کاش وہ پھولوں کی سیج کے بجائے کسی ساحل کے ریگزار پر ہوتی اور وہاں سے اس منظر کا لطف اٹھاتی، جب آفتاب اس کے قصر کے مرمریں ایوانوں پر طلوع کرتا تو وہ سوچا کرتی کہ معلوم نہیں جنگل کے چشموں اور پہاڑ کی آبشاروں پر اس کا طلوع کس طرح ہوتا ہوگا

برسات کی کسی رات میں اگر کبھی دُور سے بانسری کی آواز اوس کے کانوں میں آجاتی تو صبح کو دربار کے مغنیوں کا گانا اسے اچھا نہ معلوم ہوتا، اور اگر کبھی دھان کے کھیتوں میں وہ گاؤں کی عورتوں کو گاتے ہوئے سُن لیتی تو بے اختیار اس کا جی چاہنے لگتا کہ وہ بھی اُن کے ساتھ جاکر جذبات سے بھرے ہوئے سادہ گانے میں ان کا ساتھ دے ——— الغرض کملا نسل اور خاندان کے لحاظ سے چاہے کچھ ہو، لیکن اپنی طبیعت اور فطرت کے لحاظ سے وہ راجہ کی بیٹی نہ تھی بلکہ اس کسان کی بیٹی تھی جو دوسروں کا دُکھ برداشت کرنے اور اپنا دُکھ کسی سے نہ کہنے کے لئے پیدا ہوئی ہے —— وہ محلوں کی فضا سے بسا اوقات اتنا گھبرا جاتی کہ شکار یا تفریح کے بہانہ سے باہر جنگل کی طرف چلی جاتی اور وہاں چھپ کر بہ تبدیل لباس گاؤں کی لڑکیوں سے ملتی، اُن کے گھروں میں جاکر زمین پر بیٹھ جاتی اور اُن کی باتیں گھنٹوں سنا کرتی، وہ نہ تو اس کی اس گفتگو سے جس کا تعلق زر و جواہر اور آرائش و زیبائش کے علاوہ کسی چیز سے نہ ہوتا، گھبرا اُٹھی تھی اور جب گاؤں میں وہ صرف کھیتی یا مویشیوں کی باتیں سنتی تو ایسا محسوس کرتی کہ اس کا دل کھنچا جا رہا ہے، اور دنیا میں پہلی بار اس نے قدم رکھا ہے

مذہبی معتقدات کے لحاظ سے وہ سخت ہندو تھی اور پوجا کے تمام مراسم نہایت پابندی سے ادا کیا کرتی تھی، لیکن محل کے مندر میں وہ پوجا کرنے سے بھی خوش نہ ہوتی تھی، کیونکہ وہاں کی ہر چیز اسے سونے چاندی میں لپٹی ہوئی نظر آتی تھی اور راجکماری ہونے کا احساس اس وقت بھی اس سے علیحدہ نہ ہوتا تھا، اسی لئے وہ اکثر و بیشتر بلدا گرجی کے مندر چلی جاتی۔ کیونکہ وہاں پہونچنے کے بعد جب وہ عام انسانوں کے برابر کھڑی ہو کر پھول چڑھاتی تو اس کا ضمیر ایک حد تک مطمئن ہو جاتا اور دل کی گرانی میں بہت کمی محسوس کرتی

لیکن چونکہ مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کو مغربی علوم و فنون بھی سکھائے گئے تھے، اس لئے وہ رسماً تو پوجا پاٹ سب کچھ کر لیتی تھی، لیکن اس کا دل ہمیشہ اس فلسفہ کی جستجو میں رہتا تھا جس کے ماتحت مذاہب کے اصول وضع کئے گئے ہیں۔ وہ سمجھتی تھی کہ کسی پتھر کے ٹکڑے کے سامنے خواہ وہ کتنا ہی حسین کیوں نہ تراشا گیا ہو، جھک جانا

[redacted]



کوئی معنی نہیں رکھتا، کسی مورتی پر پھول چڑھانا یا پانی ٹپکانا۔ بالکل لایعنی حرکت ہے، اگر کوئی خاص کیفیت اس سے پیدا نہ ہو اور چونکہ کیفیت کا تعلق خود انسان کی ذات سے ہے اس لئے وہ پوجا کے مفہوم کو بھی اپنے ہی اندر تلاش کیا کرتی تھی اور یہی وہ بات تھی کہ جب اوّل اوّل سوامی جی نے یہ کہا کہ "انسان خود پرمیشور ہے اور اس کو خود اپنی ہی پوجا کرنا چاہئے" تو وہ چونک پڑی اور ایسا محسوس کرنے لگی کہ ایک آواز جو بہت دور سے اسے کم کم سنائی دیتی تھی دفعۃً بلند ہو کر اس کے دماغ میں گونجنے لگی ہے

کملا کی نسبت جگدیش پور کے راجہ سے ہو چکی تھی، لیکن یہ واقعہ ہے کہ خود کملا کی مسرت یا نفرت اس سے بالکل وابستہ نہ تھی۔ یعنی جس وقت یہ بات پختہ ہوئی اور اس کو علم ہوا تو اس نے صرف اس لئے کہ باپ کی مرضی یہی ہے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اور خاموش ہو رہی، لیکن اس عمر میں شادی کے خیال سے جو خاص دلی انبساط پیدا ہوتا ہے، وہ اس میں پیدا نہیں ہوا اور اس نے سمجھ لیا کہ جس طرح صبح کو اٹھ کر نہانا یا منہ دھونا ضروری ہے اسی طرح غالباً یہ رسم بھی ضروری ہے

راجہ جگدیش پور، اپنے ہونے والے شوہر کو وہ کئی بار دیکھ بھی چکی تھی اور سوائے اس کے کہ وہ ایک خوبصورت نوجوان تو ضرور تھا، کوئی اور خاص بات اس میں نہ پائی جاتی تھی، تعلیم کے لحاظ سے وہ بہت معمولی حیثیت کا انسان تھا اور تربیت و سیرت کے اعتبار سے جو اطلاعات حاصل ہوئی تھیں وہ اس سے زیادہ نہ تھیں کہ اس کا اکثر وقت سیر و شکار میں صرف ہوتا ہے یا پھر ایسے مشاغل میں جو دنیا کو غور و تامل کے ساتھ دیکھنے میں کوئی مدد نہیں دے سکتے

کملا کے باپ کے لئے سب سے زیادہ مسرت اس رشتہ میں یہ تھی کہ دونوں ایک ہی خاندان کے راجپوت تھے۔ اور دوسرے یہ کہ جگدیش پور بڑی ریاست تھی اور وہاں کی مہارانی بننا کوئی معمولی بات نہ تھی

نسبت کے بعد کملا اور اس کے باپ کے درمیان اس معاملہ میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی اور اگر ایک طرف آہستہ آہستہ شادی کی طیاریاں ہو رہی تھیں تو دوسری طرف کملا جو اس طرف سے بالکل خالی الذہن تھی بدستور فلسفۂ زندگی پر غور کرنے میں منہمک تھی

سوامی جی سے ملنے کے بعد اوّل اوّل جو تغیر اس کے ذہن میں ہوا وہ صرف یہ تھا کہ پہلے جن باتوں سے وہ سرسری گزر جاتی تھی اب اُن پر غور کرنے لگی۔ لیکن رفتہ رفتہ جب یہ ملاقاتیں بڑھیں اور تبادلۂ خیال زیادہ وسیع ہوا تو اس کے خیالات میں ایسا غیر معمولی انقلاب پیدا ہوا کہ اس کے باپ کو بھی آخر کار اس کا علم ہو گیا اور اس نے کملا کو بُلا کر تصدیق کرنا چاہی

راجہ رنبیر سنگھ رتن گڈھ کا راجہ، ادھیڑ عمر کا انسان تھا اور اپنی وضع و قطع، عادت و خصلت کے لحاظ سے اسی زمانہ کا راجپوت تھا۔ جب عزت کا معیار باپ دادا کی روایات اور پُرانے نقوش سے ہٹنا سخت

گناہ سمجھا جاتا تھا۔ اس میں کلام نہیں کہ یوں وہ نہایت نیک نفس، اور خوش اخلاق تھا اور یہ بھی درست ہے کہ وہ کملا کے معاملہ میں بعض اوقات اپنے اعتقاد و یقین کے خلاف اُن حدود سے بھی تجاوز کر جاتا تھا جو اس کے آبا و اجداد نے قایم کئے تھے، لیکن ظاہر ہے کہ وہ یہ سب کچھ اسی حد تک کر سکتا تھا کہ اس کی عزت نفس گوارا کرے، لیکن جب سوال خاندانی وقار کا ہو تو ظاہر ہے کہ وہ کیونکر اسے برداشت کر سکتا تھا

رنواس کے اندر خاص محل کے درمیانی کمرے میں راجہ رنبیر سنگھ بیٹھا ہوا تھا کہ کملا آئی اور سلام کرکے سامنے مؤدب کھڑی ہو گئی۔ راجہ نے کچھ دیر تک اس کے سراپا کو غور سے دیکھا اور بولا کہ "بیٹھ جاؤ"—— کملا وہیں گدے پر بیٹھ گئی اور بولی کہ "مہاراج آپ نے اس وقت خلافِ معمول کیوں یاد فرمایا ہے"

راجہ —— "کملا، یہ آج تم نے ساری کیسی پہن رکھی ہے، کیا رتن گڈھ کے توشہ خانہ میں اب کوئی ساری ایسی نہیں رہی جسے راجکماری استعمال کر سکے"

کملا —— "نہیں مہاراج، توشہ خانہ میں کیا کمی ہے، اور ہزاروں ساریاں راجکماری کے لایق موجود ہیں، لیکن کملا کے قابل کوئی نہیں"

راجہ —— "تو کیا تم کملا نہیں ہو اور کملا راجکماری نہیں ہے"

کملا —— "ہاں میرا نام کملا ہے اور میں ایک راجہ کی بیٹی بھی ہوں، لیکن مہاراج کیا راجہ اور انسان دو الگ الگ چیزیں ہیں"

راجہ —— "ہرگز نہیں"

کملا —— "پھر جب میں بھی انسان اور میرا باپ بھی انسان ہے تو کیا انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنا کوئی عیب ہے"

راجہ —— "تو کیا انسانوں کی بیٹیاں قیمتی کپڑے استعمال نہیں کرتیں"

کملا —— "ہاں کرتی ہیں مگر اس وقت جب وہ پہلے ہزاروں کے کپڑے اُن کے تن سے اتروا لیتی ہیں"

راجہ —— "یہ کیا، کپڑے کیونکر اتروا لیتی ہیں"

کملا —— "کچھ نہیں، مہاراج، جانے دیجئے، بات یہ ہے کہ میرا جی اب صرف موٹے جھوٹے کپڑوں ہی کو چاہتا ہے، ریشم اور سونا بہت پہن چکی، اب ان سے جی گھبرا اٹھا ہے، اس میں کسی کا کیا حرج ہے"

راجہ —— "حرج؟ حرج کیوں نہیں، لوگ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے، اور جگدیش پور خبر پہونچ گئی تو وہ کیا خیال کریں گے، تو آخر بے عزتی نہیں ہے، جو اس طرح بدزندگی موٹے کپڑے

کی ساری استعمال کیے "

کملا ——" مہاراج، یہ اتفاق کی بات ہے کہ میں راجہ کے گھر میں پیدا ہوگئی، اگر کسی فقیر کے جھونپڑے میں پیدا ہوتی تو یہ کپڑے بھی میسر نہ آتے "

راجہ ——" ٹھیک ہے، اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ جب تم راجہ کے گھر میں پیدا ہوئی ہو تو راجکماریوں ہی کی طرح تم کو رہنا بھی چاہئے؛ اگر پرمیشور نے ہم کو دیا ہے تو اس کو برتنا بھی چاہئے "

کملا ——" مہاراج، پرمیشور کا ذکر آپ کیوں بیچ میں لاتے ہیں وہ کیوں کسی کو دینے لگا، اس کو کیا غرض کہ سو کو تباہ کر کے ایک کا گھر بھر دے وہ اگر تقسیم کرتا تو آج یا تو ساری دنیا دولتمند ہوتی یا سب کی سب مفلس و نادار "

راجہ ——" تو یہ دولت و عزت جو آج ہمیں حاصل ہے وہ پرمیشور کی دی ہوئی نہیں ہے "

کملا ——" ہرگز نہیں، بلکہ خود حاصل کی ہے اور اتنی بڑی قیمت دے کر حاصل کی ہے کہ مجھے تو سوائے خسارہ کے اور کچھ نظر نہیں آتا "

راجہ —— ہاں، بیشک قیمت دی ہے اور واقعی بڑی قیمت دی ہے لیکن خسارہ کیسا ؟ اگر ہمارے باپ دادا نے اپنا خون بہا کر، یہ سب کچھ حاصل کیا تھا تو کیا آج ہم اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے ہیں اور اس میں خسارہ کی کون سی بات ہے "

کملا ——" مہاراج دنیا میں وہی خون قیمتی ہے جو دوسروں کے لئے بہایا جائے، لیکن اپنا خون اگر خود اپنے لئے بہایا گیا ہے تو ممکن ہے اس کی قیمت زر و جواہر، زمین و املاک کی صورت میں یہاں مل جائے لیکن پرمیشور کے نزدیک اس کی کوئی قیمت نہیں "

راجہ ——" تو کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں حکومت چھوڑ کر تمہارے سوامی جی کی طرح پہاڑ کی کھوہ میں بیٹھ جاؤں "

کملا ——" نہیں مہاراج، میں یہ نہیں کہتی، گو دنیا میں ایسا بھی ہوا ہے اور بڑے بڑے راجاؤں نے ایسا بھی کر دکھایا ہے، بلکہ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ جو زندگی میں بسر کر رہی ہوں اس سے تعرض نہ کیا جائے، کیونکہ میری راحت اسی میں ہے "

راجہ ——" میں نے اگر یہاں تم کو اس کی اجازت دے بھی دی تو کل جگدیس پور جا کر کیا ہوگا، کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ اس کو گوارہ کر لیں گے، یہاں تو خیر تم راجکماری ہو، مگر وہاں تو مہارانی ہوگی، راج کی عزت کا انحصار تمہاری ذات پر ہوگا، یہ کیونکر ممکن ہے کہ تم بھکارنوں کی طرح دربار میں

آؤ اور ان کی عزت خاک میں ملا دو "

کملا —— " ہاں، مہاراج میں خود بھی یہی سوچ رہی ہوں کہ اس حال میں میرا وہاں جانا مناسب ہے یا نہیں اور ممکن ہے کوئی صورت ایسی پیدا ہو جائے کہ اس کی نوبت ہی نہ آئے "

راجہ رنبیر سنگھ جس کا غصہ اب ضبط سے باہر ہو چکا تھا، کھڑا ہو گیا اور چیخ اٹھا کہ "کملا تم میری محبت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھاؤ، میں خوب سمجھتا ہوں کہ تمہارا دماغ کس نے خراب کیا ہے، اور میں آج ہی رتن گڈھ کو اس کے وجود سے پاک کئے دیتا ہوں، جو تم کو بھی اپنا ہی ایسا خوار و ذلیل دیکھنا چاہتا ہے "

کملا بھی ساتھ ہی ساتھ اٹھی لیکن قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتی، راجہ رنبیر سنگھ چلا گیا اور کملا بھی آنسوؤں کے چند قطرے فرش پر گرا کر پشت کے دروازہ سے نکل گئی

(باقی)

# غالب کی شوخیاں اور شوخ نگاریاں :۔۔۔

دنیا میں مشہور ہیں۔ لیکن اگر کوئی آپ سے کہے کہ اس کے حالات زندگی، اس کے کلام نظم و نثر، اس کی تصانیف اردو و فارسی سے یکجا کر کے سب کی سب کتابی صورت میں پیش کیجئے تو آپ کے لئے اس کا صرف ایک جواب ہوگا اور وہ یہ کہ

## رسالۂ نگار بابت ماہ جنوری ۱۹۳۲ء

اٹھا کر دیکھئے جس کے ۱۶۰ صفحات اسی موضوع کے لئے وقف ہیں۔ اور پورا استقصا کر کے ان کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ پھر اگر یہ رسالہ آپ کے پاس نہیں ہے یا گم ہو گیا ہے، یا آپ کے کسی اور دوست کو ضرورت ہے یا اس کے بعد سے آپ نگار کے خریدار ہوئے ہیں۔ تو ۱۲ کے ٹکٹ بھیجکر طلب کر لیجئے۔ صرف چند کاپیاں رہ گئی ہیں۔ غالب کی عالم شباب کی سہ رنگی تصویر بھی اس میں شامل ہے

منیجر نگار لکھنؤ

# باب الاستفسار

## مسیح کا دوبارہ زندہ ہونا

(جناب سید اصغر علی صاحب۔ ٹونک)

بعض تفاسیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کے مصلوب ہونے کے بعد ان کے دوبارہ زندہ ہونے کا عقیدہ مسلمانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ کیا آپ اس مسئلہ پر روشنی ڈال سکتے ہیں کہ اس کی کیا حقیقت ہے اور یہ عقیدہ مسلمانوں میں کہاں سے آیا

---

(نگار) ہر چند مسلمانوں کی مذہبی روایات میں علاوہ مسیحی و یہودی عنصر کے اور بھی دیگر عناصر اسقدر شامل ہیں کہ اگر کوئی شخص اُن کے نکالنے کی کوشش کرے، تو اسلام میں " لا الٰہ الا اللہ " بھی باقی نہیں رہ جاتا کیونکہ توحید کا خیال بھی کوئی نیا خیال نہ تھا اور ریگستان عرب میں رسول اللہ کے ظہور سے قبل خدائے واحد کی پرستش کا آوازہ کئی بار بلند ہو چکا تھا۔ یعنی ہر چند اسلام، مذہب کے باب میں کسی احداث یا ابداع کا مدعی نہ تھا اور مذاہب سابقہ کی تصدیق ہی اس کا مدعا تھا لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں ہو سکتے کہ ہر رطب و یابس جو اُن مذاہب میں پایا جاتا تھا وہ اسلام میں بھی لے لیا گیا۔ اور تمام وہ روایات جو یہودیوں، نصرانیوں، آتش پرستوں یا دیگر مسلک والوں میں پائی جاتی تھیں اُن پر ایمان لانا، اسلام کا ضروری جزو قرار پایا

یقیناً ایسا نہ ہونا چاہئے، لیکن ہوا یہی اور اب عام طور پر اسلام جس معتقدات کا مجموعہ سمجھا جاتا ہے وہ بہت کچھ

خرافیات پر مشتمل ہے ـــــ آپ کوئی مذہبی کتاب، کوئی تفسیر اٹھا لیجئے، آپ کسی مولوی سے جزئیات ایمان پر گفتگو کیجئے، کسی واعظ کا وعظ سنئے، آپ یہ معلوم کرکے حیران رہ جائیں گے کہ اسلام جس کے متعلق بالکل سادہ و فطری مذہب ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے، نہایت زبردست صنمیاتی لٹریچر اپنے اندر رکھتا ہے، جس پر ایمان لانا اس کے لئے اتنا ہی ضروری ہے، جتنا قرآن و رسول پر، کیونکہ یہ تمام باتیں احادیث سے مستنبط بتائی جاتی ہیں اور حدیث چونکہ فرمودۂ رسول ہے اس لئے اس کا ماننا فرض ہے خواہ عقل میں آئے یا نہ آئے اور خیر، یہ تو کوئی کہہ سکتا ہی نہیں کہ حدیث کا کیا اعتبار جبکہ ابوہریرہ اس کے راوی ہیں اور امام بخاری اس کو صحیح سمجھنے والے

الغرض مدعا یہ کہ موجودہ اسلام جو زیادہ تر جامعین احادیث اور اُن کے راویوں کا اسلام ہے، اتنا ہی عجیب و غریب ہے جتنا کوئی مذہب اس دنیا میں ہو سکتا ہے اور مشکل ہی سے کفر و اسلام کے درمیان کوئی خط امتیاز کھینچا جا سکتا ہے۔ مذاہب کا تقابلی مطالعہ نہایت دلچسپ چیز ہے، لیکن غالباً اس سے زیادہ دلچسپ موضوع یہ ہے کہ ایک مذہب کے معتقدات کا ماخذ اصلی کیا ہے۔ چنانچہ اس سے قبل ہم نے ایک مسلسل مضمون عہد عتیق کے ماخذ روایات کے متعلق شائع کیا تھا جو اہل علم کے طبقہ میں بہت پسند کیا گیا۔ یہ سلسلۂ استفسار جو مسئلہ آپ نے پیش کیا ہے وہ بھی اسی طرح پیروانِ محمدؐ و مسیح دونوں میں یکساں طور پر اہمیت رکھتا ہے، درانحالیکہ دونوں اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ وہ خالص بُت پرستوں کی یادگار ہے

آپ کسی مولوی سے دریافت کیجئے کہ مسیح کے دوبارہ زندہ ہونے کے متعلق اسلام کی تعلیم کیا ہے تو وہ بلا تامل کہدے گا کہ اس پر ایمان لانا ہمارا فرض ہے کیونکہ رسول اللہ کی احادیث اس باب میں موجود ہیں۔ درانحالیکہ مسیح کا دوبارہ زندہ ہونا خواہ وہ مصلوب ہونے کے ساتویں دن مانا جائے یا قیامت کے قریب، اصنامی روایات قدیمہ سے لیا گیا ہے اور حقیقت سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں

---

مسیح کی وفات کو ۳۰۵ سال کا زمانہ گزر چکا ہے اور سلطنت روما نے ابھی تک عیسوی مذہب اختیار نہیں کیا ہے، ہرچند بعض شاہانِ روما اس نئے مذہب کی طرف رجحان ظاہر کر چکے ہیں اور ایک دو کلیسا بھی تعمیر ہو چکے ہیں، لیکن شہر کی آبادی جو لاکھوں نفوس پر مشتمل ہے ہنوز اس نئے مذہب سے متنفر ہے اور نہ صرف عوام بلکہ وہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ اور اعیان و امراء کی جماعت بھی مذہب و عقائد مذہب کے لحاظ سے عہد تاریک کی باطل پرستیوں میں مبتلا ہے

ہاں، تو مارچ ۳۰۵ء کا ذکر ہے کہ روما میں موسم بہار کی مسرتیں شروع ہو گئی ہیں اور ۱۷ مارچ کو پوجاریوں کی جماعت ہاتھوں میں نرکل لئے ہوئے نکلتی ہے جو گویا اس امر کا اعلان ہے کہ سائبل دیوی کی پوجا کا مقدس ہفتہ

شروع ہوگیا ہے

اس کے پانچ دن بعد ہی پوجاری ایک بُت لئے ہوئے سڑکوں سے گزرتے ہیں اور مندر تک اُسے پہونچا دیتے ہیں یہ بُت ایک خوبصورت نوجوان دیوتا کا ہے جو ایک صنوبر کے درخت سے بندھا ہوتا ہے اور اس کے چہرہ پر موت کی زردی چھائی ہوتی ہے۔ یہ بت ایتس دیوتا کا ہے اور یہ رسم گویا اس کے موت پر اظہارِ غم کے لئے اختیار کی جاتی ہے

اس کے بعد کا دن "خونیں دن" کہلاتا ہے، یعنی وہ دن جب ایتس کا خون بہایا گیا تھا۔ اس کی یادگار میں پوجاریوں کو بھی خون آلود ہونا پڑتا تھا اور مشرق میں جہاں یہ رسم انتہائی جوش کے ساتھ ادا کی جاتی تھی۔ پوجاری اپنے عضوِ مخصوص کو کاٹ کر سائبلی دیوی کی قربانگاہ پر نذر چڑھا دیا کرتے تھے، لیکن روما میں اس کی اجازت نہ تھی اس لئے وہ صرف اپنے جسم کو جا بجا زخمی کر لیا کرتے تھے تاکہ ایتس کی موت کا غم ہر سال تازہ رہے۔

اس کے دوسرے دن ایتس کے دوبارہ زندہ ہونے پر جشن منایا جاتا تھا اور یہ تقریب اتنی پُرمسرت ہوتی تھی کہ سارا روما گویا دیوانہ ہو جاتا تھا اور جو جس کے جی میں آتا تھا کر گزرتا تھا۔ دو دن بعد پوجاریوں کی جماعت ایک سیاہ پتھر کو جو فی الحقیقت لنگ تھا اور (جس کا بالائی حصہ نقرئی ہوتا تھا) غسل دینے کے لئے ایک جگہ لیجاتے اور پھر وہاں سے باجے بجاتے ناچتے کودتے اور نہایت فحش گانے گاتے ہوئے واپس آتے

یہ بیان ہے اگسٹائن کا جو اس وقت تک عیسائی نہ ہوا تھا اور جس نے خود اپنی آنکھوں سے ۳۸۵ء میں اس رسم کو دیکھا تھا۔ اور تعجب کرتا تھا کہ عیسائیوں کے اس عقیدہ کو کہ مسیح مصلوب ہونے کے ساتویں دن پھر زندہ ہو کر آسمان سے زمین پر واپس آئے اہل روما کے اُن بُت پرستانہ مراسم سے کتنی مشابہت ہے۔ جس طرح ایتس کو وہ صنوبر کے درخت سے بندھا ہوا دکھاتے ہیں اسی طرح عیسیٰ کو صلیب سے بندھا ہوا بتاتے ہیں اور جس طرح وہ دوبارہ زندہ ہوا تھا بالکل اسی طرح مسیح کی نسبت بھی بیان کرتے ہیں ——— یہ اگسٹائن وہی شخص ہے جس کے متعلق کبھی یہ خیال بھی نہ قائم ہو سکتا تھا کہ آئندہ چل کر سنٹ اگسٹائن کے مقدس نام سے تمام عیسوی دنیا میں مشہور ہونے والا ہے

سنٹ جروم جس کے بیان کی صداقت سے عیسوی دنیا کے کسی ہر فرد کو انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی لکھتا ہے کہ

> "عہدِ بُت پرستی کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ زہرہ کا عاشق جو نہایت خوبصورت نوجوان تھا، مار ڈالا گیا تھا اور پھر ماہ جون میں دوبارہ زندہ ہو گیا تھا، چنانچہ جون کا مہینہ بھی اسی کے نام سے موسوم ہے اور اس دیوتا کے مرگ و زیست کی یادگار نہایت اہتمام سے ہر سال منائی جاتی ہے"

(حاشیہ صفحہ ۵۹) ۱؎ اہل روما کے صنمیات کی ایک دیوی جو تمام دیوتاؤں کی ماں سمجھی جاتی تھی۔

جرّوم جس نے اپنی زندگی کا بڑا حصّہ فلسطین میں بسر کیا تھا لکھتا ہے کہ یہ رسم تمام سرزمین عراق و فلسطین میں رائج تھی اور بالکل قدیم اہل روما کی خرافیاتی روایات کے مطابق تھی۔ فرق اگر تھا تو صرف اسقدر کہ وہاں اس کا نام ایسس تھا اور یہاں تموز، وہاں سائبل دیوی تھی اور یہاں اسشتار۔ بالکل یہی روایت یونانیوں کے یہاں بھی پہونچی اور وہاں ان دونوں کا نام اڈونس اور وینس ہوگیا

الغرض عیسوی مذہب جہاں جہاں پہونچا کسی نہ کسی دیوتا کے مرگ و زیست کا فسانہ ہر جگہ پایا جاتا تھا اور اس کی یادگار ہر مقام پر نہایت اہتمام سے منائی جاتی تھی۔ سرزمین عراق میں اُرسے لے کر یروشلم تک، اس مر کر زندہ ہونے والے دیوتا کا نام تموز تھا۔ فلسطین کے شمال اور تمام ایشیار کوچک میں اُسے ایتسس کہتے تھے اور یونانیوں میں وہ اڈونس کے نام سے مشہور تھا ــــــ رہ گیا مصر سو وہاں بھی دریائے نیل کے ساحل پر ہر سال اوسیرئیس دیوتا کے ہلاک کئے جانے اور پھر اس کے دوبارہ زندہ ہونے کی تقریب پر میلہ لگا کرتا تھا، اور ایران میں عیسوی مذہب سے صدیوں قبل مذہب "مترائیت" رائج تھا اور وہاں بھی مِترا کے مر کر زندہ ہونے پر ہر سال جشن منایا جاتا تھا

جس زمانہ میں عیسوی مذہب سرزمین یونان میں پھیلا، تمام مذاہب قدیمہ اور ان کے روایات اصنامی وہاں کثرت سے شائع تھے، اور تقریباً تمام مذاہب کے لوگ اپنی رسمیں آزادی سے ادا کرتے تھے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ عیسوی مذہب کو بھی ان سے متاثر ہونا چاہئے تھا، چنانچہ وہ متاثر ہوا اور مسیح کے مصلوب ہو کر دوبارہ زندہ ہونے کی روایت انھوں نے بھی لے لی

رہ گئے اہل عرب، سو ان کے یہاں چونکہ نصرانی اور یہودی روایات پر اعتماد کرنے کا دستور چلا آرہا تھا، اس لئے اسلام لانے کے بعد بھی وہی کیفیت باقی رہی اور مسیح کے دوبارہ زندہ ہونے کا عقیدہ جوں کا توں انھوں نے بھی اختیار کر کے اس کی توثیق کے لئے احادیث وضع کرلیں

قرب قیامت کی علامت میں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ مسیح آسمان سے اُتر کر آئیں گے۔ اور مہدی آخرالزماں کا ظہور ہوگا، یہ عقیدہ بھی انھیں اصنامی روایات قدیمہ کی یادگار ہے اور کسی طرح اس کو خالص اسلامی چیز نہیں کہہ سکتے

قرآن مجید ان میں سے کسی بات کی تصدیق نہیں کرتا، اس لئے ایک مسلمان ان کے ماننے پر مجبور نہیں البتہ وہ لوگ جو احادیث کو قرآن سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں، یا جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ قرآن بغیر احادیث کی مدد کے سمجھ میں آہی نہیں سکتا، ایسا کہتے ہیں تو کہنے دیجئے

# ایک لفظ اور مصرع کی تحقیق

(جناب ز۔ بیگم صاحبہ حیرت۔ شملہ)

(۱) لفظ ناگزیر ہے یا ناگریز، اگر پہلی صورت درست ہے تو کیونکر
(۲) " از سقف خانہ تا بہ ثریا ازانِ تو " اس مصرعہ کے باقی
اشعار کیا ہیں اور کس نے کہے ہیں

---

(نگار)

(۱) ناگزیر صحیح ہے اور ناگریز غلط فارسی میں گزیر کے معنی چارہ و علاج کے ہیں اور ناگزیر "ضرورت" کا مفہوم ظاہر کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے

(۲) جس نظم کا یہ مصرعہ ہے وہ وحشی کی ہے۔ پوری نظم یہ ہے:۔

زیباتر آنچہ ماندہ زیابا ازانِ تو ۔۔۔ بداے برادر از من و اعلیٰ ازانِ تو
ایں طاس خالی از من و آں کوزۂ کہ بود ۔۔۔ پارینہ پُر ز شہدِ مصفا ازانِ تو
یابوئے ریسمان گُسل، میخ کَن ز من ۔۔۔ مہمیز کلہ تیز و مطلا ازانِ تو
آں دیگ لب شکستۂ صابون پزی من ۔۔۔ آں پچخۂ ہریسہ و حلوا ازانِ تو
آں قوچ[1] شاخ کج کہ زند شاخ ازانِ من ۔۔۔ غوغائے جنگ قوچ و تماشا ازانِ تو
ایں اشتر[2] چموش[3] لگد زن ازانِ من ۔۔۔ ایں گربۂ مصاحبِ با با ازانِ تو
از صحن خانہ تا بہ لبِ بام ازانِ من ۔۔۔ وز بام خانہ تا بہ ثریا ازانِ تو

ایک نظم میلی نے بھی اسی زمین میں لکھی تھی، فرق یہ ہے کہ وحشی نے بھائی سے خطاب کیا ہے اور میلی کا

---

[1] قوچ، بکری کو کہتے ہیں [2] استر، خچر کو کہتے ہیں [3] چموش، شریر لات مارنے والے جانور کو کہتے ہیں

خطاب بہن سے ہے، لکھتا ہے :-

ہمشیرہ، خرج ماتم بابا از آنِ من　　صبر از من و تردد و غوغا از آنِ تو
درخصیہ استماع وصیت از آنِ من　　در نوحہ ہمزبانیِ بابا از آنِ تو
کہنہ قلم دوات شکستہ از آنِ من　　طومار نظم و دفتر انشا از آنِ تو
آں لاشہ اشترانِ قطاری از آنِ من　　آں بارکش خرانِ توانا از آنِ تو
یک ہفتہ خرج مطرب و ساقی از آنِ من　　ہفتاد سالہ طاعت بابا از آنِ تو
آں مالہا کہ ماندہ بدنیا از آنِ من　　واں چیزہا کہ کردہ بہ عقبیٰ از آنِ تو

رفیعی کاشانی نے بھی ایک نظم اسی مفہوم کی بہ تبدیل قافیہ لکھی تھی :-

مال و منال حضرت بابا برادرا　　یک نیمہ از تو نیمۂ دیگر از آنِ من
من آں نیم کہ گویم ازیں جنسہا کہ ہست　　جنسے کہ باشد از ہمہ بہتر از آنِ من
جان برادری تو، ز تو ہر چہ بہتر ست　　بدتر ہست ہر چہ جانِ برادر از آنِ من
قرضِ پدر کہ از ہمہ بیش ست از آنِ تو　　وجہش کہ ہست از ہمہ کمتر از آنِ من
آں چار باغ خرم مرہون از آنِ تو　　آں یک دو باغ کہنۂ بیدر از آنِ من
آں مادیاں کہ داغ صد کرہ بانِ تو　　آں اشتران بارکش نر از آنِ من

ان تینوں نظموں میں وحشی کی نظم سب سے بہتر ہے اور اسی لئے وہ مشہور ہو گئی

# باب المراسلة والمناظرہ

## (جناب ہرنام سنگھ صاحب - کرگل کشمیر)

(۱) آپ مذہب اسلام کو فطری اور آخری مذہب فرماتے ہیں مگر میری سمجھ میں نہیں آتا آخر ویدوں کی تعلیم میں وہ کون سی کمی تھی جو اس آخری مذہب سے پوری ہوئی یا تو مجھے قرآن سمجھنے میں غلطی ہوگئی ہے یا میرے ہاتھ میں غلط ترجمے لگے ہیں۔ حوالہ دینے کی چنداں ضرورت نہیں ستیارتھ پرکاش جس کے مصنف سوامی دیانند ہیں آپ کی نظر سے ضرور گذری ہوگی

اسلام کے جو اصول آپ پیش کرتے ہیں واقعی قابل قدر ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ہر مذہب کے "لغویات" نظر انداز کردینے کے بعد وہی "جوہر لطیف" رہ جاتا ہے جسے آپ اسلام کہتے ہیں تو پھر فطری اور آخری مذہب میں کیا خوبی ہوئی کیا دوسرے مذاہب کے متعلق یہی نہیں کہا جاسکتا ؟

(۲) آپ اس بات کے قائل ہیں کہ موت انسان کی آخری حد ہے اس کے بعد مادہ اپنے مرکز میں تحلیل ہوجاتا ہے نیز دوزخ و جنت کو بھی آپ اسی عالم میں مانتے ہیں یعنی کہ " ہر نیک و بد فعل خود اپنی سزا و جزا ہے ! " اگر میں نے اسے سمجھنے میں غلطی سے کام نہیں لیا تو اس کی مختصر تشریح یہی ہوسکتی ہے کہ نیک کام کرتے وقت یا کرنے کے بعد انسان کے دل کو خوشی و تسکین حاصل ہوتی ہے اور بد کام کرتے وقت یا کرنے کے بعد انسان کی جسمانی اور روحانی حالت میں خاص کمزوری پیدا ہوجاتی ہے اور اس کا ضمیر ہر وقت ملامت کرتا رہتا ہے

مگر اسی دنیا میں ایسی ہستیاں بھی ہیں جن کا ضمیر بالکل مُردہ ہوچکا ہے وہ دوسروں کی دلآزاری سے اور ہر جائز و ناجائز طریقہ سے اپنی خواہش پوری کرنے میں اپنی خوشی سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک انسانی جان کی چیونٹی سے زیادہ قدر نہیں وہ دوسروں کو اپنی خواہش پوری کرنے کے لئے قتل تک کردیتے

ہیں، عیش و عشرت سے زندگی بسر کرکے مرجاتے ہیں تو پھر آپ بتائیے کہ انھیں اپنے بداعمال کی سزا کب ملی ؟ ان کا ضمیر مرچکا تھا۔ اُن کے دل کو انسان کی قدر کرنے کے بجائے دولت کی قدر کرنے میں تسکین ہوتی تھی یا خوشی ہوتی تھی۔ للذا اس نے تمام عمر خوشی سے گذار دی۔ اور قانون کا ہاتھ بھی اُن تک نہ پہونچ سکا

خود میری حالت ہی سنئے جب کسی کارِ خیر کے لئے میں چندہ دیتا ہوں تو بعد میں میرا دل بہت "بے چین" ہوجایا کرتا ہے حالانکہ تقاضا یہ تھا کہ مجھے تسکین اور خوشی ہوتی

اگر اعتراض کیا جاوے کہ میرا مطمح نظر بجائے نیکی و ہمدردی کرنے کے دولت پیدا کرنا ہے تو میں عرض کروں گا کہ آخر نیکی و ہمدردی کے زیر اثر کس نے اپنی تمام دولت لگادی ؟

اگر واقعی ہمارا نقطۂ خیال، غلط ہے تو اس کا کیا علاج کہ ہمارے دوں کو اپنی "غلطی" سے ہی تسکین ہوتی ہے اور اسی تسکین و خوشی کو آپ 'جزا' سے تعبیر کرتے ہیں پھر نیک و بد میں کیا تفاوت

میں نے جو ویدا اور ستیارتھ پرکاش کا ذکر کیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ان کی تعلیم کو قرآن سے برتر سمجھتا ہوں بلکہ یہ محض مثال کے طور پر عرض کیا ہے ورنہ میں تو "نیاز کا زہر" مشہور ہوں جس کا مطلب ہے بے دین، کافر، ملحد وغیرہ وغیرہ

---

(نگار) میرا اسلام کو فطری و آخری مذہب کہنا اس معنی میں نہیں ہے کہ میں دوسرے مذاہب کو بُرا کہتا ہوں بلکہ مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ وقت و زمانہ کے لحاظ سے اسلام کے اصول بہت وسیع ہیں اور اس میں کافی صلاحیت زمانہ کا ساتھ دینے کی ہے ——— دنیا میں جتنے مذاہب ہوئے ہیں وہ سب اپنے وقت، و ماحول کے لحاظ سے بہتر و مناسب تھے۔ اس لئے یہ کہنا کہ فلاں مذہب فلاں سے بہتر ہے یا فلاں فلاں سے بدتر، درست نہیں البتہ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں تغیر ہوجانا ضروری ہے کیونکہ دنیا کا کوئی قانون ایسا نہیں ہے جو ہمیشہ ہماری ضروریات کو پورا کرنے والا ہو۔ پھر اگر کوئی مذہب ایسا ہے جو اس تغیر کو قبول کرنے والا ہے تو ہم کہیں گے کہ اس میں زیادہ صلاحیت زمانہ کا ساتھ دینے کی ہے اور اگر کسی میں یہ اہلیت نہیں ہے تو دنیا خود اس کو تقویم پارینہ سمجھ کر پس پشت ڈال دے گی

ہندوستان میں جتنے مذاہب رونما ہوئے وہ سب اپنے اپنے زمانہ کے لحاظ سے موزوں و مناسب تھے، اسی طرح ایران و مصر، و ایشیا کوچک وغیرہ میں جتنے مذہب پیدا ہوئے سب اپنے اپنے عہد کے اعتبار سے ٹھیک تھے، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ وہ تھے سب زمانی و مکانی، یعنی ایک خاص زمانہ اور خاص سرزمین سے متعلق

تھے اور وہاں سے ہٹ کر وہ ساری دنیا پر حاوی نہ ہو سکتے تھے۔ برخلاف اسلام کے کہ وہ بیک وقت محدود بھی تھا اور غیر محدود بھی، یعنی اگر ایک طرف اس میں اہل عرب کو اُبھارنے کی صلاحیت موجود تھی تو دوسری طرف ایسے اصول بھی اس میں پائے جاتے تھے جو ہر زمانہ اور ہر قوم کے لئے موزوں ہوں۔ اب یہ بات دوسری ہے کہ مولویوں نے اس رمز کو نہ سمجھا اور اُسے بھی اُسی رنگ میں پیش کیا جو دوسرے مُردہ مذاہب کا تھا

وہ اصول کیا ہیں اور میں کیوں اسلام کو فطری و آخری مذہب سمجھتا ہوں، اس کے متعلق بارہا اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہوں، مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ اسلام کو میں کسی خاص متعین مذہب کے اندر محدود نہیں کرتا، بلکہ اس کا مفہوم بہت بسیط لیتا ہوں جو صرف ترقی انسانیت کے مترادف ہے، یعنی اسلام نام ہے صرف ان اصول زندگی کا جو انسانیت کی ترقی کے ضامن ہیں اور جن میں تغیر ہوتے رہنا ضروری ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی وقت زمانہ کا اقتضا یہ ہوگا کہ انسان خدا کا انکار کرنے کے بعد ہی ترقی کر سکے گا تو اسلام کا مدعا بھی یہی انکار ہوگا

یقیناً عام مذہبی لوگوں کے لئے یہ بات نہایت عجیب و غریب معلوم ہوگی، لیکن اگر میں اپنی کوتاہی عقل یا خرابی دماغ سے اسلام کا یہ مفہوم قرار دیتا ہوں تو کیا آپ یا کوئی اور اس کے لئے طیار ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے مذہب کو اس وسیع معنے کے ساتھ پیش کرے، پھر اگر ایسا نہیں ہے تو میرا یہ کہنا کہ اسلام ہی آخری و فطری مذہب ہے اور اس معنی میں وہ دیگر مذاہب سے بہت ممتاز نظر آتا ہے، کیونکر غلط ہو سکتا ہے

جزا و سزا کے متعلق جو خیال جناب نے ظاہر کیا ہے وہ نیا نہیں، تمام وہ مذاہب جو معاد کے قائل ہیں اور حیات بعد الموت کا یقین دلاتے ہیں، یہی دلیل پیش کرتے ہیں کہ دنیا میں اکثر ایسی مثالیں نظر آتی ہیں کہ باوجود انتہائی معصیت کے کوئی سزا یہاں نہ ملی اور ایک گناہگار نہایت مسرور زندگی بسر کر کے چلا گیا۔ پھر اگر یہ نہ مانا جائے کہ مرنے کے بعد جزا و سزا کا قصہ بھی لگا ہوا ہے تو اس کی کیا توجیہ ہو سکے گی اور دنیا میں نیکی و بدی کا امتیاز کیونکر قائم رہے گا

معاد کے لئے یہ دلیل پیش کرنا صرف اس عقیدہ کی بنا پر ہے کہ ہر کام کا نتیجہ ایک مخصوص اسلوب و نہج پر مترتب ہو، یعنی اگر کوئی شخص جُرم کرتا ہے تو اس کو کسی نہ کسی طرح جسمانی یا روحانی سزا بھی ملنا چاہئے یعنی جس طرح دنیاوی قانون کے ماتحت ایک مجرم کو قید و بند میں ڈال دیا جاتا ہے، اسی طرح خدائی قانون میں بھی ہونا چاہئے، لیکن ایسا سمجھنا غلطی ہے، کیونکہ فطرت کبھی افراد کو نہیں دیکھتی بلکہ اجتماع کو دیکھتی ہے، یعنی اس کے جزا و سزا کا تعلق کسی مخصوص فرد یا ذات سے نہیں ہوتا، بلکہ ہیئت اجتماعی سے ہوا کرتا ہے

فرض کیجئے کہ ایک شخص نے اپنی ساری عمر جور و ستم میں بسر کر کے دولت فراہم کی اور دنیا میں نہایت مسرور زندگی بسر کر کے عمر طبیعی تک پہونچ کر مرا، لیکن فطرت کو اس سے غرض نہیں کہ وہ اس جُرم کے عوض میں اس کو کوئی سزا دے، کیونکہ اپنے اس بُرے اخلاق سے جتنا نقصان وہ سوسائٹی یا ہیئت اجتماعی کو پہونچا گیا ہے وہ

کافی سزا اس سوسائٹی کی ہے جس کا وہ فرد تھا اور جس نے اس کے اس جور وستم و بد اخلاقی کو جائز رکھا

اس کی زیادہ روشن و واضح مثال میں ہندوستان کے کسی رئیس یا نواب کو لے لیجئے کہ وہ شب و روز اپنی رعایا کو لوٹ لوٹ کر دولت جمع کرتا ہے اور اپنی خواہش نفسانی پر سب کو قربان کر دیتا ہے، پھر اسی کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی تمام عمر اسی لطف و مسرت میں بسر کر دیتا ہے اور کوئی سزا اس کو یہاں نہیں ملتی۔ لیکن کیا آپ نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ اس کی زندگی میں جن جن لوگوں کو تکلیفیں پہونچی ہیں کیا وہ ان لوگوں کے لئے کافی سزا نہ تھی، پھر سوال یہ ہے کہ کیا ایسے شخص کو رئیس بنائے رکھنا یا اس کے ہاتھ میں عنانِ حکومت دے دینا خود افراد قوم یا ہیئت اجتماعی کی غلطی نہیں ہے اور اس لئے اگر وہ اس کے مظالم کو برداشت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں تو یہ اُن کی سزا ہے جو انھیں بھگتنا چاہئے۔ یقیناً اس ایک شخص نے جو یہ سب کچھ کر گیا یہاں کوئی سزا نہیں پائی، اور نہ میرے عقیدہ کے مطابق مرنے کے بعد اسے کوئی سزا ملنا ہے؛ لیکن چونکہ یہ بالکل انفرادی امر ہے اس لئے قابلِ لحاظ نہیں اگر خدا کو آپ قادرِ مطلق مانتے ہیں تو اس سے اس کی بازپرس ممکن نہیں اور اگر خدا کے قائل نہیں تو پھر یہ سوال بدرجۂ اولیٰ اور بھی نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ نظامِ فطرت کے سامنے افراد نہیں ہوا کرتے بلکہ اُن کی اجتماعی حیثیت ہوا کرتی ہے

اگر ہماری جماعت میں کوئی شخص نااہل یا مجرمانہ ذہنیت کا پیدا ہو جاتا ہے اور ہم اس کے وجود کو بغیر کسی اصلاح کے گوارا کر رہے ہیں تو یقیناً ہم کو اس کی سزا ملنی چاہئے اور وہ سزا یہی ہے کہ اس شخص کے بدعنوانیوں سے سوسائٹی کو کافی نقصان پہونچ جاتا ہے اور پھر ایک زمانہ تک اس کی تلافی نہیں ہو سکتی

انسان کو عقل و فہم صرف اس لئے عطا ہوئی ہے کہ وہ انفرادی اغراض سے علٰحدہ ہو کر صرف اجتماعی مفاد کو پیشِ نظر رکھے اور اگر اس نے اپنی زندگی کا کوئی ایسا نظام مرتب نہیں کیا ہے تو یہ اس کی غلطی ہے اور اسی غلطی یا جرم کی یہ سزا ہے کہ وہ اپنے بعض افراد کے ہاتھ سے تباہ ہوتا رہتا ہے

ایک ظالم بادشاہ کا وجود قدرت کی سزا ہے جو رعایا کو اُن کے اس احساس غلامی پر دی جاتی ہے جس نے اُس بادشاہ کی سلطنت کو گوارا کیا۔ اور ایسی صورت میں یہ سوال اٹھانا کہ خود اس بادشاہ کو کیا سزا ملی بالکل یہی صورت رکھتا ہے کہ ہم آگ کے اس شعلہ کے متعلق جس نے ہمارے گھر کو پھونک دیا ہے۔ یہ پوچھیں کہ اسے قدرت کی طرف سے اس ظلم کی کیا سزا ملی

نوعِ انسانی کے اجتماعی زندگی کا اقتضا یہ ہے کہ وہ اپنے افراد کو حد سے آگے نہ بڑھنے دے اور ان میں اس امر کا احساس پیدا کرے کہ وہ ہیئت اجتماعی کے ایک عضو ہیں اور اگر آج ہم اس میں کامیاب ہو جائیں تو دنیا سے معصیت و جرم کا وجود مٹ جائے۔ لیکن چونکہ ہم ابھی تک اسی رمز کو نہیں سمجھ سکے ہیں اور نوعِ انسانی خود

تفریق وامتیاز کی لعنت میں گرفتار ہے اس لئے نا اہل افراد بھی پیدا ہو رہے ہیں اور رہیں ان کے مظالم برداشت کرنا پڑیں گے کیونکہ ان کا وجود خود ہمارے کردار کی سزا ہے

علاوہ اس کے موت کے بعد جزا و سزا کا خیال اصولی نقطۂ نظر سے بھی کوئی خاص وزن نہیں رکھتا ——— اگر آپ معاد کے قایل ہیں اور جزا و سزا کو سب اسی سے متعلق سمجھتے ہیں تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ خدا کا یہ نظام کوئی خاص مدعا رکھتا ہے اور وہ مدعا سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ بُرے کام کرنے والوں کو عبرت حاصل ہو اور اچھے کام کرنے کا شوق پیدا ہو۔ یعنی جس طرح اس دنیا میں ایک مجرم کو سزا اور دوسرے اچھا کام کرنے والے کو انعام دے کر ترہیب و تشویق کا سلسلہ جاری ہے، اسی طرح مرنے کے بعد بھی ہوگا، لیکن کیا کبھی آپ نے اس امر پر بھی غور کیا ہے کہ مرنے کے بعد انعام و سزا کا نتیجہ کیا ہے یعنی اگر اس دنیائے عمل میں لوٹ کر پھر واپس آنا نہیں ہے تو اس عقوبت و انعام کا اثر ہمارے اعمال و افعال پر کیا پڑ سکتا ہے۔ کتنا بڑا ظلم ہے کہ ایک شخص کو کسی جرم میں سزا دی جاتی ہے اور پھر اُسے کوئی موقع اس سے باز رہنے کا نہیں ملتا۔ ——— اسی لئے تناسخ کا عقیدہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے، لیکن اس میں بھی خرابی ہے کہ کسی شخص کو سزا و انعام کا احساس نہیں ہوتا، یعنی فرض کیجئے کہ اعمال بد کی سزا میں ایک شخص مرنے کے بعد کتا ہو گیا، تو اس کتا ہونے کی حالت میں اسے یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ کسی وقت انسان تھا اور اپنے اعمال بد کی وجہ سے کتا ہو گیا ہے اسی کے ساتھ تلافی کا بھی موقعہ اس کو حاصل نہیں ہوتا اور جانور ہونے کے بعد وہ اپنے اعمال میں کوئی تغیر ایسا نہیں کر سکتا کہ پھر انسان ہو جائے۔ اس لئے سزا کی یہ نوعیت بھی بیکار ہے ——— الغرض معاد اور حیات بعد الموت کے سلسلہ میں انعام و سزا کی جو صورتیں بھی فرض کی جائیں۔ قابل قبول نہیں ہیں اور اس لئے مجبوراً یہی ماننا پڑتا ہے کہ جو کچھ ہے اسی دنیا میں ختم ہو جاتا ہے اور مرنے کے بعد بالکل وہی حالت انعدام طاری ہو جاتی ہے جو پیدا ہونے کے قبل تھی

اگر خدا واقعی ویسا ہی عظمت والا ہے جیسا کہ عام طور پر اہل مذاہب ظاہر کرتے ہیں تو پھر انسان کی حیات بعد الموت اور جزا و سزا کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ———

چیونٹیوں کی دنیا میں بھی ممکن ہے کہ یہی اعتقاد پایا جاتا ہو کہ جو قزاق چیونٹیاں ہیں۔ انھیں مرنے کے بعد سزا ملے گی، لیکن کیا ان کا یہ خیال صحیح ہے اور کیا جس وقت انسان انھیں پامال کرتا ہوا گزر جاتا ہے تو وہ اپنی حیات بعد الموت میں انسان کے خلاف فریادی ہو کر خدا سے انصاف طلب کرتی ہیں

اگر میں یہ کہوں کہ ہاں یہ سب صحیح ہے اور یقیناً چیونٹیوں کا بھی حشر و نشر ہوگا تو یقیناً آپ ہنس پڑیں گے، کیونکہ آپ کے مقابلہ میں چیونٹی جتنی غیر اہم مخلوق ہے کسی سے مخفی نہیں، لیکن کبھی آپ نے اس پر بھی

غور فرمایا ہے کہ خدا یا قدرت کے مقابلہ میں کیا انسان کی ہستی چیونٹی سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور اگر انسان اپنی جگہ حشر و نشر کا عقیدہ لئے بیٹھا ہے تو کیا فطرت کو اس پر ہنسی نہ آنی چاہیے

---

# دلگیر اکبر آبادی مرحوم

دلگیر مرحوم میرے اُن احباب میں سے تھے جن سے باوجود تعلق قطع ہوجانے کے تعلق باقی رہا —— یعنی باوصف اس کے کہ ایک زمانہ سے میں اُن سے بے خبر تھا اور وہ مجھ سے، لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ آگرہ وجوار آگرہ کا خیال آیا ہو اور دلگیر مرحوم سامنے نہ آگئے ہوں

اوّل اوّل میری اور ان کی شناسائی اب سے تقریباً ایک رُبع صدی قبل اس وقت ہوئی تھی جب انھوں نے اجرا ر نقاد کے سلسلہ میں، یو۔پی کے بعض شہروں کا دَورہ کیا تھا اور سرا تھو سے لوٹتے ہوئے (جہاں اس وقت مہدی مرحوم تحصیلدار تھے) فتحپور میں قیام کیا تھا

ہر چند اس وقت میں بھی اُن کی طرح جوان تھا، لیکن میری جوانی صرف رعنائی خیال تک محدود تھی اور اُن کی، پرستاری جمال سے بھی آگے بڑھ جانا چاہتی تھی۔ —— اس لئے ان کا دو دن کا قیام، میرے لئے پُر لطف ہو یا نہ ہو لیکن ولولہ انگیز ضرور تھا اور غالباً یہ کہنا خلاف حقیقت نہ ہوگا کہ ادبیات کی طرف میری توجہ کے جو اسباب اوّل اوّل پیدا ہوئے، اُن میں ایک بڑا سبب دلگیر کی ذات بھی تھی —— پھر نقاد کو انھوں نے جس شان سے نکالا، اور جس انشاء کو وہ پیش کرنا چاہتے تھے؛ اس کے لکھنے والوں کو ڈھونڈھ نکالنے میں جس کاوش سے انھوں نے کام لیا، وہ حقیقتاً اُنھیں کا حصّہ تھا

دلگیر غالباً جناب غوث الاعظم کی اولاد میں سے تھے۔ اور اسی لئے ان کے نام میں لفظ شاہ کا اضافہ پایا جاتا تھا۔ اور کچھ جائداد بھی بطور جاگیر اُن کے خاندان میں منتقل ہوتی چلی آرہی تھی —— مجھے یاد نہیں خود انھوں نے یا کسی اور نے مجھ سے ذکر کیا تھا۔ بہرحال یہ بات میرے دماغ میں محفوظ ہے کہ سال میں ایک بار غالباً عشرۂ محرم کے کسی تاریخ میں وہ اُس طلائی علم کو لوگوں کے زیارت کے لئے باہر نکالتے تھے جسے اُن کے مورث اعلےٰ جیلان سے ہندوستان لائے تھے۔ وہ اپنے نام کے ساتھ لفظ۔ سید بھی لکھتے تھے، درانحالیکہ خود جناب غوث الاعظم سید نہ تھے بلکہ شیخ تھے

اس سے مدعا یہ ہے کہ دلگیر کسبِ معاش کی طرف سے مطمئن تھے اور دنیاوی افکار کی وہ اُلجھنیں جو ہندوستان کے بہت سے ذہین دماغوں کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں کبھی ان کی راہ میں حایل نہیں ہوئیں، اور اسی لئے جب تک نقاد جاری رہا - خریداروں سے بے نیاز ہو کر جاری رہا اور اس کی اصلی شان کو دلگیر نے ہاتھ سے نہ جانے دیا

چونکہ دلگیر کا ذکر عین نقاد کا ذکر ہے اور اُن کی زندگی کا صرف وہی حصّہ قابلِ التفات ہے جو نقاد کی خدمت میں صرف ہوا، اس لئے اُن کی دیگر ذاتی خصوصیات کو نظر انداز کرتے ہوئے، بار بار نقاد ہی کا نام زبان پر آتا ہے جس نے ان کو ملک سے روشناس کیا

نقاد پہلی بار کیوں بند ہوا، اس کا حال تو معلوم نہیں، لیکن دوبارہ جاری کس طرح ہوا، اس سے ملک کا ہر ادیب واقف ہے ــــــ دہلی کی کوئی خاتون "قمر زمانی بیگم" دلگیر مرحوم کے ادبی خدمات کا اعتراف کرتی ہوئی ان کو دہلی طلب کرتی ہیں - یہ وہاں پہونچتے ہیں، رفتہ رفتہ مراسم بڑھتے ہیں اور آخرکار خود خاتون، ادارت نقاد کی ذمہ داریاں اپنے سر لے لیتی ہیں ــــــ ہائے، یہ بھی کیا زمانہ تھا، جب دلگیر ایک مجسمۂ کیف و رنگ تھے - اور ان کی ہر ہر سانس عشق و محبت میں ڈوبی ہوئی نکلتی تھی

برسات کا موسم ہے، بھوپال کے ذرہ ذرہ سے جوشِ مستی اُبل رہا ہے، یادش بخیر ملک حبیب احمد صاحب کے مکان پر احباب کا قیام ہے اور دلگیر بھی موجود ہیں - کوئی کسی خیال میں ہو، لیکن دلگیر اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں ـــ ـــ ایک دن شام کو ہم سب حمیدیہ روڈ پر ٹہلتے ہوئے جا رہے تھے کہ دفعۃً شام کے دھندلکے اور سرد ہواؤں کے جھونکوں نے دلگیر کو بیتاب کر دیا اور وہ وہیں سڑک پر کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گئے، پوچھا گیا - شاہ صاحب خیر تو ہے - لیکن شاہ صاحب وہاں کہاں تھے - تھوڑی دیر بعد دفعۃً اپنی رانوں پر ہاتھ مار کر (اس زور سے کہ اگر وہ ہاتھ کسی انسان کے جسم پر پڑ جاتا تو سُرمہ ہو کر رہ جاتا) بولے کہ، سنو، اور سر دھنو، یہ کہکر انھوں نے قمر زمانی بیگم کا ایک مضمون جس کا عنوان شاید "کلی سے" تھا، اور جو حال ہی میں انھیں ملا تھا اور ابھی تک شایع نہ ہوا تھا، سُنانا شروع کیا، وہ انھیں زبانی یاد تھا ــــــ اس میں شک نہیں کہ مضمون نہایت پاکیزہ تھا، لیکن اس کی معنوی خوبی کا علم اس وقت ہوا جب دلگیر نے کہا کہ " تم لوگوں کو معلوم ہے کہ کلی سے مُراد کیا ہے " اور پھر خود ہی بول اٹھے کہ " یہ کلی میں ہوں "

اس ایک واقعہ سے مدعا صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ نقاد کا دَورِ ثانی خود دلگیر کے لئے کس درجہ نشہ آور تھا اور یہ ایک خاتون کی شرکت نے ان کو اور اُن کے رسالہ کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا تھا

افسوس ہے کہ نقاد کا یہ دَور " دولتِ مستعجل " ثابت ہوا - اور ایک سال کے اندر ہی اندر عروج

وزوال کیا حیات وموت کی تمام منزلیں ختم ہوگئیں ——— قمرزمانی بیگم کون تھیں، اور اتنا التفات ظاہر کرنے کے بعد کیوں دفعۃً کنارہ کش ہوگئیں۔ یہ راز آج تک پبلک میں نہ آسکا، کیونکہ اس کے بعد جو خاموشی دلگیر نے اختیار کی وہ اخیر وقت تک دور نہ ہوئی اور ادبی دنیا سے وہ اس حد تک کنارہ کش ہوئے کہ آخر کار آنریری مجسٹریٹ بن گئے، اور اخیر دم تک یہی بنے رہے

دلگیر، خود بھی ایک خوش گو شاعر تھے اور انشا، عالیہ کو بہت پسند کرتے تھے، شعر ایک خاص جوش کے ساتھ پڑھتے تھے اور بے اختیار ہو جاتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک دن جب انھوں نے اپنا یہ شعر سنایا

یہ میکدہ کی بھیڑ، یہ انبوہ، یہ ہجوم
ہم تو نکل کے کھوئے گئے خانقاہ سے

تو وہ دفعۃً کھڑے ہوگئے اور دونوں ہاتھ پھیلا کر رقص کرنے لگے

افسوس ہے کہ نقاد کے بند ہونے کے بعد اُن کی زندگی بالکل دوسری ہوگئی اور شعر وسخن یا ادب وانشا سے انھیں کوئی لگاؤ باقی نہ رہا تھا۔ اُن کی علالت کا حال بھی مجھے ان کی زندگی میں نہ معلوم ہوا اور موت کی خبر تو خیر مرنے سے پہلے معلوم ہی نہیں ہو سکتی۔ ان کے بڑے بیٹے سید شاہ انتظام الدین جمالی ام۔ اس۔ سی، اُن کے جانشین ہیں، خدا کرے یہ اپنے باپ کے فرزند معنوی بھی ثابت ہوں اور اُن کی یادگار میں کم از کم ان کا دیوان ہی مرتب کر کے شایع کرا سکیں (اگر واقعی کوئی دیوان موجود ہے)

# باب الانتقاد

**مخزن المفردات ہومیوپیتھی** | ہومیوپیتھی یعنی علاج بالمثل کا طریقہ اب اسقدر عام، اسدرجہ مقبول اور اتنا مفید ثابت ہوتا جارہا ہے کہ اس کی اہمیت پر گفتگو کرنا لایعنی سی بات ہے۔ ہندوستان میں اول اول اس طریق علاج کو بنگال نے قبول کیا اور اسکے بعد رفتہ رفتہ تمام ملک میں اسکی اشاعت ہونے لگی، حتے کہ ہندوستان میں اب شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جس کے کانوں تک یہ آواز نہ پہونچی ہو اور شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جس کو ایک آدھ بار اس سے واسطہ نہ پڑا ہو ـــــ یہ طریق علاج اپنی ارزانی کے لحاظ سے خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کے لئے اتنا موزوں و مناسب ہے کہ شاید ہی کوئی دوسرا اس کے مقابل آسکے، پھر فائدہ کا یہ عالم ہے کہ اگر دوا ٹھیک تجویز ہو جائے تو تیر کی طرح کام کرتی ہے

انگریزی میں تو خیر کثرت سے اور بڑی بڑی تصانیف اس موضوع پر پائی جاتی ہیں، لیکن اردو میں بہت کم ہیں، اور جو ہیں بھی وہ نہ ہونے کے برابر ہیں - دو چار کتابیں لاہور سے اور اتنی ہی لکھنؤ سے شایع ہو چکی ہیں، لیکن کوئی ایسی تصنیف جو پورے طور پر خواص الادویہ کو حاوی ہو کوئی نہ تھی ـــ اب ڈاکٹر کانشی رام صاحب ہومیوپیتھ نے جو عرصہ سے یہیں لکھنؤ میں اپنا کامیاب مطب چلا رہے ہیں اس کمی کو پورا کیا اور تین ضخیم جلدوں میں مخزن المفردات ہومیوپیتھی شایع کر کے ایسی بیش بہا خدمت ملک و قوم کی انجام دی ہے کہ اسکی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے ــــــ ہومیوپیتھی میں اصل چیز یہ معلوم کرنا ہے کہ کسی دوا کی کیا خصوصیات ہیں، یعنی ایک مریض کے حالات کس دوا کے علامات سے زیادہ ملتے جلتے ہیں اور اصل ڈاکٹر وہی ہے جو ایسی دوا کو ڈھونڈھ نکالے - پھر جو لوگ عرصہ سے اس کام کو کر رہے ہیں اور روز کے تجربہ سے انھیں معلوم ہو چکا ہے کہ فلاں فلاں امراض میں زیادہ تر فلاں فلاں ادویہ کے علامات نمودار ہوتی ہیں، ان کے لئے تو نسخہ تجویز کرنا چنداں دشوار نہیں، لیکن عام لوگوں کے لئے یہ بہت دشوار ہے اور اسی دشواری کی دور کرنے کے لئے ڈاکٹر صاحب موصوف نے یہ کتاب شایع کی ہے۔

تینوں جلدیں تقریباً ...۳ صفحات محیط ہیں اور تمام اُن دواؤں کے خواص سے بحث کرتی ہیں جن کے متعلق ہومیوپیتھی میں اس وقت تک تحقیق مکمل ہو چکی ہے ــــــ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کتاب کی طیاری میں نہ صرف انگریزی کی متعدد کتابوں سے مدد لی ہے بلکہ خود اپنے تجربات بھی پیش کئے ہیں جو از بس مفید و کار آمد ہیں اسی کے ساتھ ہر دوا کے علامات اسقدر شرح و بسط کے ساتھ بتائے ہیں کہ اگر بغور ان کا مطالعہ کیا جائے تو دوا کی تجویز میں غلطی کا بہت امکان بڑھ جاتا ہے ـ پھر زبان بھی بہت صاف اور طرز بیان بھی سلجھا ہوا ہے ــــــ وہ حضرات جو اس فن سے کسی قسم کی دلچسپی رکھتے ہیں، ان کے لئے اس کتاب کا اپنے پاس رکھنا لازم ہے ـــ تینوں جلدوں کی یکجائی قیمت عہ کسی طرح زائد نہیں ــــــ بھارت ہومیو فارمیسی چوراہا قیصر باغ لکھنؤ، اس کے ملنے کا پتہ ہے

**نسخہ جات ہومیوپیتھی** | یہ کتاب بھی ڈاکٹر کانشی رام صاحب کی تالیف ہے اور ان لوگوں کے لئے جو

معمولی امراض میں بغیر زیادہ کاوش کے دوا تجویز کرنا چاہتے ہیں، بہت کارآمد ہے - اس میں ردیف وار تمام امراض کا ذکر کرکے اس کی دوائیں درج کر دی ہیں - اور اسی کے ساتھ مختصراً یہ بھی بتا دیا ہے کہ کن کن حالات میں کونسی دوا دینا مناسب ہے - خوراک کا وقفہ اور دوا کی طاقت بھی ساتھ ساتھ ہی دے دی گئی ہے - یہ کتاب اس قابل ہے کہ سفر و حضر میں ہر وقت انسان کے پاس رہے - قیمت ۱۲؍ ہے اور بھارت فارمیسی سے یہ بھی مل سکتی ہے

**جرمنی کی قومی بیداری**

اسوقت سیاسیات عالم میں جرمنی کا مسئلہ نہایت اہم مسئلہ سمجھا جاتا ہے اور بین الاقوامی سیاست کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کے سمجھنے کے لئے اس مسئلہ پر غور کرنا ضروری نہ ہو - یہ کتاب فی الاصل فرانسیسی زبان میں لکھی گئی تھی، جس کا ترجمہ انگریزی میں ہوا اور اب انگریزی سے اُردو میں ہوا ہے - اس کے مترجم محمد امیر الحسن صاحب ہیں جو ٹائمس آف انڈیا کے رپورٹر ہیں

اس کتاب میں موجودہ نازی تحریک کے آغاز و نشو و نما، اس کے داخلی و خارجی اسباب، ہٹلر کے حالات زندگی، اور اس کے پروگرام سے بحث کرتے ہوئے جرمنی کی جدید خارجہ پالیسی اور یہودیوں کے خلاف جرمنی تحریک سے مفصل بحث کی گئی ہے - ترجمہ صاف و سادہ ہے - گو کہیں کہیں الجھا ہوا ہے —— اس کی قیمت ۱۲؍ ہے اور ذیل کے پتہ سے مل سکتی ہے

محمد امیر الحسن صاحب —— عدن والا بلڈنگ - دوسرا مالہ - روم نمبر ۸۴ پریل روڈ - بمبئی

**سمندر کا عجائب خانہ**

سلسلۂ عجائبات قدرت کی یہ پہلی کتاب ہے جسے سید محمد عسکری جعفری نے تالیف کیا ہے - اس میں آبی جانوروں کے دلچسپ حالات نہایت صاف و شگفتہ زبان میں بیان کئے ہیں اور جا بجا نقوش و تصویریں بھی دیدیے ہیں —— نیچرل ہسٹری کے متعلق ایسی کتابوں کی سخت ضرورت ہے اور اگر مؤلف نے اسی طرح اس سلسلہ کو رفتہ رفتہ مکمل کر دیا تو بڑی خدمت ملک و زبان کی ہوگی - یہ کتاب ۱۲؍ میں مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی سے مل سکتی ہے

**معیار ادب**

انڈین پریس الہ آباد نے اس نام سے چار ریڈریں، پانچویں، چھٹی، ساتویں، اور آٹھویں جماعت کے لئے شایع کی ہیں - ان کو سید حامد علی صاحب اور قاضی خورشید احمد صاحب نے متفقہ کوشش سے مرتب کیا ہے —— ان ریڈروں کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تمام مضامین خواہ وہ نظم کے ہوں یا نثر کے انتخاب نہیں کئے گئے ہیں - بلکہ اوریجنل ہیں - اور اس بات کو پیش نظر رکھ کر لکھے گئے ہیں کہ کس جماعت میں کس قسم کے اسباق ہونے چاہئیں

گو زبان و محاورہ کی غلطیاں ان میں بھی پائی جاتی ہیں —— تاہم دوسری ریڈروں کو دیکھتے ہوئے بہت غنیمت ہیں

# صنم خانۂ خیال

شیریں لبوں میں خلد کا مفہوم بے نقاب
زلفوں میں جھومتی ہوئی موجِ جنوں نواز

موجِ جنوں نواز میں طوفانِ بیخودی
طوفانِ بیخودی میں تمناؤں کا گداز

باتوں میں لہلہاتی ہوئی جام کی کھنک
اور جام کی کھنک میں بہاروں کے برگ و ساز

اعضا میں لوچ، باتوں میں رس، دل میں مستیاں
آنکھوں میں نور، نور میں رنگینیٔ مجاز!

رنگینیٔ مجاز میں گہری حقیقتیں
گہری حقیقتوں میں بہت ہی عمیق راز

رازوں میں میرے شعر کا سرچشمۂ جمال
وہ ہیں عدم کہ ایک صنم خانۂ خیال

عدم

# التفات اوّلیں

ہوا خوابِ تمنا صرفِ تعبیرِ فراموشی
اب احساسِ کشمکش ہے ــ اور زنجیرِ فراموشی

تغافل ہی تغافل رہ گیا بزمِ محبت میں
جھلکتی ہے ہر آئینے میں تصویرِ فراموشی

بسایا تھا کبھی قصرِ محبت جن نگاہوں نے
نظر آتی ہیں اب مصروفِ تعمیرِ فراموشی

جسے تم خود کبھی اپنا شہیدِ ناز کہتے تھے
وہی محروم ہے اب زخمیٔ تیرِ فراموشی

بجھانا تھا تمھیں شمعِ محبت کو بجھا بیٹھے
بھلانا تھا تمھیں ناشادِ الفت کو بھلا بیٹھے

مگر! شاداب ہے میری وفا کا گلستاں اب بھی
یہ دنیا ہے ہم آغوشِ بہارِ بے خزاں اب بھی

جو اک میکش کو بابِ میکدہ تک کھینچ لائی تھیں
وہی مہ وشیاں ہیں کارواں در کارواں اب بھی

بہت سی داستانیں صبح تک دُہرائی جاتی ہیں
بتاتے ہیں مری خاموشیوں کے رازداں اب بھی

وہی رنگینیاں اب تک گذرگاہِ تخیل میں
بہشت آباد ہوتی ہیں مری تنہائیاں اب بھی

غرض ــ اب بھی وہی دورِ وفا بنیاد باقی ہے
تمھارے التفاتِ اوّلیں کی یاد باقی ہے

روش صدیقی

# خوابِ بیداری

نصف شب کی خنک فضاؤں میں
کہکشاں کی لطیف چھاؤں میں
چُپ سے ہوتے ہیں جب در و دیوار
سرد ہوتا ہے جب ہر اک بازار
چھائی ہوتی ہے جب مناظر پر
ایک کیفیتِ سکوں پرور
آسمانوں پہ ماہ و انجم سے
جب اُبلتے ہیں نور کے چشمے
سبزۂ محوِ خواب پر پیہم
جب فضا سے ٹپکتی ہے شبنم
جب سناتی ہے شب کی خاموشی
ہلکی ہلکی لطیف موسیقی
قدسیوں کے گروہ پر کھولے
جب اُترتے ہیں آسمانوں سے
زہرۂ عرش کے ترنم پر
رقص کرتے ہیں جب مہ و اختر
محوِ گلگشت ہوتی ہیں روحیں
خواب کے جب بہشت زاروں میں
جبکہ ہوتا ہے نیند میں مخمور
سارے دن کا تھکا ہوا مزدور
جب شجر محوِ خواب ہوتے ہیں
بام و در محوِ خواب ہوتے ہیں
ایسا محسوس ہوتا ہے مجکو
جیسے میں نے شراب پی لی ہو
روح ہوتی ہے غرق کیفیت
تیز ہوتی ہے قلب کی حرکت
دوڑتی ہیں سرور کی لہریں
میری رگ رگ میں رینگتے رہتے ہیں
پھر اسی سرخوشی کے عالم میں
ہاں اسی بے خودی کے عالم میں
دفعتاً کوئی سامنے آکر
مجکو بے ہوش و بے خبر پا کر
اپنے رُخ سے نقاب اٹھاتا ہے
میری حالت پہ مسکراتا ہے

اسرار الحق مجاز (علیگ)

# غم

غم بظاہر اک اثر، اک کیفیت کا نام ہے
فی الحقیقت اک شراب، اک بادۂ بیجام ہے

غم اگر اپنی تجلی سے نہ ضوتابی کرے
ہو نہ ہرگز اس کا عرفاں، روح جس کا نام ہے

غم نہیں جز ِ مسرت تو مسرت کچھ نہیں
وہ حقیقت میں مسرت ہے جو غم انجام ہے

غم نہ ہو تو آئینۂ ہستی کا دھندلا ہی ہے
یہ مری تاریک محفل کا چراغِ شام ہے

غم سے تکمیلِ حیاتِ عشق ہے اے بے خبر
زندگی پُر غم نہ ہو تو زندگی خام ہے

کیوں پسند اسکو کروں جو چیز ہو عالم پسند
ہے پسندیدہ جہاں کو عیش، مجکو غم پسند

ساقیٔ فطرت عطا کر خاطرِ برہم مجھے
ہے گراں اوراقِ گل پر قطرۂ شبنم مجھے

عیش و عشرت نے بھری محفل کو غافل کر دیا
بزمِ عالم میں بچھانی ہے صفِ ماتم مجھے

اپنے دل کے خون سے بجھتی ہے میری تشنگی
موجِ بادہ سے نہیں ہے فکرِ کیف و کم مجھے

چاہتا ہوں جرعۂ غم سے نشاطِ بیخودی
ہے ابھی اندیشۂ نیرنگیٔ عالم مجھے

ہر خوشی دنیا کی ہے صرف ایک دھوکا اک فریب
زہر آلودہ نظر آتا ہے جامِ جم مجھے

مست ہوں اپنے خیالاتِ پریشاں میں ہنوز
اک نشاطِ جاوداں ہے کاہشِ پیہم مجھے

کچھ تو ہو دنیا میں اور مجھ میں مذاقِ امتیاز
کیفِ عشرت دے جہاں کو تو، دے کیفِ غم مجھے

غم سے انساں عالمِ فانی میں سرافراز ہے
غم نہیں، میرے نظامِ زندگی کا راز ہے

فضل الدین آثر (اکبر آبادی)

---

# جوئبار سے خطاب

مست نغموں سے نہ کر دل کو مرے یوں بیقرار
شادمانی سو رہی ہے، اور سونے دے ابھی

میرا دل ہے لذتِ موہوم کا سرمایہ دار
آنسوؤں سے غم کی بارش اور ہونے دے ابھی

دل کا ہر احساس زخمی ہو چکا ہے لاکھ بار
دل کی دنیا کو متاعِ صبر کھونے دے ابھی

فطرت (واسطی)

# غزلیات

## علی اختر

یہی نظر کا دھوکا ہے یا کار نظر ہے کیا معلوم — سطح پہ قطرے رقصاں ہیں یا موج گہر ہے کیا معلوم

کون نہ جانے محو تم ہو ناحق شکوہ کیوں کیجئے — چرخ ہے یاس پڑے ہیں وہ عربدہ گر ہے کیا معلوم

وہ بھی ہیں کچھ کھوئے ہوئے سے جنکو واقف کہتے ہیں — ہستی کے اسرار نہاں کی کسکو خبر ہے، کیا معلوم

ہاتوں کو اٹھا اٹھا کر ہمدم اک مدت سے روتا ہوں — میری آہِ نیم شبی میں کوئی اثر ہے کیا معلوم

ہستی کا ہنگامہ بپا ہے، سانس کے آنے جانے پر — عالم ضبط و تمکیں ہے یا رقص شرر ہے کیا معلوم

دیوانے تو دیوانے ہیں ان کو اپنا ہوش نہیں — عقل پہ جنکو ناز ہے اتنا ان کو مگر ہے کیا معلوم

ہجر کی شب طوفان ہجوم اشک میں اتنا ہوش کہاں — سینے میں ہے قلب کہ صرف دیدۂ تر ہے کیا معلوم

ہمنے تو رو کر ہی گزاریں گھڑیاں عمر فانی کی — ہوگا پاسِ دردِ محبت ان کو اگر ہے کیا معلوم

مدت گزری اختر کی پائی نہ کسی سے کوئی خبر
مرگیا وہ ناشاد کہ اب تک خاک بسر ہے کیا معلوم

## سید اصغر جعفری ساڈھوروی

رنگت بدل گئی ہے تمہاری شباب میں
ڈوبے ہوئے ہو سر سے قدم تک شراب میں

جو دل ہے محشر غم و حسرت ہے ان دنوں
دنیا بدل گئی ترے عہدِ شباب میں

غضب کو وہ دلکشی تجھی کہ ممکن نہیں بیاں
کل تم چھپے ہوئے تو نہ تھے ماہتاب میں

وہ جانِ نغمہ کون سے پردے میں ہے نہاں
جس کی صدائیں گونج رہی ہیں رباب میں

اصغر وہ حسن و عشق کے افسانے یاد ہیں
عالم ہی اور تھا مرے دورِ شباب میں

## عبد اللطیف تپش ایم اے

ابھی تو مجھ پہ نظر ہے کیا کہئے — اور پھر ہمیں قدر ہے کیا کہئے

پردہ داری کا کس کی چرچا ہے — کون یہ پردہ در ہے کیا کہئے

قصۂ اشک نامرادی غیر — منفعل چشم تر ہے کیا کہئے

وہ تماشائے خلوت آرائی — اب سرِ رہگذر ہے کیا کہئے

پوچھتے ہیں مآل سجدۂ شوق — یہ بھی اک دردِ سر ہے کیا کہئے

شمع ہستی کا ابھی افسانہ — کوئی دم میں سحر ہے کیا کہئے

ہونیوالا ہے کیا تپش انجام — ان کو سب کچھ خبر ہے کیا کہئے

## راز رامپوری

تری نظر میں ہیں سامانِ صد بہار آجا — بہار گلشنِ عالم ترے نثار آجا

تجھے ہے رسم زمانہ پر اختیار آجا — فنا کے قید سرِ بام وہ گنہگار آجا

بہار و کیف حیاتِ بہار کی سوگند — خزاں نصیبوں کی جانب بھی ایکبار آجا

ابھی تو راز صدائیں شناخت کرتا ہے
ابھی تو ہے ترے آنے کا انتظار آجا

# جنوری سنہ ۳۸ء کے لئے

## حسب ذیل عنوانات پر مقالے درکار ہیں

(۱) دہلی اور لکھنؤ اسکول کی شاعری پر بلحاظ فلسفۂ لفظ اور معانی خصوصیات

(۲) دونوں اسکولوں کے اکابر اور ان کا فرق مدارج

(۳) فن اور زبان کی حیثیت سے دونوں کا مرتبہ

(۴) لکھنؤ اسکول پر دہلی کا اثر

(۵) دہلی اسکول پر لکھنؤ کا اثر

(۶) دونوں اسکولوں کی غزل گوئی پر تفصیلی تبصرہ

(۷) لکھنؤ اسکول کے تین بہترین شاعروں کے ۲۰،۲۰ شعر

(۸) دہلی اسکول کے تین بہترین شاعروں کے ۲۰،۲۰ شعر

(۹) منظوم افسانے یا مثنوی لکھنؤ اسکول میں

(۱۰) منظوم افسانے یا مثنوی دہلی اسکول میں

(۱۱) دکن اور اردو شاعری (اسوقت تک تمام ادوار پر تبصرہ)

(۱۲) پنجاب اور اردو شاعری (اسوقت تک تمام ادوار پر تبصرہ)

(۱۳) تذکرہ نگاری کی حیثیت سے لکھنؤ اور دہلی کے خدمات

(۱۴) دونوں اسکولوں کے کارنامے، رباعیات، مرثیہ، قصیدہ و نعت میں

(۱۵) دولت مغلیہ کے انحطاط کا اثر دہلی کی شاعری پر

(۱۶) شاہان اودھ اور لکھنوی شاعری

(۱۷) دہلی اور لکھنوی شاعری میں اخلاقی و مذہبی عنصر

(۱۸) شاعری کے لحاظ سے لکھنؤ کا دور زریں

(۱۹) شاعری کے لحاظ سے دہلی کا دور زریں

(۲۰) لکھنؤ اسکول کا سب سے پہلا شاعر جس نے دہلی کا تتبع کیا

(۲۱) دہلی اسکول کا سب سے پہلا شاعر جس نے لکھنؤ کا تتبع کیا

(۲۲) لکھنؤ اور دہلی کے وہ شعراء جنھوں نے ملک و قوم کو کوئی خاص پیغام پہنچایا

(۲۳) کیا دہلی اسکول روبہ انحطاط ہے اور کیوں

(۲۴) کیا لکھنؤ اسکول روبہ انحطاط ہے؟ اور کیوں

(۲۵) رامپور کا تعلق دہلی اور لکھنؤ اسکولوں سے

(۲۶) حیدرآباد اور لکھنؤ و دہلی اسکول کا اس سے تعلق

(۲۷) کیا لکھنؤ اسکول نے کلکتہ میں بھی شاعری کو متاثر کیا؟

(۲۸) کیا لکھنؤ اسکول میں اصلاح کی ضرورت ہے؟ اگر ہے تو کیا

(۲۹) کیا دہلی اسکول میں اصلاح کی ضرورت ہے؟ اگر ہے تو کیا

(۳۰) مستقبل میں آپ کو اردو شاعری سے کیا توقعات ہیں

(۳۱) دونوں اسکولوں کے وہ شعراء جنھوں نے قدامت کو ترک کر کے کسی ابداع و اختراع سے کام لیا

(۳۲) لکھنؤ اور دہلی کے ریختی اور ہزل گو

(۳۳) لکھنؤ اور دہلی کی خواتین جنھوں نے شاعری میں نمایاں حصہ لیا

(۳۴) لکھنؤ اسکول کے مختلف ادوار اور ہر دور کے بہترین شاعر

(۳۵) دہلی اسکول کے مختلف ادوار اور ہر دور کے بہترین شاعر

(۳۶) آگرہ اور دہلی کا شاعرانہ تعلق

---

نوٹ:۔ لکھنؤ اور دہلی کی شاعری سے مراد وہ تمام شعراء ہیں۔ جو یہاں کی شاعری سے متاثر ہو کر اسی رنگ میں شعر کہتے ہیں۔ اس کے لئے کسی خاص جگہ کا باشندہ ہونے کی شرط نہیں ہے

# "ہمایوں"

## پنجاب کا قدیم ترین ماہوار ادبی رسالہ

اگر آپ اب ہمایوں کے ششماہی خریدار بن جائیں تو آپ کو ہمایوں کا ایک بہترین اور دلچسپ افسانہ نمبر مقررہ ششماہی چندہ میں بلا زائد قیمت کے مل جائیگا۔
اگر آپ سالانہ خریدار بن جائیں تو نہ صرف افسانہ نمبر بلکہ ایک شاندار اور ضخیم سالگرہ نمبر بھی آپ کو مقررہ سالانہ چندہ میں بلا زائد قیمت کے مل جائے گا۔

ہمایوں کے مضامین نظم و نثر کے علاوہ اس کی تصاویر اور دیگر ظاہری محاسن کا بلند معیار بھی مسلم ہے۔ ہمایوں کی چند خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ ہمایوں ہر مہینے مختلف قسم کے مذاق کو مدنظر رکھکر مرتب کیا جاتا ہے اسلئے اس میں مضامین اور معلومات کا جتنا تنوع ہوتا ہے کسی رسالہ میں نہیں ہوتا۔
۲۔ یہ رسالہ چونکہ یادگار کے طور پر نکالا گیا ہے اسلئے اس کی کتابت طباعت کاغذ اور دیگر ظاہری محاسن پر بے دریغ روپیہ صرف کیا جاتا ہے ایسا رسالہ ایک مستقل طور سے جاری ہوا ہے۔ ۳۔ بارہ سال میں آج تک کبھی یہ رسالہ ایک دن کی دیر سے بھی شائع نہیں ہوا، ہندوستان کا کوئی رسالہ "ہمایوں" کی طرح اس باقاعدگی کا دعوےٰ نہیں کر سکتا۔ ۴۔ ہمایوں کا ٹائٹل بہترین ہے اسلئے اس کا معیار مضامین بلند ہے اور زبان نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان بھر میں مستند ہے اور کوئی رسالہ اتنی توجہ اور محنت سے مرتب نہیں کیا جاتا۔ ۵۔ ہندوستان کے بہترین سحر طراز ادیب، سحر بیان شاعر اور افسانہ نگار صرف ہمایوں میں اپنے بہترین مضامین شائع کراتے ہیں اسلئے اس رسالہ کا ہر عام نمبر بھی عام رسائل کے خاص نمبروں سے بہتر ہوتا ہے۔ ۶۔ "ہمایوں" کے خاص نمبروں کی الگ قیمت نہیں لی جاتی بلکہ سالانہ چندہ ہی میں تمام خاص نمبر مل جاتے ہیں۔ ۷۔ ہمایوں کی نظمیں مضامین افسانے اور تصاویر پاکیزہ ہوتی ہیں اور اس رسالہ کا معیار اخلاق اتنا بلند ہے کہ اس میں قابل اعتراض اشتہارات بھی درج نہیں کئے جاتے خواہ کتنا ہی مالی نقصان اٹھانا پڑے۔ ۸۔ "جہاں نما" اور "محفل ادب" کے زیر عنوان ہر مہینے اس میں اردو انگریزی رسائل کے بہترین انتخابات درج ہوتے ہیں یہ رسالہ پڑھنے کے بعد کسی دوسرے رسالہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ ۹۔ ہمایوں میں نہ صرف لطیف ادب کے دلچسپ مضامین اور نظمیں ہی شائع ہوتی ہیں بلکہ علمی، تاریخی، تمدنی اور معاشرتی مسائل پر بھی پرُاز معلومات مضامین شائع ہوتے ہیں۔ یہ رسالہ صرف دلچسپ ہی نہیں بلکہ مفید بھی ہے۔

ہمایوں کی یہ چند خصوصیات بیان کرنے کے بعد میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ کم از کم اس کا مفت نمونہ ضرور منگوا لیجئے اگر آپ کو قدیم نمونہ پسند آیا تو نئے پرچے اور بھی پسند آئیں گے کیونکہ یہ رسالہ روز بروز ترقی کرتا ہوا اب بہت بلند معیار کو پہنچ چکا ہے۔

چندہ سالانہ ۵ (مع محصول) چندہ ششماہی ۳ (مع محصول)

**منیجر رسالہ ہمایوں ۲۴ لارنس روڈ لاہور**

# مکتوبات نیاز کتابی صورت میں

بہت جلد شائع ہوں گے۔ کتابت شروع ہوگئی ہے۔ شائع شدہ مکتوبات کے علاوہ اور بہت سے مکتوبات اس میں ہوں گے کتابت وطباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے اور کاغذ بھی بہت دبیز استعمال ہوگا۔ قیمت ؎ لیکن جو حضرات عہ پیشگی بھیجدیں گے ان سے اور کچھ نہ لیا جائے گا

نیجر نگار


| | | |
|---|---|---|
| سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سے) | **نگار** | بیرون ہند سے آٹھ روپیہ (عہ) سالانہ پیشگی مقرر ہے |

| | | |
|---|---|---|
| جلد ۲۶ | فہرست مضامین اگست ۱۹۳۴ء | شمارہ ۲ |



ملاحظات ———— ۲

زندگی کی عجیب وغریب داستان ———— ۹

خدا کی جستجو میں ایک زنگی لڑکی کے تجربات ———— ۱۳

افسانہ نہیں حقیقت ———— محمد اسلام اللہ ———— ۲۷

عالم گیر مذہب کی ضرورت ———— م - ر - خ ———— ۴۶

مکتوبات نیاز ———— ۴۸

کسبی ———— سید ابوسعید بزمی بھوپالی بی۔ اے ———— ۵۲

یہ یونیورسٹیاں ———— عبدالوالی بی اے ———— ۶۳

باب المراسلۃ والمناظرہ ———— ۶۷

باب الاستفسار ———— ۷۱

منظومات ———— ضیا - نظیر - مخدوم - عسدم ———— ۷۴

# نگار

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

| شمارہ ۲ | اگست ۱۹۳۴ء | جلد ۲۶ |
|---|---|---|

# ملاحظات

## مرغابی شو کہ کار با طوفان ست ۔

چندسال سے امریکہ میں بہائی مذہب کے تبعین کا ایک ادارہ "دی ہیومسٹری سوسائٹی" کے نام سے قائم ہے اور وہ اپنے مقاصد میں بین الاقوامی اہلیت پیدا کرنے کے لئے ہر سال کسی نہ کسی موضوع پر تمام دنیا کے صاحب فکر و اہل قلم نوجوانوں کو اظہار خیال کی دعوت دیکر انعامات تقسیم کیا کرتی ہے لہ

---

لہ اس سوسائٹی کی طرف سے جو اعلان شائع ہوا ہے اسکا ترجمہ جناب خان بہادر صاحبزادہ سرفراز علی خاں صاحب چیف سکرٹری دربار جاورہ نے اُردو میں کردیا ہے اور میں انکا از بس شکر گزار ہوں کہ اس طرف سب سے پہلے مجھے صاحبزادہ صاحب موصوف نے توجہ دلائی، جو اسوقت نہایت ہی روشن خیال خوش فکر اور سنجیدہ فہم و تدبر رکھنے والے امرا میں سے ہیں۔ جو حضرات اس اعلان کا مطالعہ کرنا چاہیں وہ صاحب موصوف سے طلب کرسکتے ہیں۔ (اڈیٹر)

پہلے مقابلہ کا موضوع یہ تھا کہ:۔

"اعلیٰ مدارس کن طریقوں سے دُنیا میں صلح و آشتی کے خیال کو ترقی دے سکتے ہیں"

یہ موضوع صرف امریکہ کی یونیورسٹیوں کے طلبہ کے لئے مخصوص تھا جس میں وہاں کے ۵۰۰ طلبہ نے دلچسپی کا اظہار کیا دوسرے مقابلہ کا موضوع یہ تھا:۔

"یونیورسٹیوں کے طلبہ کیونکر تمام دنیا میں ایک انسانی سلطنت قائم کرنے میں مدد کر سکتے ہیں"

اس مقابلہ میں تمام یورپ کے طلبہ کو اظہار خیال کی دعوت دی گئی تھی اور ۰۰۰ مضامین اس موضوع پر موصول ہوئے تھے۔ اب سنہ ۳۶ء کے لئے جو مقابلہ تجویز ہوا ہے اس میں ایشیا کے تمام نوجوانوں کو دعوت شرکت دی گئی ہے اور موضوع سخن یہ ہے کہ:۔

"کیا یہ ممکن ہے کہ دُنیا میں صرف ایک عالمگیر مذہب قایم کیا جائے اور اس باب میں ایشیا کے نوجوان کیا خدمت انجام دے سکتے ہیں"

یہ مقابلہ گزشتہ جولائی کو ہونے والا تھا اور جو جو مضامین قابل انعام قرار پائے ہوں گے انھیں انعام بھی مل چکا ہوگا، اسلئے اب میرا اس مسئلہ پر گفتگو کرنا اس لئے نہیں ہے کہ ہندوستان کے نوجوانوں کو اس موضوع پر لکھنے کی ترغیب دوں، بلکہ مقصود یہ بتانا ہے کہ اس وقت دنیا میں قدیم مذہبی اداروں کی طرف سے کسقدر بے چینی پھیل رہی ہے اور نوع انسانی کا یہ اضطراب تدریجی طور پر کیا صورت اختیار کرنے والا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ امریکہ کی اس سوسائٹی کا قیام محض بہائی مذہب کی تبلیغ کے لئے ہوا ممکن ہے کہ اس نوع کے نشر و اعلان میں درپردہ کوئی مذہبی تنگ نظری بھی شامل ہو لیکن ہمیں اس سے بحث نہیں ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ اب مذہب کا جدید نظریہ کن اُصول پر قایم کیا جا رہا ہے اور اختلاف مذاہب کی وجہ سے جو شورش و بدامنی، جو قتل و خونریزی اس وقت تک ہوئی اور ہو رہی ہے، اس کے انسداد کی طرف کیونکر آہستہ آہستہ طبائع انسانی مایل ہوتی جا رہی ہیں اور غالباً وہ وقت دور نہیں جب یا تو کوئی ایسا زبردست پیغمبر رونما ہو جو اختلافات مذہبی مٹا کر سب کو ایک دین و مسلک سے وابستہ کردے (جو تقریباً محال ہے) یا پھر کرۂ ارض سے مذہب کا خیال ہی یکسر محو ہو جائے (جو بالکل قرین قیاس ہے)۔

تاریخ تمدن انسانی پر جس وقت غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر طلوع آفتاب کے ساتھ انسان کا قدم ترقی کی طرف اُٹھ رہا ہے اور عقاید مذہبی کی گرفت ڈھیلی ہوتی جا رہی ہے، اس لئے یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذہب ترقی کے منافی ہے، کیا اس کے اُصول انسان کو آگے بڑھنے سے روکتے ہیں اور کیا مذہبی تعلیم دماغی نشو و نما اور ذہنی ارتقاء کو ترقی دینے سے عاری ہے

اس کا جواب ڈھونڈھنے کے لئے زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں، مذاہب عالم کی تاریخ اُٹھا کر دیکھئے تو آپ کو خود معلوم

ہوجائے گا کہ یقیناً مذہب انسان کی ترقی میں حائل ہوا اور اسے حائل ہونا چاہئے تھا۔ کیونکہ مذاہب عالم کی پیدا وار نتیجہ تھا صرف مقامی ونسلی اقتضاء کا اور اس کے ذہن میں تمام نوع انسانی کی فلاح وترقی کا سوال آ ہی نہ سکتا تھا۔ اگر کوئی مذہب ایشیاء سے مغرب میں پیدا ہوا تو اسے مشرق کے باشندوں کا حال معلوم نہ تھا اور اگر مشرق میں اس کا نشوونما ہوا تو وہ اہل مغرب کے حرف سے خالی الذہن تھا۔ صرف ایک مخصوص جماعت، ایک محدود ملک کی اصلاح کا مقصد اُن کے سامنے ہوتا تھا اور اس لئے قدرتاً وہ ایسے اُصول بنا ہی نہ سکتے تھے جو کرۂ ارض کے تمام باشندوں کے لئے اُن کے ماحول، ان کی معاشرت اور اُن کی طبیعت ومزاج کے لحاظ سے مناسب وضروری ہوں — میری مراد مذہب سے یہاں نہ صرف وہ چند معتقدات ہیں جن کا تعلق صرف خدا کی ہستی یا مابعد الطبیعیات سے ہے، بلکہ اس شریعت یا اُصول اخلاق ومعاشرت سے بھی ہے جو ایک مذہب کے ماتحت کسی قوم میں رائج ہوجاتے ہیں اور جن کا اختلاف اُصولی اختلاف قرار دیا جاکر باہمد گر کشت وخون کا باعث ہوا کرتا ہے۔

دُنیا میں سب سے آخری قابل ذکر مذہب ”اسلام“ ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مذاہب کی دُنیا میں آخری نقطہ کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ نہ اپنے معتقدات دینی کے لحاظ سے وہ سب کے لئے قابل قبول ہے اور نہ شریعت کے اعتبار سے وہ مکمل کہا جاسکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دُنیا میں جتنے انبیاء ظاہر ہوئے اُن سب نے یہی کہا کہ وہ نوع انسانی کی اصلاح کے لئے مبعوث ہوئے ہیں، لیکن علاوہ اس سے زیادہ کامیاب نہ ہوئے کہ ایک محدود جماعت و مخصوص ملک میں کچھ زمانہ تک تو بیداری ضرور پیدا رہی لیکن پھر رفتہ رفتہ وہ فنا بھی ہوگئی۔ اس کا سبب صرف یہی تھا کہ زمانہ کی ترقی کا ساتھ کوئی مذہب نہ دے سکا اور انسان کے ذہن وعقل میں جو نشوونما پیدا ہورہا ہے اس کے اقتضاء کو وہ پورا نہ کرسکا۔

مذہب نام نہ صرف خالص اصلاح اخلاق کا ہے اور نہ ترقی تمدن ومعاشرت کا بلکہ اس میں وہ اعتقادات بھی شامل ہیں جو خدا کی ہستی اس کی عبادت اور حیات بعد الموت سے بھی متعلق ہیں، اور اس لئے ایک مذہب صرف ہمارے اصول معاشرت واخلاق منضبط کرنے کا مدعی نہیں ہے بلکہ وہ انسان کو اس بات پر بھی مجبور کرتا ہے کہ خدا اور اس کی ہستی کی نسبت بعض متعین ومخصوص عقائد کو تسلیم کرے۔ یعنی وہ عقل انسانی پر بھی حکمرانی کرنے کا دعویدار ہے درآنحالیکہ عقل انسانی میں جو تدریجی ارتقاء پیدا ہورہا ہے اس کا ساتھ دینے کی اہلیت اس میں نہیں ہے — اور غالباً یہی وہ نکتہ ہے جس کی بناء پر کہا جاتا ہے کہ مذہب میں عقل کو کوئی دخل نہیں ہے۔

ایک طرف ہم کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ مذہب فطری چیز ہے، یعنی عقل انسانی خواہ کتنی ہی ترقی کرجائے، مذہب کے اصول وعقائد متزلزل نہیں ہوسکتے، اور دوسری طرف یہ تاکید بھی ہے کہ مذہب نام ہے بغیر استدلال عقل کے اُن تمام باتوں کو چون وچرا تسلیم کرلینے کا جنکو ہمارے اکابر واسلاف تسلیم کرتے چلے آئے ہیں۔ اور ان دونوں میں جو تضاد وتباین پایا جاتا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ہم ابھی ظاہر کرچکے ہیں کہ مذہب بالکل مقامی وزمانی چیز ہے یعنی ایک مخصوص قوم وملک کے مفاد کو سامنے رکھ کر ...

کیا جاتا ہے، اور اس کا قوی ترین ثبوت یہ ہے کہ دنیا میں ہر مذہب سوائے اپنے دوسرے کو باطل قرار دیتا ہے، یعنی وہ اپنے متبعین میں دوسری اقوام یا دیگر مذاہب والوں سے نفرت کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں عالم کا امن و سکون ہرگز کسی طرح وابستہ نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کے برعکس وہ باہمی اختلاف و تصادم پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔

ہرچند مذہب کی اس حقیقت کا انکشاف کوئی جدید انکشاف نہیں ہے، اور اس سے قبل بھی اس تلخی کا علم لوگوں کو حاصل تھا لیکن چونکہ تمدنی تجارب اس حد تک نہ ہوئی تھی کہ تمام کرۂ ارض کے امن و سکون اور جملہ نوع انسانی کی مرکزیت کی طرف خیال منجر ہوتا اس لئے چنداں پروا بھی نہ کی جاتی تھی، لیکن اب کہ علمی اکتشافات، ذرائع نقل و حمل اور تجارتی و اقتصادی وسعت نے دنیا کے ہر ملک کو دوسرے ملک کا محتاج بنا دیا ہے، سب سے بڑا سوال یہی ہے کہ دنیا کا امن و سکون کیونکر قائم رکھا جائے اور باہمی جذبات مخالفت و منافرت کو دور کر کے کسی طرح تمام نوع انسانی کو ایک شیرازہ سے وابستہ کر دیا جائے۔

یقیناً مذہب اس مقصد کو پورا کر سکتا تھا اگر اس کے عقاید و قانون میں اتنی لچک ہوتی کہ وہ ذہن انسانی کی ترقی کا ساتھ دے سکتا، لیکن چونکہ مذہب نام ہے صرف قدامت پرستی کا اور انھیں اصول پر کاربند رہنے کا جو صدیوں اور ہزاروں سال قبل وضع کئے گئے تھے، اس لئے وہ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں ہو سکتا اور اگر مذہب پر کیا موقوف ہے اس وقت کوئی نظام عمل جو ذہن انسانی کی شورش کو دور کرنے اور دنیا میں عام امن و سکون پیدا کرنے کے قابل نہ ہو، کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اب اسی کے ساتھ ایک اور سوال بھی غور طلب ہے، یعنی یہ کہ اگر آج دنیا سے مذہبیت یکسر فنا ہو جائے اور غیر مذہبیت بالکل مجوز کر دی جائے تو کیا مدعا حاصل ہو جائے گا، اور کیا کرۂ ارض کے تمام باشندے ایک دوسرے کے ساتھ بھائی بن کر رہنے لگیں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یقیناً مدعا اس وقت بھی حاصل نہ ہوگا کیونکہ مذہبیت کے علاوہ دو بلائیں اور نوع انسانی پر نازل ہوتی ہیں، ایک امتیاز رنگ و نسل کی اور دوسری جذبۂ سرمایہ داری کی، یعنی جس طرح مذہب لوگوں میں جذبۂ منافرت کی پرورش کر رہا ہے بالکل اس طرح گورے کالے کے امتیاز اور فراہمی دولت کی حرص نے انسانیت کو پامال کر رکھا ہے، چنانچہ امریکہ میں جو سلوک حبشیوں کے ساتھ ہوتا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں اور سرمایہ داروں کی طرف سے مزدوروں کی محنت و خونریزی کا جو صلہ ملتا ہے وہ بھی دنیا کو معلوم ہے۔ وہ اہل نظر جن کی نگاہ ان تمام مسائل پر ہے، ان میں سے بعض کا خیال یہ ہے کہ رنگ و نسل کا امتیاز بھی مذہب ہی نے پیدا کیا ہے اور سرمایہ داری بھی نتیجہ ہے مذہبیت کا جس نے اخلاق کی آڑ میں سلطنت و حکومت کی بنیادیں قائم کیں۔ اس لئے مذہبیت کے ساتھ ان کو بھی ختم ہو جانا ہے، مگر میں اس سے متفق نہیں ہوں اور ان کو جداگانہ امراض تصور کرتا ہوں جن کا علاج بھی بالکل جداگانہ ہونا چاہئے۔ تاہم اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ جب تک کلیۃً تمام امراض کے دور کرنے کی صورتیں نہ پیدا ہو جائیں، کسی ایک مرض کا بھی مداوا نہ کیا جائے، ہو سکتا ہے کہ ایک کا اندفاع دوسری بیماریوں کا مقابلہ کرنے کی اہلیت ہم میں پیدا کر دے اور اس لئے اگر دنیا سب سے پہلے مذہبیت ہی کو دور کرنا چاہتی ہے تو بیجا نہیں، بلکہ حقیقتاً سب سے زیادہ سخت و سنگین مرض یہی ہے۔

اس کے متعلق دنیا میں فی الحال دو قسم کا خیال رکھنے والے لوگ پائے جاتے ہیں، ایک وہ جو موجودہ مذاہب میں اصلاح کرکے کسی ایک عالمگیر مذہب کی بنیاد ڈالنا چاہتے ہیں اور دوسرے وہ جو سرے سے مذہب کے خیال ہی کو محو کردینا پسند کرتے ہیں۔

ان میں اول الذکر صورت یقیناً بہتر ہے لیکن تقریباً ناممکن العمل، دوسری صورت البتہ زیادہ آسان ہے اور لوگوں کے موجودہ رجحان کو دیکھتے ہوئے یقین کرنا پڑتا ہے کہ چند صدی کے بعد مذہب تو یقیناً ختم ہو ہی جائے گا، گو سرمایہ و عمل کی جنگ اور رنگ و نسل کا امتیاز علی حالہٖ قایم رہے۔

پھر جب آثار یہ ہیں اور حالات کی نزاکت اس حد تک پہونچ گئی ہے تو دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان جو اختلافِ مذہب کے لحاظ سے دُنیا کا حد درجہ بدنصیب ملک ہے، کیا کرنا چاہتا ہے اور اس کے اندر بسنے والوں نے اپنے وطن کو غلامی و ذلت، پستی و نکبت سے نکالنے کی کیا تدبیریں سوچی ہیں۔۔ اس سے یقیناً انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایک ملک کا سب سے بڑا اور سب سے پہلا حق جو اس کے فرزندوں پر عاید ہوتا ہے، یہ ہے کہ وہ اس کو کسی اور کی غلامی میں نہ رہنے دیں، یعنی ایک ملک و قوم کا تنہا طرۂ فخر و امتیاز صرف یہ ہے کہ اس کی گردن جھکی ہوئی نہیں ہے اور اس کی دولت پر دوسروں کا قبضہ نہیں ہے۔ لیکن یہ اسوقت ممکن ہے جب اس کے تمام افراد کسی ایک غرضِ مشترک سے وابستہ ہوں، ایک مرکز پر مجتمع ہوں اور صرف ایک ہی نصب العین کی طرف اُن کے متفق قدم اُٹھتے ہوں۔ پھر کس قدر بدنصیب ہے وہ ملک جس کے فرزند ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں، صرف اسلئے کہ ان میں سے ایک مسجد میں جاکر عبادت کرتا ہے اور دوسرا مندر میں، ایک کے ہاتھ میں تسبیح ہے اور دوسرے کے گلے میں زنار۔

دُنیا میں اور بہت سے ملک ہیں، لیکن اس باب میں ہندوستان سے زیادہ بدبخت کوئی نہیں اور مذہب و مذہبیت کا استعمال جس بُری طرح یہاں کے لوگوں نے کیا ہے، اس کی مثال اسوقت روئے زمین کے کسی حصہ میں نہیں مل سکتی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس طرف توجہ کون کرے۔ پنڈتوں اور مولویوں کی وہ جماعت جس کے وجود نے یہاں کی فضا کو اسقدر گندہ کر رکھا ہے؟ تو کیا ہماری موجودہ نسل کے وہ نوجوان جو مغربی علوم سیکھنے کے بعد اپنے آپ کو روشن خیال اور آزاد طبع کہلانا پسند کرتے ہیں؟

اس کے متعلق اسی اشاعت میں یونیورسٹیوں والا مضمون پڑھکر خود فیصلہ کیجئے کہ اب قسمت آزمائی کی صورت کیا باقی رہگئی ہے۔

عبدالوالی صاحب بی۔ اے اپنی ایک تحریر میں مجھے لکھتے ہیں:۔

"نیاز صاحب، یہ انگریزی تعلیم یافتہ جماعت بہت زیادہ توجہ کے قابل ہے، مذہب اور مولویوں کو چھوڑ کے اس بدمذاق جماعت کی طرف متوجہ ہوجیئے۔ ان کمبختوں کو فخر ہے کہ اُردو سے بے نیاز ہیں، دُنیا میں یہ اکیلی قوم ہے جو ہر چیز جاننے کی دعویدار ہے سوائے اپنی مادری زبان کے۔۔ مذہب تو اپنی موت آپ مر رہا ہے، مرے کو مارنے میں کیا رکھا ہے۔۔ نشانہ بازی تو ان بے حسی اور بدمذاقی کے تودوں پر کیجیے جو اپنے آپ کو یونیورسٹیوں کا تعلیم یافتہ کہتے ہیں اور جو باوجود ذہنی کام کرنے کے اسدرجہ غیر ذہنی زندگی رکھتے ہیں۔۔ بالکل ڈفالیوں کی سی

ان کی حالت ہے کہ عمر بھر گویا بچا یا گھر گاتا نہ آیا ۔۔۔۔۔"

میں اس باب میں عبدالوالی صاحب سے بالکل متفق ہوں اور میری نگاہ سے اس جدید تعلیم یافتہ جماعت کی قابلیت اور صحت دماغی کے ایسی ایسی عجیب مثالیں گزری ہیں کہ اگر ان کا اظہار کروں تو کوئی باور نہ کرے، لیکن ہم کو اگر ان سے کوئی شکایت ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ انھیں قوم کا درد نہیں ہے، ملک کی محبت سے اُن کے سینے خالی ہیں اور علم کی صحیح روشنی سے اُن کے قلب معمور نہیں، لیکن قائدین مذہب تو ملک و قوم کے دشمن ہیں، انسانیت و اخلاق کے ابوجہل ہیں اور اپنی پیٹ کی دوزخ میں ملک و ملت سب کچھ جھونک دینا چاہتے ہیں۔

آج اگر نوجوانوں کی تعلیم یافتہ جماعت اصلاح قوم کا جذبہ لیکر آمادۂ کار ہو بھی جائیں تو سب سے پہلے انھیں وہی کام کرنا پڑیگا جو میں کر رہا ہوں، کیونکہ جب تک آپ راہ سے سنگ گراں کو نہ ہٹا دیں راستہ کیونکر طے ہو سکتا ہے۔

اصلاح خواص سے شروع ہوتی ہے یا عوام سے، یہ مختلف فیہ مسئلہ ہے، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ جب تک عوام میں بیداری پیدا نہ ہو اور پبلک کی اصلاح نہ ہو ہیئت اجتماعی کی تشکیل دشوار ہے۔ پھر غور کیجئے کہ عوام کا کیا حال ہے اور ان پر کس کا اثر غالب ہے؛ اگر ہندوستان کی تمام یونیورسیٹیوں کے طلبہ جدید تہذیب و ترقی کے تمام نظریوں سے آراستہ ہو کر اصلاحِ ملک کے لئے آمادہ ہو جائیں، تو بھی مولوی کے اُس ایک سوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو وہ ملک کی جاہل آبادی پر کسی واقعۂ معجزہ و کرامت کی صورت میں پڑھکر پھونک دے گا۔ عوام کی اس کورانہ ذہنیت کا بدل دینا جو صدیوں سے نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی چلی آرہی ہے آسان کام نہیں۔ اس کے لئے یا تو اپنی حکومت ہونی چاہئے جو بزورِ شمشیر اس تمام فاسد مواد کو دور کر دے، جیسا کہ ترکی میں مصطفےٰ کمال یا ایران میں رضا شاہ پہلوی نے کیا، یا پھر تعلیم اتنی عام اور صحیح ہونی چاہئے کہ پبلک خود دوست و دشمن میں تمیز کر سکے جو یقیناً صدیوں کا کام ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اصلاح کے سلسلہ میں تعمیری اور تخریبی دونوں پہلو سامنے آتے ہیں اور عام طور پر تعمیری پروگرام بنانا ہی زیادہ پسند کیا جاتا ہے، حالانکہ اُصولاً سب سے پہلے تخریبی فرائض سے سبکدوش ہونا ضروری ہے۔

اگر کوئی عمارت اس حد تک شکستہ و خراب ہو جائے کہ معمولی مرمت اس کے لئے کافی نہ ہو، تو اس کا گرا دینا ضروری ہے اور جب تک اس کو پہلے زمین کے برابر نہ کر دیا جائے اس پر دوسری عمارت قائم نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کی تنظیمی حالت کا بھی بالکل یہی حال ہے کہ اس کے اصلاح کیلئے فی الحال تعمیری پروگرام پیش کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا جب تک پہلے اس سبب کو نہ محو کر دیا جائے جس نے اس کی بنیاد کو متزلزل کر رکھا ہے اور یہ سبب مذہبیت کا وہ غلط مفہوم ہے جسے مولویوں اور پنڈتوں نے پیدا کیا اور جو ان کے فنا ہونے کے بعد ہی دور ہو سکتا ہے۔

دُنیا میں جسمانی غلامی کو بہت بُرا سمجھا جاتا ہے، درآنحالیکہ جسمانی غلامی نتیجہ ہے، ذہنی غلامی کا اس لئے ضرورت تو سب سے پہلے ذہنی غلامی کو دور کرنے کی ہے اور غالباً اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مذہبی عصبیت سے زیادہ ذہنی غلامی پیدا کرنیوالی

کوئی تعبیر نہیں۔

اس وقت زمانہ میں علم و عقل کا ایک طوفان برپا ہے، مادی ترقی کا سیلاب موجیں مارتا چلا آرہا ہے اور اس لئے اب اگر کوئی بات منھ سے نکلنے کی ہے تو صرف یہ کہ "مرغابی شو کہ کار با طوفان ست"۔

پھر اگر دنیا کا کوئی مذہب ایسا ہے جو ہماری نجات کا ذمہ دار ہو سکتا ہے تو سامنے آئے اور ہمیں اپنی دوش پر بٹھا کر ساحل تک پہونچا دے، ورنہ خس و خاشاک کی طرح اس کا بہہ جانا بھی یقینی ہے، خواہ وہ آج ہو یا کل

---

اسی ماہ کی اشاعت میں کسی جگہ آپ کو نیجر کا اعلان نظر آئے گا کہ "مجموعۂ استفسار و جواب" چھپ کر طیار ہو گیا ہے۔ وہ حضرات جو "نگار" کا مطالعہ ابتدا سے کر رہے ہیں، اُن سے یہ امر مخفی نہ ہوگا کہ اسوقت تک کتنے اہم مسائل پر بسلسلۂ استفسارات بحث ہو چکی ہے اور جو حال کے خریدار ہیں وہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ اس سے قبل کیا کچھ نہ اس سلسلہ میں لکھا گیا ہوگا پہلے سنہ۲۲ء سے اس وقت تک کے تمام استفسار و جواب کو یکجا شائع کرنے کا ارادہ تھا، لیکن کتابت کے بعد معلوم ہوا کہ حجم ۱۵۰۰ صفحات سے زاید ہو جائے گا اور اس لئے اس کے تین حصے کر دینا مناسب ہے، چنانچہ پہلا حصہ جس میں مختلف علمی، ادبی، مذہبی و تاریخی مباحث پر گفتگو کی گئی ہے، ۲۱۰ صفحات پر شایع کیا گیا ہے، اس کی قیمت مع محصول ؏ مقرر کی گئی ہے لیکن خریداران نگار کے لئے ایک روپیہ کی رعایت ملحوظ رہے گی۔ جن حضرات نے پیشگی قیمت بھیجدی تھی ان کی خدمت میں مجموعہ روانہ کیا جا رہا ہے۔

مجھے امید ہے کہ یہ مجموعہ نہ صرف تمام خریداران نگار کے لائبریریوں میں پایا جائے گا بلکہ وہ اپنے احباب کو بھی اسکی اہمیت پر روشنی ڈالکر خریداری کی طرف مائل کریں گے۔ اگر نگار کی اعانت آپ کے نزدیک ضروری ہے تو امداد کی بہترین صورت یہی ہے کہ اس کی مطبوعات کو خود بھی خریدیں اور اپنے حلقۂ تعارف میں بھی مقبول بنانے کی کوشش کریں۔ یہ معاملہ نہ گدائی کا ہے نہ احسان کا بلکہ ایک سودا ہے جس میں آپ ایک چیز خریدتے ہیں اور میں فروخت کرتا ہوں، پھر اگر آپ ؏ خرچ کر کے کوئی ایسی چیز حاصل کر رہے ہیں جو ہمیشہ آپ کے کام آنے والی ہے تو کیا یہ سودا آپ کے نزدیک بُرا ہے۔

---

جنوری سنہ۴۴ء کے رسالہ کے لئے جن حضرات نے لکھنے کا وعدہ فرمایا ہے یا جو اصحاب لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں اُن کی خدمت میں التماس ہے کہ جسقدر جلد اُن کا مضمون موصول ہوگا اتنی ہی آسانی ترتیب میں ہوگی، اور اتنی ہی بہتر جگہ انکے مقالہ کو مل سکیگی۔

---

## تذکرۂ معرکۂ سخن

اردو زبان میں اپنی نوعیت کا پہلا تذکرہ نگار سائز کے ۲۹۰ صفحات پر شایع ہو گیا۔ مفصل اشتہار صفحہ ۹ پر ملاحظہ فرمایئے۔ قیمت ؏ منیجر نگار

---

# زندگی کی عجیب و غریب داستان

کرۂ زمین جس پر انسان آباد ہے ایسا حقیر و ذلیل کرہ ہے کہ اس وقت تک گنتی کے صرف چند ایسے سیارے دریافت ہوئے ہیں جو ہماری زمین سے چھوٹے ہیں، ورنہ باقی سب اس کے مقابلہ میں اتنے بڑے ہیں کہ اگر لاکھوں زمینیں ان کے اندر ڈال دی جائیں تو بھی جگہ خالی رہے، اور بعض تو اتنے بڑے ہیں کہ کروڑ اندر کروڑ زمینیں بھی ان کا خلا پُر کرنے کے لئے کافی نہ ہوں

اگر کوئی سوال کرے کہ اس بسیط فضا میں کتنے ستارے پائے جاتے ہیں تو اس کا جواب وہی شخص دے سکتا ہے جو تمام دنیا کے ریگزاروں میں ذرات ریگ کا شمار کر سکے ـــــــ یہ ہے کائنات کی عظمت اور یہ ہے ہمارے کرۂ ارض کی حقیقت اس کے مقابلہ میں

فضا میں جتنے تارے پائے جاتے ہیں ان میں سے بعض نے تو جھنڈ کی صورت اختیار کر لی ہے اور اکثر ایسے ہیں جو تنہا چکر لگا رہے ہیں، لیکن باوجود ستاروں کی اتنی کثرت کے فضا کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ ان کا ایک دوسرے سے متصادم ہو جانے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے اور ہر ایک دوسرے سے اتنی دُور واقع ہے کہ ہم اس بعد کا اندازہ کر ہی نہیں سکتے۔ اگر فضا کو آپ سمندر قرار دیں اور تاروں کو جہاز تو یوں سمجھئے کہ ان میں سے ہر جہاز اس طرح سفر کر رہا ہے کہ اس سے قریب ترین جہاز بھی لاکھوں میل کے فاصلہ سے کم نہیں ہے، اور ایک کا دوسرے کی حدِ کشش میں آ جانا مستبعد ہے۔ لیکن اگر ایسا کبھی ہو جائے تو کیا ہو؟

کہا جاتا ہے کہ اب سے اربوں سال قبل ایک سیارہ، فضا میں آوارہ پھرتا ہوا ہمارے آفتاب کے قریب آگیا اور اس سے آفتاب کے مادہ میں بالکل ایسا ہی تلاطم پیدا ہوا جس طرح چاند اور سورج کی کشش سے زمین کے سمندر میں مد و جزر کی کیفیت پیدا ہوتی ہے،

پھر ظاہر ہے کہ یہ زمین کے سمندروں کا تلاطم نہ تھا بلکہ آفتاب ایسے عظیم الشان کرہ کے مادہ کا ہیجان تھا جو جا بجا عظیم الشان پہاڑوں کی صورت میں ابھرنا شروع ہوا اور جب وہ سیارہ زیادہ قریب آگیا تو کشش کی زیادتی

سے آفتاب کے متلاطم بادلوں کے اجزا اس سے جدا ہو کر فضا میں چاروں طرف پھیل گئے اور گردش کرنے لگے، جو نظام شمسی کے سیارے کہلاتے ہیں اور جن میں سے ایک ہمارا کرۂ زمین بھی ہے

آفتاب اور دیگر سیارے جو ہمیں نظر آتے ہیں سخت گرم ہیں، اتنے گرم کہ ان میں کوئی ذی حیات زندہ نہیں رہ سکتا اور نہ کوئی جاندار چیز پیدا ہو سکتی ہے، اسی لئے سطح آفتاب کے جو اجزا اس سے علیحدہ ہو کر گردش میں آ گئے تھے وہ بھی حد درجہ گرم تھے، لیکن رفتہ رفتہ وہ سرد ہونے لگے، یہاں تک کہ ان میں سے ایک (گو یہ نہیں معلوم کہ کب اور کیونکر ہوا) اس قابل ہو گیا کہ اس میں آثار حیات پیدا ہوں۔ ہر چند ہم یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتے لیکن گمان غالب یہی ہے کہ انسان کا وجود بھی انھیں آثار میں سے بعض کا نتیجہ ہے، جو ایک خوردبینی ذرۂ ریگ پر کھڑا ہوا کائنات کے بسط اور فضا کی لامحدود وسعت کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے اور خوف سے کانپ اٹھتا ہے

یقیناً اس پر خوف کی کیفیت طاری ہونا چاہئے کیونکہ جس وقت وہ زمانہ کی ازلیت پر نگاہ ڈالتا ہے تو تاریخ انسانی کا تمام عہد اسے پلک مارنے سے زیادہ وسیع نظر نہیں آتا، اور کائنات میں اس کو اپنے کرہ کی اہمیت اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم ہوتی جیسے ریگزار عالم میں کسی ذرۂ ریگ کا لاکھواں حصہ ــــــ علاوہ اس کے جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ نظام عالم کو نہ اس کی زندگی کی پرواہ ہے، نہ اس کے جذبات کی پاسداری بلکہ ایک حد تک بے پروائی و دشمنی ہے تو اس کا خوف اور زیادہ بڑھ جاتا ہے

اس وسیع فضا کا اکثر حصہ اتنا سرد ہے کہ اس میں کسی کی زندگی قائم نہیں رہ سکتی اور مادہ کا اکثر حصہ اتنا گرم ہے کہ حیات کا بقا اس میں محال ہے، رات دن مہلک و مضرت رساں شعاعوں کے حملے ہوتے رہتے ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ کس وقت کس طرح نوع انسانی ختم ہو جائے

یہ ہے وہ کائنات جس کے اندر ہم ہو پڑے ہیں اور اگر یہ غلطی نہیں تھی تو اس کو سوائے اتفاق کے اور کیا کہہ سکتے ہیں

ہکسلے نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر چھ بندر ٹائپ رائٹر پر بٹھا دیئے جائیں اور وہ لاکھوں سال تک اس پر اپنی انگلیاں چلاتے رہیں تو یقیناً کہیں نہ کہیں شیکسپیر کی کوئی نظم ٹائپ کی ہوئی مل جائے گی۔ بالکل یہی حال فضا کے اندر گرداں ستاروں کا سمجھئے کہ وقت نامعلوم سے دوران گردش میں معلوم نہیں کن کن حوادث سے دوچار ہوتے چلے آئے ہیں اور اتفاق سے ان میں سے بعض کسی مرتب نظام سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ لیکن جاندار چیزیں پیدا کرنے کی صلاحیت بہت کم ستاروں میں ہے کیونکہ اس کے لئے ایک خاص معتدل درجۂ حرارت کی ضرورت ہے اور وہاں یہ عالم ہے کہ بعض سیارے بالکل آگ ہی آگ ہیں اور بعض برف ہی برف ــــــ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ کائنات حقیقتاً جاندار پیدا کرنے کے لئے وجود میں نہیں آئی تھی ورنہ شروع ہی سے اس کی حرارت میں درجۂ اعتدال پیدا کیا جاتا اور اگر

کرۂ زمین میں یہ صلاحیت پیدا ہو گئی تو اس کو محض اتفاق سمجھنا چاہیئے نہ کہ مقصودِ آفرینش

ہم کو نہیں معلوم کہ صرف مناسب مادی حالات جاندار پیدا کرنے کے لئے کافی ہیں یا نہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ کرۂ زمین چونکہ آہستہ آہستہ سرد ہو رہا تھا اس لئے قدرتاً اس میں جاندار پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا ہونی چاہیئے تھی، بعض کہتے ہیں کہ جب زمین کسی ایک حادثہ یا اتفاق سے وجود میں آئی تھی تو لازم تھا کہ کوئی دوسرا اتفاق ایسا بھی پیدا ہوتا جو جاندار اشیاء کو وجود میں لاتا۔ کیونکہ وہ مادی اجزاء جو حیات کے لئے ضروری ہیں نہایت معمولی کیمیاوی اجزا ہیں (مثلاً کاربن جو کوئلے میں پایا جاتا ہے۔ یا ہائیڈروجن و آکسیجن جو پانی میں موجود ہے یا نائٹروجن جس سے فضا معمور ہے) اور یہ سب اجزاء کرۂ زمین میں پائے جاتے تھے، جن کے باہم ملنے جلنے سے اتفاقاً جاندار خلایا وجود میں آ گئے

لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی جاندار خلایا کا پیکر ہونا انھیں کیمیاوی اجزاء کے اختلاط و امتزاج کا نتیجہ ہے اور کیا کوئی ماہر علم الکیمیا انھیں اجزاء سے کوئی جاندار چیز پیدا کر سکتا ہے، اس کا جواب اس وقت تک نہیں دیا جا سکا

کہا جاتا ہے کہ ہائیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن اور کاربن کے اجزاء باہم مل کر کروڑوں کی تعداد میں قالب (Molecules) پیدا کرتے ہیں اور ان سے جاندار اشیاء وجود میں آتی ہیں

ایک صدی قبل تک عام طور پر یہ یقین کیا جاتا تھا کہ ان اجزاء میں زندگی قبول کرنے کی صلاحیت کسی اور قوت سے پیدا ہوتی ہے جس کا علم اب تک حاصل نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن اب علماء کا رجحان اس طرف ہے کہ کوئی اور قوت کام نہیں کرتی، بلکہ انھیں عناصر کے امتزاج سے یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے، جس میں بڑا حصہ کاربن کا ہے تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کاربن کا ہر ذرہ مرکب ہے ایک مرکزی حصہ سے جسے نواۃ (Nucleus) کہتے ہیں اور چھ برقپاروں (Electrons) سے جو اس مرکزی حصہ کے چاروں طرف گردش کرتے رہتے ہیں، گویا کاربن ہی اصل چیز ہے جس سے حیات پیدا ہوتی ہے ——— ماہرین علم الکیمیا کا خیال ہے کہ مقناطیسیت کی طرح حیات بھی بالکل خود رَو چیز ہے جس کو صرف اتفاق کا نتیجہ کہنا چاہیئے

بہر حال وہ کاربن کی مدد سے انسان پیدا ہوا ہو یا کسی اور سبب سے، یہ یقینی ہے کہ اس کے بقا کے لئے مناسب روشنی اور گرمی لازم ہے اور اگر کسی وقت کرۂ ارض کا وہ درجۂ حرارت جو بقاء حیات کے لئے ضروری ہے مفقود ہو گیا تو ہمارا فنا ہو جانا یقینی ہے خواہ وہ حرارت کے بڑھ جانے سے ہو یا اس کے مفقود ہو جانے سے

جس طرح عہدِ قدیم کا انسان جو زمین کے منطقۂ معتدلہ میں آباد تھا، برف کی بڑی بڑی چٹانوں کو اپنی وادی کے اندر آتے ہوئے دیکھ کر گھبراتا تھا۔ کہ کسی دن وہ برودت کی زیادتی سے ہلاک نہ ہو جائے، بالکل اسی طرح

آج کے انسان کو بھی ڈرنا چاہئے کیونکہ جو اسباب اندیشہ کے اس وقت پائے جاتے تھے، اب بھی پائے جاتے ہیں بلکہ جوں جوں زمانہ زیادہ گزرتا جاتا ہے۔ یہ اسباب بھی زیادہ قوی ہوتے جاتے ہیں

زمین کو جتنی حرارت پہونچ رہی ہے وہ سب آفتاب کے طفیل میں ہے اس لئے ظاہر ہے کہ جب تک آفتاب اس خدمت کو انجام دے رہا ہے کرۂ ارض پر حیات بھی باقی ہے اور جس دن اس نے اس خدمت کو ترک کر دیا سب جاندار ہلاک ہو جائیں گے

پھر چونکہ آفتاب بھی ایک سیارہ ہے جو روز بروز اپنی حرارت کو کھوتا جا رہا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ اسی نسبت سے زمین کو بھی کم گرمی پہونچے گی اور وہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے آفتاب سے قریب تر ہوتی جائے گی پھر اگر یہ اس قدر قریب ہو گئی کہ آفتاب نے اسے دفعتہً اپنے اندر کھینچ لیا تو گرمی کی شدت سے حیات فنا ہو جائے گی اور اگر کسی خاص حد تک پہونچ کر قائم ہو گئی تو پھر جوں جوں آفتاب سرد ہوتا جائے گا، یہ بھی فنا سے قریب تر ہوتی جائے گی

بعض کا خیال یہ ہے کہ قانون حرکت کی رُو سے زمین آفتاب سے اور زیادہ دُور ہوتی جا رہی ہے، اگر اس کو صحیح مان لیں تو بھی نتیجہ وہی نکلتا ہے؛ کیونکہ اس صورت میں بُعد بڑھنے کی وجہ سے آفتاب کی حرارت اور کم پہونچے گی، یہاں تک کہ ایک دن برودت نقطۂ انجماد تک پہونچ جائے گی اور آثارِ حیات بالکل مفقود ہو جائیں گے۔ یہ تو اس صورت میں ہے جب یہ سارا نظامِ گردش اسی طرح بغیر کسی خلل کے جاری ہے، لیکن اگر اتفاق سے اسی دَوران میں کسی اور سیارہ سے تصادم ہو گیا تو پھر اور جلد خاتمہ ہو جائے گا، بہر حال آپ جو صورت صحیح تصور کریں اور جو واقعات و حوادث پیش آئیں، ان سب کا نتیجہ وہی ایک ہے یعنی یہ کہ کسی نہ کسی دن فنا ہونا ہے

پھر غور کرنے کی بات ہے کہ کیا زندگی کی ساری داستان اس سے زیادہ نہیں ہے، کہ پیدا تو ہوئے ہم غلطی یا اتفاق سے اور ہلاک کئے جاتے ہیں ایک ایسے منظم قانون سے جس کا توڑ کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ افسوس ہے کہ فلکیات کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں، ممکن ہے طبیعیات اس معمہ کو حل کر سکے

# خُدا کی جستجو میں ایک زنگی لڑکی کے تجربات

یہ عنوان ہے برنارڈ شا کی اس کتاب کا جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے اور جس نے دنیا کے مذاہب میں ہلچل ڈال دی ہے۔ یہ کتاب برنارڈ شا نے ۱۹۳۲ء میں اس وقت لکھی جب وہ کینیا میں مقیم تھا اور اپنے محبوب مشغلہ ڈرامہ نگاری سے ہٹ کر کوئی تصنیف کرنا چاہتا تھا

قصہ اس طرح سے شروع ہوتا ہے کہ ایک حبشی لڑکی بپتسمہ لینے کے بعد مشنری عورت سے سوال کرتی ہے کہ " خدا کہاں ہے ؟ جواب دیا جاتا ہے کہ " اوس کی جستجو کرو مل جائے گا " اس مشنری خاتون کی حالات مجملاً یہ ہیں کہ وہ تیس سال کی گورا رنگ رکھنے والی عورت تھی۔ اور انگلستان میں نجات روح کا حصول دشوار جان کر افریقہ آگئی تھی تاکہ یہاں کے حبشیوں کو تعلیمات مسیح کی طرف مائل کرے۔ وہ فطرتاً بہت عاشق مزاج واقع ہوئی تھی، دَوران تعلیم میں اس نے اپنے اساتذہ سے محبت کی اور کالج سے نکل کر تقریباً ۶، ۷ راہبوں سے لیکن آخر کار وہ ہر جگہ ناکام رہی اور محبت کے انجام کو اس درجہ تلخ دیکھ کر وہ مذہبی تسکین کی جستجو میں افریقہ آگئی اور اسی دَوران تبلیغ وہدایت میں ایک حبشی نوجوان لڑکی اسے مل گئی جو خدا کی جستجو کرنا چاہتی تھی

مشنری خاتون سے ملنے کے بعد وہ لڑکی اسی جستجو میں باہر نکلی تو جنگل میں سب سے پہلے اس کو ایک سانپ نظر آیا۔ یہ سانپ ایک راہب کا پالا ہوا تھا۔ لڑکی نے اس کو دیکھ کر اپنا ڈنڈا سنبھالا اور بولی کہ " تجھے کس نے پیدا کیا ہے اور کس مصلحت سے تیرے اندر زہر رکھ کر نوع انسانی کی ہلاکت کا ذریعہ تجھے بنایا " سانپ نے یہ سنکر اوس کو ایک طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ اس نے دیکھا کہ چٹانوں پر ایک ہیبت ناک صورت کا مرد ضعیف الجھی ہوئی داڑھی لئے بیٹھا ہے جس نے پہلے سانپ کو ہلاک کیا اور پھر لڑکی کی طرف مخاطب ہوا۔ لڑکی نے اوس سے کہا کہ " میں خدا کی تلاش میں ہوں " اوس نے جواب دیا " تم کو خدا مل گیا ہے، فوراً جھک کر میری پرستش

گر ورنہ میرا قہر بے پناہ ہے۔ میں ہی بہشت و دوزخ اور جملہ اشیا کا پیدا کرنے والا ہوں اور میرے ہی ہاتھ بیماریاں اور تباہیاں ہیں۔ فوراً مجھے سجدہ کر اور آیندہ جب تو آئے تو اپنے بچے کو قربانی کے لئے لا کیونکہ مجکو تازہ خون کی خوشبو بہت مرغوب ہے"

لڑکی نے کہا " میں کنواری ہوں میرے کوئی اولاد نہیں ہے"

مرد ضعیف نے کہا کہ " اپنے باپ کو ڈھونڈھو لا وہ مجکو قتل کرے گا اور اپنے رشتہ داروں سے کہہ کہ وہ بہت سی بھیڑیں میری بھوک کو تسکین ہو بچانے کے لئے لائیں ورنہ میں سخت وبا پھیلا دوں گا تاکہ لوگ سمجھیں کہ میں خدا ہوں"

یہ سُنکر لڑکی کو غصہ آتا ہے اور وہ اپنا ڈنڈا سنبھالتی ہوئی وہاں سے چلی جاتی ہے

آگے چل کر اسے ایک اور سانپ ملا جس کی دُم کے حلقے چلنے میں بجتے تھے۔ لڑکی نے اوس سے کہا کہ " تو اس سانپ کی طرح خطرناک تو نہیں جو مجھے ابھی ملا تھا، تو پہلے سے لوگوں کو بتا دیتا ہے کہ تو آرہا ہے اور اس لئے غالباً تیرا خدا بھی بہتر ہوگا، مجھے بتا وہ کہاں ہے"

یہ سُن کر سانپ سر کے اشارہ سے لڑکی کو ایک طرف لے گیا۔ لڑکی نے وادی میں ایک بوڑھے شخص کو دیکھا جس کی داڑھی چاندی سے زیادہ سفید تھی، اوس کے سامنے میز پر بہت سی نظموں کے مسودے بکھرے ہوئے تھے وہ بہت مہربان معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اوس کی چڑھی ہوئی مونچھیں اور اُبھری ہوئی بھویں خود پسندی کا اظہار کر رہی تھیں جس کو حبشی لڑکی نے پسند نہیں کیا۔ اوس نے لڑکی سے کہا کہ

" تم خوف نہ کرو، میں ظالم خدا نہیں ہوں۔ اور مجھ میں سوائے اس کے کوئی عیب نہیں کہ بحث بہت کرتا ہوں میری پرستش نہ کرو۔ مجکو گالیاں دو۔ میرے نقائص تلاش کرو۔ تاکہ مجھے بحث کا موقعہ ملے"

لڑکی نے پوچھا " کیا تمھیں نے دنیا پیدا کی ہے"

اس نے کہا " ہاں میں نے ہی پیدا کی ہے"

لڑکی " اگر دنیا تم نے پیدا کی ہے تو اس کو اتنی برائیوں سے کیوں بھر دیا

—— شاباش! میں چاہتا تھا کہ تو یہی سوال مجھ سے کرے، تو بہت ذہین لڑکی ہے! عرصہ ہوا میرا ایک بندہ ایوب نامی تھا وہ بھی مجھ سے اسی قسم کی بحثیں کیا کرتا تھا۔ جس کو میں نے سخت اذیتوں میں مبتلا کیا۔ اس کی بیوی مجکو ہمیشہ کوسا کرتی تھی"

لڑکی نے کہا " میں تم سے بحث کرنے نہیں آئی ہوں۔ میں تو یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ تم نے اگر دنیا کو بنایا تو اتنا خراب کیوں بنایا"

—— خوب! تو مجھ سے محاسبہ کرنے آئی ہے! تو کون ہے جو میری تخلیق پر نکتہ چینی کرتی ہے۔ کیا تو اس سے بہتر

بنا سکتی ہے؟ سب نہیں تو اس کا چھوٹا ہی سا حصہ بنا دے۔ ایک وہیل مچھلی ہی بنا کر دکھا دے، کیا تو نہیں جانتی۔ کہ میں نے اگر وہیل کو بنایا ہے تو اوس کے تیرنے کے لئے سمندر بھی بنایا ہے۔ تیرے خیال میں کیا یہ معمولی بات ہے "

لڑکی نے کہا "یہ تو کوئی دلیل نہیں ہے، افسوس ہے تمھیں یہی نہیں معلوم کہ دلیل کسے کہتے ہیں "

—— "میں دلیل نہیں جانتا! جا! میں وہ ہوں جس نے ایوب کو ختم کر دیا۔ مجھکو تیری حماقت پر ہنسی آتی ہے "

—— "مجھے تمھاری ہنسی کی پرواہ نہیں، ہنستے جاؤ۔ لیکن یہ جانتی ہوں کہ تم اس کی کوئی وجہ نہ بتا سکے کہ تم نے دنیا کو اچھا کیوں نہ بنایا۔ یہ بھی کوئی جواب ہے کہ اس سے بہتر دنیا بنانے کا معاوضہ مجھ سے کرتے ہو —— میں پوچھتی ہوں کہ تم نے سانپ کے منھ میں زہر کیوں رکھ دیا۔ جب کہ وہ بغیر اس کے بھی زندہ رہ سکتا تھا۔ گدھوں کو تم نے اسقدر بدشکل اور چڑیوں کو اس قدر خوبصورت کیوں بنایا؟ ایسا خدا جو میرے سوالات کا جواب نہیں دے سکتا میرے لئے بیکار ہے "

یہ کہکر لڑکی نے اپنا ڈنڈا سنبھالا اور وہاں سے چل دی۔ —— وہ اپنے خیالات میں چلی جا رہی تھی کہ ایک خوبصورت یونانی جوان اُسے نظر آیا۔ لڑکی نے اس کو دیکھتے ہی کہا۔ "میں خدا کی تلاش میں ہوں کیا تم میری رہنمائی کر سکتے ہو "

اس نے جواب دیا "اس کی مذمت کرو۔ دنیا کو اُسی طرح سے دیکھو جیسی وہ نظر آتی ہے۔ کیونکہ اس کے ماورا کچھ نہیں ہے۔ تمام راہیں قبر پر جا کر ختم ہو جاتی ہیں۔ جو عدم محض کا دروازہ ہے۔ میری نصیحت پر عمل کرو اور اپنی ناک کی نوک سے زیادہ اپنی جستجو کو وسیع نہ کرو، تم ہمیشہ اسی مغالطہ میں مبتلا رہو گی کہ ماورا بھی کچھ ہے "

لڑکی نے کہا۔ "میرا نصب العین اس سے زیادہ ہے لیکن اپنی آنکھ بند نہیں کر سکتی، میں تو صرف خدا کی جستجو کرتی ہوں۔ اور وہی میری راحت ہے میرا سکون ہے!

—— "اچھا اگر تم کو یہ معلوم ہو جائے کہ خدا نہیں ہے تو پھر ——"

—— "اگر مجھ اس کا یقین ہو گیا کہ خدا نہیں ہے تو میں ایک بڑی عورت ثابت ہوں گی "

جب لڑکی کو یہاں بھی تسلی نہ ہوئی تو آگے بڑھی اور ایک عجیب قسم کا انسان اوس کو نظر آیا جو سیاہ فام تھا۔ اور چہرہ پر اداس۔ چہرہ پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں لیکن ان جھریوں سے مہربانی اور رحم کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ چیخ رہا تھا۔ جب اوس نے لڑکی کو دیکھا تو چیخنا بند کر دیا۔

لڑکی نے پوچھا "کیا آپ ہی وہ برہنہ پیغمبر ہیں جو حیوانوں کی طرح چلاتے ہیں اور اُلو کی طرح رویا کرتے ہیں "

اس نے جواب دیا۔ "ہاں، ایک حد تک میں بھی کیا کرتا ہوں، تو کیا چاہتی ہے"
——— "میں خدا کی تلاش میں ہوں"
——— کیا وہ تجکو مل گیا ؟
——— "مجکو ایک بڈھا ملا جو چاہتا تھا کہ میں جانور بھون کر اوس کو کھلایا کروں کیونکہ اوس کو یہ خوشبو بہت پسند ہے۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ میں اپنے بچوں کو اوس کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھاؤں"
——— "وہ جھوٹا ہے، فریبی ہے۔ خدا کو ان چیزوں کی کیا ضرورت ہے ——— وہ تو تمھاری روح کی بندگی سے خوش ہوتا ہے۔ وہ تو تمھاری روح کو چاہتا ہے۔ وہ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ تم انصاف کرو محبت کرو اور عجز و انکسار کی راہ چلو"
——— "یہ تیسرا خدا ملا - یہ قربانی والے خدا اور بحث کرنے والے خدا دونوں سے بہتر ہے۔ لیکن محبت اور انصاف تو دنیا کا حقیر ترین حصہ ہے۔ اور عجز و انکسار سے چلنا بیکار ہے جب ہمکو یہی معلوم نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں"
——— "انکسار سے چلو خدا تمھاری رہنمائی کرے گا"
——— "اُس نے مجکو آنکھیں دی ہیں وہ میری ہدایت کرتی ہیں اوس نے مجکو دل و دماغ عطا کیا ہے۔ اور میں اوس کو استعمال کرتی ہوں ——— بڈھے نے ایک چیخ ماری اور لڑکی بدحواس وہاں سے بھاگی۔ کچھ دُور آگے دیکھا ایک ضعیف شخص لکڑی کے کھردرے لٹھے پر بیٹھا ہوا ہے۔
اس نے کہا۔ "تمھارا ڈر اور تمھاری اُمیدیں سب واہمہ کا نتیجہ ہیں۔ ۲۰ سال سے میں اسی مسئلہ پر تحقیقات کر رہا ہوں۔ اور ہزارہا کتوں کا دماغ نکال کر تجربہ کر چکا ہوں، آج تمام علمی دنیا میرے قدموں کے نیچے ہے اور اس عجیب و غریب تحقیقات کے لئے میری عزت کر رہی ہے"
لڑکی ——— "تم نے مجھ سے کیوں نہ پوچھ لیا۔ میں بجائے ۲۰ سال کے صرف ۲۰ سکنڈ میں یہ مسئلہ حل کر دیتی اور ہزارہا کتوں کی جان بھی بچ جاتی"
——— "یہ واقعہ تو سب کو معلوم ہے لیکن علمی نقطۂ نظر سے اس کا تجربہ نہ کیا گیا تھا۔ کیا تو نے بھی کوئی تجربہ کبھی کیا ہے ؟
——— "بہتیرے، اچھا میں ایک تجربہ ابھی کرتی ہوں۔ کیا تم کو علم ہے کہ تم کس چیز پر بیٹھے ہوئے ہو ؟
——— "میں ایک لٹھے پر بیٹھا ہوں"
——— "بالکل غلط، تم ایک سوئے ہوئے گھڑیال کی پیٹھ پر بیٹھے ہو"
یہ سنتے ہی وہ فلسفی گھبرا کر بھاگا اور بلی کی طرح ایک درخت پر چڑھ گیا

لڑکی نے کہا۔ " نیچے آؤ۔ تم کو جاننا چاہیے کہ گھڑیال تو ہمیشہ دریا کے قریب پائے جاتے ہیں۔ میں تو محض ایک تجربہ کر رہی تھی "

وہ بولا " میں نیچے کیسے آؤں۔ اگر گرونگا تو گردن ٹوٹ جائے گی "

———" تم اوپر کیسے گئے تھے ؟ "

———" مجکو نہیں معلوم۔ معجزہ پر ایمان لانے کے لئے یہ واقعہ کافی ہے۔ میں کبھی بھی درخت پر چڑھ نہیں سکتا تھا۔ اور اب میں اوپر سے نیچے نہیں اتر سکتا "

———" واقعی بڑا دلچسپ منظر ہے "

———" تو بڑی ظالم ہے۔ تو نے مجھے مار ہی ڈالا ہوتا "

———" اگر تم کسی ہنگے کا نصف حصہ کاٹ کر اوس کے قلب کو متحرک رکھ سکتے ہو تو تم کو کوئی فکر نہ کرنا چاہئے لیکن میں افریقہ کے جادو کو تمھارے تجربات سے زیادہ با اثر سمجھتی ہوں میرے ایک لفظ سے تم بلی کی طرح درخت پر چڑھ گئے۔ کیا تم اس معجزہ پر ایمان لائے ؟

———" کاش کہ تم دوبارہ کوئی ایسا ہی معجزہ پیش کرو۔ تاکہ میں درخت سے نیچے اتر سکوں "

———" وہ، دیکھو ایک سانپ تمھاری گردن کے قریب بیٹھا ہوا ہے "

یہ سنتے ہی فلسفی گھبرا کر درخت سے نیچے اتر آیا۔ اور پھر دونوں میں باہم گفتگو ہونے لگی، آخر کار جب وہ جانے لگا تو لڑکی نے کہا کہ " قبل اس کے تم جاؤ یہ بتلا دو کہ تم خدا کے وجود کے قائل ہو یا نہیں ؟ "

اس نے جواب دیا " خدا ایک فضول اور لاطائل مسئلہ ہے۔ یہ تمام کائنات محض چند جھٹکوں کے انعکاس کا نتیجہ ہے میں اگر ابھی تمھارے گھٹنے پر ضرب لگاؤں تو تمھارے پاؤں خود بخود کانپنے لگیں گے "

لڑکی نے کہا۔ " کہیں ایسا کرنا بھی نہیں ورنہ ایسا ڈنڈا رسید کروں گی کہ یاد ہی رکھو گے "

اس کے بعد لڑکی ایک پہاڑی پر پہونچی جہاں ایک صلیب نصب تھی اور ایک رومی سپاہی اس کی حفاظت کر رہا تھا ——— وہ آنکھیں بچائے ہوئے چلی جا رہی تھی کہ سپاہی نے چیختے ہوئے کہا " جھک جا۔ رومی انصاف رومی قانون اور رومی امن و سکون کے نشان کے حضور میں جھک جا " لیکن وہ لڑکی علٰحدہ کھڑی ہو گئی، اور اس قدر تیزی سے اوس نے اپنا ڈنڈا سپاہی کی گردن پہ مارا کہ وہ پہاڑی سے نیچے گر گیا، یہاں سے جب وہ آگے چلی تو پیاس معلوم ہوئی اور ایک کنویں کے قریب گئی جیسے ہی اس نے کنویں سے پانی نکالنے کا ارادہ کیا ایک شخص نے پانی کا گلاس اوس کو دیتے ہوئے کہا کہ " میری یادگار کے طور پر اس کو پی لو "

لڑکی نے پانی پیا اور شکریہ کے ساتھ گلاس واپس دیا، لیکن اس نے گلاس فوراً غائب کر دیا،

لڑکی نے کہا " تم بازی گر ہو۔ تم نے گلاس غائب کر دیا۔ میں خدا کی تلاش میں ہوں ۔ مجھے بتاؤ وہ کہاں ہے ؟
اس نے کہا " تمہارے دل میں ہے اور میرے دل میں بھی "
لڑکی نے کہا " میرا بھی یہی خیال ہے لیکن وہ کیا شے ہے ؟ "
بازی گر نے کہا " وہ ہمارا باپ ہے "
لڑکی نے کہا " ہماری ماں کیوں نہیں "
اُسنے جواب دیا " اگر میری ماں میری رہنمائی کرتی تو میں امیر تو ضرور ہو جاتا۔ لیکن خدا کبھی مجھ کو نہ ملتا "
لڑکی نے کہا " میرا باپ بچپن ہی سے مجھکو مارا کرتا تھا۔ حتیٰ کہ ایک دن میں نے اپنے ڈنڈے سے اوس کی خوب خبر لی، لیکن اوس کے بعد بھی اوس نے مجھکو ایک سفید فام سپاہی کے ہاتھ بیچ ڈالنا چاہا۔ اس لئے میں باپ کو خدا کبھی نہ بناؤں گی "
بازی گر بولا " لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ بھائی بہن کی طرح آپس میں محبت نہ کی جائے "
لڑکی بولی " لیکن ایک عورت کبھی اپنے بھائی سے محبت نہیں کرتی وہ تو ایک اجنبی کی طرف مائل ہوتی ہے جس طرح میں تمہاری طرف مائل ہوں "
——— " یہ تو صرف ایک استعارہ تھا۔ ہم سب نوع انسانی کے فرد ہیں اور سب کو باہمدگر محبت کرنا چاہیئے "
——— " نہیں میں یہ نہیں کر سکتی میں ہر کس و ناکس سے محبت نہیں کر سکتی۔ مگر سچ بتاؤ۔ کیا واقعی تم مجھ سے محبت کرتے ہو "
——— " ذاتیات سے گفتگو کرنا مناسب نہیں "
——— " لیکن اگر ذاتی مسایل پر گفتگو نہ کی جائے تو یہ کوئی دانشمندی کا فعل نہ ہوگا۔ فرض کرو میں نے یہ کہا کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ جیسا تم کہتے ہو کہ کرنا چاہیئے۔ تو کیا یہ تو تم محسوس کر رہے ہو کہ میں تم سے آزادانہ گفتگو کر رہی ہوں "
——— " نہیں تم کو یہ نہیں سمجھنا چاہیئے۔ گو تم سیاہ فام ہو اور میں سفید لیکن خدا کی نظر میں جو ہمارا خالق ہے سب برابر ہیں "
——— " اچھا تم مجھے سفید ملکہ تصور کرو اور خود اپنے کو سفید بادشاہ اس میں کیا حرج ہے ، یہ تم گھبرا کیوں گئے "
——— " نہیں کچھ نہیں۔ گو میں غریب سفید لوگوں میں سب سے زیادہ غریب ہوں ، تاہم میں اپنے کو بادشاہ ہی سمجھتا ہوں ——— لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب انسانوں کی بدمعاشیوں نے مجھکو پاگل بنا رکھا تھا "

——— میں نے بڑے بادشاہ بھی دیکھے ہیں اس لئے تم کو شرمندہ نہ ہونا چاہئے۔ اچھا تم سلیمان بنو، میں ملکہ سبا بنوں اور بالکل اسی طرح جس طرح انجیل میں ہے میں تمہارے پاس آ کر یہ کہوں گی کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں یعنی میں تم پر قابو حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ اور ایک بھوکی شیرنی کی طرح تم کو کھا کر اپنے جسم کا ایک جزو بنانا چاہتی ہوں تاکہ میں تمہارے اور تمہاری خودی کے درمیان، تمہارے اور خدا کے درمیان حائل ہو جاؤں۔ مگر کیا یہ خوفناک ظلم نہ ہوگا ——— حقیقت یہ ہے کہ محبت اشیا کو ہضم کئے جا رہی ہے۔ کیا تم ایسی فردوس کا تخیل کر سکتے ہو جس میں محبت بھی ہو"

حبشی لڑکی اور آگے بڑھی تو اسے ایک قدیم ماہی گیر ملا جو اپنے شانہ پر ایک بڑا کلیسا اٹھائے لئے جا رہا تھا اس نے کہا

——— "اس بوجھ سے تمہاری کمر ٹوٹ جائے گی"

وہ بولا ——— "نہیں میں ایک چٹان ہوں جس پر یہ کلیسا بنا ہوا ہے"

——— "لیکن تم تو چٹان نہیں ہو اور یہ کلیسا بہت وزنی ہے"

اس نے کہا "کوئی ڈر کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ یہ صرف کاغذ کا بنا ہوا ہے"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا لیکن اس کے بعد چند ماہی گیر اور سیاہ و سفید لباس پہنے کاغذی کلیسے لئے ہوئے آئے ان میں سے ہر ایک کہتا تھا کہ اس مچھلی والے کی بات کا یقین نہ کرو"

اس کے بعد وہ آپس میں مصروف جنگ ہو گئے اور لڑکی اس نتیجہ پر پہونچی کہ خدا کا پتہ ان سے نہیں چل سکتا"

جب وہ چلے گئے۔ تو وہ سڑک پر واپس آئی جہاں ایک بوڑھا یہودی اُسے ملا جس نے سوال کیا کہ "کیا وہ آ گیا؟"

لڑکی نے پوچھا "کون آ گیا؟"

اُس نے جواب دیا "وہی جس نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ جس نے یہ کہا تھا کہ میں جب تک وہ آئے اوس کا منتظر رہوں میں نے اوس کا بہت انتظار کیا۔ اگر وہ اب بھی نہ آیا تو پھر بہت دیر ہو جائے گی، کیونکہ آدمی سوائے قتل و غارت کے اور کچھ نہیں سیکھنا چاہتے"

لڑکی نے کہا "اس کو تو کوئی بھی آکر نہیں روک سکتا"

اس نے کہا۔ "لیکن وہ جاہ و جلال کے ساتھ نمودار ہوگا خداوند کے داہنی جانب بیٹھا ہوگا۔ وہ ہر چیز کو درست کر دے گا"

لڑکی نے کہا " اگر تم چیزوں کی درستی کیلئے دوسروں کے منتظر رہو گے۔ تم ہمیشہ انتظار ہی کیا کرو گے "

یہودی یہ سنکر چیخ اٹھا۔ اور لڑکی آگے بڑھ گئی۔ اب وہ ایک سایہ دار ساحل تک پہونچی۔ جہاں اس کے ہم قوم ۵۰ حبشی نظر آئے، جو چند سفید رنگ کے لوگوں کے قریب بیٹھ کر دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ یہ حبشی ان لوگوں کے قلی تھے

اُس نے ایک حبشی سے سوال کیا کہ یہ کیا قصہ ہے،

اس نے کہا " کہ یہ عجائب و غرائب کا کارواں کہلاتا ہے "

لڑکی نے سوال کیا " یہ لوگ اچھے ہیں یا برے ؟ "

اس نے کہا " یہ لوگ سب بے خیال ہیں۔ ذرا ذرا سی باتوں پر جھگڑتے رہتے ہیں، انھیں سوال و جستجو کا مرض ہے "

اتفاقاً ایک سفید رنگ عورت نے حبشی لڑکی کو دیکھ کر کہا " بھاگ جاؤ، یہاں تمھارا کوئی کام نہیں، تم ہمارے مردوں کو ناکارہ کردوگی "

کچھ اور گفتگو کے بعد حبشی لڑکی نے کہا کہ " تم لوگ کاروانِ عجائب کیوں کہلاتے ہو۔ کیا تم خدا کے متعلق عجیب و غریب عقائد رکھتے ہو "

یہ سنکر سب نے زور سے قہقہہ لگایا

اور بولے کہ " سیکڑوں برس ہوئے جب متمدن ممالک میں اس قسم کے عقائد پائے جاتے تھے اور خدا کی جستجو کی جاتی تھی "

لڑکی نے کہا کہ " تمھارے یہاں کے پادری تو کہتے ہیں کہ خدا پر ایمان لاؤ، اور تم کہتے ہو کہ یہ سب پرانی باتیں ہیں "

ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر کہا کہ واقعی یہ تو بڑی بُری بات ہے کہ جس بات کا ہمیں یقین نہ ہو اس پر یقین لانے کی ہدایت دوسروں کو کریں، کیوں نہ صاف صاف کہہ دیا جائے کہ خدا تو افسانہ ہی افسانہ ہے اور کائنات انتخاب طبیعی کے ذریعہ سے وجود میں آئی ہے "

دوسرے نے جواب دیا کہ " اس میں بڑی خرابی پیدا ہو جائے گی کیونکہ پھر ان لوگوں کا خیال بقاء اصلح کی طرف مائل ہو جائے گا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ہم لوگ ان کے مقابلہ میں کسی طرح " اصلح " نہیں ہیں "

آخرکار حبشی لڑکی یہاں سے بھی آگے بڑھی اور ایک ایسی جگہ پہونچی جہاں لکڑی اور ہاتھی دانت کے بہت سے چھوٹے چھوٹے بت بغرض فروخت رکھے ہوئے تھے، پاس ہی ایک بڑی چوبی صلیب پر ایک شخص ہاتھ پھیلائے، ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ رکھے ہوئے پڑا تھا۔ اور وہ شخص جس کی دکان تھی اس کو دیکھ دیکھ کر بت طیار کر رہا تھا۔ ان کا ایک خوب صورت عرب پگڑی باندھے ہوئے اور پہلو میں تلوار لٹکائے ہوئے بہ غور دیکھ رہا تھا۔ یہ اپنی داڑھی میں شانہ کر رہا تھا

عرب نے کہا۔ "ایسا کیوں کر رہے ہو کیا تم کو معلوم نہیں ہے خدا نے موسیٰ کے ذریعہ سے اس کی مخالفت کی ہے"

اس نے جواب دیا کہ "کیا کروں فاقہ سے مجبور ہوں، یہ صناع مجھے معاوضہ دیتا ہے اور میں اس طرح اپنا پیٹ پالتا ہوں اور وہ بھی میرے اور صلیب کے بت بنا کر کھاتا کماتا ہے ——— جب کچھ پونجی میرے پاس جمع ہو جاتی ہے تو میں جاتا ہوں اور لوگوں کو سچائی کی دعوت دیتا ہوں، لیکن جب تک میں ان کو کوئی شعبدہ نہ دکھاؤں، وہ میری طرف توجہ ہی نہیں کرتے"

عرب نے کہا "میرے پاس بھی ایک پیغام ہے۔ اور وہ یہ کہ دنیا میں کوئی عظمت و قوت والا نہیں۔ سوائے اللہ کے۔ اور جب میں اپنی قوم کو یہ پیغام سناتا ہوں تو وہ مجھ سے بھی شعبدہ کے طلبگار ہوتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ میں انھیں جیسا انسان ہوں تو وہ چلے جاتے ہیں لیکن اوروں سے یہی کہتے ہیں کہ میں معجزہ دکھاتا ہوں۔ اور دوسرے لوگ اس کا یقین کر لیتے ہیں کیونکہ وہ اگر یقین نہ کریں تو وہ قتل کر دیئے جائیں"

اس نے کہا "لیکن میرا پیغام تو یہ ہے کہ کوئی کسی کو قتل نہ کرے"

عرب نے جواب دیا "یہ ٹھیک ہے، لیکن جو لوگ زندہ رہنے کے قابل نہیں ہیں انھیں فنا کر دینا ہی بہتر ہے، باغ میں پانی بھی دیا جاتا ہے اور خس و خاشاک کو دور بھی کیا جاتا ہے"

شعبدہ باز نے کہا "اس کا فیصلہ کون کر سکتا ہے کہ ہم زندہ رہنے کے قابل ہیں، میرے متعلق تو بڑے بڑے حاکموں اور پادریوں کا فیصلہ یہی ہے کہ میں زندہ رہنے کے قابل نہیں اور شاید ان کا یہ فیصلہ درست ہو"

عرب ——— "تقریباً یہی فیصلہ میرے متعلق بھی کیا گیا تھا، لیکن جب چند قوی نوجوان میرے ساتھی ہو گئے تو میں نے باغ کو خس و خاشاک سے پاک کرنا شروع کیا"

——— "میں تمہاری ہمت اور عملی فراست کی داد دیتا ہوں"

عرب ——— "میری ان صفات کی داد نہ دو کیونکہ ریگستان کا ہر سردار ان صفات کا مظاہرہ کر سکتا ہے، مجھے تو اپنے علوئے نفس پر ناز ہے جو الہام ربانی کا محل بنا، کیا تم نے کبھی کوئی کتاب لکھی ہے"

شعبدہ باز۔ "نہیں، کیونکہ مجھ پر گفتگو کرنے کا الہام ہوتا ہے لکھنے کا نہیں، میں نے سوائے ایک مختصر سی دعا کے اور کوئی چیز نہیں مرتب کی"

عرب ——— "لکھنا زیادہ کارآمد ہے، خدا نے مجھ سے بہت سی باتیں لکھوائیں، لیکن اس دنیا میں بعض آدمی ایسے بھی ہیں جو خدا کی پرواہ نہیں کرتے۔ اور ان کے سمجھانے کے لئے مجھے اپنی ذہانت سے بھی کام لینا پڑتا ہے، چنانچہ ان کے لئے میں نے بہشت و دوزخ اور قیامت وغیرہ کے قصے لکھے تاکہ ان پر اثر ہو"

شعبدہ باز۔ " اس میں شک نہیں کہ تم میں کامیاب ہونے کی تمام صفتیں پائی جاتی ہیں "
بت ساز بولا۔ " یہ تمھارا خدا کی قوت و عظمت کا درس دینا بیکار ہے جب تک حسن کا احساس نہ پیدا ہو اور بت کی صورت میں ہم اُس حسن کو منتقل نہ کرسکیں، میں ایسے اللہ کو کیا کروں جو بت بنانے کی مخالفت کرتا ہے "

عرب ۔ " اے کافر تجھے معلوم نہیں کہ حسن کا یہ احساس لوگوں کو انھیں بتوں کی پرستش پر مجبور کر دیتا ہے، عیسائی جنھوں نے خدا کی پرستش کرنا ایک انسان کی صورت میں اختیار کیا تھا، اب وہ ایک بھیڑ کے بچے کی صورت میں کرتے ہیں۔ یہ سزا ہے خدا کی طرف سے اس گناہ کی کہ انسان نے خدا کی بنائی ہوئی چیزوں کی نقل شروع کر دی تھی۔ وہ تم کو اجازت دیتا ہے کہ عمدہ عمدہ لباس طیار کرو، نفیس قالین بناؤ لیکن جو کام اس کا ہے اس میں دخل نہ دو۔ بت بنانا اس کی قدرت میں شریک پیدا کرنا ہے "

بت ساز ۔ " تو کیا تمھارا خدا بت ساز ہے، اگر ایسا ہے تو میں یونانی دیوتاؤں کے بعض ایسے بت دکھاتا ہوں کہ تمھارا خدا بھی عش عش کرنے لگے۔ تمھارا خدا عورت بنا سکتا ہے، لیکن محبت کی دیوی نہیں بنا سکتا اسے صرف ایک بت ساز آرٹسٹ ہی بنا سکتا ہے "

یہ کہکر اس نے زہرہ کا مجسمہ نکالا اور کہا " کیا خدا ایسا بنا سکتا ہے "

حبشی لڑکی جو اسوقت تک یہ باتیں خاموشی سے سن رہی تھی بولی کہ " اس کے اعضاء سرد ہیں "

لڑکی سے مخاطب ہوکر عرب بولا۔ " خوب کہا، ایک زندہ ناکامی مُردہ شاہکار سے بدرجہا بہتر ہے اور اگر تو نے اپنے ایک لفظ سے اس بت ساز کو ہلاک نہ کر دیا ہوتا تو میں اپنی تلوار سے ہلاک کر ڈالتا "

بت ساز بولا۔ " میں پھر بھی زندہ رہتا، اس لڑکی کے اعضاء ایک دن سنگ مرمر سے زیادہ سرد ہو جائیں گے۔ میری دیوی کے تم دو ٹکڑے کر دو، وہ پھر بھی سنگ مرمر رہے گی لیکن اس لڑکی کے دو ٹکڑے کرکے دیکھو کیا باقی رہتا ہے "

عرب نے کہا کہ " مجھے تمھاری گفتگو سے کوئی دلچسپی نہیں " اور پھر لڑکی کی طرف مخاطب ہوکر کہا۔ " اے لڑکی میرے گھر میں ایک بیوی کی جگہ خالی ہے، تو خوبصورت ہے، تیری جلد سیاہ اطلس کی طرح چمکدار ہے، تو زندگی سے معمور نظر آتی ہے "

لڑکی نے سوال کیا۔ " اس وقت کتنی بیویاں تمھارے پاس ہیں "

عرب نے جواب دیا۔ " میں نے تو عرصہ سے شمار کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ لیکن وہ اتنی ہیں کہ تو ان کو دیکھ کر میرے تجربہ کار شوہر ہونے پر یقین لے آئے گی اور جان لے گی کہ میں ان کو خوش رکھ سکتا ہوں "

حبشی لڑکی۔ " مجھے خوشی کی جستجو نہیں، میں تو خدا کی تلاش میں ہوں "
شعبدہ باز بولا " کیا تجھے اب تک وہ نہیں ملا ؟ "
لڑکی " مجھے بہت سے خدا ملے، جو ملتا ہے اپنا خدا میرے سامنے پیش کرتا ہے اور اس بُت ساز کے پاس تو جانے کتنے خدا موجود ہیں، لیکن میرے لئے وہ سب نیم مُردہ ہیں "
شعبدہ باز بولا۔ " لیکن خدا اور انسانیت کے درمیان تعلق پیدا کرنے کے لئے کسی خدا کو آدمی ضرور بننا چاہئے "
لڑکی " ہاں اگر وہ آدمی عورت ہو تو بہتر ہے کیونکہ وہ خدا جو مرد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اپنی توہین کرتا ہے۔ لیکن عورت کا خدا ہو جانا اس کے لئے مناسب ارتقاء ہے "
عرب نے یہ سنکر کہا۔ نعوذ باللہ یہ عورت تو بڑی جھگڑالو ہے، یہ بھی خدا کی شان ہے کہ عورت کو حسین بنایا تو اسی کے ساتھ ضدی بھی کر دیا "

اس کے بعد برنارڈ شا نے اسلامی مسئلہ ازدواج کو سامنے رکھکر مکالمہ کو زیادہ وسیع کر دیا ہے اور جناب عائشہ کے متعلق اچھا خیال ظاہر نہیں کیا ——— آخرکار حبشی لڑکی یہاں سے یہ کہتی ہوئی بھاگ جاتی ہے کہ " جہاں مرد عورتوں کا ذکر کر رہے ہوں، وہاں خدا کا کیا گزر "

اب وہ ایک گاؤں میں پہونچی جہاں بہت خوب صورت باغ تھا۔ اوس کا مالک ایک بوڑھا آدمی تھا لڑکی نے اوس کو روک کر " خدا کی بابت سوال کیا "
مرد ضعیف نے جواب دیا کہ " ادھر آؤ، بڑے تجربہ کے بعد مجھے معلوم ہوا ہے کہ خدا کو ڈھونڈھنے کی بہترین جگہ باغ ہے، وہاں زمین کھودو تو وہ مل جائے گا "
لڑکی نے کہا۔ " نہیں، مجھے ایسا خدا نہیں چاہئے، میرا خیال اس کے متعلق کچھ اور ہے "
بڈھے نے پوچھا " کیا تمھارے خیال نے اس وقت تک کوئی صحیح رہبری کی ہے ؟ "
لڑکی نے کہا۔ " نہیں ایسا تو نہیں ہوا لیکن میں تمھارے خیال سے بھی متفق نہیں ہوں "
بڈھے نے کہا۔ " بہت سے لوگوں نے خدا پالینے کے بعد بھی اس کو پسند نہیں کیا۔ پھر تم یہ کیوں یقین کرتی ہو کہ تم اسے پسند کرو گی۔ بیوقوف نہ بنو، خدا تمھاری کہنیوں کے پاس ہے اور ہمیشہ یہیں رہا ہے، لیکن اس نے اپنے آپ کو پوری طرح کبھی ظاہر نہیں کیا کہ مبادا تم پاگل ہو جاؤ، اس لئے بہتر طریقہ یہی ہے کہ تم ایک چھوٹا سا باغ طیار کرو، زمین کھودو، پودے لگاؤ "
لڑکی یہ سُن کر اوس کے ساتھ باغ میں چلی گئی۔ جہاں روزانہ آدمی آتے جاتے رہتے تھے، ایک دن ایک شخص آئرلینڈ کا رہنے والا آیا اور باغ کے بائیں حصہ میں کام کرنے لگا

لڑکی نے اوس سے پوچھا تم یہاں کیونکر آئے
اس نے کہا۔" میں خود آیا ہوں ؟
لڑکی نے کہا" لیکن یہ باغ تو اس بوڑھے کی ملکیت ہے "
اسنے جواب دیا۔" میں سوشلسٹ ہوں اور اس عقیدہ کا نہیں ہوں کہ باغ کسی تنہا شخص کی ملکیت ہوسکتا ہے"
لڑکی نے کہا۔" تو تم خدا کی تلاشس میں نہیں آئے ہو ؟ "
اس نے کہا" اگر خدا کو میری ضرورت ہوگی وہ خود مجھے تلاش کر لے گا۔ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ وہ ویسا نہیں ہے جیسا کہ ظاہر کیا جاتا ہے۔ وہ ابھی تک مکمل نہیں ہوا ہے "

لڑکی اور بوڑھا دونوں اس شخص کی کج خلقی کے شاکی تھے لیکن چونکہ وہ کام بہت کرتا تھا اس لئے اوس کو علحدہ بھی نہ کرتے تھے۔ ان لوگوں نے اوس کو عمدہ خصایل اور خوش زبانی کی تعلیم دینے کی کوشش کی۔ لیکن کوئی عقیدہ اوس سکول میں یہ خیال نہ پیدا کر سکا کہ خدا بھی کوئی کامیاب نقش ہوسکتا ہے

ایک دن اُس بوڑھے شخص نے اوس لڑکی سے کہا " کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ تم ایسی جمیل عورت کا شوہر ہو۔ اور اس سے بچے پیدا ہوں۔ میں تو خیر بہت بوڑھا ہوگیا ہوں، لیکن یہ آئرلینڈ کا باشندہ موزوں ہوگا "

چونکہ اوس بوڑھے سے لڑکی کا تعلق خاطر پیدا ہوگیا تھا۔ اس لئے اوس کو یہ خیال بہت ناگوار گزرا وہ تمام رات اس نوجوان کو باغ سے نکال دینے کی اسکیم پر غور کرتی رہی۔ لیکن بعد کو وہ لڑکی بھی شادی کے لئے تیار ہوگئی۔ چنانچہ وہ دونوں اس کے پاس گئے اور لڑکی نے کہا کہ وہ اوس سے شادی کرنے والی ہے

اوس نے اپنا کدال اٹھا لیا اور نہایت خوفناک آواز نکال کر باغ کی دیوار سے پھاند جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن حبشی لڑکی نے اوس کو مضبوطی سے پکڑ لیا

اسنے غصہ سے کہا" کیا میں ایک حبشی لڑکی سے شادی کرلوں ؟

لیکن حبشی لڑکی نے اوس کو اپنی آہنی گرفت میں دبوچ لیا۔ اور ڈیڑھ گھنٹہ کی گفت و شنید کے بعد شادی ہوگئی ـــــ بعد کو حبشی لڑکی کے بچے ہوگئے۔ اور خدا کا تخیل بھی اوس کے دماغ سے نکل گیا

---

یہ ہے خلاصہ برنارڈشا کی اس کتاب کا جس نے اس وقت مذہبی تنقید کی دنیا میں ہلچل ڈال دی ہے برنارڈشا نے اس کتاب میں صرف انجیل اور قرآن یا بالفاظ دیگر علیسویت و اسلام سے بحث کی ہے۔ اور اس کا مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ خدا کا تصور آہستہ آہستہ کیونکر بلند ہوتا گیا۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ مذہب کو انسانی زندگی کے لئے نہ صرف یہ کہ غیر ضروری بلکہ مضرت رساں بھی خیال کرتا ہے

وہ اسی کتاب کے اخیر باب میں جہاں اس نے اپنے خیالات کو بغیر کسی استعارہ و تشبیہ کے زیادہ صاف و صریح الفاظ میں بیان کیا ہے، ایک جگہ لکھتا ہے کہ قدیم پرستار بن خدا صرف تلوار و نیزہ رکھتے تھے اور وہ اپنے مخالفین کا قتل عام نہ کرسکتے تھے لیکن آج جبکہ مشین گنوں، ہوائی جہازوں، زہریلی گیسوں نے ہلاکت کو اسقدر عام و ارزاں کر رکھا ہے، بچوں کی تعلیم نوح اور یوشع سے بہتر ہونی چاہئے یعنی اگر ہم بائبل کو علحدہ نہیں کرسکتے تو وہ ہم کو علحدہ کردے گی اگر ہم نے اس کا مطالعہ صحیح تنقید کی روشنی میں نہ کیا۔ کوئی وجہ نہیں کہ قرآن، اپنشید اور الف لیلہ پر تو تنقیدی نگاہ ڈالی جائے اور بائبل کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔

معلومات اور حقایق کے لحاظ سے بائبل کی یہ حالت ہے کہ اگر اس کے بیانات پر اعتبار کرکے کوئی طالب علم تخلیق عالم، اسرار حیات اور رموز مابعد الطبیعیات کے متعلق سوالات کا جواب دے تو فیل ہونا تو خیر کوئی بات ہی نہیں، سیدھا پاگل خانہ بھیجدیا جائے کہ یہ بک کیا رہا ہے

بائبل صرف ایک یادداشت ہے اس بات کی کہ زمانۂ قدیم میں انسان کی عقل کسقدر ناقص تھی اور انسانیت اپنے عہدِ طفلی میں کیا کیا خواب دیکھ رہی تھی۔ اس لئے اس کی حیثیت بالکل ایسی ہے جیسے انسائکلوپیڈیا کا پہلا اڈیشن کہ یادگار کے طور پر الماری کی زینت بنی رہے اور یہ اندازہ کرنے کا موقعہ ملے کہ ذہن انسانی نے رفتہ رفتہ کس قدر ترقی حاصل کی ہے

عہد نامۂ عتیق و جدید کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے مفہوم و تصور میں رفتہ رفتہ کیا تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں۔ جو خدا نوح کا تھا وہ ایوب کا نہ تھا اور جو ایوب کا خدا تھا وہ مسیح کا نہ تھا۔ نوح کا خدا تو وہ تھا جس نے طوفان برپا کرکے سارے زمانہ کو تباہ کرنے میں تامل نہ کیا اور صرف ایک خاندان کو زندہ چھوڑ دیا۔ اور پھر حکم دیا کہ قربانیوں کے جلتے ہوئے گوشت کی بو سے اسے خوشش کرے

ایوب کا خدا زیادہ متحمل، زیادہ استدلال پسند، اور زیادہ فلسفی تھا جس نے شیطان سے شرط کی تھی کہ وہ ایوب کو گمراہ نہ کرسکے گا —— اس کے بعد ( Micah ) کے خدا کا مرتبہ ہے جو نوح کے خدا کی طرح قربانی چاہتا تھا، نہ ایوب کی خدا کی طرح حجت پسند تھا۔ بلکہ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ انسان راستی اختیار کرے، اور محبت کرنا سیکھے۔ پھر مسیح کا خدا آیا جو اور زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ کیونکہ وہ انسان کو اپنا مظہر قرار دینا چاہتا تھا، لیکن بت پرستی کے جرائیم ہنوز باقی تھے۔ اس کے ۶۰۰ برس بعد محمدؐ نے جو تصور خدا کا پیش کیا وہ بہت ارفع و اعلےٰ تھا۔ اور اس میں ایسی خالص وحدانیت پائی جاتی تھی جو اس سے قبل کبھی پیش نہیں کی گئی، لیکن جاہل عربوں کو راہِ راست پر لانے کے لئے بہشت و دوزخ، حشر و نشر، عذاب و ثواب کے تدابیر انھیں بھی اختیار کرنا پڑیں، اس لئے مسلمانوں کے لئے بھی لازم ہے کہ وہ اسلام کو دوبارہ کھود کر نکالیں اور اس کے چہرہ کے اصلی

خدوخال پیش کریں ورنہ اس کا بھی وہی حال ہوگا جو دیگر قدیم مذاہب کا ہوا ہے "

برنارڈشا، اشتراکیت کا حامی ہے اور اسی لئے اس کا میلان موجودہ بالشویزم کی طرف ہے، وہ چاہتا ہے کہ مذاہب کو دنیا سے نیست ونابود کر دیا جائے، کیونکہ بغیر اس کے انسانیت کا انتشار دور نہیں ہو سکتا اور نہ سرمایہ داروں کی لعنت سے انسان آزاد ہو سکتا ہے

رسول اللہ کی ازدواجی زندگی کے متعلق جن الفاظ میں اس نے اظہار خیال کیا ہے وہ کسی ذاتی تحقیق پر مبنی نہیں معلوم ہوتا بلکہ وہی آواز ہے۔ جو عیسوی دنیا میں عرصہ سے گونج رہی ہے

ہر وہ شخص جو کسی خاص ماحول میں پرورش پاتا ہے مجبور ہوتا ہے کہ وہ اسی مخصوص نقطۂ نظر سے دوسروں کے حالات کا مطالعہ کرے جو گہوارہ سے اس کے سامنے رہا ہے۔ مسئلہ ازدواج میں یورپین ذہنیت چونکہ جذبۂ شہوانی سے علیحدہ کوئی چیز نہیں ہے اس لئے برنارڈشا سا آزاد خیال انسان بھی اس سے مغلوب ہوگیا، ورنہ اگر وہ انصاف سے کام لیتا تو اس کو معلوم ہوتا کہ رسول اللہ کی تمام شادیاں صرف وقتی ضرورت ومصلحت کی بنا پر ہوئیں اور ان میں سے کوئی ایک رشتۂ ازدواج بھی ایسا نہیں تھا جس سے مقصود صرف شہوت رانی ہو

خدا کے متعلق خود برنارڈشا کا جو خیال ہے، وہ آئرلینڈ کے اس باشندہ کی زبان سے ظاہر کیا گیا ہے۔ جس کے ساتھ حبشی لڑکی کی شادی ہوئی تھی، یعنی نہ صرف یہ کہ وہ خدا کے وجود کا قائل نہیں ہے۔ بلکہ اس خیال وعقیدہ کو نوع انسانی کی ترقی کے منافی سمجھتا ہے

یہ کتاب صرف ۷۵ صفحات کی ہے اور ۱۲ میں ہر جگہ مل سکتی ہے

# ضرورت ہے شوہر کی

# فسانہ نہیں حقیقت!

یہ سرگزشت ہے ایک نوجوان کی جو اکثر دفتر نگار میں آتے ہیں اور گھنٹوں مغموم و خاموش بیٹھ کر چلے جاتے ہیں

میں سمجھا کرتا تھا کہ ان کا یہ "سوگ" شاید فطری چیز ہے، لیکن اب معلوم ہوا کہ وہ سوسائٹی کے مظالم کا شکار ہیں اور ایک سے زاید بیویاں کرنے کی جو مذموم رسم مسلمانوں میں قایم ہو گئی ہے اسی کے شکار یہ بھی ہیں

اڈیٹر

(۱)

بیمار نے آنکھیں کھولیں۔ داہنی طرف اس کی بھانجی صالحہ اور اس سے کچھ دور اس کی پہلی بیوی خالدہ بیٹھی ہوئی تھی بائیں کی طرف اس کی لڑکی زبیدہ پنکھا جھل رہی تھی۔ اس نے نحیف آواز میں کہا " پانی لاؤ " فہیم اور عزیز نے اسے کمر اور پیٹھ میں ہاتھ ڈال کر اٹھایا۔ پانی پینے کے بعد مریض ایک ہلکی کراہ کے ساتھ پھر لیٹ گیا۔ دفعتہً اس نے کہا " فہیم " اور جب فہیم اس کے قریب تر ہو گیا تو اس نے کمزور تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہا " دیکھو اب تک نعیم نہیں آئے تم نے پرسوں خط بھیجا تھا۔ کل انھیں ملا ہو گا۔ اور اس حساب سے انھیں آج ضرور آجانا چاہیے تھا۔ تم انھیں ایک تار دے دو کہ فوراً آجائیں۔ تم لوگ میری حالت دیکھتے ہی ہو میں نہیں چاہتا کہ میرے بچے ایسی حالت میں مجھ سے علحدہ رہیں ۔۔۔۔ جائداد کا انتظام ہوتا رہے گا" فہیم نے ایک سعادت مند بیٹے کی طرح " اچھا آیا " کہا۔ اور ایک تار دینے چلا گیا

ناصر علی شہر پٹنہ کے معززین میں شمار کئے جاتے تھے۔ جائداد کافی تھی۔ شہر میں مکان مسکونہ کے علاوہ تین مکان اور بارہ دکانیں کرایہ پر چلتی تھیں۔ عہدِ شباب میں وہ ایک ریاست کے منیجر تھے۔ اور تقریباً پچیس سال تک ریاست کی خدمات انجام دیتے رہے۔ لیکن اُن کا عروج حاسدوں کی آنکھوں میں خار بنکر کھٹکا۔ راجہ صاحب سے لگائی بجھائی

کی گئی۔ چونکہ اس ریاست میں یہ اور ان کے دیگر بزرگ اچھے عہدوں پر رہ چکے تھے نیز ان کی ذاتی قابلیت اور حسن انتظام سے بھی راجہ صاحب خوش تھے اس لئے ان سے کوئی محاسبہ نہیں کیا گیا۔ لیکن جب انھیں اپنی نسبت معلوم ہوا کہ اغیار غلط بیانی سے کام لے کر میری جانب سے راجہ کے دل میں بس بو رہے ہیں تو انھوں نے استعفیٰ دینا ہی مناسب سمجھا۔ اس کے بعد وہ اپنے مکان پٹنہ میں آکر مقیم ہو گئے۔

ناصر علی میں بجز اس کے کہ وہ حد سے زیادہ وضعدار تھے۔ اور کوئی خاص خصوصیت نہ تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ ایک سال کی بیماری سے صحت پانے کے بعد ڈاکٹر کے منع کرنے کے باوجود جب انھوں نے دماغی کام زیادہ کیا تو وہ پھر بیمار ہو گئے۔ ابھی معمولی بخار ہی تھا کہ پیٹھ میں سرطان نمودار ہو گیا چھ ماہ تک وہ موت اور حیات کے درمیان لٹکے رہے مستند ڈاکٹروں اور حکیموں کے علاج سے اس سے بھی نجات ملی۔ لیکن سن رسیدہ آدمی کا کسی ایسے مرض مہلک میں مبتلا ہو کر بچ نکلنا دشوار ہوتا ہے۔ صدر جہ کمزور اور نقیہ ہونے کے سبب سے نہ توان کی اب غذا ہوتی تھی اور نہ وہ اچھی طرح چل پھر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے کھانسی اور پھر حرارت نے بخار کی صورت اختیار کر کے ان پر اپنا تسلط جمالیا۔ ہر قسم کا علاج ہوا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا

ایک ہفتہ سے ان کی حالت روز بروز زیادہ گرتی جا رہی تھی اور انھیں تو خیر اپنی موت کا یقین تھا ہی لیکن اعزہ بھی ان کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے

(۲)

باہر سے معصوم وحید دوڑتا اور چیختا ہوا اندر پہونچا۔ " امی۔ امی۔ بیلے بھیا آ گئے "۔ ناصر علی نے بھی سنا اشارہ سے رشید کو پاس بلایا اور پوچھا " کیا نعیم آ گئے " اور جب جواب اثبات میں دیا گیا تو کہا " اچھا انھیں بلا لو " ابھی رشید کمرہ سے باہر نہ گیا تھا کہ نعیم بیمار باپ کے کمرے میں پہونچ گئے۔ ادب سے سلام کیا اور کرسی پر بیٹھ کر اپنے جلد نہ پہونچنے کی مجبوریاں بیان کرنے لگے

آج ناصر علی کی طبیعت کچھ سنبھلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ چہرہ روز کی طرح پژمردہ نہ تھا۔ شام کو انھوں نے اپنے جملہ متعلقین کو اپنے پاس بلا کر بٹھایا۔ ایک طرف ان کی دونوں بیویاں خالدہ اور سعیدہ اور ان کے پاس ہی ان کی بھانجی صالحہ بیٹھی ہوئی تھی۔ سامنے کرسی پر نعیم بیٹھے ہوئے تھے اور کرسی کو پکڑے ہوئے نعیم کے سوتیلے بھائی عزیز اور رشید کھڑے تھے۔ پلنگ کے پائنتی ان کی نہ سالہ بچی زبیدہ بیٹھی ہوئی تھی۔ خود ناصر علی تکیہ کی ٹیک لئے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی گود میں معصوم وحید تھا اور سرہانے ان کا سب سے بڑا لڑکا نعیم بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے دیگر اعزہ بھی کچھ کھڑے اور کچھ بیٹھے ہوئے تھے۔ پہلے تو انھوں نے کمزور آواز میں حقوق انسانی اور اتفاق پر لکچر دیا کہ کس طرح ایک انسان دوسرے کی مدد کا محتاج ہے۔ اور کس طرح انھوں نے اپنی پچپن سال کی زندگی میں اپنے دوسرے غریب رشتہ داروں

کی ہر قسم کی امداد سے کبھی پہلو تہی نہیں کی اور ہمیشہ ان کے رنج و راحت کے شریک رہے۔ اور اس کا نتیجہ دکھلاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہی وجہ ہے کہ دوسرے لوگ آج بھی مجھے رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کیونکہ میری حیثیت اپنے خاندان کے افراد پر مثل ایک سردار کے تھی۔ پھر نعیم اور فہیم کو مخاطب کرکے کہا۔ "بیٹے! زندگی اور موت کا کوئی بھروسہ نہیں۔ بہتوں کو دیکھا کہ چلتے چلتے گرے اور دم نکل گیا۔ انسان کی زندگی ہی کیا۔ اس لئے اگر میں مرجاؤں تو صبر کرنا، میں نے تم دونوں کو پڑھایا لکھایا بیاہ کیا ماشاءاللہ ذی ہوش نوجوان ہو اپنے قوت بازو سے روزی حاصل کرنے والے ہو اس لئے اب تمھارے حقوق مجھ پر نہیں ہیں۔ البتہ میرے حقوق ضرور تم پر ہیں۔ جس طرح انسان درخت لگاتا ہے اس کی آبیاری کرتا ہے دنیا کی سردی گرمی سے اس کی نگہداشت کرتا ہے اور پھر اس کے بڑھنے پر اس کے سایہ میں بیٹھ کر خوش ہوتا ہے۔ اسی طرح بیٹے! تم میرے لگائے ہوئے درخت ہو اور الحمد للہ کہ تمھارے سایہ میں میں خوش ہوں"

پھر عزیز اور رشید کی طرف اشارہ کرکے وحید کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے۔ "دیکھو یہ تمھارے بھائی ہیں اور وہ تمھاری بہن ہے۔ دنیا کی نظروں میں یہ تمھارے سوتیلے بھائی اور بہن ہیں۔ لیکن تم لوگ انھیں ایسا نہ سمجھنا ایک حقیقی بھائی کی طرح ان سے محبت کرنا۔ معصوم وحید اور ناسمجھ عزیز و رشید میرے بعد یتیم ہو جائیں گے اسوقت تمھیں ان کے مربی اور سرپرست ہو گے ایسا نہ ہو کہ تم لوگوں کی لاپرواہی سے ان کی تعلیم نہ ہوسکے یا خدانخواستہ نااتفاقی کی ہوا ان کو تم سے جدا کرکے آوارہ کر دے۔ یہ سمجھ لو کہ ابھی وہ نئی شاخ کی طرح ہیں۔ جس طرف موڑو گے مڑ جائیں گے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اگر تم لوگ ان کے ساتھ محبت سے پیش آؤ گے تو عمر بھر یہ اپنے کو تمھارا خادم سمجھیں گے۔ اس لئے......... ایسا نہ ہو میرے لگائے ہوئے باغ میں خزاں آئے اور اغیار کو ہنسنے کا موقع ملے۔ بولو! کیا تم دونوں میری وصیتوں پر عمل کروگے؟"

نعیم کی آنکھوں سے ایک نہ رکنے والا چشمہ رواں تھا۔ فہیم کا رومال آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا۔ عزیز رشید کو سینے سے لپٹائے الگ رو رہا تھا۔ معصوم زبیدہ کے ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ دونوں بیویاں خالدہ اور سعیدہ بری طرح بین کر رہی تھیں۔ صالحہ روتی بھی جاتی اور ان دونوں کو خاموش کرنے کی کوشش بھی کرتی تھی۔ البتہ ایک معصوم وحید تھا جو گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن جب چاروں طرف اسے ایک ہی منظر نظر آیا تو وہ بھی باپ سے لپٹ کر رونے لگا

ناصر علی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "دیکھو تم لوگوں کو میں نے اس لئے اپنے پاس نہیں بٹھایا ہے کہ رو رو کر میری طبیعت اور بھی پریشان کرو میں بہت کمزور ہوں زیادہ بات بھی نہیں کر سکتا۔ اس لئے نعیم اور فہیم کیا تم دونوں عہد کرتے ہو کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اس کو کروگے؟"

نعیم نے باپ کے کمزور ہاتھ کو بوسہ دیتے اور آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ "ابا"! میں آپ کی ہر وصیت پر

عمل کروں گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں اپنی بہن بھائیوں کو چاہے مجھ پر کتنی ہی مصیبت کیوں نہ ہو کبھی کوئی تکلیف نہ پہونچنے دوں گا" اور اس کے بعد اُس کے پھر ہچکیاں بندھ گئیں۔ ناصر علی نے نعیم کو سمجھاتے ہوئے [illegible] اور رشید کو اپنے پاس بُلایا اور ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر ان کے ہاتھوں کو نعیم اور فہیم کے ہاتھوں میں دے کر کہا "خدا کرے تم لوگ اپنے وعدہ پر مستقل رہو پھر خالدہ کو نزدیک بُلا کر فہیم سے کہا۔ " اس کے سر پر ہاتھ پھیرو خبردار اسے کوئی صدمہ نہ پہونچے اس کا دل نہ ٹوٹے" غریب خالدہ فہیم کی گردن میں ہاتھ ڈال کر رونے لگی۔ معصوم وحید جب بمشکل سے خاموش ہوا تو اسے پیار کرتے ہوئے اپنی بڑی بیوی خالدہ سے کہا۔" لو اسے گود میں لے کر پیار کرو اور وعدہ کرو۔ کہ کبھی نعیم اور فہیم سے کم اسے نہ سمجھوں گی۔ اور تم دونوں آپس میں بہنوں کی طرح رہو گی" خالدہ نے سعیدہ کو سینے سے لگا کر روتے ہوئے کہا۔ " میں آپ کا فرمان سر آنکھوں سے بجا لاؤں گی۔ خدا کا دیدار اور رسول کی شفاعت محشر میں مجھے نصیب نہ ہو۔ اگر میں آپ کے کہنے پر عمل نہ کروں۔ یا کسی بچے کو اپنا نہ سمجھ کر اس کا دل دکھاؤں" ناصر علی نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔" بس اب میری روح سے بہت بڑا بوجھ اُتر گیا۔ مجھے اطمینان ہے کہ تم لوگ میرے کہنے پر عمل کرو گے اور لوگوں کے لئے اتفاق اور اتحاد کی مثال بنو گے۔ اس کے بعد انھوں نے کھانا منگوا کر سب کو اپنے سامنے بمشکل کھلوایا۔ اور دیر تک سمجھانے کے طور پر نصیحتیں کرتے رہے

ناصر علی کو سب سے زیادہ عزیز ان کا لڑکا عزیز تھا یوں تو انھیں ایک باپ کی حیثیت سے سب بچوں سے محبت تھی لیکن عزیز کے ساتھ انھیں عشق تھا۔ دو سال کی عمر سے لے کر اب جبکہ اس کی عمر پندرہ برس کی تھی۔ کبھی اپنے سے اسے جدا نہیں کیا۔ اور اسی محبت کا نتیجہ تھا کہ اسے کوئی معقول تعلیم وہ نہ دلا سکے۔ جب سے ناصر علی بیمار پڑے عزیز کو کھانا پینا حرام ہو گیا۔ ہر وقت اسے باپ کے آرام کی فکر۔ ہر گھڑی اس کی یہ دعا کہ باپ اچھا ہو جائے۔ رات کو آٹھ بجے سے دس بجے تک تو وہ سو لیتا باقی تمام رات مریض کے باپ کے سرہانے بیٹھ کر گذار دیتا کہ شاید انھیں کسی چیز کی ضرورت ہو اور وہ کمزوری کے سبب سے کسی کو پُکار نہ سکیں

نعیم کے آنے کے تیسرے روز رات کو چار بجے کے قریب جب تمام گھر کے لوگ سو رہے تھے عزیز کو معلوم ہوا۔ جیسے اس کے باپ نے ہاتھ کو پلنگ پر پٹخا عزیز فوراً ہی سامنے پہونچا اور پوچھا: " کیا ہے ابا " لیکن انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تنفس کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی دو تین بار پُکارنے کے بعد جب اس نے بخار معلوم کرنے کے لئے پیشانی پر ہاتھ پھیرا تو اُسے سردی کے موسم میں ماتھے پر پسینہ کے قطرے معلوم کر کے حیرت ہوئی۔ اور آخر اس عقدۂ لاینحل کو سمجھنے کے لیے بڑے بھائی نعیم اور فہیم کو جگا دیا ان لوگوں کے اُٹھتے ہی اور سب لوگ بھی اٹھ بیٹھے۔ اور ناصر علی کے پلنگ کے گرد جمع ہو گئے۔ اعزہ میں جو لوگ سن رسیدہ تھے۔ وہ سمجھ گئے کہ ان کے سفر کا وقت آ گیا کسی نے یٰسین اور کسی نے کلمۂ طیبہ پڑھنا شروع کیا۔ پلنگ کی ایک جانب نعیم و فہیم اور دوسری جانب عزیز [illegible]

کے پلنگ پر جھکا ہوا تھا۔ دونوں بیویاں خالدہ اور سعیدہ انجام کی تصویر آنکھوں میں لئے ہوئے حیران وششدر پائنتی کھڑی ہوئی تھیں۔ کہ ایک مرتبہ ناصر علی نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں کچھ کہنے کی کوشش کی اور پھر حسرت بھری نظر سب کی طرف ڈال کر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی

(۳)

عزیز بیحد مغموم تھا۔ اسے مطلب پرست دنیا کی بیوفائی پر رہ رہ کر غصہ آرہا تھا۔ لیکن ایک بے بس اور بیکس یتیم کی طرح وہ اپنے غصہ کی آگ اپنے آنسوؤں سے بجھا رہا تھا۔ اس نے اپنے عہد گذشتہ سے عہد حال کا موازنہ کیا۔ کہ کس طرح وہ اپنے باپ کی زندگی میں آرام اور بے فکری کی زندگی بسر کرتا تھا۔ جب وہ اپنے باپ کے ہمراہ ان کے دوستوں کے یہاں جاتا تو کس طرح لوگ پیار اور محبت سے اس سے پیش آتے تھے۔ جب وہ اپنے سبزہ رنگ گھوڑے پر سیر کو نکلتا تو کیسے لوگوں کی انگلیاں اس کی طرف اٹھتی تھیں۔ خود جب وہ اپنے گھر میں ہوتا تو اس کے سوتیلے بھائی کیسے پیارے لفظوں سے اسے مخاطب کرتے تھے۔ اس کی سوتیلی ماں نے کبھی بھیا اور چھوٹے میاں کے علاوہ عزیز کہہ کر بھی نہیں بُلایا۔ پھر اس نے اپنے باپ کے انتقال کے بعد کے واقعات پر غور کیا کہ اس کے سوتیلے بھائیوں اور ماں نے کس کس طرح اس کی اور اس کے چھوٹے بھائیوں اور بہن کی دلجوئی کی۔ پھر اس نے اس وقت خیال کیا جب رشید وحید کو ایک میلے کے دکھانے کے سلسلہ میں سائیکل سے ٹکرا کر بُری طرح زخمی ہوگیا تھا۔ اور جس وقت دوسرے لوگ بیہوش رشید کو ڈولی میں ڈال کر اس کے گھر لائے تو وہ خود اور اس کی ماں بہن کس بُری طرح سے روتی تھیں۔ لیکن اس کا بھائی نعیم بگڑ بگڑ کر کہہ رہا تھا کہ کیوں وہ میلہ گیا۔ اور اگر زخمی ہوا تھا تو وہیں کیوں نہ مر گیا اس کی سوتیلی ماں نے کہا۔ " صاحب زادے آوارہ گردی میں سر پھوڑ کر گھر آویں، مفت کے روپے کہاں سے آویں گے جوان کا علاج کیا جاوے گا " پھر اس کی نظروں میں اس وقت کا منظر آیا۔ جب اس کا چھوٹا بھائی وحید اپنی بڑی ماں کے ہاتھوں اس قصور پر پٹا تھا کہ باورچی خانہ سے اس نے مرغی کیوں نہیں ہنکائی۔ اور جب اس کی ماں نے اعتراضاً منع کیا کہ بچے کو جھوٹوں سے اس طرح نہ مارنا چاہیئے تو اس سے اس طرح کہا گیا کہ " بی بی تم اس گھر میں حاکم بنکر تو رہ نہیں سکتیں ذرا سا ہاتھ لگایا تو اس کے لعل گر گئے۔ نہ کام کے نہ کاج کے دشمن اناج کے ہمارے بچے تو اپنا خون پانی کر کے کمائیں اور تم لوگ حرام ایسا کھا کر ہمھی پر آنکھیں نکالو " اس نے اپنی بابتہ سوچا کہ باپ کے انتقال کے جب جہلم میں تمام عزیز جمع ہوئے تو اس کے اور رشید کے لئے رائے زنی ہونے لگی کہ کس قسم کی تعلیم دی جائے۔ کسی نے کہا اس کا رجحان آرٹ کی طرف ہے اس لئے اس سے دریافت کرکے جس کام کو سیکھنا چاہے اسے سکھایا جائے۔ کسی نے رائے دی اس کا دماغ بہت اچھا ہے اسے انگریزی کی تعلیم باقاعدہ کسی کالج میں دی جائے۔ لیکن یہ محض خیالی آرائیاں تھیں جن کا وجود حقیقت میں کچھ نہ تھا۔ اسے اس وقت کا بھی

خیال آیا جب اس کے سوتیلے بھائی ہر وقت طعن و تشنیع سے اس کا کلیجہ چھلنی کیا کرتے تھے۔ گھر میں اس کی وقعت ایک کتے کے برابر بھی نہ تھی اگر کپڑے پھٹ کر چیتھڑے ہو گئے ہیں تو ہو جائیں اگر وہ یا اس کے بھائی بہن بھوکے ہیں تو ہوا کریں جب تک گھر کے اور تمام لوگ کھانا نہ کھا لیں انھیں کوئی حق نہیں تھا۔ کہ باورچی خانہ میں قدم رکھیں۔ وہ اپنی اس تکلیف کو یاد کرکے پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ جب ننھا وحید اور معصوم زبیدہ بخار میں جھلس رہی تھی اور جب تین دن تک اس کی کوئی خبر نہ لی گئی تو محلہ کی ایک عورت سے کچھ پیسے اس کی ماں نے قرض لے کر دوا منگوائی۔ بچوں کی تیمارداری کے سبب سے دو وقت وہ سب کے لئے کھانا نہ پکا سکی تو اسے اور اس کے بچوں کو کھانا نہ دیا گیا۔ پھر جب اس کی بہن اور بھائی کی طبیعت کچھ سنبھلی تو فہیم کے بچے کے منقوں کے ڈبے سے بغیر اجازت فہیم کی بیوی کے جب اس نے چند دانے نکال کر اپنے بھائی کو کھلا دئے تو کس قدر اس کی بھاوج اس پر بگڑی اور اس سے کہا۔ "حرام خوب منہ کو لگ گیا ہے۔ جوان ہو گئے نہیں ہو جاکر کہیں کماؤ، نہیں تو بھیک مانگو خدا کرے میرے بچے کے منقے سنکھیا بن کر لگیں" اور جب اس کی ماں نے منع کیا کہ دولھن تمھارا چھوٹا دیور ہے اس طرح نہ کہو۔ تو اسے سیکڑوں صلواتیں سنائی گئیں۔ ہزاروں گالیاں دی گئیں۔ فہیم اور نعیم دیکھتے رہے اور کچھ نہ بولے۔ رات کو جب اس کی ماں نے اس سے کہا کہ بیٹے عزیز! کب تک آخر یہ بے حیا زندگی بسر کی جائے گی۔ تم بھی اپنے باپ کے ترکے کے حصہ دار تھے لیکن تمھیں کچھ نہ دیا گیا۔ تمھارے باپ کے مرنے کے بعد جب تک تمھارے بھائیوں نے ہر چیز کو سمیٹ کر اپنا نہ کر لیا اس وقت تک خوب ہماری تمھاری خاطر کرتے رہے۔ جائداد تمھارے نام بھی ہے لیکن کیا فائدہ جب اس کے مالک و مختار وہی ہیں اور اس سے خود ہی نفع حاصل کرتے ہیں۔ ہم لوگ ہیں کہ دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیئے گئے ہیں مگر کس سے کہیں کون اپنا ہے۔ میرے پاس نقدی میں سے ایک پیسہ نہیں ہے ہاں دو چار چھلے پڑے ہیں، تم ان کو بیچ کر سفر کرو یہ تمھارا شہر ہے یہاں تم سے کچھ نہ ہوگا کہ یہاں کے لوگ ایک وقت میں تمھارا عیش و آرام دیکھ چکے ہیں۔ دوسری جگہ اگر مزدوری بھی کر دگے تو تمھارا کوئی جاننے والا نہ ہوگا

اور جب وہ دو مہینہ کلکتہ میں ٹھوکریں کھاتا پھرا لاکھ جتن کیا کہ کسی ہوٹل میں بیرا ہو جائے یا کسی دوکان میں ملازم ہو جائے۔ لیکن جب اسے کوئی نوکری نہ ملی تو اس نے اپنی ماں کو لکھا کہ میں سخت مصیبت میں ہوں کوئی نوکری نہیں ملتی چار روز سے صرف چنے چبا کر بسر کر رہا ہوں میرے پاس صرف دو پیسے تھے جن سے کارڈ لے کر آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ جس طرح ہو پانچ روپیہ مجھے بھجوائیے کہ میں آپ تک آسکوں۔ اور جب اس کی ماں [illegible] کر اس کے سوتیلے بھائیوں کی خوشامدیں کیں منتیں کیں اور کہا کہ خدا کے لئے پانچ روپے دو کہ عزیز کو بلا لیا جائے تو اسے دھتکار دیا گیا۔ اور از راہ تمسخر کہا گیا کہ جس طرح اسے زیور بیچ کر دفع کیا تھا اسی طرح اب بلا لے [illegible]۔

میرے یہاں روپیہ پھلتے نہیں ہیں اور نہ میں ایک پیسہ دے سکتا ہوں" چنانچہ اس کی ماں نے اسے اپنا زیور گرو رکھ کے بلوایا

اس نے اپنے دل میں سوچا کہ دنیا کتنی مکار اور اہل دنیا کتنے غدار ہیں آج دو سال کا زمانہ والد کے انتقال کو ہو گیا لیکن یہ مدت صدیوں سے کم نہیں تھی۔ اس عرصہ میں اتنی مصیبتیں جھیلیں کہ ایک یاد نہیں کاش والد کچھ دنوں اور زندہ رہتے اور مجھے اس قابل بنا جاتے کہ میں کسی کا دست نگر تو نہ رہتا۔ یہ تھے وہ خیالات جو عزیز کو ایک شب لیٹے لیٹے یاد آئے اور وہ اپنی بیکسی پر روتے روتے سو گیا

---

گذشتہ چھ ماہ سے اس کی بیوہ ماں کے منہ سے خون آ رہا تھا شروع میں ایک ماہ تک اتنا خفیف کہ وہ بھی مشکل سے یقین کر سکی لیکن جب ایک دن صبح منہ دھوتے وقت یک بیک کھانسی کے ساتھ بلغم میں خون کے بندھے ہوئے لوتھڑے گرے تو اسے اپنی دُکھیاری زندگی سے جلد سبکدوش ہونے پر مسرت ہوئی ــــ پہلے تو اس نے عزیز سے بھی نہیں بتایا کیونکہ وہ مجبور تھا اور کچھ کر نہیں سکتا تھا، سنکر اسے صدمہ ہوگا۔ لیکن جب ایک دن عزیز کی سوتیلی ماں نے اسے چار پیسے دئے اور اس سے کہا کہ بازار سے مٹی کے برتن لا کر اپنی ماں کے لئے علٰحدہ رکھو اس لئے کہ اس کے منہ سے خون آتا ہے اور چھوت کا اندیشہ ہے تو اُسے معلوم ہوا۔ اس نے گھر میں ماں کے علاج کے لئے بھائیوں کی خوشامدیں کیں ہاتھ جوڑے کہ خدا کے لئے اگر آپ لوگ کسی حکیم ڈاکٹر کو نہیں بُلاتے تو دس پانچ روپیہ ہی دے دیجئے کہ میں حکیم کے یہاں اماں کو لیجا کر دکھاؤں۔ لیکن شنوائی نہ ہوئی۔ کہیں سے قرض بھی نہ مل سکا مجبور ہو کر اس نے عطائیوں کے بتائے ہوئے گھاس پھوس پر اکتفا کیا۔ یہ بھی خدا کی مرضی تھی۔ کہ کسی نے اس سے کہدیا کہ وہ ریشہ برگد بھگو کر زلال میں پکی شکر ملا کر استعمال کرادے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ اور اسے بیحد مسرت ہوئی جب پندرہ روز کے بعد اس کی ماں نے بتایا کہ خون بالکل بند ہو گیا ہے۔ لیکن مہینوں سیروں خون بہ جانے سے اب وہ صرف ہڈی اور چمڑے کا ڈھانچہ رہ گئی تھی کمزور اسقدر کہ چار قدم چلنے میں پیر لڑکھڑاتے اس پر بھی والدۂ فہیم کا اصرار تھا کہ کھانا اگر نہیں پکا سکتی ہو تو برتن جھاڑ دو ضرور ہی کر دیا کرو

ایک دن شام کا وقت تھا رشید نے کسی بات پر فہیم کے لڑکے کو جھڑک دیا وہ رونے لگا۔ فہیم کی جاہل بیوی کو برداشت کہاں۔ پاس ہی تانبے کا وزنی گلاس رکھا تھا۔ پھینک کر مارا تو رشید کی کلائی پر پڑا وہ رونے لگا۔ غریب ماں برداشت نہ کر سکی منہ سے نکل گیا "دلھن اپنا جیسا بچہ سب کا سمجھا کرو اگر کلائی کے بجائے گلاس سر پر یا اور کسی نازک جگہ پڑتا تو کیا ہوتا۔ میں کمزور مریض ہوں مجھ سے تو تیمارداری بھی نہ ہو لی" اب گویا فہیم کی ماں کی باری تھی اور فہیم کی بیوی ان کے لفظوں کا اعادہ کر رہی تھی۔ "پڑ جاتا کھوپڑی پر، اچھا ہوتا، کھا کھا کے سانڈ ہوا

رہے " اور یہ کہہ کر اُسے باہر نے کو لپکیں وہ ڈر کر باہر بھاگا اتفاق کہ باہر سے نعیم آرہے تھے بیان سے ٹکرا گیا۔ بھلا اُنھیں ایک غریب یتیم بچے کی اس جسارت کی کہاں تاب پکڑ کر اندر لائے۔ اور جب نعیم کی بیوی نے رو رو کر کہا کہ چھوٹے بچے علیم کو کھلاؤ رہے تھے گالی دی تو جہاں تک مار سکے اسے مارا۔ غریب ماں نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو اسے ڈانٹ دیا اور گھر سے اس کا سامان نکال کر باہر صحن میں ڈال دیا۔ عزیز کھڑا کھڑا سب کچھ دیکھتا رہا لیکن کرتا کیا۔ مجبور تھا بیکس تھا۔ ایک چھوٹے دالان میں اپنا اور اپنی ماں کا پلنگ بچھایا۔ ایک پلنگ پر خود اور رشید دوسری پر اس کی ماں چھوٹا بچہ وحید اور زبیدہ لیٹی۔ سردی کا موسم اور رات کو پانی کا برسنا۔ سرد ہوا سینے میں تیر کی طرح لگتی تھی۔ جس مصیبت سے ان غریبوں نے رات گذاری خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ صبح کو جب عزیز اٹھا تو اس کی ماں کراہ رہی تھی۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ سینے میں درد ہے۔ زبیدہ نے کڑوا تیل گرم کر کے سینہ پر مالش کی لیکن اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا

دوسرے دن شام کو سعیدہ اپنے بڑے لڑکے عزیز کو اپنے پاس بٹھا کر دیر تک سمجھاتی رہی پھر کہا " مجھے نمونیا ہوگیا ہے میں پہلے ہی کمزور تھی اور اب تو یہ مرض شاید . . . . . . اس کے شدت الم سے اس کی آواز نہ نکل سکی۔ پھر اس نے کہا۔ بھیا ! میں موت سے نہیں ڈرتی۔ اور نہ مجھے مرنے کا افسوس ہے لیکن تم لوگوں کا خیال ہے کہ خدا جانے میرے بعد تم لوگوں کی کیا حالت ہو۔ خیر جیسی اس کی مرضی؛ ہم سب اس کے مجبور بندے ہیں جس طرح چاہے رکھے۔ میں دیکھتی ہوں جب میری زندگی میں تم لوگوں پر ظلم توڑے جا رہے ہیں، مصیبتیں ڈھائی جا رہی ہیں تو خدا جانے میرے بعد کیا کچھ تم لوگوں کو تکلیفیں نہ پہنچائی جائیں گی۔ اس لئے بیٹے! صبر کرنا اور اس کی رحمت کے منتظر رہنا۔ دُنیا میں اپنا کوئی ہمدرد نہیں ہے کوئی عزیز نہیں ہے۔ اس لئے تم سب کو خدا کے سپرد کئے جاتی ہوں جس حال میں بھی رکھے۔ ہاں البتہ یہ کرنا کہ صالحہ کو ایک خط لکھ دینا کہ وہ وحید کو اپنے پاس بلا لیں وہ ابھی بچہ ہے یہاں وہ ظلموں کی تاب نہ لا سکے گا۔ مجھے امید ہے کہ وہ ان کے پاس آرام سے رہے گا "

عزیز پہلے تو حیران تھا کہ ماں کہہ کیا رہی ہے۔ اور جب اسے معلوم ہوا کہ میرے زخمی دل پر صبر کا مرہم رکھنے والی میری ہمدرد، غمگسار اور میری مصیبتوں میں برابر کا حصہ لینے والی ماں بھی مجھکو تین ہستیوں کی ذمہ دار بنا کر دوسرے عالم کو سفر کرنے والی ہے تو اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اور بے اختیارانہ ماں کے سینہ پر گر پڑا

سعیدہ دیر تک بیہوش عزیز کو سینے سے لگائے روتی رہی۔ جب طوفان اشک کچھ کم ہوا تو زبیدہ کو جو صحن میں بیٹھی ہوئی وحید اور نعیم کے بچے علیم کو کھلا رہی تھی اپنے پاس بلایا اور جب وہ آئی تو اس سے کہا کہ مٹی کے ڈھیلے کو تر کر کے بیہوش بھائی کو سنگھا دے۔ وہ غریب حیران کہ بیٹھے بیٹھے بھائی کو کیا ہوگیا۔ کچھ دیر میں جب عزیز کو ہوش آیا۔ تو ماں نے تاثرانگی کے لہجہ میں کہا۔ " بیٹے ! میں نے تمھیں صبر کی تلقین کی اور تم نے اتنی جلد اُسے بھلا دیا۔ دنیا میں

کیسے آرام و دوام حاصل ہوا ہے۔ ابھی تمہیں دنیا اور دنیا والوں سے بہت کچھ نصیحتیں اور تلخ تجربے حاصل کرنا ہیں ماشاء اللہ سمجھ دار ہو اگر ابھی سے ہمت ہار دوگے تو تمہارے بہن بھائیوں کا خدا حافظ اس لئے صبر و استقلال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔" پھر عزیز سے کہا کہ کلام مجید لاکر مجھے سناؤ۔ غریب عزیز مجبوری اور بیکسی کی تصویر بنا ہوا اٹھا۔ اور قرآن شریف ماں کے سرہانے بیٹھ کر پڑھنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ الفاظ اس کے منہ سے ضرور نکل رہے تھے لیکن بلا غور کئے اور سمجھے ہوئے۔ اگر اس کے دماغ میں کوئی خیال تھا تو صرف یہ کہ۔ کیا ہونے والا ہے۔ فہیم کی ماں نے کلام مجید غیر وقت پڑھتے ہوئے سنا تو نہ جانے کیا خیال کر کے دالان میں آگئیں ان کے ساتھ ان کی بہو نعیم کی بیوی بھی تھیں۔ محلہ کی دو چار عورتوں نے سنا تو وہ سب دوڑی آئیں۔ دیر تک سعیدہ سب سے اس طرح معافی مانگتی رہی کہ اگر اس نے کسی کے ساتھ اپنی زندگی میں کوئی برائی کی ہو تو وہ اسے معاف کر دے۔ چھوٹا بچہ وحید گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ آخر یہ مجمع کیوں ہے۔ آخر وقت تک سعیدہ باہوش حواس سب سے باتیں کیا کی شب میں گیارہ بجے کے قریب یک بیک اس نے کلمہ طیبہ پڑھنا شروع کیا چھوٹے بچے اور بچی کو سینے سے لگا کر رشید کے زخمی ہاتھ کو بوسہ دیا اور چراغ سحری کی طرح گل ہو گئی

(۴)

بدنصیب عزیز اب ہر وقت مغموم رہتا۔ کڑھتا۔ اور تنہائی میں اپنی بیکسی پر زار زار روتا۔ صالحہ بیگم عزیز کی والدہ مرحومہ کے فاتحہ چہلم میں آئی تھیں اور جاتے وقت اپنے ہمراہ وحید کو قصبہ "باڑھ" (جہاں وہ رہتی تھیں اور ان کی جائداد تھی) لیتی گئی تھیں۔ جس وقت صالحہ بیگم نے فہیم کی والدہ سے وحید کو لیجانے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ کسی طرح راضی نہ ہوئیں اور کہا "بیٹا! میں علیم اور وحید کو دیکھ دیکھ کر جیتی ہوں۔ اگر تم اسے لے گئیں تو میں تو پاگل ہو جاؤں گی تم خود جانتی ہو کہ بچوں سے مجھے کتنی محبت ہے۔" لیکن صالحہ بیگم اس جان لیوا محبت کو خوب جانتی تھیں اس لئے انھوں نے صاف صاف کہدیا کہ چونکہ مومانی کی وصیت تھی کہ وحید میرے پاس رہے اس لئے میں اسے یہاں کسی طرح نہیں چھوڑ سکتی۔ عزیز اپنے بھائی وحید کے جانے سے بہت کچھ سبکدوش ہو چکا تھا۔ پھر بھی اس کی تکالیف میں کوئی کمی نہیں ہوئی بلکہ اضافہ ہی ہوتا گیا۔ کیونکہ جب تک اس کی ماں زندہ تھی اس کے اور اس کی بہن بھائیوں کے مصائب میں برابر کا حصہ لینے والی تھی۔ جس بچہ کو تکلیف پہونچتی اسے سمجھاتی۔ بہلاتی۔ حتیٰ کہ اس کا خیال ہٹ جانے سے غم مٹ جاتا۔ لیکن اب وہ کیا کرتا؟ اسے اس کا سلیقہ نہیں تھا کہ جب اس کے بھائی رشید پر اس کے سوتیلے بھائی نعیم یا فہیم بگڑ دیں۔ خصوصاً اسے گھر سے نکل جانے کی دھمکی دیں۔ یا اس سے اس طرح کہیں کہ "کمبخت تو بھی جا کہ جھگڑا پاک ہو" تو اس کے مغموم دل کو کس طرح سمجھا دے کیونکر بہلا کر اس کے رنجیدہ دل کو تسکین دے۔ وہ اپنی ماں کی زندگی میں دیکھتا تھا کہ

جب زبیدہ پر گھر میں کوئی خفا ہوا اور اس نے رنجیدہ صورت بنا کر ماں سے شکایت کی تو وہ اسے یوں کہکر بہلادیا کرتی تھی " کیا ہوا بیٹا اگر تمھارے بھاوج تم پر ناراض ہوئیں تو خفا ہونے کی کیا بات تمھاری ہی تو غلطی تھی۔ حلیم اتنی دیر سے رو رہا ہے کیوں نہ تم نے اسے گود میں لے لیا " لیکن اب ۔ ۔ ۔ ۔ آہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب وہ نہیں جانتا تھا کہ جب زبیدہ پر کوئی خفا ہو کوئی جھڑکے اور وہ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے اس کی طرف دیکھے تو وہ اسے کیا کہکر سمجھاوے۔ اکثر ایسا ہوا کہ جب وہ باہر سے گھر میں آیا تو بہن کو روتا ہوا پایا۔ لیکن اس خیال سے کہ اگر بہن نے مجھ سے کسی کی کچھ شکایت کی تو میں کچھ نہ کہہ سکوں گا۔ وہ دل کو ہاتھوں سے پکڑے ہوئے پھر باہر چلا گیا

اس کا روز کا معمول یہ تھا کہ صبح اٹھ کر ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد بازار سے گھر کا سودا لاتا۔ پھر کچھ دیر بہن کو پڑھاتا دوپہر کو بڑے بھائیوں کو کھانا کھلا کر جو کچھ اسے ملتا خود کھاتا اور اپنے چھوٹے بھائی اور بہن کو کھلاتا۔ اکثر وہ اپنے دل میں غور کرتا کہ اللہ اکبر جس باپ نے مجھے اس شفقت سے پالا اور پرورش کیا اگر آج وہ زندہ کردیا جائے اور ہم لوگوں کو آکر دیکھے تو کیا کہے۔ اور پھر اس خیال سے اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ آجاتی کہ تکلیفیں ہمیشہ نہیں ہوا کرتیں کبھی تو راحت اپنا چہرہ دکھائے گی۔ اسے اس کا سخت ملال تھا کہ اس کی زندگی برباد ہو رہی ہے نہ تو اسے تعلیم دی گئی۔ نہ کوئی کام سکھایا گیا۔ اور جب وہ کوئی کام اپنی خوشی سے کرنا چاہتا ہے تو اس کی راہ میں بیسیوں روڑے اٹکا دیے جاتے ہیں۔ وہ سوچا کرتا " آخر مجھے اس طرح بے بس کرکے رکھنے سے بھائیوں کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ شاید یہی کہ گھر میں کوئی نوکر نہیں۔ یا یہ کہ میں ہمیشہ خادم کی طرح ان لوگوں کی خدمت کروں اور یہ ہم لوگوں کی جائداد سے خوب نفع حاصل کریں " اسے بھائیوں کی خدمت سے عار نہ تھا۔ لیکن وہ اس کا حقیر صلہ یہی چاہتا تھا یعنی کہ کسی وقت تو اس کو محبت آمیز لہجہ میں مخاطب کریں کبھی تو اس سے اخلاق سے پیش آدیں۔ لیکن نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ محبت کا لفظ اس کے نزدیک ایک بے معنی لفظ تھا۔ ایک ایسا مہمل لفظ جس کا صحیح مفہوم دنیا سے اٹھ چکا تھا۔ اور جس کا اطلاق اب خودغرضی مطلب پرستی پر ہونے لگا تھا۔ اس سے اور اس کی بہن بھائیوں سے محبت کرنے والے دنیا سے اٹھ چکے تھے اور اُسے ان خودغرض دنیا والوں کے مصائب برداشت کرنے کو چھوڑ گئے تھے

---

جب سے رشید کی ماں کا انتقال ہوا تھا وہ ہر وقت رنجیدہ رہتا۔ اس کی ماں کو دوسرے عالم میں گئے ہوئے چھ ماہ ہو گئے تھے اور اس مدت میں عید اور بقرعید جیسے خوشی کے تہوار بھی گذر گئے لیکن کبھی کسی نے اس کے چہرہ پر مسکراہٹ نہیں دیکھی۔ کبھی کسی نے اسے ہنسکر بات کرتے نہیں دیکھا۔ وہ روتا بھی نہیں تھا۔ ماں کے

انتقال کے دن تو خیر وہ دن بھر رویا اور اس کے دوسرے دن بھی۔ لیکن پھر......؟..... شاید اس کی آنکھوں میں کسی نے آنسو بھی جھلکتا نہیں دیکھا۔ وہ اب سوچا کرتا۔ اسے ہر وقت کوئی خیال رہتا۔ لیکن...... اس نے کبھی اپنے خیال کو کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ وہ حد درجہ صابر اور ضابط تھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ گھر کے کسی کام کے نہ کرنے کے قصور میں اسے گھر سے نکال دیا گیا۔ دو دو دن تک گھر میں اسے آنے نہ دیا گیا اور اس نے محلہ کی مسجد میں فاقے سے پڑا رہ کر دن گذار دیے۔ اسے نہ تو کھانے کی پرواہ تھی نہ سونے کی فکر۔ اس کا محبوب ترین یہ مشغلہ تھا کہ یا تو وہ گھر میں کسی کپڑے سے منہ ڈھانپے پڑا رہے۔ اور یا کسی ویرانے میں دونوں زانوؤں میں سر ڈالے بیٹھا کچھ سوچا کرے۔

عزیز کو سخت کوفت ہوتی جب وہ شام کو رشید کو تلاش کرتا اور وہ نہ ملتا یہاں تک کہ اسے ڈھونڈھتا اور لوگوں سے پوچھتا کسی ویرانے یا جنگل میں نکل جاتا جہاں اسے رشید اس حال میں ملتا کہ کسی درخت سے لپٹا ہوا خاموش کھڑا ہے۔ وہ اسے سمجھاتا۔ بہلاتا۔ اور دریافت کرتا کہ آخر اسے کیا تکلیف ہے اور جواب نہ ملنے پر اس کو جھڑکتا اور خفا بھی ہوتا۔ لیکن مظلوم رشید جواب میں اس کی طرف ایک ایسی نظر سے دیکھ لیتا جس میں ایک ہی وقت میں نفرت وحقارت، یاس وحرماں کے جذبات موجزن ہوتے۔ اسے اب کسی سے محبت نہیں تھی وہ اہل دنیا کی بے وفائیوں سے تنگ آگیا تھا۔ درحقیقت وہ اپنی تکلیف کو بھائی سے کیا بتاتا جبکہ اس کے پاس الفاظ ہی نہیں تھے۔ وہ اپنے درد نہاں کو کیسے دکھاتا جبکہ وہ دکھانے کی چیز ہی نہ تھی۔ اس کی شفیق ماں مرچکی تھی۔ وہ کہ جس نے اس کو بڑی مصیبتوں سے پالا تھا اس کے ہر جا وبیجا ناز اٹھاتی اور ضد پوری کرتی تھی اب دنیا سے جا چکی تھی۔ اس پر ظلم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے اور کوئی اسے تسلی دینے والا نہ تھا۔ اس کا دل لعنت وملامت اور طعن وتشنیع کے تیروں سے چھلنی کر دیا جا چکا تھا۔ بعض وقت عزیز اس کی بیکسی اور ہر وقت کی خاموشی پر کڑھتا اور اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر رونے لگتا۔ لیکن رشید خاموشی سے اس کے ہاتھوں کو اپنے گلے سے علیحدہ کر کے الگ ہٹ جاتا

(۵)

ہر وقت کی خاموشی نے رشید کی صحت پر بہت برا اثر کیا۔ یوں بھی وہ دائم المرض تھا لیکن اب تو اور گھلنے کو ٹھیلنے کا بہانہ ہو گیا ـــــ رشید عمر میں عزیز سے دو سال چھوٹا تھا۔ اور اب اس کی عمر سولہ برس کے قریب تھی لیکن غم واندوہ نے اسے قبل از وقت مسن بنا دیا تھا۔ عزیز نے اسے لاکھ سمجھایا۔ قسمیں دیں۔ منتیں کیں کہ خدا کے لئے وہ اپنی اس خاموشی کو چھوڑے۔ لیکن اس نے ہر سوال کا جواب ہمیشہ خاموشی سے دیا

ایک روز تمام دن رشید گھر نہیں آیا، یوں بھی وہ گھر بہت کم آتا تھا لیکن آج شام کو بارش ہو جانے سے عزیز

کو اس کی طرف سے تشویش ہو گئی تھی۔ وہ اس کی طبیعت سے واقف تھا سوچا کہ خدا جانے کس ویرانے میں پڑا ہو اس لئے جب بعد مغرب بھائی آیا تو وہ اسے ڈھونڈھنے نکلا۔ بمشکل تمام اسے وہ آدھ گھنٹہ کی تلاش میں ایک کھنڈر میں درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا ملا۔ عزیز اس کی روزانہ کی ان حرکتوں سے تنگ آگیا تھا۔ اس لئے اس نے غصہ کے لہجہ میں کہا " آخر رشید تمہارا کیا مطلب ہے، تم کیوں مجھے پریشان کرتے ہو، میرے لئے میری مصیبتیں ہی کیا کم ہیں جن میں تم اور اضافہ کرتے ہو، صبح کے غائب اب اس وقت رات کو تم یہاں بیٹھے ملے ہو، نہ کھانے کی فکر نہ پانی کی پرواہ۔ کیا جان دو گے؟ " رشید نے ایک مرتبہ بھائی کی طرف دیکھ تو لیا لیکن جواب کچھ نہ دیا۔ عزیز نے دوبارہ کہا۔ " بولو رشید تم آخر جواب کیوں نہیں دیتے کیا گونگے ہو، چلو گھر " لیکن رشید اب بھی خاموش تھا گویا وہ کسی کا مخاطب نہیں ہے اور یہاں بالکل تنہا ہے۔ مجبور ہو کر عزیز نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کہا " چلو گھر " رشید نے بھائی کے ہاتھ کی گرفت سے اپنے کو آزاد کرتے ہوئے کہا۔ " بھائی جان آخر آپ مجھے کیوں پریشان کرتے ہیں، آپ جائیے جب میری طبیعت چاہے گی تب آؤں گا " عزیز نے یہ کہتے ہوئے کہ " نہیں تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا " اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ لیکن وہ استقلال سے زمین پر بیٹھ گیا اور دردناک آواز میں کہنا شروع کیا۔

" بھائی جان! مجھے کن کن باتوں میں آپ کی پیروی کرنی پڑے گی۔ گھر جاتا ہوں تو ظالموں سے نجات نہیں ملتی کہیں تنہائی میں بیٹھتا ہوں تو آپ بیٹھنے نہیں دیتے۔ " اب اس کی آواز گلوگیر ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے پھر کہا " ظالموں سے آپ ہی نباہ کیجئے۔ آپ ہی ان کے ساتھ رہیئے۔ میری دنیا اجڑ چکی، میرا گھر ویران ہو چکا۔ مجھ کو میرے حال پر چھوڑیئے کہ میرا مرض لاعلاج ہے۔ میرا اب کوئی رفیق نہیں کوئی شفیق اور ہمدرد نہیں " پھر دفعتہً بھائی کے گلے سے لگ کر وہ رو رو کر کہنے لگا۔ " بھائی جان! آپ کو کس طرح سمجھاؤں جو میرے دل پر گذرتی ہے میں ویرانوں میں مارا مارا پھرتا ہوں کہ کوئی سانپ ہی ڈس لے مگر بدقسمت کو کوئی نہیں پوچھتا۔ دیکھئے...... یہ دیکھئے!...... اور اس نے گلے سے ایک چھوٹی سی تعویذ نما پوٹلی اتارتے ہوئے کہا " آپ جانتے ہیں اس میں کیا ہے؟..... اس میں اماں کی قبر کی مٹی ہے۔ میں اسے چھ مہینہ سے سینہ سے لگائے پھرتا ہوں۔ وہ زندگی میں مجھے اپنے سینے سے لگائے رہتی تھیں تو اب میں اس کی خاک کو چھاتی سے لگائے پھرتا ہوں۔ مجھے اگر کچھ تسکین ہوتی ہے تو اسی سے اور اسی مٹی میں اب ملنا چاہتا ہوں۔ آپ کی...... محض آپ کی لاپرواہی سے اماں نے صدمے اٹھا اٹھا کر اور تکلیفیں برداشت کر کے جان دی " اور پھر بھائی کی گردن سے ہاتھوں کو علیحدہ کر کے وہ پاس کے درخت سے لپٹ گیا اور غصہ سے کہنے لگا۔ " بیشک میں تو یہ کہوں گا کہ اس کی جان آپ نے لی کیوں آپ نے نہ اپنے حقوق طلب کئے اور نہ میرے کیوں نہ آپ نے ان لوگوں سے کہا کہ اثاث البیت اور زمین سے ہم لوگوں کا حصہ علیحدہ کر دو۔ کیوں آپ یہ کہنے سے خاموش رہے کہ اگر سب نہیں دینا چاہتے ہو تو کچھ تو دو۔ کچھ مہینہ ہی بعد

دو گز میں ماں کو الگ لے کر رہوں۔ غضب خدا کا جن لڑکوں کے مکان و جائداد کی آمدنی ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ ہو ان کی ماں یوں پیسہ پیسہ کو محتاج ہو جس کی ماں کے ذاتی دو دو مکان ہوں۔ وہ یوں ایک کوٹھری میں سسک سسک کر جان دے۔ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے، آپ نے صبر کیا اور یہ سوچا کہ اللہ میاں آپ کی مصیبتوں کو آپ سے دُور کر دیں گے، تو اطمینان رکھئے کہ خدا ایسا رحیم نہیں ہے کہ بغیر ہاتھ پیر ہلائے آپ کے منہ میں سونے کا نوالہ دیدے۔ جب آپ خود اپنی مدد نہیں کر سکتے تو اسے کیا پڑی ہے کہ آپ کو خاک سے اٹھا کر کاخ پر بٹھا دے"

عزیز کے پاس رشید کے سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ دیر تک بیٹھا وہ اپنی حالت پر نفریں کرتا اور روتا رہا پھر اس نے کہا: "اچھا میاں جو تم کہو گے میں کروں گا لیکن اب تو گھر چلو۔ بجلی چمک رہی ہے اگر پانی برسنے لگا تو پہونچنا دشوار ہو جائے گا" بمشکل عزیز رشید کو گھر تک لانے میں کامیاب ہوا۔ لیکن مشکل یہ پڑی کہ گھر کا دروازہ نہیں کھولا جا رہا تھا۔ جب چیختے چیختے عزیز کا گلا بیٹھ گیا تو اندر سے جواب ملا "یہاں تمھارا کوئی نوکر نہیں ہے کہ رات کو دس دس بجے جب گھوم کر آؤ تو دروازہ کھولا جائے" زبیدہ آ رہی تھی لیکن عزیز نے باہر سے سنا کہ اسے یہ کہکر ڈانٹا جا رہا ہے کہ "خبردار اگر پلنگ سے اٹھی تو تجھے بھی باہر نکال دوں گی" مجبور ہو کر عزیز و رشید محلے کی مسجد میں شب بسر کرنے چلے گئے۔

(۶)

عزیز کا چچازاد بھائی "نہال" آرہ میں رہتا تھا۔ وہاں اس کی کپڑے کی دوکان تھی۔ کبھی کبھی وہ پٹنہ بھی آتا اور عزیز سے کہتا کہ وہ اس کے ساتھ آرہ چلے اور وہاں وہ اس کے پاس رہ کر کوئی کام سیکھے اسنے بتایا کہ وہاں اگر وہ ملازمت کرنا چاہے تو قریب ہی "بھیٹہ" کے کارخانہ شکر سازی میں اس کے لئے نوکری کی کوشش کی جائے گی۔ اور یا پھر آرہ میں اس کی ایک موٹر کمپنی کے مالک سے دوستی ہے اس سے کہہ دیا جائے گا کہ وہ اس کو کام سکھائے۔ دراصل نہال کو عزیز سے بیحد محبت تھی وہ عمر میں عزیز سے پانچ چھ برس بڑا تھا۔ لیکن اکثر دیکھا گیا کہ اس نے عزیز کی ایک حقیقی بڑے بھائی کی طرح عزت کی۔ خاندانی ناچاقیوں کے سبب سے نہال جب پٹنہ آتا تو فہیم کے یہاں ٹھیرنے کے بجائے وہ اپنے کسی دوست کا مہمان ہوتا۔ لیکن اسے عزیز اور اس کے بھائی بہن کی تکالیف کی اطلاع ملتی رہتی۔ ایکی مرتبہ جب وہ پٹنہ آیا تو اس نے عزیز کو اپنے ساتھ چلنے کے لئے بیحد اصرار کیا۔ اس نے کہا "آخر تمھارے یہاں رہنے ہی سے کیا فائدہ ہے۔ تم اپنے بھائی بہن کی یہاں کون سی مصیبت دُور کرتے ہو۔ سوائے اس کے کہ تمھیں دیکھ کر ان کو کوفت ہو اور انھیں دیکھ کر تم کو صدمہ" اس نے بتایا کہ اگر کوشش کر کے کام سیکھا جائے تو چھ ماہ میں بخوبی موٹر کا کام آجائیگا

اور پھر کام سیکھنے کے بعد کوشش کرنے سے بیسیوں جگہ نوکری مل سکتی ہے۔ چنانچہ جاتے وقت وہ عزیز کو اپنے ہمراہ لے گیا

"آرہ" پہونچ کر عزیز نے موٹر کا کام سیکھنا مناسب سمجھا۔ اور نہال نے بھی یہی رائے دی کہ موٹر ڈرائیوری بہر حال ایک ہنر ہے اور اس کام کو سیکھنے کے بعد ہر شہر میں وہ اس سے نفع اٹھا سکتا ہے۔ لیکن "شکر کا کارخانہ" ہر جگہ نہیں ہوا کرتا۔ چنانچہ عزیز نے اس کام کو سیکھنا شروع کیا۔ وہ صبح اٹھتا۔ نہال اور وہ ساتھ ہی ناشتہ کر کے بازار تک ساتھ آتے نہال اپنی دوکان پر رہ جاتا اور وہ کمپنی چلا جاتا جہاں وہ بارہ بجے تک کام سیکھنے کے بعد گھر کھانا کھانے کے لئے آتا اور پھر کارخانہ جا کر شام تک کام سیکھتا

عزیز کو یہاں آئے ہوئے اب چار مہینہ ہو چکے تھے اور اس کی جانفشانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ موٹر کا کام بخوبی سیکھ چکا تھا۔ اسے بیحد خوشی تھی کہ کوئی دن میں وہ اپنی قوت بازو سے روزی حاصل کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ اور تب وہ اپنے بھائی رشید اور بہن زبیدہ کو اپنے پاس لا کر ان کے مغموم دل کو اپنی عملی محبت اور الفت کا ثبوت دے کر گذشتہ صدمات کی تلافی کرے گا۔ جب سے وہ یہاں آیا تھا اسے اپنے بھائی بہن کی کوئی خیریت نہیں معلوم ہوئی تھی۔ اسے وحید کی طرف سے تو اطمینان تھا کہ وہ پھوپھی زاد بہن "صالحہ" کے پاس آرام سے ہوگا۔ لیکن رشید اور زبیدہ ؟ وہ نہیں جانتا تھا کہ میرے آنے کے بعد ان پر کیا کیا ستم ڈھائے گئے ہیں۔ اور اس لئے اکثر وہ متفکر اور رنجیدہ رہتا

ایک دن جب وہ کارخانہ سے دوپہر کو گھر پہونچا تو اُسے اپنے نام کا ایک خط ملا۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس نے خط کو جلدی جلدی پڑھنا شروع کیا۔ یہ خط پٹنہ سے اس کے محلے کے ایک ہمسایہ کے پاس سے آیا تھا جو کبھی عزیز کے مرحوم باپ کا دوست تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ "تمہاری چچی (اس کی بیوی) گذشتہ نیم فرصت تمہارے گھر گئی ہوئی تھی وہاں سے آنے پر اس نے بتایا کہ رشید بہت بیمار ہے۔ اسے دق ہے۔ پاؤں میں ورم آ گیا ہے۔ دست بھی جاری ہیں۔ رشید نے اس سے کہا تھا کہ ایک خط بھائی کو میری حالت کا لکھ دیا جائے۔ اس لئے تمہیں یہ خط لکھا جا رہا ہے کہ خط ملتے ہی تم پہلی ٹرین سے یہاں آ جاؤ۔" خط پڑھکر رشید کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی "یارب! کیا ہونے والا ہے۔ کیا اب بھائی بھی داغ جدائی دے جائے گا۔ آہ..... کیوں نہ ہم سب کو ایک ہی وقت میں موت آ جائے کہ کوئی کسی کا صدمہ نہ دیکھے" اس کی آنکھیں ساون بھادوں کا نقشہ پیش کر رہی تھیں۔ وہ اپنے دل میں خیال کرتا کہ "ابھی کل تک کیا کیا سبز باغ اپنے بھائی بہن کے لئے تیار کئے تھے۔ کیسا کیسا دل میں خوش ہو رہا تھا کہ نوکری ملنے پر اپنے پاس یوں لاؤں گا۔ اس طرح ان کو آرام پہونچاؤں گا۔ اگر وہ مجھ سے کبھی ناراض ہو جائیں گے تو یہ کہکر ان کو مناؤں گا۔ غرض ہر وقت ان کی راحت

وآرام کی مجھے فکر رہے گی۔ لیکن ...... آہ ..... فلک ستم ظریف کو یہ بھی نہ بھایا کہ اپنے خیالی باغ کی بھی سیر کرلوں" اس کی چچی (نہال کی والدہ) اسے سمجھا رہی تھی۔ کہ نہال بھی کھانا کھانے گھر آگیا۔ خط پڑھا۔ اور دیر تک اس کی بدنصیبی پر افسوس کرتا رہا۔ شام کو نہال نے دوکان سے آکر پچیس روپے عزیز کو دیے اور اسے پٹنہ روانہ کر دیا۔ چلتے وقت وہ عزیز کو اسٹیشن تک پہنچانے آیا اور اس سے کہا کہ اگر خرچ کی ضرورت ہو تو تار دے کر اسے مطلع کیا جائے یہاں سے وہ بذریعہ تار روپیہ روانہ کردے گا۔ اور دیر تک اسے سمجھاتا رہا

پٹنے سے جب عزیز آرہ آیا تھا تو نہ تو اس نے بھائیوں سے اجازت لی اور نہ ان سے بتایا کہ میں آرہ کس غرض سے جا رہا ہوں۔ وہ خوب جانتا تھا اگر ان لوگوں کی اجازت پر میرا جانا ہوا۔ تو میرا آرہ پہونچنا معلوم۔ یا اگر ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ میں جا رہا ہوں تو میرے راستے میں ہزاروں غار کھود دے جائیں گے۔ اور میں مجبور ہو کر پھر ان کے رحم وکرم پر پڑ جاؤں گا۔ اس لئے جب وہ رشید کی بیماری کا خط پاکر پٹنہ پہونچا تو سب نے اس سے بیزاری کا اظہار کیا کوئی اس سے مخاطب نہ ہوا۔ نعیم صاحب تو اتنا متاثر ہوئے کہ دوسرے دن وہ کلکتہ گھومنے چلے گئے۔ اس نے رشید کو اس حال میں پایا کہ مرحومہ ماں کا جس جگہ انتقال ہوا تھا اس کا پلنگ پڑا تھا۔ شاید اس نے خود کہکر اس جگہ پلنگ بچھوایا تھا۔ چھوٹی بہن نے بانده کو بیچ پلنگ سے کاٹ دیا تھا۔ اس لئے کہ اسے ہر وقت دست آیا کرتے تھے وہ بالکل برہنہ چارپائی پر لیٹا تھا اور مرحومہ ماں کا ایک دوپٹہ اس کی سترپوشی کر رہا تھا۔ لاغر اتنا کہ وہ اپنا سایہ معلوم ہوتا۔ جس وقت وہ گھر پہونچا ہے تو یہ دیکھ کر اس کے آنسو نکل پڑے کہ چھوٹی بہن منہ پھیرے ہوئے اسے استنجا کرا رہی ہے۔ اور گھر کے سب لوگ اس کی ہوا سے بچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ زبیدہ نے اتنا عرصہ کے بعد جو بھائی کو دیکھا تو وہ رونے لگی۔ شاید یہ خیال کرکے کہ میری تکلیفیں بتانے سے آپ ہی گھبرا کر چلے گئے۔ عزیز نے اسے سمجھایا اور رشید کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کے تمام جسم کی روح کھنچکر چہرے میں آگئی تھی۔ عزیز کو تعجب تھا کہ جب جسم اسقدر نحیف وضعیف ہو رہا ہے تو چہرہ پر کیوں اسقدر رنگ ہے۔ اس کی آنکھیں اسقدر خوشنما ہو گئی تھیں کہ عزیز دیر تک انھیں دیکھتا رہا۔ اب اس کی آنکھوں میں خوف وہراس یاس وناامیدی کے جذبات نہیں تھے بلکہ اطمینان وسکون، آرام وراحت کی جھلک ان میں پائی جاتی تھی۔ اس کو جسمی تکلیف تو تھی ......... لیکن اس کی روح اپنی آزادی کی جد وجہد میں خوش ہو رہی تھی۔ انتہائی کمزوری کے سبب سے رشید بول نہ سکتا تھا۔ البتہ جب اس کے منہ کے پاس کان لگا کر غور سے سنا جاتا تو کسی قدر آواز سنائی دیتی۔ مرحومہ ماں کی قبر کی مٹی اب بھی کپڑے میں بندھی ہوئی اس کی کلائی میں بندھی ہوئی تھی

عزیز کو دیکھ کر اس نے کہا۔ بھائی جان! اچھا ہوا کہ آپ چلے آئے۔ میں تو بالکل مایوس ہو چکا تھا لیکن شکر ہے کہ مجھے آخری وقت میں آپ کا دیدار نہ ہونے کا صدمہ نہیں برداشت کرنا پڑا۔ آپ کے جانے کے قبل

ہی سے مجھے حرارت رہتی تھی لیکن میں نے کبھی آپ سے بھی نہیں بتایا کہ آپ کرتے ہی کیا۔ آپکے جانے کے بعد کچھ دنوں تو میں اس قابل رہا کہ چل پھر سکوں لیکن رفتہ رفتہ میری طاقت مجکو جواب دینے لگی اور آج آپ دیکھتے ہیں کہ میں پلنگ سے بالکل لگ گیا ہوں۔ مجھے اس کی خوشی ہے کہ اب میں اماں سے ملنے جا رہا ہوں اور ساتھ ہی اس کی بھی خوشی ہے کہ آپ کو بھی میری فکروں سے نجات مل جائے گی۔ لیکن خدا کے لئے میرے بعد زبیدہ کو یہاں نہ چھوڑیے گا۔ جب سے میں پڑا ہوں یہ غم میں گھلی جا رہی ہے اور اگر اس کو یہاں کچھ دنوں اور رہنا پڑا تو شاید ........ اس کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ رشید نے یہ بھی عزیز سے کہا تھا کہ آج تک میں نے بھائیوں سے کسی قسم کی امداد نہیں چاہی نہ ان کو اپنا علاج کرنے کی زحمت دی۔ اور نہ کبھی یہ خواہش کی کہ میری تیمارداری کریں۔ وحید کے لئے ایک دفعہ ضرور کہا تھا کہ اسے بلوا دیجئے تاکہ اسے بھی ایک نظر دیکھ لوں۔ لیکن جواب میں ہنسکر اس سے کہدیا گیا کہ " آپ ہی نے تو اسے وہاں بھجوایا تھا۔ اور اب یہاں اسے آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ میرے گھر میں اس کا کوئی کام نہیں اور نہ کوئی اسے لائے گا" اس کے بعد پھر رشید نے کبھی کچھ نہیں کہا

مسلسل صدمات اٹھانے سے عزیز اب بالکل کھو چکا تھا۔ وہ نہ تو روتا نہ افسوس کرتا ہر وقت چپ بیٹھا ہوا رشید کو دیکھا کرتا۔ اسے پٹنہ آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ آج رشید کی حالت بہت خراب تھی۔ لیکن صبر و استقلال کا مجسمہ زبان سے اُف بھی نہ کہتا۔ برسات کا زمانہ تھا اور دو روز سے ہر وقت بوندا باندی ہوتی تھی جب عزیز آرہ سے آیا تھا۔ تو اس نے چاہا تھا کہ کسی حکیم یا ڈاکٹر کو رشید کو دکھلا دیا جائے لیکن رشید نے خود اس کو منظور نہیں کیا۔ محلہ کے لوگوں نے بھی عزیز سے کہا کہ اس مرض کا مریض برسات میں کم بچتا ہے اور پھر ایسی نازک حالت میں اس کو دوائیں پلانا اس پر ظلم کرنا ہے۔ اس کی غذا ہفتوں سے چھوٹ چکی تھی۔ اب صرف پانی ہی اس کی دوا اور غذا تھا۔ کبھی سادہ اور کبھی شربت کی صورت میں عزیز اس کی حلق دو چار چمچوں سے ترکر دیا کرتا

شب کا ایک بج چکا تھا۔ ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ پتنگوں کی وجہ سے لالٹین کی روشنی دھیمی کر کے علیحدہ رکھدی گئی تھی۔ آج رشید کی زبان میں قدرت نے جانے کہاں کی قوت گویائی عطا کر دی تھی کہ وہ تمام دن باتیں کرتا رہا۔ رات کو گیارہ بجے تک زبیدہ اس کے پاس بیٹھی رہی اس سے کبھی تو اس قسم کی باتیں کرتا کہ وہ بے اختیار بار بار رو دیتی۔ مثلاً " دیکھو زبیدہ اگر میرے بعد تم روئیں تو میری روح کو بڑی تکلیف ہوگی " کبھی کہتا " سبھی مریں گے پھر اگر میں مرتا ہوں تو کیا نئی بات کرتا ہوں۔ کیا تم ہمیشہ زندہ رہوگی زبیدہ " اور کبھی بالکل بے معنی اور وقت کے لحاظ سے مہمل گفتگو کرتا۔ جیسے " برسات

میں آنکھ سے پانی کیوں برستا ہے " یا " بھائی جان ! کون کون ساتھ جائے گا " آخر پریشان ہو کر عزیز نے زبیدہ کو زبردستی وہاں سے یہ کہکر ہٹا دیا کہ کئی روز سے وہ بالکل نہیں سوئی اور یہاں بیٹھ کر پریشان ہو رہی ہے اس لئے جاکر سو رہے

عزیز بھائی بالکل پاس بیٹھا ہوا تھا۔ جب بجلی چمکتی تو اس کی روشنی میں وہ دیکھتا کہ رشید چپ آنکھ بند کئے پڑا ہے۔ شاید اب بھی وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ کبھی اس کی تنفس کی رفتار اسقدر تیز ہو جاتی کہ جیسے دھونکنی چلتی ہے اور کبھی اسقدر سست کہ اس کی طبیعت گھبرانے لگتی۔ اور دل دھڑکنے لگتا۔ وہ خاموش بیٹھا ہوا اپنا رومال آنسوؤں سے بھگو رہا تھا اور سوچتا جاتا تھا کہ کیا مجھ سے بھی زیادہ کوئی اس دنیا میں بیکس ہے ، مجھ سے بھی زیادہ کوئی بدنصیب ہے۔ کہ یہاں سے دس قدم کے فاصلہ پر دوسری دالانوں اور کمروں میں لوگ سو رہے ہیں اور میں تھوڑی دیر کے مہمان بھائی کے سرہانے بیٹھا ہوا اس کی سانسیں گن رہا ہوں۔ دفعۃً رشید نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں اور دونوں ہاتھوں سے بھائی کے ہاتھ کو پکڑ لیا۔ عزیز نے جلدی سے رومال سے آنسو خشک کئے اور یہ جاننے کو کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ اس کی طرف جھک گیا۔ وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ " بھائی جان ! میں جا رہا ہوں۔ ... دیکھئے اماں کے ..... پاس مجھے دفن کیجئے .... گا .... اور .... اور .... قرآن شریف پڑھکر .... مجھے ..... پھر ایک بارگی وہ اس نقاہت میں بھی کہ اسے بات تک کرنا دشوار تھا۔ عزیز کے دونوں ہاتھ پکڑ کے اُٹھ بیٹھا۔ بجلی چمکی اور اس کی روشنی میں عزیز نے اس کی آنکھوں میں وہ کچھ دیکھا کہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے ...... آہ ..... انتہائی یاس وحرماں کی تصویریں اس کی آنکھیں ہو رہی تھیں۔ شاید وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اب آپ مجھے کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔ اور پھر اس کے ہاتھوں کی گرفت کمزور ہو گئی۔ عزیز نے جلدی سے اسے لٹایا۔ اور لالٹین کو بھی تیز کر کے اسے دیکھنا چاہا لیکن قسمت کا عتاب کہ جلدی میں وہ بھی بجھ گئی۔ اس نے قلب پر ہاتھ رکھا۔ لیکن ..... اب وہ ..... مٹی ..... ہو چکا تھا

(۷)

عزیز اب عزیز نہ تھا۔ وہ دیوانوں کی طرح چاروں طرف مارا مارا پھرتا۔ اسے گھر سے بھی کوئی سروکار نہ تھا۔ اس کا وقت قبرستان میں باپ ، ماں اور بھائی کی قبروں کے پاس بیٹھے ہوئے گذرتا۔ عام طور پر لوگوں کا یہی خیال تھا کہ وہ بھی غم کھاتے کھاتے اپنے بھائی کی طرح مدقوق ہو کر جلدی ہی کشاکش حیات سے چھوٹ جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس لئے کہ دُنیا میں مصیبتوں کا نشانہ کون بنتا۔ اس نے کئی بار خودکشی کی کوشش کی کیونکہ اس کا دل زیادہ صدمات اٹھانے کے قابل نہ رہا تھا۔ لیکن عین اس موقعہ پر جب وہ دریا کے قریب پہونچ چکا تھا۔ اس کے چھوٹے بھائی وحید اور اس کی بہن زبیدہ کی تصویریں آئیں اور اس کو یہ کہکر واپس لے

گئیں کہ آپ کے بعد میرا کیا انجام ہوگا

"نہال" خاندان کی نا اتفاقیوں کے سبب سے پٹنہ نہ آئے۔ وہ جانتے تھے اگر میں تعزیت میں جاؤں گا تو نعیم کے یہاں ٹھیرنا ہوگا۔ اور وہاں وہ ٹھہرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے عزیز کو کئی خط روانہ کئے کہ وہ اب "آرہ" چلا آئے۔ لیکن اسے کوئی خط نہیں دیا گیا۔ آخر کار ایک ماہ بعد نہال خود آئے۔ اپنے ایک دوست کے یہاں ٹھیرے اور یہ معلوم کرکے کہ عزیز "گورغریباں" میں ملے گا وہ اس کے پاس چل دئے عزیز اپنی ماں اور بھائی کی قبروں کے درمیان مغموم بیٹھا ہوا تھا

نہال سے برداشت نہ ہوسکا دیر تک عزیز سے مل کر رو دیا کیا۔ اور پھر رسم دنیا کے مطابق صبر کرنے کی تلقین کرتا ہوا اسے اپنے ہمراہ اپنے مستقر پر لایا۔ دو روز تک وہ پٹنہ میں رہا تیسرے دن عزیز کو لے کر اپنے مکان "آرہ" چلا گیا۔ چلتے وقت اس نے عزیز کو مجبور کیا کہ وہ زبیدہ کو بھی اپنے ہمراہ لے چلے وہاں اس کی طبیعت چچی اور بھاوج سے بہل جائے گی۔ چنانچہ عزیز نے زبیدہ سے چلنے کے لئے بہت کہا لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوئی۔ اس نے کہا "بھائی جان! آپ شوق سے جائیے۔ وہاں آپ نے کام سیکھا ہے اور نہال بھائی کی کوشش سے کہیں نہ کہیں آپ کو نوکری بھی مل جائے گی۔ لیکن مجھے ساتھ لے جانے کی آپ کوشش نہ کیجئے۔ میری ماں، باپ، بھائی کی ہڈیاں اس شہر میں دفن ہیں اور مجھے اس گھر کی مغموم فضا سے کچھ نسبت سی ہوگئی ہے۔ اس لئے میں نہ جاؤں گی۔ جس طرح بھی ان لوگوں کے ساتھ بسر ہو۔ ہاں۔ جب آپ ملازم ہو جائیے گا۔ اس وقت آپ چلے آئے گا میں چلی چلوں گی"

(۸)

عزیز اب بھی کارخانہ میں کام سیکھ رہا تھا۔ کام تو وہ سیکھ چکا تھا لیکن ابھی اس نے ملازمت کہیں نہیں کی تھی اس لئے مزید احتیاط کی بنا پر یا یوں کہ "بیکار" سے وہ "بیگار" کو مناسب سمجھ کر کارخانہ چلا جاتا شام کو جب وہ اور نہال کھانے وغیرہ سے فارغ ہوتے تو اکثر موضوع گفتگو اس کے مصائب پر ہوتا۔ نہال کہتا "عزیز! مجھے تعجب ہے کہ تم اتنے دنوں سے میرے پاس ہو لیکن کبھی تم نے اپنے بھائیوں کی شکایت تک نہ کی اپنی بڑی ماں اور بھاوج کا شکوہ تک نہ کیا۔ کیا تم میں دوسروں کی طرح انتقام کے جذبات نہیں ہیں؟ کیا تمہارا دل بے حس ہو چکا ہے؟" اور وہ جواب میں ایسی ہنسی ہنس کر جس میں تلخی کا زیادہ عنصر ہوتا کہتا نہال بھائی! جذبات؟ آپ میرے جذبات کو کیا پوچھتے ہیں۔ اور میں اس کا جواب کیا دوں جبکہ میں اس کا مفہوم سمجھنے سے عاری ہوں۔ درحقیقت میرا دل مردہ ہو چکا ہے۔ اور جس طرح ایک نعش "درد" کی تصویر ہوتی ہے اسی طرح میرے دل کو بھی سمجھئے کہ وہ "درد" ہو کر رہ گیا ہے۔ رہا انتقام! یہ میرا کام نہیں

ایک مجبور ذات کسی سے انتقام ہی کیا لے سکتی ہے۔ اور بالفرض میں ایسا کر بھی سکوں تو بھی میرے خون شدہ دل کے ذرے اب یکجا نہیں ہو سکتے۔ میں نے اپنے معاملات خدا کے سپرد کر دیے ہیں اور وہی بہتر منتقم حقیقی ہے"

گرمیوں میں اس کی بہن زبیدہ کے پاس سے ایک خط آیا تھا۔ اس نے لکھا تھا "بھائی جان! آپ نے وہاں جاکر مجھے بالکل ہی بھلا دیا۔ میں اپنی حالت آپ کو کیا لکھوں۔ اکثر میری ناک سے خون آتا رہتا ہے۔ خیر یہ تو خشکی سے گرمیوں میں اوروں کو بھی آجاتا ہے لیکن کبھی کبھی مجھے ایسا دورہ ہو جاتا ہے کہ میں بیہوش ہو جاتی ہوں اور شاید چیخنے بھی لگتی ہوں۔ اور لوگ تو کہتے ہیں کہ تمھیں "ہسٹریا" ہو گیا ہے۔ لیکن گھر کے لوگ میرے پاس نہیں آتے وہ سمجھتے ہیں کہ شاید کسی جن یا بھوت کا سایہ ہے۔ پرسوں دورہ کی حالت میں میرے سر میں پلنگ کا پایہ لگ جانے سے کچھ زخم ہو گیا ہے۔ کوئی زیادہ گہرا نہیں ہے جلد اچھا ہو جائے گا آپ کوئی فکر نہ کیجئے گا۔ آپ کے دیکھنے کو طبیعت بہت چاہتی ہے اگر دو ایک دن کے لئے آجائے تو بہت اچھا ہو گا" خط کو عزیز نے نہال کو دکھایا اور پھر اس کی رائے سے وہ اپنی بہن کو "آرہ" لے آیا۔ زبیدہ کی صحت بہت خراب ہو گئی تھی۔ لیکن بھائی کے پاس آکر جب آزادی کی سانس لی تو اسے بغیر کسی علاج کے صحت ہو گئی۔ ایک ماہ وہ اپنے بھائی کے پاس رہی تھی اور اس مدت میں وہ اپنی بہترین تندرستی کی حالت میں ہو گئی۔ لیکن ایک دن جب نہال اپنی دوکان اور عزیز کارخانہ گیا ہوا تھا۔ اس کے دونوں بھائی نعیم اور فہیم پہونچے اور زبردستی اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ اس لئے کہ اب وہ تندرست تھی اور گھر کی عورتیں کام کرنے کی عادی نہ تھیں۔ چلتے وقت ایک پرچہ وہ بھائی کے نام چھوڑ گئی تھی۔ جس میں اس نے لکھا تھا "بھیا مجھے افسوس ہے کہ میں آپ سے مل کے بھی نہیں جا رہی ہوں لیکن کیا کروں مجبوری ہے۔ جب تک میری قسمت میں مصیبتیں جھیلنا ہیں جھیلنے دیجئے۔ اور میرے معاملات خدا کے سپرد کر کے صبر کے ساتھ انجام کے منتظر رہئے"..... عزیز جب شام کو آیا تو اس نے رقعہ پڑھا اور صبر کر کے خاموش ہو گیا

---

یہ ہیں میری زندگی کے وہ واقعات جن کو خدا جانے آج کیوں سپرد قلم کر رہا ہوں، زبیدہ اب بھی بدستور حیا کرانہ زندگی بسر کر رہی ہے اور میں اسی طرح بیکار اس درد میں مبتلا ہوں کہ ـــــ ہمہ جیرم کہ دہقان بچہ کار کشت ما ما میں سمجھتا ہوں کہ میری بہن زبیدہ کا بھی ایک دن وہی حشر ہونے والا ہے جو میرے بھائی اور ماں کا ہوا اور میں اس کے دیکھنے کے لئے بھی زندہ رہوں گا، کیونکہ باوجود ان تمام مصائب کے میں نہایت سخت جان پیدا ہوا ہوں اور سوسائٹی کے وہ تمام مظالم برداشت کروں گا جو مجھ ایسے ہزاروں انسان اس وقت تک برداشت کرتے چلے آئے ہیں اور غالباً ہمیشہ برداشت کریں گے

اسلام

---

(۵) دنیا کے سب مذہبوں کے بانی اور بزرگوں کو عزت کی نظر سے دیکھا جائے
(۶) ایک عبادتگاہ بنائی جائے جہاں ایک مقررہ طرز پر خدا کی عبادت کی جائے اور سب مذہب کے بانیوں کے نام عزت سے لئے جائیں
(۷) حج کے طور پر سال میں ایک بار اس مذہب کے ماننے والوں کی کانفرنس منعقد کی جائے
(۸) عبادت کا مقصد یہ سمجھا جائے کہ اس سے خود انسان کی بھلائی مقصود ہے
(۹) نیکی سے مطلب نیک کاموں کے علاوہ دولت عزت حکومت حاصل کرنا بھی ہو
(۱۰) اس مذہب میں جو ہندو مسلمان عیسائی یہودی وغیرہ مذہب کے لوگ شامل ہوں ان کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ باہم شادی کر سکیں
(۱۱) اس مذہب کے اصول ہمیشہ انسانی ترقی کی روشنی میں جانچے جائیں
(۱۲) اخلاق کی فہرست میں ایمانداری صبر نرمی بہادری کے علاوہ دنیا میں اتحاد و امن قائم کرنا اور دنیا کے ہر حصے کو ترقی پر پہنچانا بھی ہو
(۱۳) چند اصول کو چھوڑ کر فروعات سے اس مذہب کو واسطہ نہ ہو
(۱۴) اس مذہب کی طرف سے ایک نیا علم "فلاح انسان" کے نام سے بنایا جائے اور اس کے ذریعہ سے انسان کی ترقی اتحاد امن اور اچھی سوسائٹی بنانے کے طریقے بتلائے جائیں۔ اس علم کی کتابیں سکولوں میں پڑھائی جائیں

آج ہم سیاسیات میں دیکھتے ہیں کہ یورپ نے سیاسی اتحاد پیدا کرنے کیلئے بین الاقوامی انجمن بنائی ہے اور کتابوں میں ورلڈ سٹیٹ (دنیا کی حکومت) کا خیال ظاہر کیا جا رہا ہے۔ مختلف قومیں اپنی قومی سلطنتوں کے وجود قائم رکھتے ہوئے بھی بین الاقوامی انجمن کو مان رہی ہیں گویا لوگ دو حکومتوں کے ماتحت آئے ہیں ایک اپنی حکومت اور دوسری بین الاقوامی ـــ یہ طریق کار ہم مذہب میں بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ اور اس طرح مختلف مذہب کے لوگ اپنی خصوصیت قائم رکھتے ہوئے بھی ایک نظام سے وابستہ ہو سکتے ہیں۔ جس سے مذہبی تصادم کی جگہ مذہبی اتحاد کا جلوہ نظر آئیگا ـــ اس مذہب کے بنانے میں جمہوری طریقے اختیار کئے جائیں۔ جمہوری سلطنت میں جسطرح سب کی مرضی سے نظام بنتا ہے۔ اسی طرح یہ مذہب بھی اس میں شامل ہونیوالے مختلف مذہبوں کی مرضی اور اجازت سے بنیگا۔ گویا یہ مذہب ایسا ہوگا جس کے بارے میں کہا جائیگا کہ اس کو خود انسان نے غور کر کے جمہور کی رائے کے مطابق تمام دنیا کی بہتری کے لئے بنایا ہے

م۔ ر۔ غ

---

(نگار) آپ کے خیالات میں جس حد تک نیت کا تعلق ہے نہایت پاکیزہ ہیں، لیکن عملاً کس حد تک قابل لحاظ ہیں، اس کے متعلق میں آئندہ اشاعت میں اپنے خیالات پیش کروں گا ـــ اس ماہ کے ملاحظات غور سے پڑھئے، ممکن ہے آپ کی بعض تجاویز کا ذکر اس میں آگیا ہو

(نیاز)

# مکتوبات نیاز

آہ ! — تمھارا جانا بھی ——— عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے

پورے تیس دن اس توقع میں گزر گئے کہ کیا آج کے بعد کل نہ آئے گی، اور جب کل آج ہوگئی تو پھر وہی تم۔ تھے میری ایک نہ سننے والے اور وہی میں تھا تمھاری ضد پر کچھ نہ کہہ سکنے والا! میں نے کہا کہ ایک ہی بار جی لگا کر میری کہانی سُن لو، تم نے ہنس کر ٹال دیا، میں نے التجا کی کہ میری نہیں سنتے تو تمھیں کہو، تمھارے جی میں کیا ہے، یہ بھی تمھیں پسند نہ آیا، آخرکار اسی راز و نیاز میں یہ فرصت ختم ہوگئی، اور میرے کسی ایک دُکھ کا بھی علاج تم سے نہ ہوسکا۔

کیسی کیسی چاندنی راتیں آئیں اور ختم ہوگئیں۔ کیسی کیسی متوالی گھٹائیں آئیں اور گزر گئیں، لیکن ایک دن بھی ”کھل کھیلنے“ کا بہانہ تم نے ہاتھ نہ آنے دیا۔ میری ناصبوری کی شکایت کرتے ہو، لیکن اپنی بے حسی کا احساس نہیں، میں تنگ ظرف سہی لیکن تمھیں بھی تو دوستی و مروت کا پاس نہیں۔

بہرحال تم مجھے تشنہ و مہجور چھوڑ کر جانے پر نادم ہوئے یا نہ ہوئے، مگر یہ سمجھ رکھو کہ

مے باقی و مہتاب باقی ست

ما را بتو صد حساب باقی ست

پھر بولو کہ یہ مطالبہ کب ادا ہوگا، یہ حساب فہمی کس وقت ہوگی۔ کہہ دو ”کبھی نہیں“ — یہ بھی برحق اور قیامت بھی برحق!

---

دیکھئے! آخرکار آپ مانے نہیں، اور مجھے پھر ستایا! میں آپ سے کہہ چکا ہوں، شرعی حلف کے ساتھ کہہ چکا ہوں کہ مجھے اُن کے ہاتھ سے آب حیات پینا بھی گوارا نہیں، لیکن آپ کا اصرار یہی ہے کہ میں زہر بھی پی لوں — اچھا! مجھے منظور ہے، لیکن ایک شرط میری بھی ہے اور وہ یہ کہ آپ خود آیئے اور مجھے وہاں لے چلئے۔ آپ پوچھیں گے اس کی کیا ضرورت ہے، میں کہوں گا کہ جب آپ ہی جنازہ میں کاندھا دینے کے لئے پاس نہ ہوئے تو مرنے کا کیا لطف ہے۔ آپ ہنسیں گے کہ یہ کیا؟ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہاں جانا صرف موت ہے میرے اخلاق کی، میری روح کی، میری انسانیت کی اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اس منظر کو دیکھیں اور معلوم کریں کہ فطرت کے خلاف کسی کو مجبور کرنا ”قتل انسان“ سے زیادہ سنگین جرم ہے، جس کی سزا اگر قانون سے نہیں تو ضمیر کی طرف سے ملنا ضروری ہے۔

باور کیجئے! مجھے اُن سے کوئی بغض و عناد نہیں، اور ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ جبکہ میں اپنی بیکسی و بیچارگی اور اُن کی عظمت و شوکت سے پوری طرح واقف ہوں، لیکن یہ ضرور ہے کہ ان کے سایۂ دیوار میں پناہ لینے کو جی نہیں چاہتا۔

یوں اگر کوئی خدمت مجھ سے اُن کی ہو سکتی ہے تو اسکو انجام دینا میرے لئے سعادت ہے، لیکن وہاں جا کر از راہِ حاضری دینا اور پھر یہ سمجھ کر اس وقت فرصت نہیں ہے۔ میرے بس کی بات نہیں ہے۔

آپ کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ غلط ہے، انھیں خبر ہی نہیں ہوئی، درانحالیکہ یہ سب کچھ خود میرے کانوں نے سُنا۔ نہ آپ کو جھٹلا سکتا ہوں، نہ اُنھیں، اس لئے خود اپنی ہی سماعت پر الزام دیکر خاموش ہو جانا چاہتا ہوں۔ مگر آپ اس پر بھی راضی نہیں۔ پھر کیا مطلب یہ ہے کہ میں اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں، کالا منہ کر کے کسی طرف نکل جاؤں — لاحول ولا قوۃ، معلوم نہیں آپ لوگوں کو اس چھیڑ چھاڑ میں کیا مزہ ملتا ہے۔

براہِ کرم آیندہ اس باب میں مجھے کچھ نہ لکھئے، ورنہ میں اس سے زیادہ بد اخلاقی کا مجرم ہوں گا، اور آپ سے بھی قطعِ تعلق کر لوں گا۔

نیاز

---

صدیقی۔

آپ ملامت کرتے ہیں کہ میں کیوں مسوری سے چلا آیا۔ میں پوچھتا ہوں کہ آپ نے وہاں کا ذکر چھیڑ کر کیوں مجھے تڑپا دیا۔ سنئے، ٹھیک دوپہر کو میں دفتر میں بیٹھا ہوا کام کر رہا ہوں کہ راجپور سے ٹیلی فون آتا ہے — "ہم یہاں پہنچ گئے ہیں، پہنچ کے بعد روانہ ہوں گے" — یہ وہ خبر تھی جس کے سننے کا میں مہینوں سے منتظر تھا۔ ۴ بجے کا وقت ہے، گہرا ابر محیط ہے، پہاڑ کی خنک ہوائیں جسم میں سردی لیکن دل و دماغ میں شراب کی سی گرمی پیدا کر رہی ہیں کہ دفعۃً بنگلہ سے باہر ونڈا منڈیم میں میرا قیام تھا، چہل پہل سی معلوم ہوتی ہے اور میں باہر نکلتا ہوں — معلوم نہیں غالب کا "بگہ آتشیں رخ سر کھلا" کیسا تھا، لیکن یہاں تو وہ ایک سمٹی ہوئی روشنی تھی پیکرِ انسانی میں، ایک قید کی ہوئی بجلی تھی عالمِ آب و گل میں۔ نہ آنکھیں کیسر سحرِ بابل، لب "ہمہ خونِ صد میخانہ" — اور اب یہ نہ پوچھئے کہ سن کیا تھا بس یوں سمجھئے کہ جوانی کانٹے پر تل رہی تھی۔

میں اگر یہ کہوں کہ بیہوش ہو کر گر پڑا تو آپ اسے شاعرانہ مبالغہ تصور کریں گے، لیکن اگر حواس کا تعطل، اعصاب کا استرخاء، جسم کی لرزش اور دل و دماغ کا عدمِ توازن بھی بیہوشی کا مفہوم رکھ سکتا ہے تو باور کیجئے کہ اسوقت مجھ سے زیادہ دنیا میں کوئی بیہوش نہ تھا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ وہ خاندان ہے جس میں شرفاء فرانس اور دہلی کی خواتین تیموریہ کا خون ایک جگہ آکر ملتا ہے۔ گویا ان دونوں جگہ کے پیکانوں سے ملا کر ایک نئی قسم کا ایسا تیر بنایا گیا ہے جس سے نہ مشرق میں پناہ مل سکتی ہے نہ مغرب میں۔

پھر انصاف کیجئے کہ جس شخص کو ایک دن نہیں، دو دن نہیں، مسلسل چار مہینے اس شعلۂ جوالہ، اس برقِ بے پناہ کی معیت حاصل رہی ہو، وہ کیونکر اس سے جدا ہو کر زندگی بسر کر سکتا تھا۔

آہ،
خورشید خرامید و فروغے بنظر ماند

آپ اس کو ترک ملازمت یا جگہ چھوڑ کر چلا جانا کہتے ہیں حالانکہ یہ کہنا چاہئے کہ باہر نکل جانا ہے۔ آپ عقل و مصلحت کی دنیا کا ذکر کر رہے ہیں، اور ادھر یہ حال ہے کہ ان سب منزلوں سے گزر کر

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

انتہائی مجبوری و بیکسی میں آپ "الله بس باقی ہوس" کہکر خاموش ہو جایا کریں۔ یہاں تو اب بھی لب پر دعوائے "انا الشرق" ہے اور دل جز وہی آفتاب جلوہ گر۔

ذرا سوچ سمجھ کر بات کیا کیجئے۔ مرتبہ و آداب کا لحاظ رکھ کر گفتگو کرنا سیکھئے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ ہم عاشق ہیں عاشق!

مشعلِ خورشید کے مباسے جو نار سرکریں

نیاز

---

عزیزی۔

کیا مکتوب محبت کے زبانی شکریہ ادا کرنے کا بھی اہل نہیں ہوں؟ سچ ہے، جہاں "جانسپاری" کی ضرورت ہو، وہاں صرف جنبشِ لب کیا کام آسکتی ہے، مگر آپ اسے اعتراف بیکسی سمجھ کر کیوں نہ قبول کریں۔

معاملات محبت میں تو لوگ اس قدر جری ہو جاتے ہیں کہ

خطا نمودہ ام و چشمِ آفریں دارم

کا نعرہ لگانے لگتے ہیں، میں اگر ایک "بیچارانہ شکریہ" پر قناعت کر لوں تو کیوں موردِ الزام قرار پاؤں۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ کا خلوص بے پناہ ہے، جہاں اعترافِ شکست کے سوا کوئی چارہ نہیں

برسات کا ذکر مجھ سے نہ کیجئے۔ جس طرح اس کا پہلا دن بے خبری میں طلوع ہوا ہے، اسی طرح آخری دن بھی ختم ہو جائیگا۔

اے وادیِ من، صدرا دلِ من

مجھے سوچنے دیجئے کہ آپ کو میرے سفرِ حیدرآباد کا علم کیونکر ہوگیا۔ کیونکہ اگر خدانخواستہ میں آپ کو دلی سمجھنے لگا تو قیامت ہی ہو جائیگی بار بار "ارتباطِ قلب" کی بات آپ نے خوب کہی۔ اچھا تو یہ بتائیے کہ میں آپ کو کیا دیکھنا چاہتا ہوں؟

بابِ الاستفسار و باب: مراسلت میں ایسی تحریروں سے احتراز ضروری ہے، جب تک مدعا کی تکرار بار بار نہ ہو، لوگوں کے ذہن نشین ہونا دشوار ہے۔ آپ کو میرا مشن معلوم ہی ہے — دیوانہ ہوں، دیوانہ — بکنے دیجئے جو بک رہا ہوں۔ شاید کبھی کوئی کام کی بات بھی زبان سے نکل جائے۔

خوش رہئے کہ آپ کا وجود میرے لئے خدا جانے کیوں باعثِ تسکین ہے —

نیاز

محترم!

آپ کی علالت کا حال تو مجھے معلوم ہو گیا تھا، لیکن یہ خبر نہ تھی کہ صورت اس قدر نازک پیدا ہو گئی تھی۔ بارے شکر ہے کہ خطرہ جاتا رہا، نقاہت کا کیا، بے جاتی رہیگی، اور یوں بھی آپ کیا بڑے سام و نریمان تھے کہ ضعف و ناتوانی کی شکایت ہو۔ ہر چند آپ ان ہستیوں میں سے ہیں، جن کو قدرت زیادہ مہلت دنیا میں نہیں دیتی، لیکن معلوم نہیں، کیوں مجھے اسکا یقین ہے کہ آپ ابھی بہت جئیں گے۔ اس لئے نہیں کہ آپ کے سر بہت سے بندگانِ خدا کا بار ہے، بلکہ شاید اس لئے کہ آپ کا زندہ رہنا ہی خدا کی قدرت کا بڑا ثبوت ہے۔

وہ شخص جو مسلسل ہفتوں کا فاقہ کرے، دو دو دن پانی نہ پئے (شراب کا کیا ذکر ہے) چار چار دفعہ حجرہ بند کئے پڑا رہے، مہینوں کسی سے بات نہ کرے۔ اس کی زندگی ہی کیا ہے جسے موت آئے گی، اور آئی بھی تو کیا لیجائے گی۔

خدا کے لئے چند دن کے لئے یہاں آجایئے، یہ میرا ذمہ ہے کہ تبدیلِ آب و ہوا سے نہ آپ کے جسم میں ایک انچ کا اضافہ ہوگا اور نہ آپ کے وزن میں ایک تولہ کی بیشی۔ البتہ الجھنوں سے دور رہکر ممکن ہے آپ کے دل و دماغ میں کیفیتِ نشاط پیدا ہو جائے۔

میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

اس سے قبل بارہا لکھ چکا تو کیا نتیجہ نکلا، اور اب لکھ رہا ہوں تو کیا ہوگا — عہد کر چکا تھا کہ آیندہ آپ سے مراسلت یکقلم موقوف کر دوں گا

مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

میں یونہی جھک مارتا رہوں گا اور آپ اسی طرح کبھی خاموش رہکر اور کبھی حرفِ منسکر ٹالتے رہیں گے —

---

نیاز نوازا

اس طلب و پرسش کا شکریہ۔ میری غریب الوطنی پر آپ کو رحم آتا ہے اور یہاں سے بے حسی کہئے یا استغناء، یہ عالم ہے کہ

بہ حسرت غنچہ ام یعنی بہ دل تنگی وطن دارم

آپ کے جذبات کا احترام مجھ پر فرض ہے ورنہ میں تو یہی درخواست کرتا کہ آپ مجھے بھلا دیجئے کیونکہ اب جس منزل سے میں گزر رہا ہوں وہ یہی ہے کہ

"ما بہ خاطر ہا فراموشی ست در یادیم ما"

نیاز

---

# کسبی

قبل اس کے کہ آپ اس عنوان کو دیکھکر میرے جمالیاتی ذوق پر کوئی حملہ کریں میں آپ سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے کبھی اس امر پر بھی غور کیا ہے کہ "آخر کسبی کو اتنا بُرا کیوں سمجھا جاتا ہے" میرے خیال سے تو ہماری اس نفرت کا سبب شاید قدامت پرستی کی کورانہ تقلید کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ لیکن چونکہ اس سے ہمارے تعقل وادراک کی انفرادیت پر ضرب پہونچتی ہے اس لئے ہم ذرا شعلہ ریز ہو کر اپنے عقیدہ کو کسی قدر استدلالی بناتے ہوئے یوں کہدیتے ہیں کہ "کسبی چونکہ عصمت فروشی کرتی ہے اس لئے وہ ننگ انسانیت ہے" لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر امعان نظر سے کام لیا جائے تو شاید یہ حقیقت مستتر نہ رہے کی کہ ہم نے اس دلیل میں بھی جس کو ہم اختلافات ونزاع سے بہت بلند سمجھے ہوئے ہیں ہمارے ماحول کا فریب اور ہماری سوسائٹی کا اثر ونفوذ بُری طرح کام کر رہا ہے۔ جس طرح عرب کی سوسائٹی نے لڑکیوں کے زندہ درگور کرنے کے انسانیت سوز جرم کو ایک عرصہ تک انسانی غیرت وشرافت کا اعلیٰ معیار بنائے رکھا اسی طرح یہ حقیقت بھی مضحکہ خیز نہیں ہے کہ ہماری موجودہ سوسائٹی کے بعض مستبد فیصلوں کی بنا پر ہم ابھی تک کسبی کی صحیح پوزیشن کو نہیں سمجھ سکے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ اگر تھوڑی سی اخلاقی جرأت سے کام لیکر ہم قدامت پرستی کی عبا اُتار پھینکیں، سوسائٹی کے دباؤ سے متاثر ہوں اور چیز ولی کا حقیقت کو ماحول کی عینک سے دیکھنے کے بجائے اپنی بصیرت سے پرکھیں تو ہم کسبی کو اپنے فیصلوں کا افسوسناک شکار سمجھ کر سو سائٹی کے اس استبداد کے خلاف شاید اُس سے کم ماتم نہ کریں گے جو آج فرنچ اکاڈیمی کے اُس فیصلہ پر کیا جاتا ہے جس میں میڈیم کیوری کو اکاڈیمی کا ممبر بنانے سے صرف اس لئے انکار کر دیا گیا تھا کہ:-

"اسوقت ہماری قدیم روایات کے ماتحت کسی عورت کا ممبر منتخب کیا جانا نازیبا سمجھا جاتا رہا ہے جس کا احترام کرنا ہمارے لئے بے انتہا ضروری معلوم ہوتا ہے" [1]

بہرحال میں چاہتا ہوں کہ آپ اسوقت میرے ساتھ رہکر تھوڑی دیر کے لئے اس موضوع پر خالص علمی حیثیت سے غور کریں۔

---

[1] ملاحظہ ہو مشاہیر فرنچ اکاڈیمی ۱۹۱۱ء، اس کے الفاظ کا صحیح ترجمہ انگریزی میں یہ ہے:-
"There is an immutable tradition against the election of women of which it seems eminently wise to respect."

لیکن اس مسئلہ پر بحث کرنے سے پہلے یہ نہایت ضروری ہے کہ فلسفۂ جرم کو سمجھ لیا جائے [1]

اگر جرم یا گناہ کی نفسیاتی تحلیل کیجئے تو معلوم ہوگا کہ "وہ ایک ایسا فعل ہے جس کے ارتکاب سے خود مرتکب کی ذات پر یا سوسائٹی کے کل یا بعض افراد پر یا کسی ایک واحد ذات پر کوئی مضر اثر مترتب ہو" اور اسی لئے منطقی اعتبار سے جرم کی دو تقسیمیں ہو سکتی ہیں شخصی جرم اور جماعتی جرم، بخل، بدنفسی اور استنکاف ذات جیسے افعال شخصی جرائم کی تحت میں شمار ہوں گے، اور بازار میں ننگا پھرنا، سرقہ، زنا بالجبر اور دغا وغیرہ کی قسم کے جملہ افعال جماعتی جرائم کی ذیل میں رکھے جائیں گے۔ پھر شخصی جرائم تو بالکلیہ سارے کے سارے برے ہوتے ہیں۔ لیکن جماعتی جرائم میں سے بعض بذاتہ برے نہیں ہوتے بلکہ سوسائٹی کے افراد کی ذہنیت اور اس کے نقطۂ نظر کے فیصلوں کے مطابق برے قرار دے دئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ممکن ہے کہ کوئی ایک ہی فعل کسی ایک زمانہ میں یا کسی ایک سوسائٹی میں تو جماعتی جرم سمجھا جائے لیکن کسی دوسرے زمانہ میں یا کسی دوسری سوسائٹی میں نہ سمجھا جائے۔ مثلاً مناظر عام پر ننگے پھرنا آج کل ایک جماعتی جرم ہے جس کا ارتکاب نہایت شرمناک اور قبیح امر تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف آج سے ڈھائی ہزار سال قبل یونان اپنی سرسبز و شاداب تہذیب و تمدن کے باوجود ننگے رہنے کو باعث عار نہ سمجھتا تھا [2]۔ دنیا کے قدیم ترین گہوارۂ تہذیب کی حسین ترین دیوی کلیوپٹرا جب انطونی سے ملنے آئی گئی ہے تو نہ صرف وہ خود ننگی تھی بلکہ اُس کی کشتی کو کھینچنے والی ہر لڑکی کو سراپا عریاں رکھا گیا تھا۔ آج کل بھی جنوبی امریکہ کے بعض حصص میں لوگ ننگے پھرتے ہیں [3]۔ شمالی نائیجیریا میں بنگو ایک مقام ہے جہاں کا یہ عجیب دستور ہے کہ عورتوں کا کپڑے پہننا اس لئے معیوب سمجھا جاتا ہے کہ وہاں کے باشندوں کے نزدیک اس سے اُن کے حُسن و جاذبیت میں زیادتی ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے جنگجو اور بہادر سپاہیوں کے لئے اُن کی طرف رغبت پیدا ہو کر عیاشی میں پڑ جانے کا امکان زیادہ قوی ہو جاتا ہے۔

اسی طرح آپ دیکھتے ہیں کہ پارسی فرقہ میں حقیقی بہن سے شادی کرنا کوئی قابل اعتراض فعل نہیں ہے، لیکن اس کے برخلاف دوسری اقوام کے نقطۂ نظر سے یہ چیز انسانی حمیت و غیرت کے سخت منافی سمجھی جاتی ہے۔

یورپ میں دو بیویاں رکھنا خوفناک وحشت و بربریت کا مصداق خیال کیا جاتا ہے لیکن ایشیا میں ایک شوہر کی کئی کئی بیویاں

---

[1] فلسفۂ جرم کی اس تمام تحقیق کی ذیل میں مندرجہ ذیل کتابیں میرے پیش نظر ہیں:-
(1) Crime and its causes, by Morrison (2) Crime Psychology (3) Psychology of murder by Bjerre, by H. G. Gross (4) Crime, Law and social science, by Michael + Adler (5) A new way with crime by A. F. Brock way.

[2] ملاحظہ ہو:- Essay on Nudity, by Inea

[3] ملاحظہ ہو:- Essay on Nudity, by Inea

ہونا کوئی بری بات نہیں ہے۔ بلکہ ایشیا کے بعض علاقے تو ایسے بھی ہیں جہاں دو یا تین لوگ ملکر کسی ایک لڑکی سے شادی کر لیتے ہیں۔ اور یہ امر مطلق معیوب نہیں سمجھا جاتا۔

غرضکہ بہت سے جماعتی جرائم کا حسن و قبح سوسائٹی کے عام رجحان پر موقوف ہوتا ہے۔ اور اسی لئے کسی سوسائٹی کے جماعتی جرائم کی فہرست کو دیکھکر اُس کے افراد کی ذہنیت اور طبعی رجحان کا پتہ چلانا آج کل فلسفہ تاریخ کا ایک اہم مسئلہ قرار پا گیا ہے۔ اگر کسی سوسائٹی میں سنجیدہ اور ذی ہوش افراد کی اکثریت ہے تو اس کے سارے جماعتی جرائم بھی معقول ہوں گے۔ اس کے برخلاف جاہل اور احمق سوسائٹی کے جماعتی جرائم منطقی علل و اسباب سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ اُن کے بہت سے فیصلے مضحکہ خیز ہوتے ہیں۔ بہت سے فیصلے ایسے ہوتے ہیں جن کے ہر ہر روزن سے جبر و استبداد کے بھیانک عفریت جھانکتے دیتا۔

پھر چونکہ دُنیا میں بہت کم جماعتوں کی اکثریت ذی عقل و ہوش افراد پر مشتمل رہی ہے اس لئے انسانی تاریخ میں سینکڑوں ایسی مثالیں ملیں گی جن میں لاکھوں بے گناہ افراد سوسائٹی کے ان غیر معقول فیصلوں کی نذر ہو کر زندہ آگ میں ڈالے گئے، کھولتے ہوئے تیل کے کڑاہوں میں پھینکے گئے، جلتی ریت پر لٹائے گئے، جیتے جاگتے زمین میں دفنائے گئے، خانماں برباد ہو کر جنگلوں میں مارے مارے پھرے، بھوک سے تڑپے اور پیاس سے بلبلائے۔۔۔ غرضکہ وہ تمام واقعات جن کے متعلق آج ہم کہہ سکتے ہیں کہ انکی یاد اشت میں

اس زمیں پر آگ اور پتھر برسنے چاہئیں    برق گرنی چاہئے اور برسنے چاہئیں

سوسائٹی کے یہی فیصلے ہیں جن کو ہم بعض اوقات کسی ملک کے رسم و رواج سے تعبیر کرتے ہیں۔

پھر یہ صحیح ہے کہ ہماری موجودہ تہذیب اور موجودہ سوسائٹی پہلے کے اعتبار سے بہت بلند ہے اور اس کے فیصلے پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ معقولیت پسند ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود اب بھی بہت سے ایسے فیصلے ہیں جن میں سوسائٹی کا ہاتھ خون سے رنگا ہوا نظر آتا ہے۔ اور بالخصوص ہمارے ہندوستان کی خونریزی تو ابھی اس معاملہ میں بہت بڑھی ہوئی ہے۔

بہرحال فلسفۂ جرم کی اس مختصر سی تحقیق کے بعد اب ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ عصمت فروشی کا وہ جرم جو قدرت کے ساتھ کسبی کے خلاف لگایا جاتا ہے آیا شخصی جرم ہے یا جماعتی

ظاہر ہے کہ شخصی جرم تو یہ اُسوقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی اسقدر غیر معتدل کثرت نہ ہو کہ مرتکبین کی صحت جسمانی پر اس سے بُرا اثر پڑے۔ اور اس لئے عصمت فروشی " اس صورت میں شخصی جرم نہ ہوئی جبکہ اُس کا ارتکاب حد اعتدال سے تجاوز نہ کرے یا بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ " عصمت فروشی " بذاتہٖ شخصی جرم نہیں ہے۔ اب اسکی قباحت کی ساری کائنات اس کا جماعتی جرم ہونا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آیا اسکی قباحت اور قرمطاکی کے متعلق سوسائٹی نے جو فیصلہ صادر کیا ہے وہ معقول بھی ہے یا نہیں یعنی آیا فلسفۂ جرم کے اعتبار سے یہ کوئی ایسا جرم ہے جس کا بُرا اثر سوسائٹی کے کل یا بعض افراد پر یا کسی ایک فرد پر پڑتا ہے۔

لیکن اس مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ انفرادی اور اجتماعی اعتبار سے عورت و مرد کے اتصال کی غرض غایت کیا ہے۔

مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں کہ عورت و مرد کے اتصال کی تین اہم اغراض ہیں۔ (۱) بقائے نسل (۲) بچوں کی پرورشس، یا تدبیر منزل، اور (۳) آلام حیات سے کسی قدر آسودگی۔

ان میں سے پہلی دو اغراض خالص حیوانی اور جبلّی ( Instinctive ) ہیں۔ اور انسان و حیوان دونوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہیں۔

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ دوسری غرض یعنی بچوں کی تربیت یا تدبیر منزل کا تقاضہ یہ ہے کہ کوئی سے دو مرد و عورت باہم یہ پختہ معاہمت کرلیں کہ وہ تازیست ایک دوسرے پر اعتماد کریں گے، زندگی کی ذمہ داریوں کو نبیڑنے میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں گے اور رنج و راحت کے ہر موقعہ پر ایک دوسرے کے شریک حال رہیں گے۔

مرد و عورت کی اسی مفاہمت کا نام سوسائٹی کی زبان میں شادی یا نکاح ہے،

جنسی محبت ـــــ جس کی تعریف میں ہمارے ادیبوں، شاعروں، اور فلسفیوں نے زمین و آسمان کے قلابے ملادئیے ہیں کی واحد غرض بھی اسی منزلی زندگی کا قیام و بقا ہے۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ مرد و عورت اپنی منزلی زندگی کے آغاز کے وقت جو عہد باندھتے ہیں، "جذبۂ محبت" اُسی عہد کی پختگی اور توثیق کا ایک فطری ذریعہ ہے۔

یعنی محبت کا جذبہ ایک ایسا قدرتی سیمنٹ ہے جو بچوں کی پرورشس یا تدبیر منزل جیسے اہم مقصد کی تکمیل کی خاطر مرد و عورت کے جوڑے کو ایک دوسرے سے شدت کے ساتھ چسپاں رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں یہ سیمنٹ زیادہ مستحکم اور زیادہ شدید ہوتا ہے وہاں منزلی او رخانگی زندگی کا شیرازہ بھی زیادہ منظم اور زیادہ سلجھا ہوا نظر آتا ہے۔

محبت کا یہ جذبہ بعض جانوروں میں بڑی شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے[۱]، چنانچہ ہندوستان کا سارس اور آسٹریلیا کے ایک خاص قسم کے طوطے جن کو "طیور محبت" ( Love birds ) کہتے ہیں اس سلسلہ میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔

منزلی زندگی کے قیام و بقا کے لئے جو چیز سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے وہ یہ ہے کہ مرد و عورت اپنے تناسلی تعلقات میں ایک دوسرے کے ساتھ وفادار رہیں، تاکہ بچوں کی پیدائش پر اُن دونوں میں سے ہر ایک اُن کی پرورش کرنا اپنا فرض سمجھے ورنہ بصورت دیگر اگر عورت و مرد میں تناسلی تعلقات کی اس تحدید کے متعلق کوئی مفاہمت نہ ہو تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ مرد اپنی "بیوی" کے بچہ کو یقینی طور پر اپنا بچہ نہ کہہ سکیگا اور اس۔لئے کسی حیثیت سے اُس کی پرورش اور تربیت میں عورت کا ساتھ دینے کو تیار نہ ہوگا جسکا

---

[۱] اس بحث کی بعض دلچسپ تفصیلات کے لئے مندرجۂ ذیل تصانیف ملاحظہ ہوں:۔

(1) Animal ways; by Boulenger (2) Animals in the wild and captivity, by Bolenger (3) Animals of all countries, by Hutchinson.

لازمی نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ انسان کی منزلی زندگی تباہ ہو جائے اور اُس کے ساتھ ساتھ اُس کے حیات اجتماعی کے تار و پود بھی بکھر کر رہ جائیں۔

تناسلی تعلقات کے متعلق اسی مفاہمت کا نام سوسائٹی کی اصطلاح میں "تحفظِ عصمت" ہے اور اس مفاہمت کی خلاف ورزی کرنا بے عصمتی اور بے حیائی،

اگر آپ عورت و مرد کے اتصال پر ایک مرتبہ اور نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اگرچہ "تحفظِ عصمت" کا تعلق بلا واسطہ تدبیرِ منزل سے ہے لیکن چونکہ بقائے نسل اور بچوں کی پرورش یا تدبیرِ منزل دونوں مقاصد لازم و ملزوم کی سی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ عورت و مرد کے اتصالِ جنسی کی پہلی دو اہم اغراض کے قیام و بقا کے لئے عورت کے واسطے تحفظِ عصمت سخت ضروری ہے[1]

اب تک ہم جس نتیجہ پر پہونچے ہیں وہ یہ ہے کہ ہر اُس عورت کے لئے عصمت دری ایک عظیم جماعتی گناہ ہے جس کی زندگی کے مقاصد میں بقائے نسل اور تربیت اولاد داخل ہوں۔ لیکن ہم بتا آئے ہیں کہ عورت و مرد کے اتصال کے یہی دو سبب نہیں ہیں بلکہ ایک تیسرا مقصد اور بھی ہے جس کے ماتحت وہ دونوں زندگی کی تلخکامیوں کو کسی قدر فرخندگی کے ساتھ برداشت کرنے کے اہل ہو جاتے ہیں۔ یعنی مرد و عورت کے اتصال کا مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ وہ سوسائٹی کو بچے دئے جائیں اور پھر اُن کی پرورش کرتے رہیں۔ بلکہ اُس کی ایک اہم غرض یہ بھی ہے کہ اس طرح وہ خود بھی تھوڑی دیر کے لئے زندگی کے آلام و افکار سے بے نیاز ہو کر ایکدوسرے میں کھو جائیں، اور اُن کا یہ اتصال کچھ عرصہ کے لئے اُن کو اس عالم آب و گل کی مفلوج کن بندشوں سے چھڑا کر اُن کے دماغ میں نشاط و سرور کی ایک نئی روح پھونکدے اور جس طرح ایک رومانی نظم (Romantic poem) ہم کو اس دُنیا کی کثافتوں سے بہت دور عیش و کامرانی کی کیف آور جنت میں پہونچا دیتی ہے اسی طرح مرد و عورت کا اتصالِ جنسی بھی اُن کو زندگی کی اِن گرانباریوں سے سبکبار کر کے لطف و مسرت کے اُس سبزہ زار میں لیجاتا ہے جہاں پہونچکر وہ بچوں کی طرح بیفکر ہوتے ہیں اور چڑیوں کی طرح خوش۔

اس موقعہ پر میں اس خیال سے کہ کہیں آپ میرے مقصد کے خلاف اِس "لطف و مسرت" کو کوئی اور "حیوانی مفہوم" نہ دیدیں یہ کہدینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہاں مسرت سے میری مراد صرف وہ مسرت ہے جو عاشق کو نیاز میں اور محبوب کو ناز میں محسوس ہوتی ہے، وہ مسرت جس کو نظیری اس طرح ادا کرتا ہے:۔

چہ خوش ست از دو یکدل سرِ حرف باز کردن | سخنِ گذشتہ گفتن گلۂ دراز کردن
اثرِ عتاب بُردن ز دل ہم اندک اندک | بہ بدیہہ آفریدن بہ بہانہ ساز کردن

گزشتہ زمانہ میں عورت و مرد کے اتصالِ جنسی میں اس چیز کو زیادہ اہمیت نہیں ۔ دیجاتی تھی اس لئے کہ اُس زمانہ میں زندگی کے مسائل اتنے اُلجھے ہوئے نہ تھے جتنے اب ہو گئے ہیں جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ پہلے کی بہ نسبت آج کل ہماری دماغی ترقی بہت بڑھی ہوئی ہے

---

[1] "عورت" کی تخصیص یہاں صرف اس لئے کی گئی ہے کہ اسوقت ہمارا موضوعِ بحث صرف "عورت کی عصمت" ہے۔

جس کی بنا پر روزمرہ زندگی کے تنوعات میں اتنا اضافہ ہو گیا ہے کہ وہ فطرت کے سادہ اُصولوں سے ہٹکر بہت پیچیدہ ہو گئے ہیں [illegible]
لئے اب جبکہ تمدن و تہذیب کی ترقی نے ہر انسانی دماغ کو بے پناہ طور پر معروفِ عمل بنا رکھا ہے اور جبکہ زندگی اپنی پوری [illegible]
اپنے تمام آلام و افکار کو جلو میں لئے ہوئے دُنیا میں نازیباشیاں کر رہی ہے — تو فطرتاً "سکون" کی احتیاج بھی انتہا اضافہ [illegible]
پہلے دماغی محنت کے مقابلہ میں جسمانی ورزش اور دماغی لیاقت و استعداد کے مقابلہ میں جسمانی طاقت و قوت بہت زیادہ وقیع سمجھی جاتی
تھی اور اس لئے دماغی سکون کی "مانگ" کم تھی[1] لیکن اب جبکہ ہر شخص کم و بیش تعلیمیافتہ ہے، دُنیا کا ہر قطعہ دوسرے قطعہ [illegible]
[illegible] ملکی "ریلوں اور ہوائی [illegible] سے جکڑا ہوا ہے۔ ہر شخص اخبار پڑھتا ہے اور فرانس میں رہکر جاپان کی جنگ کے امکانات کو [illegible]
کرگھتا رہتا ہے — وہ [illegible] سکون کی "صدائے ضرب" سے دُنیا کا گوشہ گوشہ گونج اُٹھا ہے۔

ایسی حالت میں ایک معقول سوسائٹی کا فرض یہ ہونا چاہئے کہ وہ ہر اُس چیز کا خیر مقدم گرمجوشی سے کرے جس سے عوام کو سکون
دماغی حاصل ہو سکے۔

اس قدر بحث کے بعد اب غور کیجئے کہ کسبی کے وجود کا مقصد کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ بقائے نسل اور تدبیر منزل اُس کے مقاصد سے خارج ہیں اس کے بعد اُس کا واحد مقصد جو کچھ رہجاتا ہے وہ
یہی ہے کہ تھکے ہوئے دماغوں کو سکون اور مجروح روحوں کو راحت پہونچائے۔ یعنی عورت و مرد کے باہمی اتصال کی صرف تیسری غرض کی
تکمیل کرنا اُس کی زندگی کا مقصد ہے۔ اور اسی لئے ظاہر ہے کہ "عصمت ریزی" کا وہ اجتماعی جرم "جو ایک منزلی اور خانہ دار خاتون
کے لئے خطرناک طور پر شرمناک ہے ایک کسبی کے حق میں کوئی جرم نہیں رہتا۔

کسبی کے پیشہ کی واحد غرض "اتصال مرد و زن" کے ابتدائی دونوں مقاصد (یعنی بقائے نسل اور تدبیر منزل) کو نظر انداز [illegible]
ہوئے اُس کے صرف تیسرے مقصد یعنی الام حیات سے کسیقدر آسودگی کو تقویت پہونچانا ہوتی ہے۔ وہ صرف اسی تیسری [illegible]
مہارت بہم پہونچاتی ہے اور گویا اس طرح انگریزی اصطلاح میں اس فن کو ( [illegible] ) [illegible]
نغمہ و رقص ہی کی ماہر نہیں ہوتی بلکہ "ابتدا" عام مرد و زن کے اہم مسئلہ کو ایک آرٹ بنا کر اپنی ساری زندگی اس تعریف مقصد[2] کی تکمیل کے لئے
وقف کر دیتی ہے۔ وہ "اتصال زوجین" کی اسی تیسری غرض کو اپنی حیات کا ایک مستقل موضوع بنا کر دنیا کے سامنے لذت و [illegible]
دسترخوان چُنتی ہے، وہ عشوہ و کرشمہ کے باریک ترین نکات کا گہرا مطالعہ کرتی ہے، حُسن اور حُسن کی جاذبانہ کشش کے مختلف پہلوؤں پر
غور کرتی ہے اور پھر اپنی تحقیقات کے ہر ہر جزو کو انسانی زندگی کے ساتھ تطبیق دینے کی کوشش کرتی ہے۔ جس سے [illegible]
بعد کائنات کی ساری فضا میں قوس قزح کے سے لطیف رنگ بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں، سائنس کی ہر [illegible]

---

[1] مقتبس از "بک آف نالج" (Book of Knowledge) طبع دوم

[2] "شرف ہر علمے یا بہ مناسبت موضوع آنست یا بجلالت غایت و منفعت یا بوثاقت براہان و حجت" (اخلاق جلالی مطبوعہ نولکشور صفحہ ۲)

ایک دنیا جلوہ نمائی کرتی ہے اور آواز کا ہر وہ تار جو ہوا میں ارتعاش پیدا کرتا ہے کوثر و تسنیم کی اُن رنگین موجوں کی نازک لہروں کے مشابہ ہوتا ہے جس کی ایک ایک جنبش کے ساتھ موسیقیت کے سیکڑوں ساز نغمہ ریز ہوتے ہیں۔

ان اُمور کو پیش نظر رکھتے ہوئے غالباً اب آپ میرے اس خیال سے اختلاف نہ کریں گے کہ کسبی کے پیشہ کا نتہائے مقصد عقلی اور منطقی اعتبار سے جرم نہیں ہے، اس لئے کہ فلسفۂ جرم کے اعتبار سے اس پیشہ سے خود کسبی کی ذات پر کوئی برا اثر پڑتا ہے اور نہ سوسائٹی پر، پھر اگر اعتدال پسندی سے ہٹ جانے کی بنا پر یا بعض خارجی عوارض کی وجہ سے سوسائٹی پر کبھی اس کا بُرا اثر مترتب ہوتا ہے تو اس سے نفس پیشہ کے وقار پر کوئی صدمہ نہیں پہونچنا چاہئے۔ اس کی مثال بالکل اس طرح سمجھئے جیسے اگر کوئی وکیل یا طبیب اپنے پیشہ سے ناجائز فائدہ اُٹھانے لگے تو اس کے یہ معنے نہ ہوں گے کہ وکالت یا طب کا پیشہ بذاتہ ذلیل سمجھ لیا جائے۔ پھر پیشہ کی شرافت و رذالت کا معیار اُس کے بنیادی اغراض کی شرافت و بلندی کے اعتبار سے قائم کیا جاتا ہے اور اسی لئے وکالت کو ایک شریف پیشہ سمجھا جاتا ہے اگرچہ ۹۰ فیصدی حالات کے ماتحت وکلاء مقدمات کی پیروی میں حق پرستی سے اعراض کرتے ہوں۔ اسی طرح کسبی جس کے بنیادی مقاصد میں رقص و سرود اور روح افزا مشاغل ہیں اپنے مقاصد کے اعتبار سے کچھ کم بلند نہیں ہے۔

بہرحال یہ ممکن ہے کہ بعض پست درجہ کی پیشہ ور کسبیاں بری ہوں، لیکن اس سے بلند رقاصاؤں پر الزام نہیں آنا چاہئے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے نفسِ ملازمت کے اعتبار سے وائسرائے بھی ملازم ہے اور عدالت کا ادنیٰ چپراسی بھی، لیکن اس کے باوجود دونوں میں اختلاف و افتراق کا ایک عالم حائل ہے۔

پھر جس طرح ایک جاہل یا غیر مہذب طبیب بھی ہمارے لئے ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک بد مذاق اور جاہل مغنیہ کے مسئلہ میں بھی سوسائٹی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اُس کی جہالت اور بد ذوقی کی بنا پر اُس کو حقارت کی نظر سے دیکھے لیکن ایک سنجیدہ اور تعلیم یافتہ مغنیہ کا مرتبہ کسی حیثیت سے بھی ایک بلند پروفیسر یا ایک اچھے شاعر سے کم سمجھنا ہماری اخلاقی کمزوری کی کچھ کم نفرت انگیز مثال نہیں ہے۔

عصمت فروشی کے بعد سب سے اہم چیز جو مغنیہ کے پیشہ کے خلاف بڑی شدت کے ساتھ پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہوتی ہے کہ "وہ محبت کے شریف جذبہ کا بہت غلط استعمال کرتی ہے۔ اس لئے کہ محبت کے الوہی جذبہ کے نام پر بازار میں بیٹھکر ہر کس و ناکس سے چار پیسے مانگنا فطرت کے اس لطیف جذبہ کی زبردست ترین توہین کرنا ہے نیز اپنے اُس جمالیاتی احساس کے خلاف بھی ایک عظیم بغاوت ہے جو فطرت کی طرف سے ہم کو ودیعت کیا گیا ہے"۔

اس اعتراض کی ساری بنیاد محبت کے اُس عجیب و غریب تخیل پر ہے جو خیالی افسانوں، شعرا کے دیوانوں یا ادیبوں کے مضامین کے سوا عملی دنیا میں کہیں نہیں پایا جاتا، پھر گو اس "الوہی جذبہ" کے متعلق کتنی ہی مبالغہ آرائیوں اور بلند پروازیوں سے کام کیوں نہ لیا جائے لیکن جب آپ اُس کی خالص فلسفیانہ تحلیل کریں گے تو اُس کا درجہ اُس ناقابلِ فطری ما بہ الاتصالی سے زیادہ ثابت نہ ہوگا جو انسان کی منزلی زندگی کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اور اس بنا پر جہاں منزلی زندگی کے ماتحت اُس معاہدہ کا

سوال ہی نہ پیدا ہو جسے سوسائٹی کے عرف میں "شادی" کہتے ہیں وہاں محبت کا سوال بھی قطعاً بے محل ہو جاتا ہے۔

پھر خوشنما پھولوں سے، لہلہاتے ہوئے سبزہ زار سے، برستی ہوئی گھٹا سے، پرکیف فضا سے، ماں، باپ اور بھائی بہن سے بھی ہم کو محبت ہو سکتی ہے لیکن جس طرح اُس کی نوعیت زوجین کی محبت سے سراسر مختلف ہوتی ہے اسی طرح رقاصہ سے بھی محبت ہو سکتی ہے لیکن اُس کی نوعیت بھی عام جنسی محبت سے مختلف ہو گی۔ جس طرح حسین کوئل کی "پکار" میں وہ لطافت اور کشش تلاش کرنا جو آپ کی بیوی کے حلقوم سے نکلے ہوئے گانوں میں ہوتی ہے ایک مضحکہ خیز مطالبہ ہو گا اسی طرح ایک کسبی سے بیوی کی سی محبت طلب کرنا حماقت و نادانی کی کچھ کم افسوسناک مثال نہ ہونا چاہئے۔

بہرحال جب بقائے نسل اور تدبیر منزل مغنیہ کے بنیادی مقاصد سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے تو پھر اُس میں اُس مابہ الانفصال یعنی زنا شوہرانہ محبت کا فقدان بھی جو خالص منزلی زندگی کی پیداوار ہے کسی حیثیت سے قابل الزام قرار نہیں پا سکتا۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ کسبی، جسکو ہم اپنی زبان کا کثیف ترین لغت سمجھتے ہیں اور جس کے مختلف ناموں کو ہماری سوسائٹی دنیا کی بدترین گالی سمجھتی ہے کیوں ہماری نظر عتاب کا اس درجہ غیر معقول سبب بنی ہوئی ہے اگر سوسائٹی کے فرد یا مجموعہ افراد کو اپنے اندر جذب ہونے کا استحقاق دینا نہیں چاہتی تو اس کا سب سے پہلا فرض یہ ہونا چاہئے کہ وہ اُس فرد یا اس مجموعہ افراد کو اپنے اس ارادہ اور نیت سے مطلع کر دے۔ لیکن اگر اس کے علی الرغم وہ اُس فرد یا اُس مجموعۂ افراد کو برقرار رکھنے کیلئے سہولتیں بہم پہونچاتی رہے گی تو اس کے کھُلے ہوئے معنے اس کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں کہ اُس کے خلاف ہر وہ نفرت جس کا اظہار سوسائٹی کی طرف سے کیا جاتا ہے شرمناک طور پر منافقانہ اور ریاکارانہ ہے۔

اگر مطربہ اور مغنیہ کو ہماری سوسائٹی نفرت و حقارت کا مستحق سمجھتی ہے اور وہ اس پیشہ کو قوم کے معاشرتی مفاد کے حق میں مضر تصور کرتی ہے تو پھر وہ اس پیشہ کے بقا کے لئے چندہ کیوں دیتی ہے؟ اگر قوم کے اس عضو کو وہ کاٹ ڈالنے کے قابل سمجھتی ہے تو پھر وہ اُس کے تغذیہ میں اتنی گہری دلچسپی کیوں لے رہی ہے؟

ہر مغنیہ کی سربفلک عمارتیں اور فردوس نما پائیں باغ ہمیں سوسائٹی کے اس منافقانہ فیصلہ کی جانب بار بار توجہ دلاتے ہیں۔

پھر اگر رقاصگی کا پیشہ قابل نفرین ہی ہے تو رقاصہ سے زیادہ ہر وہ مرد سزاوار سرزنش ہونا چاہئے جو اُس کے کوٹھے پر چڑھتا ہے۔ اگر سوسائٹی "پیشہ ور" کو بُرا سمجھتی ہے تو صرف اسی لئے کہ وہ اپنی عفت کو سربازار فروخت کرتی ہے۔ اور اس لئے اگر الزام کی ساری کائنات یہی ہے تو اس کے برخلاف ہر وہ مرد مستحق عتاب ہے جو اُس کی گلی میں نظریں اُٹھائے پھرتا ہے۔ ایسی صورت میں کیا کسبی کو ذلیل نظروں سے دیکھنے کے بجائے ہر اُس مرد کو قابل تشنیع نہ سمجھا جائے جو اُس کے یہاں سوسائٹی کے زعم کے مطابق یہ "شرمناک سودا" کرتا دکھائی دے؟

پھر سوسائٹی کا یہ فیصلہ کس اعتبار سے قابل تسلیم قرار دیا جا سکتا ہے کہ زنا کا ارتکاب مرد کے لئے تو زیادہ شرمناک نہ ہو لیکن جب عورت کا سوال آئے تو یہی معصیت اُسکی معاشرتی زندگی کے سارے جوڑ بند بُری طرح کھوکھلا کر دے؟

آخر اخلاقی یا معاشرتی زندگی کے فلسفہ کے اعتبار سے زنا کے مسئلہ میں مرد و عورت کا یہ امتیاز حق بجانب سمجھا جاسکتا ہے؟

بہرحال ان تمام حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے مندرجۂ ذیل منطقی نتائج نکالے جاسکتے ہیں:۔

۱۔ حقیقتاً سوسائٹی کسبی کو عصمت فروشی کی بنا پر قابل عتاب قرار نہیں دیتی ورنہ مرد کو بھی اُتنا ہی ذلیل سمجھا جاتا۔ اسکے برخلاف اس عتاب کا اصلی سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ چونکہ اسوقت تک عورت کو مرد کی ملکیت سمجھا جاتا رہا ہے اس لئے رقاصگی کے بیشہ کی خود اختیاری اور وقار نفس کو دیکھکر سوسائٹی کو یہ ڈر پیدا ہوگیا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اور عورتوں میں بھی خود اختیاری اور وقار نفس کا خیال سرایت کرجائے اور اس طرح مرد کو اپنے اس اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑے۔

۲۔ سوسائٹی رقاصگی کے فلسفہ سے ناواقف ہے اور چونکہ باپ دادا سے ہمیشہ اس کے خلاف کتھائیں سنتی چلی آرہی ہے، اسلئے قدامت پرستی کے جذبہ کے ماتحت اُس کے دل میں کسبی کے خلاف نفرت و عناد کا بے بنیاد جذبہ پیدا ہوگیا ہے۔

۳۔ اگر کسبی کے وجود سے سوسائٹی کے کسی اہم مقصد کی تکمیل نہ ہوتی تو دنیا کے اور بہت سے ناکارہ پیشوں کی طرح سے یہ چیز بھی یا تو بالکل ختم ہوجاتی یا دنیا میں خال خال نظر آتی۔ لیکن اس کے برخلاف سوسائٹی کے نفرت و اکراہ کے باوجود مغنیہ کا سرسبز ہونا بتلاتا ہے کہ سوسائٹی کو مغنیہ کی ضرورت ہے اگرچہ وہ نہ جانے کہ اس ضرورت کی بنیاد کن اُمور پر ہے۔

الغرض میں سمجھتا ہوں کہ ان اُمور کو پیش نظر رکھنے کے بعد رقاصہ کی صحیح حیثیت بہت کچھ واضح ہوجاتی ہے۔ اور اس لئے کتنا افسوسناک ہے یہ امر کہ ہم نے ابتک اُس کی بلند معاشرتی پوزیشن کو سمجھنے میں بیدردانہ تجاہل سے کام لیا ہے۔ لیکن اگر ہماری حقیقت ناشناسی کا یہ عالم کچھ دن اور باقی رہا تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس غلطی کا ردعمل سوسائٹی کی کسی صنف کو اُلٹ کر نہ رکھدے۔ فقط

سید ابوسعید بزمی بھوپالی۔ بی۔ اے

# یہ یونیورسٹیاں

ہمنے بچوں کو ایک کھیل کھیلتے دیکھا ہے۔ وہ کھیل یہ ہو کہ ایک بچہ بڑھیا بنتا ہے اور لکڑی لیکے جھکا جھکا بڈھوں کی طرح چلتا ہے۔ دوسرا بچہ اس سے پوچھتا ہے "بڑھیا۔ بڑھیا کیا ڈھونڈتی ہے" بڑھیا جواب دیتی ہے "سوئی"

سوال:۔ سوئی لیکے کیا کرے گی۔

جواب:۔ بٹوا سیونگی۔

سوال:۔ بٹوا سیکے کیا کرے گی۔

جواب:۔ روپئے رکھوں گی۔

سوال:۔ روپئے رکھ کے کیا کرے گی۔

جواب:۔ گائے لوں گی۔

سوال:۔ گائے لیکے کیا کرے گی۔

جواب:۔ دودھ پیوں گی۔

سوال کرنے والا بچہ کہتا ہے "دودھ نہیں موت پئے گی" اس پر لکڑی لیکے بڑھیا اس کے پیچھے دوڑتی ہے اب سب لڑکے شریک ہو جاتے ہیں اور "دودھ نہیں موت" چلانے لگتے ہیں، اور بڑھیا ہر ایک کو لکڑی مارنے کی کوشش کرتی ہے۔

یہی کھیل ہم اس مضمون میں یونیورسٹیوں سے کھیلنا چاہتے ہیں اور پوچھتے ہیں۔

یونیورسٹی۔ یونیورسٹی کیا ڈھونڈھتی ہے؟

یونیورسٹی:۔ روپیہ۔

ہم:۔ روپیہ لیکے کیا کریگی۔

یونیورسٹی:۔ پروفیسروں کو بھاری بھاری تنخواہیں دوں گی انکو چین عیش اور کاہلی کی زندگی بسر کراؤں گی۔

ہم:۔ پروفیسر کیا کریں گے۔

یونیورسٹی:۔ پروفیسر قوم کے لڑکوں کو مہینہ میں تین چار گھنٹے اگر دل چاہا پڑھا دیں گے اس کے بعد اپنی شان و شوکت دکھائیں گے وائس چینسلر اپنے بڑھاپے کا زمانہ چین و عیش سے گزارے گا۔

ہم:۔ لڑکے اس یونیورسٹی میں پڑھ کے کیا کریں گے۔

یونیورسٹی:۔ قوم کو ترقی دیں گے۔

ہم:۔ ترقی نہیں ٹھینگا دیں گے۔

ہمارے اس کہنے پر وائس چانسلر۔ پروفیسر۔ ریڈر اور لکچرار ہمیں مارنے دوڑیں گے اور ہم یہی کہے جائیں گے۔

ہمیں یہ بتاؤ کہ ان یونیورسٹیوں نے ہندوستان کی ذہنی سطح کتنی بلند کی؟ کس مقدار میں ذہن خلاق ان یونیورسٹیوں نے ہندوستان میں پیدا کیا۔ ملک کی زندگی کے مسائل کے حل کرنے کی کتنی طاقت یونیورسٹیوں سے لیکر طالب علم نکلے اور کتنی ہمت و جرأت کے ساتھ اسے استعمال کیا۔

وہ یونیورسٹی جو اپنے طالب علموں میں خیال کرنے کی قوت اور عمل کرنے کی جرأت نہ پیدا کرے۔ وہ یونیورسٹی جس کے

طالبعلموں کی ذہنی طاقتیں ۱۹۵۲ء میں وہی ہوں جو ۱۹۴۲ء میں تھیں اور ۱۹۵۲ء میں وہی رہیں جو ۱۹۳۲ء میں تھیں، اسکے معلموں کو باوجود ان کے علم و تجربہ کے طوق لعنت پہنایا جائے تو بہتر ہے۔ معلم وہ ہے جو اپنے دماغ کی قوت متعلم میں منتقل کرے کسی نہ کسی طرح متعلم تک پہونچائے معلم کی شان پیغمبر کی ہونا چاہئے اس کو جو فیض ملا ہو اسے متعلمین پر منتقل کرے یونیورسٹی کا کام یہ ہے کہ متعلمین کا دماغ (خلاق) بنائے۔ اگر اس نے یہ نہ کیا تو کچھ نہ کیا۔ یونیورسٹی طوطے پڑھانے کی جگہ نہیں ہے۔ یونیورسٹی چراغ سے چراغ روشن کرنے کی جگہ ہے۔

اس صوبۂ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ میں پانچ یونیورسٹیاں ہیں، سوسائٹی کے لئے ذہنی قوت کی مقدار کسقدر ہر سال ہمکو ان یونیورسٹیوں سے حاصل ہوتی ہے۔ کتنے نئے خیال ان یونیورسٹیوں نے پچھلے دس سال میں پھیلائے سوسائٹی کی کتنی خرابیاں ان یونیورسٹیوں کے متعلمین نے دور کیں۔ نئی دنیا بنانے میں ان یونیورسٹیوں کے نوجوانوں نے کیا اور کتنی سعی کی

ہم نے اپنے گرم خون اور تازی جان والے نوجوان یونیورسٹیوں کے سپرد کئے تھے اُنھیں کیا بنا کے اُنھوں نے ہمیں واپس کیا۔ ان یونیورسٹیوں کی شاندار عمارتیں کیا قوم کی ذہنی طاقتوں کے مقبرے ہیں جن میں وہ دفن کیجاتی ہیں۔ پچھلے دس برس میں دس ہزار جوان گریجوئیٹ یونیورسٹیوں نے نکالے ہونگے دس ہزار گرم خون والے نوجوان جس سوسائٹی میں ہوں اور وہ سوسائٹی جس جگہ پر تھی اُسی جگہ پر رہے۔ دس ہزار تازی جان رکھنے والے نوجوان جس سوسائٹی میں ہوں وہ سوسائٹی اپنی اصلاح نہ کرسکے۔ دس ہزار نوجوان! اور سوسائٹی کی خرابیوں کا رونا۔ دس ہزار یونیورسٹیوں کے نکلے ہوئے نوجوان اور فرسودہ اور پست خیال والوں کی حکومت اور جمود سوسائٹی میں قائم رہے۔ دس ہزار یونیورسٹیوں میں پلی ہوئی جانیں سوسائٹی میں موجود ہوں اور سوسائٹی کے ذہن کی سطح وہی ہو جو دس برس اُدھر تھی۔ دس ہزار ڈائینامو اور کرنٹ ندارد واہ ری یونیورسٹی۔ وا رے یونیورسٹی کے معلم اور واہ رے یونیورسٹی کے طالب علم۔

یونیورسٹی کا کام یہ ہے کہ متعلمین کے دماغوں کو وسیع کرے ابھارے اور بلند کرے انھیں یہ محسوس کرائے کہ انسانی کوششوں نے عالم کے کیا کیا راز کھولے ہیں۔ ہر شاخ علم کے حدود کیا ہیں اور کیا واسطہ اور رابطہ ایک علم کا دوسرے علم سے ہے۔ وہ حقیقتیں جو علوم سے منکشف ہوئی ہیں، ان کا تعلق انسانی زندگی سے کیا ہے انسانی مجبوریاں اور اس کی طاقتیں کیا ہیں۔ انسان نے کیا کیا۔ کیا اور جو کچھ کیا کس طرح کیا۔ فرد کا جماعت سے کیا تعلق ہے۔ جماعت کی مضبوطی افراد سے کس طرح ہوتی ہے۔ انسان کی کمزوریاں کیا ہیں افراد اور جماعتیں کس طرح ان کمزوریوں سے اپنے کو پست کرتے کرتے فنا ہو جاتی ہیں۔ یہ کمزوریاں کس طرح دنیا سے دور ہوں اور ہو سکتی ہیں خلاصہ یہ کہ یونیورسٹی کا کام یہ ہے کہ متعلم کے دماغ کو حقیقت جو بنائے اور ہر چیز کے اصلی حدود سمجھنے کی طاقت پیدا کرے علم اور صنعت یعنی فطرت اور انسانی طاقت کے جو اجزاء انسانی زندگی میں ہیں انھیں الگ الگ سمجھ سکے

یہ عمل جب انسانی ذہن کے ساتھ کیا جاتا ہے تو وہ (خلاق) ہونے لگتا ہے۔ بات میں بات پیدا کرتا ہے۔ ایک خیال کو دوسرے خیال سے ملا کے تیسرا خیال پیدا کرنے کی قوت اس میں ہو جاتی ہے۔ ایک خیال کو نئے حالات پر استعمال کرنے کی استعداد اور قدرت وہ پیدا کر لیتا ہے۔ اس کو اپنے اوپر اعتماد ہوتا ہے جس سے ہمت و جرات پیدا ہوتی ہے یہی چیزیں انسانی زندگی کے آلۂ کار ہیں

کیا یہ یونیورسٹیاں زندگی کے آلات کار اپنے متعلمین کو فراہم کرتی ہیں۔ یا صرف یہ سکھاتی ہیں کہ دفتروں میں نوکری کے لیے عرضیاں لئے گھوما کرو۔ کسی پیشہ میں داخل ہو تو اس کو بجائے بلند کرنے کے پست کر دو۔ یونیورسٹی کے متعلمین انڈین سول سروس اور انڈین پولیس سروس میں اب آئے ہیں۔ لوگ ان کی بابت کیا کہتے ہیں؟ جو کچھ ہم نے سنا ہے اور جو کچھ ہم جانتے ہیں اس کی بنا پر یونیورسٹی کی تعلیم تعریف کی مستحق نہیں ہے۔

یہ متعلمین یونیورسٹیوں کے کیا کرتے ہیں اس کا بھی کوئی دیکھنے والا ہے ان کے نتائج کار تو ہمارے سامنے ہیں ان سے ان کے کام کی خوبی تو نظر نہیں آتی۔ وہ ہی امتحانات وہ ہی متعلمین کی ذہنی سطح، پھر ان یونیورسٹیوں پر اتنا روپیہ صرف کرنے کی ضرورت کیا ہے۔

تھیوسیڈائڈ باشندگان ایتھنیس کی بابت لکھتا ہے:۔

"ہم ایتھنی حسن کے عاشقوں میں ہیں مگر ہمارے مذاق میں سادگی ہے اپنے ذہن کی تربیت مردانگی کو بغیر ضائع کئے ہم کرتے ہیں۔ دولت کا صرف ہم لات اور نمائش کے لئے نہیں کرتے۔ ناداری ہمارے یہاں ذلت نہیں ہے بلکہ حقیقی ذلت اسمیں ہے کہ ناداری سے بچنے کی کوشش نہ کیجائے۔ ایتھنی باشندہ یعنے ملکی سیاست سے بے پرواہ اور بے خبر نہیں ہوتا اگر وہ کاروبار میں بھی مشغول ہے تب بھی سیاست کے متعلق معقول واقفیت اور خیال رکھتا ہے۔ ہم ایتھنی اس شخص کو جو سیاست کے متعلق خیال نہیں رکھتا اور سیاسی معاملات میں دلچسپی نہیں دکھاتا۔ ایک بے مصرف آدمی سمجھتے ہیں۔

کیا علما ر یونیورسٹی اپنے طلبا ر کے لئے یہ نمونہ زندگی پسند کرتے ہیں۔ کیا ان کی زندگی بھی اسی نمونہ کی ہے اگر نہیں تو کس نمونہ کے نوجوان تم پیدا کرنا چاہتے ہو علما ر یونیورسٹی یا تم کس طرح ان مولویوں اور پنڈتوں سے بہتر ہو جن کی مذمتیں تمہارے ورد زبان ہیں۔ وہ قدما کی سکھائی ہوئی باتیں دہراتے اور اپنے شاگردوں کے دماغوں میں ٹھونستے ہیں تم جدید یورپ کی تصانیف رٹتے ہو اور اپنے طالبعلموں کے دماغوں میں بھر دیتے ہو۔ کیا گیٹے کا مشہور مقولہ تم نے سنا ہے "حقایق عالم جن کا علم ہمیں پڑھنے یا سننے سے ہو ان کا انکشاف از سر نو ہمیں کرنا پڑتا ہے" جس کے یہ معنے ہیں کہ پڑھکے یا سن کے کوئی خیال اور کوئی حقیقت انسان کے ذہن کی ملکیت اسوقت تک نہیں ہوتی جب تک یہ محسوس نہ ہو کہ اس کو اس نے خود دریافت کیا یعنی قوت فاعلی اس پر صرف کی ہے۔ یونیورسٹی کا کام نوجوانوں میں فعل کرنے والا ذہن پیدا کرنا ہے۔ جو خیال اُس کے ذہن کے سامنے پیش کیا جائے اُسے اپنا کرے اور یہ زینہ ہو خلاق ذہن پیدا کرنے کا، ہمیں بتاؤ دماغ کی اس قسم کی تربیت کے لئے ہماری یونیورسٹیوں میں کون طریقے اختیار کئے جاتے ہیں سب سے بہتر طریقہ خیال پیدا کرنے اور حقیقت کو منکشف کرنے کا گفتگو ہے ان یونیورسٹیوں میں یہ طریقہ کس حد تک استعمال ہوتا ہے۔ سقراط نے کوئی کتاب نہیں تصنیف کی کوئی نظام فلسفہ نہیں مدون کیا۔ وہ حقیقت جو تھا اور اپنے خیالات کو گفتگو کر کے خود بھی فائدہ حاصل کرتا تھا اور دوسروں کو بھی مستفید کرتا تھا اپنے اس طریقہ تعلیم سے کتنے حقیقت جو دماغ اُس نے پیدا کر دئے یونانی فلسفہ حقیقت میں ان دماغوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے جنہوں نے اپنے چراغ سقراط کے چراغ سے روشن کئے تھے، درسگاہوں کا طریقہ افلاطون نے قائم کیا اور پہلی درسگاہ یونان میں افلاطون کی اکادمیہ تھی۔ لیکن اس اکادمیہ سے

افلاطون دوسرا افلاطون نہ پیدا کرسکا جیسے سقراط نے افلاطون پیدا کیا تھا۔ درسگاہوں میں تعلیم لکچر دیکر کرسکتے ہو بحث و مباحثہ کرکے نہیں دے سکتے۔ لکچر اور کتابیں متعلمین کے دماغوں کو مرعوب کردیتی ہیں ان کو اُبھرنے سے روکتی ہیں۔

سقراط نہیں ہوسکتے ہو نہ سہی لیکن وہ طریقے تو برت سکتے ہو جو وہ برتتا تھا۔ وہ فضا تو اپنے گرد پیدا کرنے کی کوشش کرسکتے ہو جو وہ پیدا کرتا تھا۔ یونیورسٹی حقیقتاً سقراطی فضا پیدا کرنے کی جگہ ہے۔ تم افلاطون کی طرح لکچر دینے کا شوق رکھتے ہو مگر سقراط کی طرح مسئلہ کے حل کرنے میں متعلمین کی مدد کیوں نہیں کرتے تاکہ متعلم تمھارے چراغ سے اپنا چراغ جلائے۔ یونیورسٹی کسی نظام خیال کی تعلیم دینے کی جگہ نہیں بلکہ ہر نظام پر بحث کرنے کی جگہ ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں مسلمات کی گنجائش نہیں۔ یہ رد و قدح کی جگہ ہے۔ یہاں ذہنی اشیاء کی تحلیل و ترکیب ہوتی ہے۔ کیا ان یونیورسٹیوں کے دس ہزار تلامذہ کے دماغ اسی کام کے لئے تیار کئے گئے ہیں؟ ملک کی زندگی کے کتنے مسائل پر اپنی ذہنی طاقتیں انھوں نے استعمال کیں اور نہیں استعمال کیں تو کیوں کیا کسی مسئلہ کا حل درکار نہیں ہے۔ یہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھنا کیا معنے۔

اس کی ضرورت ہم تم کو بتائیں۔ یونیورسٹیوں سے تم دس ہزار گریجویٹ کیا سیکھ کے آئے ہو۔

یہ جو کچھ ہم نے کہا وہ حقیقتاً یونیورسٹیوں سے کہا۔ اب ہم دو دو باتیں یونیورسٹیوں کے طالبعلموں سے کرنا چاہتے ہیں۔ یہ یونیورسٹیاں ہماری نسل کے لوگوں کی بنائی ہوئی نہیں ہیں بلکہ ہم سے بھی پہلی نسل کے لوگ اس کے بنانے میں شریک تھے ہمارا اور ہم سے پہلے والا جنریشن ہندوستان کا یورپ اور انگلستان کے اُنیسویں صدی کے خیالات کا فضلہ نوشش جنریشن تھا۔ تمھارے اساتذہ بھی ظاہر ہے کہ اسی جنریشن کے لوگ ہیں۔ ان سے بہت زیادہ امیدیں تمھیں نہ رکھنا چاہئیں۔ ان میں بہت سے علم و تجربہ والے لوگ ہیں لیکن تمھارے ذہنوں اور قلبوں کو جس آگ کی ضرورت ہے وہ ان میں ہے ہی نہیں تم تک کیا پہونچائیں گے ان سے ان کے ذہن کے بغیر سلگے کونئے لو۔ ممکن ہے خود تمھاری دبی ہوئی آگ ان کو سلگا دے اور یہ بھی دکھیں اور پھر تم بھی دہک اُٹھو۔ لکچرار سے لیکر ریڈر اور پروفیسر تک کسی کو آرام نہ لینے دو۔ ہر وقت ان سے کہو کہ تم ہمیں ذہنی کشتیاں لڑنا سکھاؤ۔ اسی کی تم تنخواہ پاتے ہو۔ ہندوستان کی زندگی کی اُن سے کہو تصویر بنا کے پیش کریں تم اُس کے ہر جزو پر رد و قدح کرو اگر یہ تصویر پیش ہوا ہے مضحکہ کرو ہندوستانی زندگی کے ہر پہلو پر ذہنی نقطۂ نظر سے غور کرنے کا نہ صرف تمھیں اختیار ہی بلکہ اس پر غور کرنا تمھارا فرض ہے۔

پروفیسروں کو اتنی مہلت نہ دو کہ وہ اپنی بیویوں یا پرائی بیویوں میں بیٹھ کے وقت ضائع کریں۔ کلاس روم کے بعد ان کا زیادہ وقت طلبا کی صحبت میں صرف ہونا چاہئے۔ پروفیسر ہمہ وقت ان ڈیوٹی ہے تم اپنی جگہ یونیورسٹی کو محکمہ نہ بننے دو۔ اسے اپنے ذہنوں کے پنپنے بڑھنے کی جگہ بناؤ۔ تمھاری زندگیاں گورنمنٹ اسکولوں اور انٹرمیجیٹ کالجوں میں پہلے ستیاناس کردی جا چکی ہیں وہاں تم ایسے ہاتھوں میں آتے ہو۔ جنھیں ہمہ وقت اپنی تنخواہوں کی فکر ہوتی ہے۔ جن کا رجحان مدرسہ کو مثل دیگر سرکاری محکموں کے ایک محکمہ بنا دینے کی جانب ہوتا ہے ہمیں موجودہ گورنمنٹ اسکولوں کا کافی تجربہ ہے۔ اور اسی تجربہ کی بنا پر یہ کہنے کی ہم جرأت کرتے ہیں کہ گورنمنٹ اسکولوں کی فضا ذہنی لطائف سے اسدرجہ خالی ہوتی ہے کہ اللہ کی پناہ

مدرسین کی ذہنیت ادنےٰ سے ادنیٰ اعلیٰ تک وہی ہوتی ہے جو پٹواری سے لیکے ڈپٹی کی ہوتی ہے۔ طالبعلموں خدا کے لئے یونیورسٹی میں پہونچکر گورنمنٹ اسکولوں کی زندگی کو بھلا دو۔ اگر یہ زندگی تمھیں یونیورسٹی میں بھی یاد رہی تو سوائے گورنمنٹ ملازمت کے تم کسی مصرف کے نہ ہوگے اور گورنمنٹ میں ملازمین کی جتنی بلند زندگی ہوتی ہے اس کو اگر جاننا چاہتے ہو تو کسی ضلع میں ان لوگوں کی صحبت میں ایک ہفتہ رہو۔ تم اگر صاحب مذاق ہو تو تمھارا دم گھٹنے لگے گا اور یہ محسوس کروگے کہ کسی بند کمرہ میں بٹھادئے گئے ہو اور دل چاہتا ہے کہ دروازہ کوئی کھولدے تاکہ ٹھنڈی ہوا کا کوئی جھونکا آجائے۔

ٹیگور نے کہا ہے جب بچہ جنم لیتا ہے تو خدا اس کے کان میں کہتا ہے اے انسان میں تجھ سے ناامید اور بددل نہیں ہوا ہوں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر انسان نئی غرض خداوندی پوری کرنے کے لئے آتا ہے ایک نیا پیام عالم بالا سے لیکر آتا ہے بقول ٹینیسن یہ کہتا آتا ہے "پرانی ترتیب بدلتی ہے اور اپنی جگہ نئی کو دیتی ہے۔ خدا کی مرضی پوری ہونے کے بہت سے ڈھنگ ہیں" اپنے دل میں یہی سمجھو کہ یونیورسٹی کے ذریعہ دُنیا میں نئی جان ہم پھونک رہے ہیں۔ جو چیز آنے والی ہے اس کی شکل بنانے میں مصروف ہیں اپنے پیام کو موزوں شکل دینا چاہتے ہیں تاکہ دنیا دلچسپی سے سنے۔ دنیا کے ساتھ بیاہ کرنے کے لئے دولھا بن رہے ہیں۔ یہ اسٹاف یہ پروفیسر ہیں سجانے بنانے کیلئے ہیں براہ خدا اپنا یہ طرز عمل بدلو کہ تم میاں مٹھو ہو اور تمھارے اُستاد تمھیں پڑھا رہے ہیں۔ میاں مٹھو سسٹم آف ایجوکیشن غلط اور بالکل غلط ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تم پڑھتے اور سیکھتے ہو لیکن یہ غلط ہے کہ کوئی دوسرا تمھیں سکھاتا ہے، معلم کا انداز طبیعت تو یہی ہو کہ میں پڑھاؤں اور سکھاؤں لیکن متعلم یہ نہ سمجھے کہ وہ سکھایا جارہا ہے اور وہ یہی سمجھے کہ اُستاد بخل کر رہا ہے اور وہ زبردستی اس کے پاس جو کچھ ہے اسے چھین رہا ہے اُستاد کے لئے متعلم رہزن وڈاکو ہو جو کچھ اُس کے دماغ میں ہو اُسے لے لے۔ ایک آخری بات کان میں کہنا اور پوچھنا چاہتا ہوں بکسر میں مہاتما گاندھی کے ساتھ سناتن دھرمیوں نے جو کچھ کیا وہ تم نے سنا ہوگا۔ اس شرمناک واقعہ کی ذمہ داری یونیورسٹی کے گریجویٹ پر کچھ عائد کرتے ہو یا نہیں۔ ان گریجویٹس نے تعصب پست خیالی، وہم پرستی بلند اور اعلیٰ خیال سے نفرت، پُرانے فرسودہ خیالات سے اس درجہ رغبت کہ جان ان پر قربان کرنے کو تیار، ان حالات کی اصلاح کے لئے کیا کیا۔ تمھارا کیا قصد ہے۔ جمود، پستی اور کنسرویٹزم پر اپنے کو بھی قربان کردوگے۔ ہمیں بتاؤ تمھارا کیا قصد ہے۔؟

(معلومات)

عبدالوالی بی۔ اے

---

# باب المراسلۃ والمناظرۃ

## کیا لامذہبیت امن و سکون کی ضامن ہے

(جناب شہاب الدین صاحب۔ عثمانیہ یونیورسٹی)

ماہ مئی کے نگار میں ایک صاحب کا مضمون ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے۔ "تاریخ کا منارہ، تمدن کا ستون، قوموں کی زندگی کا اہم اصول اگر کوئی چیز ہے تو وہ صرف مذہبی اصول ہیں" آپ نے جو نوٹ لکھا ہے اس کے متعلق مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔

امن و سکون کے قیام کے لئے یہ ضروری ہے کہ بنی نوع انسان ایک خیالِ مشترک سے وابستہ ہوں ان کے اغراض و مقاصد باہمدگر متصادم نہ ہونے پائیں۔ سامنے ایک منزل ہو اور ہر قدم اُٹھانے والا اُسی کو اپنا منتہائے مقصود تصور کرے۔ یہی ہے حاصل اتحاد اور اسی سے دلچسپی اور خواہش عمل پیدا ہوتی ہے جو بقائے انسانیت کے لئے ازحد ضروری ہے۔ پھر ذرا غور کیجئے کہ نفس انفرادی کے مقابل نفس اجتماعی پیدا کرنے کے جو ذرائع اختیار کئے گئے ان میں سب سے قوی ذریعہ کیا ہے؟ میرا خیال ہے کہ مرکزیت واجتماعیت کے قیام میں (جس کے بغیر امن و سکون ممکن نہیں) اور احساس انسانیت کو بیدار کرنے میں مذہب نے جس قدر حصہ لیا۔ اس کا مقابلہ دنیا کی کوئی قوت نہیں کر سکتی۔ اب رہی قومیت سو بقول آپ کے "وہ بھی مذہب ہی کے اثرات باقیہ میں سے ہے" اس میں شک نہیں کہ مذہب کی تاریخ خوں آشامی کی ایک ہیبتناک داستان ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے صفحات اتحادِ خیال اور اتحادِ عمل کے ایسے عجیب و غریب مناظر پیش کرتے ہیں جن سے انکار کرنا گویا حقیقت پر پردہ ڈالنا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ جس مقصد کے لئے مذہب کا قیام عمل میں آیا۔ اس کی تکمیل اس نے نہیں کی۔ اسمیں بھی

شبہ نہیں کہ دنیا سے افتراق و بدامنی، خونریزی و انسانیت شکنی کا خاتمہ ہو سکا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کونسا ذریعہ ہو سکتا ہے جو بنی نوع انسان کو ایک شیرازہ سے وابستہ کرے؟ یقیناً اس کا جواب آپ یہ دیں گے کہ "لامذہبیت" اور "لاقومیت" ہی وہ تنہا ذریعہ ہے جو انسانیت نواز ہو سکتا ہے۔ مگر خوف یہ ہے کہ یہ نظریہ جو اتنی وسعت اختیار کرے کہ تمام انسانوں کو "ایک ہی کرہ کے رہنے والے اور ایک ہی مادرِ گیتی کے فرزند" ہونے کا یقین دلائے لیکن نظریہ کی حد تک ہی نہ رہے۔ جو اعتراض مذہب کے متعلق آپکا ہے وہی اس پر بھی عائد ہوتا ہے کہ اُصول کی حد تک "آپ پاکیزہ سے پاکیزہ جذباتِ انسانیت و اخوت لوگوں کے سامنے پیش کر سکتے ہیں" مگر دُنیائے عمل میں ان کی حقیقت معلوم۔

آج کل روس "لامذہبیت" کا سب سے بڑا علمبردار ہے، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ روسی قوم اپنے مفاد کے آگے "ایک ہی سیارہ کے بسنے والوں" کے اغراض کو بالکل اسی طرح پامال نہ کرے گی جو متعین مذہب کے کارناموں کا نمایاں پہلو ہے؟ اگر فطرتِ انسانی ہر جگہ ایک ہے تو پھر کیوں مذہب کو بدنام کیا جاتا ہے۔

امید ہے کہ شخصِ ثالث کی حیثیت سے جس طرح آپ مذہب پر تنقید فرماتے ہیں اسی طرح "لامذہبیت" سے بھی بے تعلق ہو کر اس کا جواب عنایت فرمائیں گے۔

---

(نگار) یہ آپ نے بالکل درست فرمایا کہ امن و سکون کے قیام کے لئے بنی نوع انسان کا کسی ایک خیال مشترک سے وابستہ ہونا ضروری ہے۔ اور اگر اسی اصول کو سامنے رکھکر آپ غور و تامل سے کام لیں تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ مذاہب عالم کبھی اس اُصول پر کاربند نہیں ہو سکے اور نہ یہ اُن کے حیطۂ اقتدار میں تھا۔

افسوس ہے کہ آپ نے "نفسِ اجتماعی" سے کسی خاص قوم یا مخصوص جماعت کا مفہوم مراد لیا ہے اور اسی لئے آپ فرماتے ہیں کہ مذہب نے اس کے قیام میں بڑا حصہ لیا ہے، لیکن اگر ہئیت اجتماعی میں تمام بنی نوع انسان کو شامل کر لیں (اور دنیا کے امن و سکون کے لئے ان کو شامل کرنا ضروری ہے) تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ مذہب نہ صرف یہ کہ اس باب میں ناکام رہا بلکہ بڑی حد تک برہمی سکون کا باعث ہوا۔

اگر دُنیا میں صرف ایک ہی مذہب رائج ہوتا تو بیشک آپ کا یہ دعوےٰ صحیح ہو سکتا تھا کہ اس نے وہ نفسِ اجتماعی پیدا کیا جو دنیا میں قیامِ امن و سکون کے لئے ضروری ہے، لیکن چونکہ ایسا نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا تھا اسلئے بجائے اس کے کہ تمام بنی نوع انسانی میں یکجہتی پیدا ہوتی، انھیں مذاہب کے وجہ سے باہم گرا اور اختلاف پیدا ہوا یہاں تک کہ دُنیا کا کوئی ظلم ایسا نہ تھا جو مذہب کے نام پر روا نہ رکھا گیا ہو۔

آپ اس کے جواب میں ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو دنیا کا قصور ہے کہ وہ کیوں نہ مسلمان ہو کر ایک رشتہ سے وابستہ ہو گئی، لیکن آپ کا یہ اعتراض درست نہ ہوگا، کیونکہ جس طرح آپ کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے، اسی طرح ایک عیسائی بھی کہہ سکتا ہے کہ دنیا نے کیوں نہ مسیحی مذہب اختیار کیا اور ایک ہندو بھی یہی کہنے کا حق رکھتا ہے اور ایک آتش پرست بھی۔ پھر اس کا فیصلہ کیونکر ہو کہ دُنیا اور اہل دُنیا کو کیا کرنا چاہئے تھا اور کس مذہب کا اختیار کرنا مناسب تھا۔

دین یا مذہب نام ہے ایک مخصوص اعتقاد و یقین کا جو کسی شخص کے دل میں پیدا ہو کر اس کے ضمیر کو مطمئن کر دے اور چونکہ یہ اطمینان بڑی حد تک ایک ملک کے آب و ہوا، اسکی جغرافی حالت، اور تمدنی و معاشری ضروریات سے وابستہ ہوتا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ وہ مذہب جو اہل مغرب کے زندگی یا حالات کے لحاظ سے ظہور میں آئے گا وہ مشرق والوں کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا، اور جو اہل شمال کے لئے مناسب ہوگا وہ جنوب کے باشندوں کے لئے قابل قبول نہ ہوگا۔ اگر آپ نے سامی مذاہب اور آرین مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان دونوں میں کیا فرق ہے اور اس فرق کے پیدا ہونے کا خاص سبب یہی اختلافِ ذوق تھا جو ان دونوں قوموں میں پایا جاتا تھا اور چونکہ اختلاف ذوق ہمیشہ نتیجہ ہوا کرتا ہے اختلافِ آب و ہوا، اختلافِ احول، اور اختلافِ جغرافی کا، اس لئے دنیا میں مختلف مذاہب کا پیدا ہونا ضروری تھا اور یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ تمام دُنیا کسی ایک مذہب کو اختیار کر کے تمام بنی نوع انسان کو کسی ایک مرکز سے وابستہ کر دے۔ الغرض مذہب کا خیال اصولاً و فطرتاً کوئی ایسا خیال نہیں ہے جو کرۂ ارض کے تمام باشندوں کو کسی ایک شیرازہ سے منسلک کر سکے اور اس لئے یہ قیاس کرنا کہ مذہب دنیا میں قیام امن و سکون کا باعث ہو سکتا ہے، بالکل قیاس مع الفارق ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ مذہب نے اتحادِ خیال و اتحادِ عمل کے ایسے ایسے مناظر پیش کئے ہیں جس سے انکار محال ہے، بالکل درست ہے، لیکن کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اتحادِ خیال و عمل کسی مخصوص جماعت یا مخصوص افراد سے آگے بڑھ سکا اور کیا اس اتحادِ خیال و عمل کی بنیاد دوسری قوموں اور جماعتوں کی تباہی و بربادی پر قائم نہیں رہی، پھر ایسا اتحاد و اجتماع یا ایسا نفسِ اجتماعی، دنیا کے کس کام آ سکتا ہے اور وہ لوگ جو بنی نوع انسان کے تمام افراد کو ایک مرکز پر لانا چاہتے ہیں، اس سے کیا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

اب آپ کے استفسار کا دوسرا حصہ سامنے آتا ہے کہ اگر مذہب اس مقصد میں ناکام رہا تو اس کا دوسرا ذریعہ اور کیا ہو سکتا ہے اور اگر یہ ذریعہ "لامذہبیت" یا "لاقومیت" قرار دیا جائے تو اس کی کامیابی کی کیا ضمانت ہے اور کیا روس جو اس وقت "لامذہبیت" کا سب سے بڑا علمبردار ہے، دوسرے ملکوں کے اغراض کو بالکل اس طرح پامال نہ کرے گا جس طرح "مذہبیت" نے کیا۔

آپ کا یہ سوال یقیناً غور طلب ہے لیکن قبل اس کے کہ اس کا جواب دیا جائے یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ "لامذہبیت" کا صحیح مفہوم کیا ہے ــــ مجھے علم نہیں کہ آپ نے اس کا کیا مفہوم قرار دیا ہے، لیکن میرے نزدیک اس مصنف میں

ایک وہ جس کا تعلق فلسفۂ مذہب یا معتقدات دینی سے ہے جس میں ایک قوم کی روایات بھی شامل ہیں اور دوسرا وہ جو سوسائٹی یا سماج سے متعلق ہے۔ پھر اب دیکھنا یہ ہے کہ مذاہب میں باہم گر خونریزی کا سبب کونسا پہلو ہوا ہے، ظاہر ہے کہ اس کا سبب صرف معتقدات دینی تھے جن کی تبلیغ و ترویج نے سارا فساد برپا کیا اور اس کو محو کر دینے کا نام میں نے "لامذہبیت" قرار دیا ہے۔ یعنی اگر ایک شخص کا مذہب صرف اس کے ذاتی احساس و یقین تک محدود رہتا ہے اور دوسرے کے اعتقاد کو مجروح نہیں کرتا تو ہمیں کوئی حق حاصل نہیں کہ اس کے خلاف گفتگو کریں لیکن اگر وہ سوسائٹی کے نظام کو درہم برہم کر دینے والا ہے یا ہمارے حاسۂ اجتماعی کو ضرر پہونچانے والا ہے، تو یقیناً اسے محو ہو جانا چاہئے۔

روس کی "لامذہبیت" بجائے خود ایک ایسی سخت "مذہبیت" ہے کہ عام رواداری کے جذبات اس کے ماتحت بہت مشکل سے نشو و نما پا سکتے ہیں، درانحالیکہ "لامذہبیت" کا وہ مفہوم جو دنیا میں قیام امن کا باعث ہو سکتا ہے "مذہبی آزادی" یا "لاعصبیت" سے زیادہ نہیں۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ مذہب کے سماجی پہلو کو علی حالہٖ قائم رکھ کر اس کے معتقداتی پہلو کو تنگ کرکے صرف افراد تک محدود کر دیں اور تبلیغی سرگرمی کو یکقلم موقوف کرنے کی ضرورت ہے۔

آپ نے اگر نگار کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہوگا تو یہ حقیقت آپ سے مخفی نہ ہوگی کہ میں شروع سے مذہبی علماء کی مخالفت کر رہا ہوں اور اس کا سبب صرف یہی ہے کہ جب تک ان کا اقتدار قائم ہے، مذہبی تبلیغ برابر جاری رہیگی اور جس وقت تک یہ مشغلہ قائم ہے، فتنہ و فساد کبھی دور نہیں ہو سکتا۔

مسلمانوں کی یہ ذہنیت کہ جب ناقوس کی آواز کانوں میں آئے تو لاحول پڑھنے لگیں اور نماز کے وقت اگر گھنٹے یا باجے کی صدا بلند ہو تو اُسے توہین اسلام قرار دیں، محض مولویوں کی پیدا کی ہوئی گمراہ ذہنیت ہے اسی طرح ہندوؤں کی یہ ذہنیت کہ اگر کسی مسلمان کو گائے کی قربانی کرتا ہوا دیکھ لیں تو اُن کی آنکھوں میں خون اُتر آئے، یا اللہ اکبر کی آواز سُن لیں تو ان کا جذبۂ عناد مشتعل ہو جائے، اُن کے پنڈتوں کی پیدا کی ہوئی ذہنیت ہے اور اس کا سدّباب اسی طرح ممکن ہے کہ ان قائدین مذہب کو فنا کر دیا جائے۔

میں جس "لامذہبیت" کا مؤید و حامی ہوں وہ روس کی لامذہبیت نہیں ہے جس میں خود نہایت سخت تعصب پایا جاتا ہے بلکہ وہ ایک ایسی مذہبی آزادی ہے جسے "لاعصبیت" کہنا زیادہ موزوں ہے اور اس کے پیدا کرنے کی صورت صرف یہی ہے کہ مولویوں اور مذہبی علمبرداروں کو فنا کر دیا جائے۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہو جائیں تو مذہب کا خیال رفتہ رفتہ بالکل انفرادی رہ جائیگا اور دُنیا کے ہیئت اجتماعی کو اس سے کوئی نقصان نہ پہونچے گا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ بہت دشوار ہے ...ی ہوگا جو آپ روس میں دیکھ رہے ہیں، کیونکہ اقتصادی مسایل کا حل بھی بڑی حد تک اس سے وابستہ ...معاش کی دشواریوں میں مبتلا ہو رہی ہے مجبور ہوگی کہ بھوکا مارنے والے مفلس و قلاش بنانے والے مذہب ...نار کرے جو اور کچھ نہیں تو کم از کم فاقہ کی مصیبت کو دور کرنے والی ہے۔

روانہ رکھا گیا

# باب الاستفسار

## گھڑی سازی کی تاریخ

(جناب محمد اصغر علی صاحب۔ فرخ آباد)

میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ اپنے باب الاستفسار میں گھڑی سازی کے فن پر روشنی ڈالنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے۔ ابتداءً وقت کی تقسیم کی کیا صورت تھی اور رفتہ رفتہ اس میں کیا تدریجی ترقی ہوئی کہ موجودہ حالت تک پہونچ گئی۔

---

(نگار) گھڑیوں کی ایجاد سے قبل وقت کے تقسیم اجرام سماوی اور سایہ کو دیکھ کر کیا کرتے تھے، یعنی جب چاند اپنا چکر زمین کے گرد ختم کر لیتا تھا تو اسے مہینہ کہتے تھے اور جب زمین اپنا چکر سورج کے گرد پورا کر لیتی تھی تو اس کو سال سے تعبیر کرتے تھے اور دن سے مراد وہ وقت تھا جو زمین کو اپنے محور پر گردش کرنے میں صرف ہوتا تھا۔

اب رہ گئی اس سے بھی چھوٹی تقسیم گھنٹوں یا ساعتوں کی سو اس کے لئے وہ دن میں درختوں کے سایہ سے اور رات کو سیاروں کے رفتار سے مدد لیتے تھے۔ انسان نے کتنے عرصہ تک وقت کی تقسیم کا حساب اس طرح رکھا اس کی تعیین دشوار ہے، لیکن یہ یقینی ہے کہ سب سے پہلی گھڑی جو اختراع ہوئی وہ "دھوپ گھڑی" تھی اور بعض کا خیال ہے کہ انجیل کے "سفر ملوک ثانی" اور "سفر اشعیا" میں بسلسلۂ شفا، خرقیا ملک یہودا اس کا ذکر پایا جاتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ قبل مسیح ۷۴۰ سال دھوپ گھڑی کا رواج پایا جاتا تھا اور ایسا ہو سکتا ہے کیونکہ کلدانی تہذیب زیادہ قدیم العہد تھی اور ممکن ہے دھوپ گھڑی وہاں سے منتقل ہوئی ہو۔

یونان کا فلسفی انکسیمندر، بیروسس کے دو سو سال بعد جب سرزمین کلدآنیہ میں پہونچا ہے تو اس نے وہاں دھوپ گھڑی دیکھی اور وہیں سے وہ یونان لایا تھا جہاں بعد کو اس کا رواج عام ہو گیا۔ پھر اس دھوپ گھڑی کی صنعت میں

کس کس تفنن سے کام لیا گیا اس کا بیان دشوار ہے، ان میں سے بعض اتنی بڑی بنائی گئیں کہ بقول بعض اہرام مصری بھی اسی میں داخل ہیں اور جن کے سایہ سے تعیین وقت ہوا کرتی تھی اور بعض اتنی چھوٹی تیار کی گئیں کہ انگوٹھی میں نگینہ کا کام دیتی تھیں۔

لیکن چونکہ دھوپ گھڑی صرف دھوپ میں کام دے سکتی تھی اور ابر و باد کے موسم میں وہ بیکار تھی اس لئے لوگوں کا خیال پانی کی گھڑی کی طرف منتقل ہوا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ دو برتن لئے جاتے تھے ان میں سے ایک کے اندر پانی بھر دیا جاتا تھا اور اس کی پیندی میں باریک سوراخ ہوتا تھا جس سے پانی ٹپک کر دوسرے برتن میں جاتا تھا۔ اس برتن کے چاروں طرف متعدد خطوط منقوش ہوتے تھے جن سے پتہ چلتا تھا کہ پانی کس خط تک پہونچا اور کتنا وقت گزر گیا بعد کو اس میں جدتیں بھی کی گئیں یعنی ایک یا ایک سے زیادہ پہیے استعمال کئے گئے جو پانی کے دباؤ سے گھومتے تھے اور ایک پہیہ میں سوئی لگادی گئی جو پہیہ کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ گھومتی تھی اور وقت بتاتی تھی۔

پانی کی گھڑی کے موجد اہل مصر ہیں اور حسب بیان وٹروویس اسکندریہ کے ایک حجام نے ۱۵۰ سال قبل مسیح اسکو ایجاد کیا تھا۔ یہ خاص شخص اس کا موجد ہو یا نہ ہو لیکن یہ یقین ہے کہ پہیہ کا اضافہ اس نے کیا تھا۔ اس کے بعد جب افلاطون یونانی مصر میں آیا تو یہاں سے پانی کی گھڑی اپنے ساتھ یونان لے گیا اور وہاں خود اپنے ہاتھ سے ایسی گھڑی تیار کی جس میں ہر گھنٹہ ختم ہونے پر ستار بجتا تھا۔ ۱۵۰ سال قبل مسیح روما میں اس کا رواج ہوا، چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ پمپیوس جنگ کے موقعہ پر بھی اس گھڑی کو ساتھ رکھتا تھا جس میں موتی جڑے ہوئے تھے۔ جولیس قیصر نے لکھا ہے کہ ۵۵ سال قبل مسیح انگلستان میں بھی اس نے یہ گھڑیاں دیکھی تھیں اور غالباً فنیقی تاجروں نے یہاں ان کو رواج دیا ہوگا۔

اہل عرب نے گھڑی سازی کے فن میں بڑی محنت و ذہانت سے کام لیا، چنانچہ وہ گھڑی جو ہارون الرشید نے ۸۰۶ء میں فرانس کے بادشاہ شارلمان پاس بھیجی تھی بہت مشہور تاریخی گھڑی سمجھی جاتی ہے۔ یہ بھی پانی کی گھڑی تھی، یہ تھی تو تانبہ کی لیکن اس پر طلا کا کام تھا، اس میں بارہ چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں تھیں جن میں سے چھوٹے چھوٹے معدنی گیند گر گر کر گھنٹا بجاتے تھے جب اسکے بارہوں کھڑکیاں کھل جاتی تھیں تو ان میں سوار نکلتے تھے اور چاروں طرف چکر لگا کر پھر اندر داخل ہو جاتے تھے اور کھڑکیاں بند ہو جاتی تھیں۔

پانی کی گھڑی کے بہت زمانہ بعد "ریت گھڑی" ایجاد ہوئی، یعنی بجائے پانی کے ریت بھر دی جاتی تھی اور وہ سوراخ سے آہستہ آہستہ گرتی تھی، اس کے موجد بھی اہل مصر ہیں۔

انگلستان میں شمعوں کے ذریعہ سے تعیین اوقات کی جاتی تھی، روزانہ چھ شمعیں روشن کی جاتی تھیں جن میں سے ہر ایک بارہ انچ کی ہوتی تھی، ان شمعوں کے بدلنے اور اس کی بتی کاٹنے کے لئے دو راہب مقرر ہوتے تھے جو اپنی انگلیوں سے بتی کاٹتے تھے (قینچی کا رواج اسوقت تک نہ ہوا تھا) یہ شمعیں سینگ کے اندر روشن کی جاتی تھیں تاکہ ہوا سے گل نہ ہوں، بعد کو فانوس کے اندر رکھ کر جلانے کا رواج پیدا ہوا

موجودہ پہیہ رکھنے والی گھڑیوں کی ایجاد کب ہوئی، یقین کے ساتھ بتانا مشکل ہے، بعض کہتے ہیں کہ قبل مسیح دو سو سال اسکی ایجاد ہوگئی، بعض کا خیال ہے کہ سنہ ۵۱۰ء میں ایک شخص بیتھوس نے ایجاد کی، اور بعض کی تحقیق یہ ہے کہ سنہ ۸۵۰ء میں ایک راہب باسیو یکوس نے اس کو اختراع کیا۔ سنہ ۹۹۶ء میں پاپائے اعظم سلوسٹر ثانی نے ایسی گھڑی بنائی جو پہیوں کے ثقل سے گھومتی تھی، چنانچہ لوگوں نے مشہور کر دیا کہ پاپا سحر جانتا ہے اور جادو کے زور سے اس نے یہ گھڑی بنائی ہے۔

تیرھویں صدی عیسوی تک اس صنعت میں کافی ترقی ہوگئی چنانچہ اہل عرب نے بعض ایسی گھڑیاں طیار کرکے خلفاء مصر کے سامنے پیش کیں جو نہایت مکمل تھیں۔ یہی گھڑیاں بعد کو فریڈرک ثانی کے پاس پہونچیں اور اسی وقت سے اطالیہ میں پہیہ والی گھڑیاں بننی شروع ہوئیں جس کا تتبع انگلستان میں بھی کیا گیا۔ چنانچہ اڈورڈ اول کے زمانہ میں کسی راہب نے جو لوہار کا لڑکا تھا ایسی گھڑیاں طیار کیں جو گھنٹوں کے علاوہ شمس و قمر کی گردش اور اوقات مد و جزر کو بھی بتاتی تھیں۔ اس کے بعد ۱۳۲۵ء میں ایک اور راہب نے ایسی گھڑی بنائی جو سیاروں کی گردش کو بھی بتاتی تھی۔ اس میں دو پتلے نصب تھے جو گھنٹہ بجاتے تھے اور اوپر آٹھ پتلے پہلوانوں کے تھے جو آپس میں زور آزمائی کرتے تھے، کہا جاتا ہے کہ یہ گھڑی اب بھی موجود ہے اور کام دیتی ہے۔

سنہ ۱۳۶۴ء میں وینس کے ایک آدمی نے ایسی گھڑی بنائی جو نہ صرف شمس و قمر اور سیاروں کی حرکات کو ظاہر کرتی تھی بلکہ سال کے تمام تہواروں کو بھی بتاتی تھی۔

گھڑی میں پنڈولم یا رقاص کا استعمال سترھویں صدی عیسوی سے ہوا ہے، بعض کہتے ہیں کہ اس کے موجد اہل عرب ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ وہ کوئی فرنگی تھا، لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس کے موجد اہل عرب تھے لیکن ترقی دی اسکو اہل فرنگ نے۔ سنہ ۱۸۰۸ء میں نیویارک کے ایک شخص نے ایسی گھڑی بنائی جو ۱۸ فٹ لمبی، ۸ فٹ چوڑی اور ۵ فٹ دبیز تھی۔ اس میں دو ہزار پہیے تھے۔ اس کے اوپر واشنگٹن کا مجسمہ بنایا گیا تھا اور بہت سے دوسرے مجسمے ایسے تھے جو علاوہ وقت کے گردش شمس و قمر اور رصد اجانے کیا کیا ظاہر کرتے تھے۔

موجودہ ساخت کی جیبی گھڑی بیضاوی شکل کی سب سے پہلے سنہ ۱۴۹۰ء میں طیار ہوئی اور ایک شخص پیٹر سہیلی نے اسے طیار کیا تھا۔ اس قسم کی گھڑیوں میں صرف ایک سوئی ہوتی تھی جو دن میں دو یا تین مرتبہ گردش کرتی تھی۔ اور چونکہ یہ بھاری بہت ہوتی تھیں اس لئے گردن میں موٹی زنجیر سے باندھ کر لٹکائی جاتی تھیں۔

چونکہ یہ گھڑیاں بہت قیمتی ہوتی تھیں اس لئے سوائے بادشاہوں اور امراء کے دوسرے استعمال نہ کر سکتے تھے، سترھویں صدی میں کمانی ایجاد ہوئی اور جیبی گھڑیاں زیادہ مکمل بننے لگیں — یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اب جتنی ترقی ہوئی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ سب سے زیادہ مکمل گھڑیاں وہ ہیں جو کرونوگراف یا کرونومیٹر کہلاتی ہیں اور رصد گاہوں میں استعمال ہوتی ہیں۔

# انتباہ!

اے روشِ نا آشنا گم گشتۂ راہِ حیات
آ، بتاؤں تجھ کو رمزِ زندگی وجہِ ممات

دل ترا احساس کی لذت سے ہے نا آشنا
راہِ آزادی میں واماندہ ہے تیرا حوصلہ

مشکلاتِ وقت سے تو جنگ کر سکتا نہیں
تو غلامی کے اندھیرے سے اُبھر سکتا نہیں

ہے یہاں ہر پھول کے پردے میں پنہاں خارزار
آستیں کے سانپ ہیں یہ تیرے سارے غمگسار

اپنے مستقبل کی اپنے ہاتھ سے تعمیر کر
بیٹھ جا اقبال کے سینے میں پہلو چیر کر

جب رگِ انسانیت میں عزم کرتا ہے گزر
شوق آتا ہے نکل، دیوارِ آہن توڑ کر

خون میں جب آتشِ احساس ہوتی ہو رواں
سانس سے بن بن کے انگارے نکلتا ہو دھواں

جذبۂ آزاد جب ہوتا ہے دل میں موجزن
شیر کے پنجے میں بھی ہرگز نہیں رُکتا ہرن

اور جب بیچارگی کرتی ہے عزمِ احتجاج
سر پہ اک مزدور کے سلطان کا ہوتا ہے تاج

محمد صادق ضیا

# ہمارے قائدینِ ملّت

غم و آلام سے خالی ہے پیشہ رہنمائی کا　　نکموں کے لئے اچھا ہے پیشہ رہنمائی کا
چراغِ معصیت سے خلوتیں جن کی فروزاں ہیں　　عصائے رہنمائی ہے فروغِ بزمِ ایماں ہیں
عطا ہوتا ہے اک دو ماہ میں تمغۂ شرافت کا　　وکیونکر ہر بزو مایہ کو سودا ہے [illegible] دت کا
درخشاں ہیں گلے ہاروں سے مانندِ عروس انکے　　نہایت شان و شوکت سے نکلتے ہیں جلوس انکے
بہت ہے اپنی مفلس قوم کے پیسے کا پاس ان کو　　سفر کے واسطے مطلوب ہے سیکنڈ کلاس ان کو
نہ راجاؤں سے ڈرتے ہیں نہ دبتے ہیں حکومت سے　　بسر ہوتی ہے چندوں کی بدولت شان و شوکت سے
نہایت قابلِ نفرت ہیں افعالِ زبوں ان کے　　ہوئے ہیں قوم کا خوں پی کے چہرے لالہ گوں ان کے
مہاجن بن رہے ہیں گوشت مفلس قوم کا کھا کر　　یہ بندے نفس کے مسرور ہیں احرار کہلا کر
حکومت پھانس لے تو جیل کی سختی سے ڈرتے ہیں　　شکوہِ قوم سے حکام کو مرعوب کرتے ہیں
سفارش سے گزارش سے علالت کے بہانے سے　　نکل آتے ہیں دو لھن بن کے اکثر جیل خانے سے
اگر چلتا نہیں اہلِ حکومت پر کوئی افسوں　　رقم کرتے ہیں بیکس قوم کو ک نامۂ [illegible]
کسی صورت سے حاصل جیل میں ہوا ے کلاس انکو　　نہ کرنے پائیں تنہائی کی راتیں بھی [illegible] ان کو

یہ حالت ہے تو زنداں سے کوئی گھبرائے کیا معنی
کسی ظالم کے ظلم و جور سے ڈر جائے کیا معنی

ہوا محشر بپا نعروں سے گردوں کی فضاؤں میں　　مگر سولہ برس میں کیا کیا ان رہنماؤں نے
دیارِ ہند میں ہے ملتِ بیضا غلام اب تک　　یہ حریت کی طالب دم بخود ہے زیرِ دام [illegible]
گلا اس سخت جاں کا ہے عدو کی تیغِ بُرّاں ہے　　مسلماں کا لہو اب تک مثالِ آب ارزاں ہے
وہی پستی وہی نکبت وہی ذلت وہی خواری　　وہی مستی وہی غفلت وہی خوابِ گراں طاری
رہینِ انتظارِ ناخدا یہ قوم ہے اب تک　　یہ تعلیم سے نا آشنا یہ قوم ہے اب تک

نہ ہے کوئی نصاب اس کا، نہ ہے کوئی نظام اس کا — نہ کوئی مدعا اس کا، نہ کوئی اہتمام اس کا
جو دیکھو رہناؤں کو تو اک اک شیرِ صحرا ہے — کوئی ہٹلر بنا پھرتا ہے کوئی ڈی دلیرا ہے
جو کیجے امتحاں تو نفسِ آوارہ کے بندے ہیں — کلام حشر زا کے دام ہیں چندوں کے پھندے ہیں
کوئی مسجد بنے سیلاب آئے زلزلہ آئے — نکل آتے ہیں چندے کے لئے دامن کو پھیلائے
ہر اک بستی ہر اک قریہ میں مولانوں کا پھندہ ہو — کسی تحریک کو لے لیجے مقصد "صرف چندہ" ہو
پشاور سے اگر رنگون تک پھیلی ہے آگ ان کی — کراچی سے اگر کشمیر تک ہے دوڑ بھاگ ان کی
تعلق کیا ہے اس کا ملتِ بیضا کی خدمت سے — مسلمانوں کو کیا ملتا ہے اس سیر و سیاحت سے
سُن اے مردِ جری! اے خالد و فاروقؓ کے پوتے — ضرورت کیا ہے لیڈر کی تجھے قرآن کے ہوتے
ضرورت ہے کہ اب تو ان ستمرانوں کو پہچانے — لئے جاتے ہیں دوزخ کی طرف تجھکو یہ مولانے
نہ ہو مرعوب، ان کی آتشیں تقریر سے غافل — نہ ہو دم بھر بھی ان کے نعرۂ تکبیر سے غافل
یہ آزادی کے دعوے بے خبر باتیں ہی باتیں ہیں — متاعِ دین و ایماں لوٹنے والوں کی گھاتیں ہیں

ترے ہمدرد بن کر تیرے خوں سے پیٹ بھرتے ہیں
تری خدمت کے پردہ میں حکومت تجھ پہ کرتے ہیں

**اصغر حسین** خاں نظیر لودھیانہ

# تذکرۂ معرکۂ سخن شائع ہوگیا

# انتخاب از کلامِ محروم

(مرسلۂ عدم)

اسیرانِ قفس کی اے چمن والو خبر لینا　　بہار آئے تو ان بھولے ہوؤں کو یاد کر لینا
دلِ نازک ترا اس سے نہ اے صیاد ہو برہم　　مری عادت میں داخل ہے کبھی فریاد کر لینا

---

ترا نام تسکین دہِ قلبِ مضطر　　تری یاد آرامِ جانِ حزیں ہے

---

کھُل سکے اُن پہ کس طرح واقفِ سوز و ساز ہوں　　چاہئے اب کہ شمع ساں میں بھی زباں دراز ہوں

---

اک اضطرابِ پیہم پہلے تھا اب سکوں ہے　　وہ غم کی ابتدا تھی، یہ غم کی انتہا ہے

---

اہلِ ہوا نہیں ہیں فقط آج غم نصیب　　روزِ ازل سے جام نگوں ہے حباب کا
محروم کچھ بُرا نہ ہوا جب اچکا اگر　　تھا دورِ غفلتوں کا زمانہ شباب کا

---

جو وہ غمخوار ہو جائے تو غم کیا　　زمانہ کیا۔ زمانہ کے ستم کیا

---

دلِ ناداں کی بدولت ہے جو رسوائی ہے　　بددُعا اور اسے کیا دوں کہ یہ ناکام تو ہے

---

حسرتِ خفتہ کو جگاتا ہے　　ذکر پیری میں نوجوانی کا

---

ذراتِ خاک بن نہیں جاتے نجوم کیوں　　حیرت سے دیکھتا ہوں تری رہگزر کو میں

طبیعت مائلِ ذوقِ جفا معلوم ہوتی ہے		کہ اُن کی بے وفائی بھی وفا معلوم ہوتی ہے

---

سفر کرتے ہوئے منزل بمنزل جا رہے ہیں ہم		مجھے یہ ساری دُنیا کارواں معلوم ہوتی ہے

---

یوں پشیماں ہوں میں غفلت میں جوانی کاٹ کر		جس طرح دن بجر پشیماں ہو پشیمانِ سحر
حُسن یہ سارا اُسی کا ہے کہ جس کے عشق میں		چاک روزِ ابتدا سے ہے گریبانِ سحر
سوئے در کیا دیکھتا ہے۔ اے دلِ غمدیدہ دیکھ		یہ شبِ فرقت ہے جس میں کم ہے امکانِ سحر

---

فتنہ آرا شورشِ اُمید ہے میرے لئے		نا اُمیدی راحتِ جاوید ہے میرے لئے

---

گزر تی جا رہی ہے زندگی اور روح شاداں ہے		مسافر کے لئے کم تر مسافت ہوتی جاتی ہے

---

محروم

---

# رقص

دل کی وہ گہرائیاں، جذبات کے وہ ولولے		ترجمانی جن کی ناممکن ہو یکسر، نطق سے
روپ بھر لیتے ہیں اعضا کی لچک کا ہمنشیں		رقص میں عریاں نظر آتی ہے دِل کی سرزمیں
مرمریں اعضا میں ہوتا ہے بہاروں کا ہجوم		پھول کھلتے ہیں نگاہوں میں، لرزتے ہیں نجوم
دِل کے ہر ذرے کا سوز و ساز ہوتا ہے عیاں		روح کے اعماق کا ہر راز ہوتا ہے عیاں
دل کی ہر پہلو سے پوری ترجمانی رقص ہے		رعشۂ اعضا سے تخلیقِ معانی رقص ہے

عدم

---

# جنوری ۳۵ء کیلئے

## حسب ذیل عنوانات پر مقالے درکار ہیں

(۱) دہلی اور لکھنؤ اسکول کی شاعری پر مؤرخانہ نظر اور ان کی خصوصیات
(۲) دونوں اسکولوں کے اکابر اور ان کا فرق مدارج
(۳) فن اور زبان کی حیثیت سے دونوں کا مرتبہ
(۴) لکھنؤ اسکول پر دہلی کا اثر
(۵) دہلی اسکول پر لکھنؤ کا اثر
(۶) دونوں اسکولوں کی غزلگوئی پر تفصیلی تبصرہ
(۷) لکھنؤ اسکول کے تین بہترین شاعروں کے ۲۰، ۲۰ شعر
(۸) دہلی اسکول کے تین بہترین شاعروں کے ۲۰، ۲۰ شعر
(۹) منظوم افسانے یا مثنوی لکھنؤ اسکول میں
(۱۰) منظوم افسانے یا مثنوی دہلی اسکول میں
(۱۱) دکن اور اُردو شاعری (اسوقت تک تمام ادوار پر تبصرہ)
(۱۲) پنجاب اور اُردو شاعری (اسوقت تک تمام ادوار پر تبصرہ)
(۱۳) تذکرہ نگاری کی حیثیت سے لکھنؤ اور دہلی کے خدمات
(۱۴) دونوں اسکولوں کے کارنامے، رباعیات مرثیہ، قصیدہ و نعتیں
(۱۵) دولت مغلیہ کے انحطاط کا اثر دہلی کی شاعری پر
(۱۶) شاہان اودھ اور لکھنوی شاعری
(۱۷) دہلی اور لکھنوی شاعری میں اخلاقی و مذہبی عنصر
(۱۸) شاعری کے لحاظ سے لکھنؤ کا دور زرّیں
(۱۹) شاعری کے لحاظ سے دہلی کا دور زرّیں
(۲۰) لکھنؤ اسکول کا سب سے پہلا شاعر جس نے دہلی کا تتبع کیا
(۲۱) دہلی اسکول کا سب سے پہلا شاعر جس نے لکھنؤ کا تتبع کیا
(۲۲) لکھنؤ اور دہلی کے وہ شعراء جنہوں نے ملک و قوم کو کوئی خاص پیغام پہنچایا
(۲۳) کیا دہلی اسکول رو بہ انحطاط ہے؟ اور کیوں
(۲۴) کیا لکھنؤ اسکول رو بہ انحطاط ہے؟ اور کیوں
(۲۵) رامپور کا تعلق دہلی اور لکھنؤ اسکولوں سے
(۲۶) حیدر آباد اور لکھنؤ و دہلی اسکول کا اس سے تعلق
(۲۷) کیا لکھنؤ اسکول نے کلکتہ میں بھی شاعری کو متاثر کیا؟
(۲۸) کیا لکھنؤ اسکول میں اصلاح کی ضرورت ہے؟ اگر ہے تو کیا
(۲۹) کیا دہلی اسکول میں اصلاح کی ضرورت ہے؟ اگر ہے تو کیا
(۳۰) مستقبل میں آپ کو اُردو شاعری سے کیا توقعات ہیں؟
(۳۱) دونوں اسکولوں کے وہ شعراء جنہوں نے قدامت کو
ترک کر کے کسی ابداع و اختراع سے کام لیا
(۳۲) لکھنؤ اور دہلی کے ریختی اور ہزل گو
(۳۳) لکھنؤ اور دہلی کی خواتین جنہوں نے شاعری میں نمایاں
حصّہ لیا
(۳۴) لکھنؤ اسکول کے مختلف ادوار اور ہر دور کے بہترین شاعر
(۳۵) دہلی اسکول کے مختلف ادوار اور ہر دور کے بہترین شاعر
(۳۶) آگرہ اور دہلی کا شاعرانہ تعلق

**نوٹ**:— لکھنؤ اور دہلی کی شاعری سے مراد وہ تمام شعراء ہیں جو یہاں کی شاعری سے متاثر ہو کر اسی رنگ میں شعر کہتے ہیں۔ اس کے لئے کسی خاص جگہ کا باشندہ ہونے کی شرط نہیں ہے۔

# نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہوتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے۔ ورنہ رسالہ مفت روانہ نہ ہوگا

سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ ہے۔

بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

| جلد ۲۶ | فہرست مضامین ستمبر سنہ ۱۹۳۴ء | شمارہ ۳ |
|---|---|---|

ملاحظات — ۲

خواتین عرب کی فیشن طرازیاں — ۹

دو رُخ — تمنائی — ۱۵

نغمۂ دل — مرزا احسان احمد بی اے — ۱۸

حیات و ماوراء حیات — ۳۴

مکتوبات نیاز — ۴۰

دختر کفش دوز — طاہرہ دیوی شیرازی — ۴۸

ریاض مرحوم — ۵۴

باب المراسلۃ والمناظرۃ — ۵۶

باب الاستفسار — ۵۸

مطبوعات موصولہ — ۶۷

کیوپڈ و شاعر — محمد صادق ضیا چینوٹی — ۷۱

منظومات — عدم۔ روش۔ اختر — ۷۴

# نگار

ایڈیٹر:- نیاز فتحپوری

| جلد ۲۶ | ستمبر ۱۹۳۴ء | شمارہ ۳ |
| --- | --- | --- |

# ملاحظات

## ہندوستان کی عورت کا مستقبل ——

وہ لوگ جو جدید تعلیم اور ترقی کو مترادف سمجھتے ہیں، اُن کے لئے یہ امر یقیناً باعث مسرت ہے کہ ہندوستان کی عورت میں علم کا ذوق بڑھتا جاتا ہے اور کالجوں کی کرسیوں پر وہ بھی مردوں کے دوش بدوش بیٹھی ہوئی نظر آتی ہے۔ لیکن کیا عورتوں کا یہ رجحان واقعی قابل مسرت امر ہے، کیا عورت کا تعلیم جدید حاصل کر لینا حقیقتاً ملک و قوم کے مستقبل کے لئے کوئی امید افزا بات ہے؟ اس کا جواب آسان نہیں

اس سے انکار ممکن نہیں کہ انسانی ترقی کا واحد ذریعہ صرف علم ہے، لیکن ترقی اور علم کا مفہوم متعین کرنے میں اختلاف رائے ممکن ہے، پھر یہی وہ چیز تھی جس نے عرصہ تک مشرق کو مغرب سے علحدہ رکھا اور لبعید یہی

وہ چیز ہے جو مشرق کو مغرب کی طرف کھینچے لئے جا رہی ہے۔ اس لئے آیئے سب سے پہلے ترقی کا مفہوم متعین کریں، یعنی سب سے پہلے "غایت و نتیجہ" کو سمجھ لیں اور پھر غور کریں کہ اس مقصود تک پہونچنے کے لئے جو ذرایع اختیار کئے جاتے ہیں وہ درست ہیں یا نہیں

ترقی سے مراد یقیناً دنیاوی ترقی ہے اور اس باب میں مذہبی نظریوں کو شامل کرنے کی ضرورت نہیں، تاہم یہ سوال بدستور اپنی جگہ قایم رہتا ہے کہ کیا مادہ سے ہٹکر کوئی مفہوم دنیاوی ترقی کا متعین نہیں ہو سکتا اور کیا اخلاقِ انسانی کے نتائج صرف حیات بعد الموت ہی سے تعلق رکھتے ہیں اور اس دُنیا سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ ممکن ہے ایک تاریک خیال مولوی یا پنڈت اس کے جواب میں یہی کہے کہ اس دُنیا کی ترقی کوئی چیز نہیں، اس عارضی زندگی کی مسرت و اذیت لایعنی بات ہے، لیکن میں کہ میرے نزدیک انسان کو پھر دوبارہ زندہ ہونا نہیں ہے، یہی کہوں گا کہ انسان کے تمام افعال و اخلاق اسی دنیا سے متعلق ہیں اور اُن کو کسی اور عالم سے متعلق کرنا خدا یا فطرت کی توہین ہے —— اچھا اب اس اصول کو سامنے رکھکر کہ جو کچھ ہے اسی دُنیا میں ہے اور اس کے بعد انسان کو نسیاً منسیاً ہو جاتا ہے، غور کیجئے کہ ترقی کا مفہوم کیا ہونا چاہئے

"آدمی" نام نہ صرف میرا ہے، نہ آپ کا، نہ مغرب کے باشندہ کا، نہ مشرق کے رہنے والے کا، نہ گاما پہلوان کا، نہ مجھ ایسے نحیف و ناتواں انسان کا، نہ "ترکانِ سمرقندی و سیہ چشمانِ کشمیری" کا اور نہ حبش کی سیاہ فام بدصورت مخلوق کا۔ بلکہ لفظ "انسان" ایک ایسے "مفہوم کُلی" کو پیش کرتا ہے جس میں شکل و صورت کا اختلاف، نسل و رنگ کا امتیاز کوئی معنی نہیں رکھتا، اور اگر ہم اُس کے کسی ایک فرد کو بھی نظر انداز کر دیں تو اس کے حقیقی مفہوم کا مجروح ہو جانا یقینی ہے —— پھر "انسان و انسانیت" کے اس مفہوم کو سامنے رکھکر غور کیجئے کہ نوعِ انسانی کی موجودہ ترقیاں یا اس کے علمی اقدامات کس حد تک قابل اعتنا ہیں

کہا جاتا ہے کہ یہ مغرب و اہلِ مغرب کی ترقی کا دور ہے اور اُن کے علمی اکتشافات نے انسان کے ذہنی ارتقار کے لئے ایسی ایسی نئی راہیں پیدا کر دی ہیں کہ اس سے قبل کسی زمانہ میں نہیں پائی جاتی تھیں، اور ایسا کیوں کہا جاتا ہے؟ غالباً اس لئے کہ اس نے طبیعیات کے بہت سے نوامیس کو بے نقاب کر دیا ہے، وہ عناصر پر مالکانہ تصرف حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے اور شاید اس لئے بھی کہ اس نے سوسائٹی کی بہت سی قیود کو توڑ کر کے اخلاق کے ایسے جدید نظرئے قائم کئے ہیں جو عقل سے زیادہ جذبات کا ساتھ دینے والے ہیں

یقیناً اس توجیہ میں کوئی غلطی نہیں ہے اور کون ہے جو مغرب کی ترقی علوم و فنون سے انکار کرسکے، لیکن یہ سوال بدستور اپنی جگہ قائم رہتا ہے کہ کیا یہ ترقی واقعی "نوع انسانی" کی اجتماعی ترقی ہے یا انفرادی خود غرضی کی تکمیل یعنی اس عروج عقل و فراست میں کوئی شائبہ انسانی خلوص و ہمدردی کا پایا جاتا ہے یا نہیں اور کیا یہی وہ معیار ہے جس سے ہم ترقی کے کھرے کھوٹے کو پہچان سکتے ہیں ــــ بیشک آج انسان، کشش زمین کا مقابلہ کرکے اس کوشش میں کامیاب ہوگیا ہے کہ وہ فضائے بسیط میں جہاں چاہے اُڑتا پھرے، لیکن کیا یہ کیفیت پرواز اس کو "عقاب" سے زیادہ کسی اور خطاب کی مستحق قرار دے سکتی ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ وہ پانی کے مقابلہ میں اپنے ثقل نوعی کو گھٹا کر سمندر کی تہ تک پہونچ جانے میں بھی پس و پیش نہیں کرتا، لیکن کیا اس باب میں وہ مچھلیوں سے زیادہ ترقی کرسکا ہے، یہ بھی غلط نہیں کہ وہ آناً فاناً اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے دور دور دراز ملکوں کے حالات معلوم کرلیتا ہے، مگر یہ شعور اُن تمام وحوش و طیور میں بھی پایا جاتا ہے جو روے زمین کے مختلف حصوں کی آب و ہوا کا حال معلوم کرکے تبدیل موسم کے لئے نقل مکانی کیا کرتے ہیں ــــ یہ بھی درست ہے کہ علوم و فنون کی ترقی سے کام لیکر اس کی سرمایہ دارانہ ذہنیت نے بے شمار دولت جمع کرلی ہے، لیکن کیا یہ نوع انسانی کے کام آنے والی دولت اُن کوہساروں اور معدنوں کی دولت سے زیادہ اہم ہے جو زر و جواہر سے معمور نظر آتے ہیں؟ اور پھر اگر یہ تمام ترقیاں صرف "غیر نفع بخش" حد تک قائم رہتیں تو بھی کوئی حرج نہ تھا، لیکن قہر تو یہ ہے، کہ وہ بجائے نفع کے نقصان پہونچانے والی ہیں اور آج دنیا کے امن و سکون کا سب بڑا خطرہ انھیں ترقیوں سے متعلق ہے ــــ عقاب آسمان میں اُڑتا ہے، لیکن وہ بم کے گولے برسا کر معصوم آبادی کو ہلاک تو نہیں کرسکتا، مچھلیاں سمندر کی تہ میں تیرتی پھرتی ہیں، لیکن وہ آبدوز سرنگیں بچھا کر خدا کی مخلوق کو تباہ تو نہیں کرتیں، معدنیں اپنی آغوش میں دولت کا انبار لئے ہوئے ہیں، لیکن وہ مزدوروں کے حقوق تو پامال نہیں کرتیں۔ اس لئے محض علمی اختراعات، یا تجارتی ترقی و خوشحالی کو انسانی ترقی سمجھنا انفرادی طور پر خواہ کتنا ہی صحیح ہو، لیکن اجتماعی حیثیت اور انسان کے مفہوم کلی کے اعتبار سے یقیناً اس کو انحطاط و زوال سے تعبیر کیا جائے گا۔

اچھا اب اس تمہید کے بعد اصل مدعا کی طرف آئیے اور غور کیجئے کہ ہندوستان کا رجحان کیا ہے اور اس پر کیا حکم لگایا جاسکتا ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان بھی بیدار ہو چلا ہے اور اگر اس مختصر فقرہ کی توضیح کی جائے تو بالفاظ دیگر مفہوم یہ قرار پائے گا کہ ہندوستان بھی مغرب کے نقش قدم پر چل رہا ہے اور ترقی کی جو راہیں اس نے متعین کی ہیں، ہمارا ملک بھی آمناً و صدقنا کہکر انھیں پر چل کھڑا ہوا ہے ۔ یہاں تک کہ وضع و معاشرت، کردار و گفتار، اور زبان و ذہنیت وغیرہ سب کچھ مغرب ہی کے ذوق میں ڈھل رہی ہے اور جس طرح یہاں کے ایک مرد کا انتہائی نقطۂ نظر "انگریز" بنجانا ہے اسی طرح

یہاں کی عورت کا نصب العین "میم" ہوکر رہ جاتا ہے ۔ پھر قبل اس کے کہ یہاں کی عورت میم بنے، اس کو سمجھ لینا چاہئے کہ میم کیا چیز ہے اور حوا کی ان مغرب نژاد بیٹیوں میں جو آزادی نظر آتی ہے اس کی ترکیب میں کیا کیا اجزا شامل ہیں ۔ یقیناً فطرت کے لحاظ سے عورت آزاد ہے اور قدرت کے تمام عطایا سے وہ بھی فائدہ اُٹھانے کی مستحق ہے، لیکن کیا اس فرق و امتیاز کو مٹایا جا سکتا ہے جو عورت و مرد کی تخلیق میں ودیعت کر دیا گیا ہے اور اگر عورت بھی مردوں ہی کی سطح پر آکر تمام کام کرنے کے لئے پیدا ہوئی ہے تو کیا قدرت پر یہ الزام عاید نہیں ہوتا کہ اس نے کیوں دونوں کی تخلیق ایک دوسرے سے مختلف رکھی اور کیوں ایک کو قوی اور دوسرے کو کمزور پیدا کیا؟ ممکن ہے بعض حضرات کو یہ اعتراض ہو کہ یورپ کی موجودہ عورت نے اس اختلاف کو مٹا کر ثابت کر دیا ہے کہ وہ بھی مرد ہی کی طرح قوی و مضبوط ہو سکتی ہے۔ لیکن یہاں سوال اکتساب و سعی کا نہیں بلکہ صرف فطرت و مقتضائے فطرت کا ہے، ورنہ یوں تو ہر وہ بندر اور ریچھ جو دو پاؤں پر چلنا سیکھ لے دعوے کر سکتا ہے کہ میں انسان ہوں — اس میں شک نہیں کہ ایک انسان سعی و کوشش سے بہت کچھ ترقی کر سکتا ہے، لیکن فطری اقتضا اس کا کبھی محو نہیں ہو سکتا۔ آپ ایک شخص کو جو قدرت کی طرف سے شاعرانہ دماغ لیکر نہیں آیا ہزار کوشش کے بعد بھی شاعر نہیں بنا سکتے، لاکھ تدبیریں کیجئے مگر ایک شخص ماہر ریاضیات نہیں ہو سکتا اگر فطرت نے اس کے دماغ میں اس کی اہلیت پیدا نہیں کی، الغرض ایڈیسن پیدا ہوتا ہے بنتا نہیں اور شیکسپیر ماں کے پیٹ ہی سے شیکسپیر بن کر آتا ہے ۔ پھر عورت لاکھ کوشش مرد بننے کے لئے کرے لیکن آخرکار وہ رہیگی فطرت کے اعتبار سے عورت ہی، خواہ وہ اس سعی و اقدام میں کتنے ہی ہنگامے کیوں نہ برپا کرے — پھر دیکھئے کہ عورت کی فطرت کیا ہے، یعنی قدرت کا مقصود اس کی آفرینش سے کیا ہے؟ اس کے دماغ و اعضا کی ساخت سے بحث نہیں بلکہ صرف نظام تمدن کے اُس تدریجی ارتقا کو دیکھئے جس نے دنیا کو آہستہ آہستہ علم و روشنی کی اس منزل تک پہونچا دیا ہے اور سوچئے کہ تاریخ تمدن میں عورت کی خدمات کس طرح شروع ہوئیں اور اس نے تعمیر عمرانیت میں کیا حصہ لیا؟ — عہد وحشت میں بھی جب اصولاً عورت کو زیادہ قوی، زیادہ محنتی و جفاکش اور زیادہ جنگجو ہونا چاہئے تھا، وہ مردوں کے دوش بدوش صحرائی درندوں کا مقابلہ نہیں کرتی تھی، بلکہ اُن زخموں کے اندمال میں مصروف رہتی تھی جو "تنازع للبقا" کے سخت و سنگین اصول کے ماتحت مردوں کو پہونچتے تھے، درانحالیکہ یہ بات اس کو کسی نے نہ سکھائی تھی ۔ اگر مرد دن بھر خاک بسر مارا مارا پھرتا تھا تو عورت کسی درخت کے نیچے خس و خاشاک مہیا کر کے اس کے لئے بستر طیار کرنے میں مصروف رہتی تھی اور اگر مرد شکار کی جستجو میں بھوکا پیاسا سرگرداں رہتا تھا تو یہ اس فکر میں مبتلا رہتی تھی کہ شام کو جب وہ واپس آئے تو فوراً اپنی بھوک اور خستگی کو دور کر سکے، وہ بچوں کو پالتی تھی، کھانا پکاتی تھی، پانی چشموں سے لاتی تھی، ملبوس طیار کرتی تھی، سر چھپانے کے لئے مکان بناتی تھی اور اسی کے ساتھ مرد کے تھکے ہوئے خستہ اعصاب کو اپنے محبت بھرے ہاتھوں سے مس کر کے راحت و سکون پہونچایا کرتی تھی — پھر زمانہ گزرتا گیا اور انسان کی تمدنی ترقی وسیع ہوتی گئی، لیکن عورت کی اس خدمت کی نوعیت بدستور قائم رہی اور اس کے ان فطری مشاغل میں سوائے اس کے

کوئی فرق نہ پیدا ہوا کہ اگر پہلے وہ یہ تمام کام اپنے ہاتھوں سے بھدّے طریقہ پر دیر میں انجام دیتی تھی، تو بعد کو آلات کے ذریعہ سے خوبی کے ساتھ جلد انجام دینے لگی — اگر پہلے وہ اپنے بچہ کو صرف اپنی آغوش میں پالتی تھی تو بعد کو طرح طرح کے پالنے بنائے اور دوسری عورتوں کی خدمات حاصل کر کے اُن کی گود سے فائدہ اُٹھایا۔ الغرض تمدنی ترقی کے ساتھ عورت کی خدمات میں بھی زیادہ شائستگی پیدا ہوتی گئی لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ اس کے خدمات کی نوعیت بدل گئی ہو، یا یہ کہ اس نے مردوں کے فرائض اپنے سر لینا پسند کیا ہو — اسی طرح زمانہ گزرتا گیا اور انسان کی اہلی زندگی کا نظام بدستور اسی حال پر قائم رہا کہ دفعۃً جنگ عظیم کا شعلہ بھڑک اُٹھا اور مردوں کے میدانِ حرب میں چلے جانے اور اُن کی کثیر تعداد قتل ہو جانے سے عورت مجبور ہوئی کہ وہ بعض ان خدمات کو بھی انجام دے جو مردوں کے سپرد تھیں اور اس طرح گویا یہ پہلا قدم تھا عورت کی اس آزادی کا جس نے اس کے اندر مرد کی طرف سے بعد کو بغاوت کے جذبات پیدا کر دئے۔ یہ بحث طویل ہے کہ عورت میں مرد کی طرف سے بے نیازانہ جذبۂ آزادی کیوں پیدا ہوا، لیکن مجملاً یوں سمجھئے کہ اس کا بڑا سبب صرف یہ تھا کہ مرد و عورت کی تعلیم وہاں بالکل یکساں اصول پر جاری تھی اور اصول تربیت میں کوئی ایسا فرق و امتیاز نہ باقی رہ گیا تھا جو مرد و عورت کے جذبات و خیالات میں حدّ فاصل قائم کر سکے۔ عورت کو سالہا سال سے یہ تعلیم دی جا رہی تھی کہ وہ مرد کے مساوی ہے لیکن اس مساوات کا یہ مفہوم نہ بتایا جاتا تھا کہ اپنی اپنی خدمات کے لحاظ سے نظام تمدن میں دونوں یکساں طور پر اہمیت رکھتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورت، مردانہ فرائض میں بھی اپنے آپ کو اس کا مساوی سمجھنے لگی اور جب جنگ عظیم میں اس کا ایک حد تک کامیاب تجربہ بھی ہو چکا تو پھر عورت جو مرد کی ناجائز آزادیٔ اخلاق سے پہلے ہی کافی بیزار تھی، دفعۃً تمام قیود کو توڑ کر اس میدان میں بھی آ گئی جو مردوں کے لئے مخصوص تھا، یہاں تک کہ آج وہ مرد سے کلّہ بہ کلّہ لڑنے کے لئے طیار ہے اور اہلی زندگی کا وہ توازن جو صرف امتیازِ خدمات اور تقسیمِ عمل کے احساس پر قایم رہ سکتا ہے یکسر درہم برہم نظر آتا ہے — اس میں شک نہیں کہ بظاہر مغرب کی موجودہ نسائی ذہنیت میں اہلِ ہند کو کوئی بُرائی نظر نہیں آتی اور ہر شخص اُن کے صحیح و توانا جسم، اُن کے شگفتہ چہروں اور مضبوط اعصاب کو دیکھ کر یہی حکم لگائے گا کہ مغربی سوسائٹی سعادت و برکت کی انتہائی حد تک پہونچ گئی ہے لیکن وہ لوگ جنھوں نے ان کی اندرونی زندگی و معاشرت کا مطالعہ کیا ہے اُن سے پوچھئے کہ اس کی گندگی و پریشانی کا کیا عالم ہے اور وہ حسین جمیل چہرے جو غازہ کے نیچے دوسروں کو پھول ہی پھول نظر آتے ہیں، مردوں کی اہلی زندگی کی راہ میں کتنے کانٹے بچھا رہے ہیں — پھر کیا ہندوستان کے اربابِ تعلیم کے لئے یہ مسئلہ قابلِ غور نہیں ہے کہ جس نصاب اور اصولِ تعلیم نے مغرب کی عورت کو اس حد تک جری و بیباک بنا دیا ہے کیا وہ مشرق کی عورت میں کوئی اور ذہنیت پیدا کر سکتا ہے اور کیا یہاں کا مرد اس عذاب سے بچ رہیگا جو اسی تعلیم کے بدولت مغرب کے مرد پر مسلط ہوا ہے؟ — گزشتہ ربع صدی کے اندر ہندوستان کی عورت نے تعلیم میں کافی ترقی کی ہے اور یہ احساس کہ عورت کے لئے تعلیم ضروری ہے آج ہر گھر میں

پایا جاتا ہے، لیکن عورت کی اس خواہش کو بالکل اسی غلط اصول پر پورا کیا جا رہا ہے جو مغرب میں رائج ہوا۔ اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ہندوستان کی عورت بھی سوائے عورت رہنے کے اور سب کچھ ہو جانے پر مائل نظر آتی ہے ۔۔۔ پھر اس خرابی کا باعث یقیناً عورت کا رجحان تعلیم نہیں، بلکہ وہ اسلوب تعلیم اس کا باعث ہے، جس نے مغرب کی تہذیب، مغرب کی معاشرت اور مغرب کی ذہنیت کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے ۔۔۔ لڑکیوں کے مدارس میں نظم و نسق اور تعلیم کی ذمہ داری زیادہ تر عیسائی خواتین کے ہاتھ میں ہے یا اُن خواتین کے جو باوجود غیر عیسائی و غیر مغربی ہونے کے اپنے آپ کو اسی رنگ میں پیش کرنا پسند کرتی ہیں اور اُن سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ہندوستان کی عورت میں یہیں کی ذہنیت باقی رکھیں گی، بالکل دور از کار بات ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سب سے پہلے جو انقلاب ایک لڑکی کی ذہنیت میں اسکول کی تعلیم سے پیدا ہوتا ہے، وہ آرایش و زیبایش سے وابستہ ہوتا ہے اور میرے نزدیک یہ سب سے پہلا جرثومہ ہے جو آہستہ آہستہ پہلے بیجا نمود و نمایش اور پھر بیجا آزادی و بیباکی پیدا کرنیکا باعث ہوتا ہے ۔۔۔ یقیناً زیبایش و آرایش، تجمیل و تحسین عورت کی صفت ہے، لیکن اس کی زندگی کا حقیقی مقصود تو شاید یہ نہیں اور اس لئے اگر ثانوی حیثیت سے اس طرف توجہ کی جائے تو خیر، لیکن اس کو اصل کار کی حیثیت دیدینا یقیناً کبھی مفید نہیں ہو سکتا ۔۔۔ دیکھا جاتا ہے کہ اُستانیاں اکثر و بیشتر جوان اور ناکتخدا ہوتی ہیں، اور یہ دوسرا اہم سبب خرابی اخلاق کا ہے، کیونکہ خود ان کا اکثر وقت اس نمود و نمایش میں بسر ہوتا ہے جو مردوں کی سوسائٹی میں کشش قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے اور ان کا دماغ کسی وقت اس خیال سے خالی نہیں رہتا کہ وہ جوان ہیں، دلکش اداؤں کی مالک ہیں اور انھیں جذبات کو ساتھ لیکر وہ کلاس روم میں لڑکیوں کے سامنے آتی ہیں۔ وہ ملازمت اس لئے نہیں کرتیں کہ لڑکیوں کو پڑھائیں یا اُن کے اخلاق کو سدھاریں بلکہ ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ روپیہ حاصل کر کے عطر و غازہ کے فضول مصارف کو پورا کر سکیں اور تختۂ رقص پر وہ بہتر سے بہتر وضع و ملبوس کے ساتھ جلوہ آرا ہوں ۔۔۔ پھر اسی کے ساتھ تعلیم نصاب کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس میں بھی کوئی بات ایسی نہیں جو عورت کو اس کے حقیقی نسائی خدمات کی طرف متوجہ کرنے والی ہو، وہی نصاب جو لڑکوں کے لئے مقرر ہے، لڑکیوں کو بھی پڑھایا جاتا ہے اور سوائے اس کے کہ کبھی کبھی (اور وہ بھی بطور تفنن) سینے پرونے یا کھانا پکانے کا بھی درس دیدیا جاتا ہے، کوئی اور فرق لڑکوں اور لڑکیوں کے نصاب یا طریق تعلیم میں نہیں ہے ۔۔۔ تعلیم کا اصل مقصود یہ ہے کہ ہر فرد میں اس کے فرائض کا احساس پیدا ہو جائے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور اگر یہ صحیح ہے کہ دونوں کے فرایض علٰحدہ علٰحدہ ہیں تو اصولاً ان کی تعلیم کا معیار بھی علٰحدہ علٰحدہ قائم ہونا چاہئے، ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عورت میں رفتہ رفتہ خودسری و آزادی پیدا ہو جائیگی جو اُسے مرد تو نہیں بنا سکتی، لیکن مرد کیلئے اسے بیسر الحصول ضرور کر دینے والی ہے، یہی وہ عذاب ہے جس میں آج یورپ کا مرد مبتلا ہے اور ہندوستان کے مرد کے سامنے بھی ہے اگر اس نے اس کا سدباب نہ کیا ۔۔۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی عورت کی یہ بدنصیبی کہ اگر آج اس کا شوہر مر جائے تو کل سے اسے فاقہ کرنا ناگزیر ہے

اس بات کو لازم قرار دیتا ہے کہ وہ معاش کی طرف سے خود مختارانہ زندگی بسر کرنے کی اہل بنائی جائے، لیکن اس کا علاج اسکولوں کی تعلیم نہیں کیونکہ اس حیثیت سے تعلیم خود مردوں کے لئے بھی مفید و کارآمد ثابت نہیں ہوئی، چہ جائیکہ عورتیں جو نسبتاً کم تعلیم یافتہ ہوتی ہیں اور شوہر کا مقابلہ کرنے کی زیادہ ضعیف اہلیت رکھتی ہیں ۔۔۔ اس لحاظ سے عورت کی تعلیم تو ضروری ہے لیکن وہی تعلیم جو اُسے کسب معاش میں مدد دے سکے: کانسہ بہترین ذریعہ تفریح بنادے ۔۔ اس راز کو اگر ایشیا کے کسی ملک نے سمجھا ہے تو وہ صرف جاپان ہے کہ وہاں آپ کو ایک عورت بھی غیر تعلیم یافتہ نہ ملیگی، لیکن یہ تعلیم وہ نہ ہوگی جو اُسے مرغ زریں تو بنادیتی ہے لیکن سوائے اِترا کر چلنے کے اور کسی کام کا نہیں رکھتی ۔۔ اُس کو سب سے پہلے یہ بتایا جاتا ہے کہ انسانی زندگی پھولوں کی سیج نہیں ہے، بلکہ خارزار حیات میں مردوں کے ساتھ چلکر اس کے پاؤں کے کانٹے بھی نکالنا پڑتے ہیں یعنی اگر جوے کا ایک سرا مرد کے شانہ پر رکھا ہوا ہے تو دوسرا سرا اس کے شانہ پر بھی ہے وہ گھر کی ملکہ ہے اور ایک ملکہ ہی کی طرح اس کا انتظام کرتی ہے، شوہر کو وہ اپنا سچا رفیق جانتی ہے اور کشاکشِ حیات میں وہ پوری طرح اس کا ہاتھ بٹاتی ہے وہ اپنے بچوں کو خود دودھ پلاتی ہے خود ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت کی ذمہ دار ہے اور بیکار وقت ضایع کرنا اس کے مذہب میں جرم عظیم ہے۔ وہ خود بھی ہر وقت کام میں مصروف رہتی ہے، اپنے بچوں کو بھی مصروف رکھتی ہے، یہاں تک کہ جب شام کو مرد گھر واپس آتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ اگر دن بھر محنت کرکے اس نے اپنے متعلقین کے خورونوش کا سامان فراہم کیا ہے تو انھوں نے بھی اسکی راحت و آسائش کے اسباب فراہم کرنے میں کوئی دقیقہ کوشش کا اُٹھا نہیں رکھا۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اسی تربیت نے وہاں خانگی صنعت ( *Home Industry* ) کو اتنا عام و وسیع کر دیا ہے کہ گھر کا کوئی فرد کسی وقت بیکار نہیں رہتا اور ہر عورت میں اتنی اہلیت پیدا ہوگئی ہے کہ ضرورت کے وقت وہ اپنے اور بچوں کے لئے کسب معاش کر سکے ۔۔۔ برخلاف اس کے ہمارے یہاں کی عورت کو دیکھئے کہ تعلیم نے ان کے اندر کیا انقلاب پیدا کیا ہے۔ بچوں کو دودھ پلانا اُن کے نزدیک معیوب، گھر کا کام کرنا خلافِ شان، اور مرد کے جذبات کی رعایت نسائیت کی توہین ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ آرایش وضع و ملبوس میں کافی مہارت رکھتی ہیں، لیکن اس تحسین و تجمیل کا ہدف گھر سے باہر ڈھونڈھا جاتا ہے، یہ بالکل صحیح ہے کہ ان کی رفتار و گفتار میں کافی دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ گر ان کے لبوں کی مسیحائی اور ان کے خرام ناز کی جاں بخشیاں ان کے شوہروں کا مقسوم نہیں۔ وہ اپنے آپ کو مردوں سے علیحدہ ایک مستقل چیز ثابت کرنے کی تو کوشش کرتی ہیں لیکن حال یہ ہے کہ اگر آج اُن کے شوہر مر جائیں یا چھوڑ دیں تو سوائے عشوہ فروشی کے کوئی اور ذریعہ اُن کے پاس کسب معاش کا نہیں رہتا ۔۔ پھر بتائیے کہ یہ تعلیم ملک و قوم کے لئے کیا خاک مفید ہو سکتی ہے اور ہم ایسی تعلیم یافتہ عورتوں کو کیا کریں جو "مالِ عرب" کے بجائے "مالِ نیا" بنجانا پسند کرتی ہیں ۔ افسوس ہے کہ ملک کے ارباب فہم نے تعلیم نسواں کی طرف تو پوری توجہ کی، لیکن اسوقت تک یہ نہ معلوم کر سکے کہ جس راہ کو انھوں نے اختیار کیا ہے وہ "کعبہ" کی طرف جاتی ہے یا "ترکستان" کی طرف !

نیاز

# خواتین عرب کی فیشن طرازیاں

## (عہد جاہلیۃ و اسلام میں)

عورت، ہر جگہ عورت ہے، خواہ وہ کشمیر کے مرغزاروں میں پیدا ہوئی ہو، یا صحرائے عرب کے ریگزاروں میں، عورت کی یہ جنس کہ وہ حسین ہے، جاذب قلب و نظر ہے اور یہ کہ "زیب دیتا ہے اُسے دشمنِ ایماں ہونا" یورپ و ایشیا ہر جگہ یکساں ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ اگر ایک اپنا دامن مرد کے ہاتھ سے نہیں چھڑا سکتی تو دوسری بگڑ کر یہ کہہ گزرتی ہے کہ

میرا دامن چھوڑئیے اپنا گریباں پھاڑئیے

الغرض عورت حسین ہو یا نہ ہو وہ اپنے آپ کو ایسا ضرور سمجھتی ہے اور یہی وہ حس ہے جو اس میں جذبۂ آرائش و زیبائش پیدا کرتی ہے۔ پھر یہ حس جو آج مغرب کی عورت میں اسقدر نمایاں طور پر پائی جاتی ہے وہ اس سے قبل ایشیا کی عورت میں بھی پائی جاتی تھی اور جن اسباب غمزہ و ناز سے آج مغرب کی عورتیں آراستہ نظر آتی ہیں، انھیں اسباب سے خواتین ایشیا بھی کسی وقت آراستہ تھیں۔

خواتین یورپ کی ابداع و اختراع وضع و ملبوس آج ضرب المثل ہے لیکن تاریخ اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ایشیا کی عورت بھی یہی ذہنیت رکھتی تھی اور ماحول کے اختلاف کے لحاظ سے ہر جگہ اور ہمیشہ اس نے اس ابداع و اختراع سے کام لیا۔

بعض کا خیال ہے کہ خواتینِ عرب عہد جاہلیت میں اپنے وضع و ملبوس کے لحاظ سے سخت وحشی تھیں اور ان میں زیبائش و آرائش کا خیال بڑی حد تک معدوم تھا حالانکہ حقیقت بالکل اس کے خلاف ہے۔ وہ آرائش و زیبائش کے مختلف طریقوں سے واقف تھیں، ملبوس کی تراش و خراش میں بھی اختراع سے کام لیتی تھیں اور وضع میں رنگینیاں پیدا کرنا بھی انھیں معلوم تھا۔ پھر چونکہ اُن کا نہ کوئی دین تھا، نہ قانون اس لئے اس ذوقِ آرائش میں اعتدال قائم رکھنے کی بھی کوئی صورت نہ تھی اور اسی لئے جب ظہور اسلام ہوا اور اس نے خواتین عرب کے شوقِ تجمیل و آرائش میں نامناسب افراط کو محسوس کیا، تو اُسے "تبرج جاہلیت" (یعنی عہد جاہلیت کی زینت و آرائش) کو ممنوع قرار دیا۔

عہد جاہلیت کا لٹریچر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت عورتیں صرف اُون اور سوت ہی کا لباس استعمال نہ کرتی تھیں بلکہ مختلف رنگ کے دیبا و حریر بھی حسب استطاعت پہنتی تھیں اور جب کسی جگہ اجتماع ہوتا تھا تو بہترین لباس و آرائش کے ساتھ شریک ہوا کرتی تھیں۔ المنخل الیشکری لکھتا ہے:۔

الکاعب الحسناء ترفل فی الدمقس والحریر

(نوجوان حسین لڑکی دیبا و حریر کا ملبوس پہنے ہوئے اترا رہی ہے)

کپڑوں کے زرین نقش و نگار کا حال سلمی بن ربیعہ اس طرح بیان کرتا ہے:۔

والبیض یرفلن کالدمی فی الریط والمذہب المصون

ریط سے مراد ڈھیلے ڈھالے کپڑے ہیں اور المذہب المصون سے زرین نقش و نگار رکھنے والے ملبوس اسی طرح کے ہزاروں اشعار عہد جاہلیت کے ایسے پائے جاتے ہیں جن سے وہاں کی عورتوں کی رنگینی طبع و تزئین و تجمیل پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

اس وقت یورپ میں خاص تقریبات کے وقت امیر گھرانوں کی عورتیں ایسے ملبوس پہنتی ہیں جن کے دامن فرش پر گھسٹتے رہتے ہیں اور غالباً یہی وہ وضع ہے جس کو فارسی میں "دامن کشاں گزشتن" سے ظاہر کرتے ہیں۔ قدیم عربی عورتیں بھی بالکل اسی طرح کے لباس پہنکر مجالس و محافل میں شریک ہوتی تھیں جسے "جرّ ذیول" کہتے ہیں اس فیشن کے متعلق مورخین عرب کا بیان ہے کہ سب سے پہلے اس کو جناب ابراہیم کی بیوی ہاجرہ نے وضع کیا تاکہ دامن کے گھسٹ کر چلنے سے اُن کے نشان قدم مٹتے جائیں اور اُن کی سوکن سارہ کو پتہ نہ چلے۔ اس کے بعد اور عورتوں نے بھی یہی وضع اختیار کی۔ چنانچہ عرب عورتوں کے اس طرح "دامن کشاں" چلنے کا ذکر کثرت سے وہاں کے اشعار میں پایا جاتا ہے۔ امرؤ القیس لکھتا ہے:۔

خرجتُ بہا امشی تجرّ وراءنا علی اثرینا ذیل مرط مرحّل

اس شعر میں شاعر اپنی معشوقہ فاطمہ کا ذکر کرتا ہے کہ جب وہ خلوتگاہ سے نکل کر چلی اور عاشق بھی ساتھ ساتھ چلا تو وہ اپنے ملبوس کا دامن گھسیٹتی ہوئی گزری تاکہ دونوں کے نشان قدم مٹتے جائیں اور کسی کو پتہ نہ چلے۔

"مرط مرحل" سے مراد وہ ریشمی کپڑا ہے جس کے اوپر محمل کی تصویریں منقوش ہوں۔

یہ وضع عرب عورتوں میں بہت مقبول تھی اور عہد اسلام میں بھی پائی جاتی تھی چنانچہ عمر بن ابی ربیعہ لکھتا ہے:۔

کتب القتل والقتال علینا وعلی الغانیات جرّ الذیول

یورپ کے عہد وسطےٰ کے بعد بھی عورتوں میں رسم تھی کہ وہ اپنے کولوں کو بڑا دکھانے کے لئے چھوٹے چھوٹے گدے یا تکیے کمر سے نیچے دونوں طرف باندھ لیتی تھیں۔ اور پھر اس کے اوپر دوسرا ملبوس پہن لیتی تھیں۔

یہ وضع بھی عہد جاہلیت کی عورت نے اختراع کی تھی جسے عظامہ، حشیہ اور رفاعتہ کہتے تھے اور اہل لغت نے اس کے معنی لکھے ہیں کہ وہ تکیے کی طرح کپڑے کی گدی ہوتی ہے جس کو باندھ کر عورتیں اپنے کولوں کو بڑا ظاہر کرتی ہیں۔

استعمال زیور میں وہاں کی عورتوں کو بہت شغف تھا اور لباس سے زیادہ اس طرف توجہ تھی۔ اور ایک ایک حصۂ جسم کے لئے متعدد زیور استعمال کرتی تھیں۔ مثلاً ہاتھ کی انگلیوں میں انگوٹھیاں، کلائی میں کنگن، بازو میں جوشن اور پہونچے میں دست بند استعمال کرتی تھیں جن کا نام علی الترتیب خاتم، سوار، دملج اور جبرۃ تھا۔ دست بند استعمال کرنے کی رسم بعد کو متمدن یورپ میں بھی جاری ہوئی اور اسوقت تک پائی جاتی ہے۔

انگوٹھیاں وہ دسوں انگلیوں میں پہنتی تھیں اور یہ رسم عہدِ اسلام میں بھی پائی جاتی تھی چنانچہ عمر بن ابی ربیعہ کا ذکر کرتے ہوئے صاحب آغانی لکھتے ہیں کہ:-

"وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ معشوقہ (ثریا) کے پاس گیا اور جب وہ کپڑے اتار کر اسکے پاس آئی تو اسکے دوست کو دیکھکر لوٹ گئی۔ اس نے کہا کہ شرم کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ میرا دوست ہے اور اس سے کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔ یہ کہکر وہ ہنسنے لگا۔ ثریا کو غصہ معلوم ہوا تو اس نے نکل کر ایسا دوہتڑ مارا کہ دسوں انگوٹھیوں کے نشان اسکی پیشانی پر پڑ گئے"

جب ظہورِ اسلام ہوا تو عورتوں کا یہ ذوقِ آرایش حد کو پہونچا ہوا تھا قمیص کا گریبان کھُلا رہتا تھا اور دوپٹہ پیچھے لٹکتا رہتا تھا جس سے سینہ و گردن دونوں عریاں نظر آتے تھے۔ اسلام نے اس وضع کو فتنہ سے خالی نہ دیکھ کر حکم دیا کہ عورتیں اپنے دوپٹہ کا پلو سینہ پر ڈہرا لیا کریں۔　　(ولا یبدین زینتہن الا لبعولتہن وآبائہن)

اس حکم سے ان کو سخت صدمہ ہوا، لیکن چونکہ دینی روح ان میں پوری طرح رچ چکی تھی اس لئے سوائے تعمیل کے کوئی چارہ نہ تھا۔ مگر کچھ زمانہ بعد ایک اور وضع انھوں نے ایجاد کی جو ان کے گمان میں خلافِ مذہب نہ ہوسکتی تھی یعنی تنگ کپڑا استعمال کرنا شروع کیا جسے "وضعِ قباطی" کہتے تھے۔ ابن رشد نے لکھا ہے کہ قباطی ان تنگ و چُست کپڑوں کو کہتے ہیں جو جسم کے نشیب و فراز اور اعضاء کے اُتار چڑہاؤ کو نمایاں کر دیتے ہیں، خلیفۂ ثانی نے اس وضع کو بھی ممنوع قرار دیا کیونکہ اسمیں بھی کافی عریانی تھی۔

عرب کی عورتوں کا ملبوس بعض مرتبہ شاعری سے بھی کافی متاثر ہوا ہے اس سلسلہ میں ایک ادبی واقعہ کا بیان کرنا خالی از لطف نہ ہوگا۔

خواتین عرب سیاہ رنگ کا ملبوس اور خاصکر سیاہ دوپٹہ پسند نہ کرتی تھیں۔ ایک بار عراق کا کوئی سوداگر مدینہ آیا جسکے پاس مختلف رنگوں کے دوپٹے تھے۔ یہاں پہونچتے ہی اس کا تمام مال فروخت ہوگیا لیکن سیاہ دوپٹہ کسی نے نہ لیا۔ سوداگر مسکین الدارمی کے پاس گیا جو اپنے زمانہ کا مشہور رنگین مزاج شاعر تھا اور کچھ دن سے مسجد کے گوشہ میں بیٹھ رہا تھا۔ مسکین کو اس پر رحم آیا اور خرقۂ زہد اُتار کر مسجد سے باہر آگیا۔ اب اس کی وہی شان رندی تھی اور وہی ادائے رنگیں۔ اسنے چند شعر لکھ کر اپنے ایک دوست کو جو مغنی تھا دے دئے تاکہ وہ کسی جگہ جاکر اُن کو سنا دے۔ وہ اشعار یہ تھے:

قل للملیحۃ فی الخمار الاسود　　ماذا فعلت براہبٍ متعبد

قد کان شمر للصلاۃ ثیابہ حتی خطرت لہ بباب المسجد
ردی علیہ صلاتہ وصیامہ لا تقتلیہ بحق دین محمد[1]

ان اشعار کا مدینہ میں مشہور ہونا تھا کہ گوشہ گوشہ تک یہ خبر پہونچ گئی کہ دارمی کسی سانولی لڑکی کے عشق میں جو سیاہ دوپٹہ اوڑھتی ہے مسجد سے باہر آگیا ہے اور مدینہ کی کوئی ملیح لڑکی ایسی نہ تھی جو سیاہ رنگ کی اوڑھنی کی طرف مائل نہ ہوگئی ہو، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوداگر نے بہت کافی نفع سے سیاہ رنگ کے دوپٹے فروخت کر دئے اور اسوقت سے سیاہ دوپٹوں کا رواج شروع ہوگیا۔

اس کے بعد سنہرے رنگ کے دوپٹوں کا رواج ہوا، جیسا کہ قاضی کے بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے جو دارمی کے رنگ میں لکھے گئے تھے:-

قل للملیحۃ فی الخمار المذہب افسدت نسک اخی التقی المترہب
نور الخمار و نور وجہک تحتہ عجبا لوجہک کیف لم یتلہب
وجمعت بین المذہبین فلم یکن للحسن عن ذہبیہا من مذہب
واذا اتت عین لتسرق نظرۃ قال الشعاع اذہبی لا تذہبی

بالوں کی آرایش کے سلسلہ میں وہاں مشاہرہ کا بھی رواج تھا جو عہد جاہلیت میں بھی پایا جاتا تھا اور عہد اسلام میں بھی عرصہ تک باقی رہا۔ مشاہرہ کی صورت یہ تھی کہ بالوں کی مینڈھیاں گوندھکر سر کے اوپر اس طرح باندھ لیتی تھیں کہ خراسانی اونٹ کی دو کوہانوں کی طرح وہ حصہ دو جگہ سے بلند نظر آتا تھا۔ رسول اللہ نے اس سے بھی عورتوں کو باز رکھا کیونکہ اس وضع میں پہلے سر پر دوپٹہ وغیرہ پیشانی تک لپیٹا جاتا تھا اور اس سے صحت کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ تھا۔

بالوں کی ایک وضع جناب سکینہ بنت حسین کے نام پر "طرۂ سکینہ" کے نام سے رائج ہوئی۔ جناب سکینہ نہ صرف اپنے حسن وجمال بلکہ جلوں کی خوبصورتی کے لحاظ سے بھی اپنے زمانہ کی نہایت مشہور خاتون تھیں۔ آپ کو تزئین وآرائش کا خاص ذوق فطرت سے ودیعت ہوا تھا اور بالوں کی زیبایش میں آپ نے ایک خاص اختراع کی جسے "طرۂ سکینہ" کہتے ہیں۔ یہ وضع خواتین عرب میں بہت مقبول ہوئی۔ یہاں تک کہ عمر بن عبدالعزیز نے نہایت سختی سے اسے روکا۔

ایک وضع خلیفۂ مہدی کی بیٹی علیہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ نہایت حسین وجمیل تھی اور فن شعر وموسیقی کی بھی بڑی ماہر تھی، لیکن پیشانی بدنمائی کی حد تک وسیع وکشادہ پائی تھی، اس عیب کو چھپانے کے لئے اس نے جڑاؤ سربند وضع کیا جس سے پیشانی

---

[1] ان اشعار کا مفہوم یہ ہے:۔ اس سانولے رنگ کی لڑکی سے جو سیاہ دوپٹہ اوڑھتی ہے جاکر کہو کہ یہ تو نے ایک زاہد شب زندہ دار کا کیا حال کر دیا وہ تو اپنی تمام عمر عبادت ونیایش کے لئے وقف کر چکا تھا کہ ناگہاں تو نظر آگئی اور نماز و روزہ سب خاک میں ملا دیا۔ پھر تجھے اپنے دین و مذہب کا واسطہ، سچ بتا کیا تو اس کو واقعی قتل کر دے گی۔

ڈھک جاتی تھی یہ وضع اتنی مقبول ہوئی کہ جس عورت کو دیکھئے سربند سے پیشانی کو چھپائے ہوئے ہے۔

بالکل اسی طرح فرانس کی ایک مشہور امیرزادی نے کیا جس کا نام (La Belle Ferronnière) تھا۔ اس کے وسط پیشانی میں آگ سے جل جانے کا داغ تھا۔ اس کو چھپانے کے لئے اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ داغ کی جگہ ہیرا رکھ کر دونوں طرف ریشمی دھاگے سے باندھ کر سر میں لپیٹ لیا۔ اسپین کی ایک امیرزادی کی رانیں بہت موٹی تھیں اس نے ایک خاص لباس ایجاد کیا جس سے یہ عیب چھپا رہتا تھا، اسی طرح لوئی نہم شاہ فرانس کی ایک لڑکی کے پاؤں بہت بھدے تھے اور ان کے چھپانے کے لئے اس نے لانبا گون اختراع کیا جس کا دامن زمین تک لٹکتا رہتا تھا اور پاؤں کو چھپائے رکھتا تھا۔ بعد کو یہ اوضاع تمام ملک میں رائج ہوگئیں۔

دور عباسیہ ترقی تمدن اور تہذیب مجلس و معاشرت کے لحاظ سے اسلام کا عہد زریں کہلاتا ہے۔ اس لئے اس زمانہ میں اس قسم کی اختراعیں کثرت سے ہوئیں اور عورتوں کو اپنی تجمیل و تحسین کی طرف بہت توجہ ہوئی۔ علی ابن ہشام کی ایک کنیز (یتیم) تھی جو بے انتہا خوبصورت و وضعدار تھی۔ اس نے سر کی ٹوپی میں فیتہ باندھنے کی وضع ایجاد کی تاکہ سر کے نہیں۔ اور پھر یہ وضع عام ہوگئی۔ یہ کنیز ابن ہشام (اپنے مالک) کے قتل کا بھی باعث ہوئی، کیونکہ خلیفہ مامون نے یہ لونڈی علی ابن ہشام سے طلب کی تھی اور اس نے دینے سے انکار کر دیا تھا۔

عہد بنی امیہ میں دستی پنکھوں میں اشعار لکھنے کا رواج عام تھا، لیکن عہد عباسیہ میں کپڑوں پر بھی عمدہ عمدہ فقرے اور اشعار لکھے جاتے تھے۔ کمر اور سر کی مرصع پٹیوں قمیص کے دامنوں اور ٹوپیوں وغیرہ پر بھی سونے کے ورق لگا کر اشعار نمایاں کئے جاتے تھے اور یہ ایجاد بھی عورتوں ہی نے کی تھی پھر یہ وضع صرف طبقۂ امراہی تک محدود نہ تھی بلکہ کلیساؤں کی کنواریاں بھی اپنی چادروں، پٹیوں اور ملبوسوں میں اشعار منقوش کراتی تھیں۔ چنانچہ وشار لکھتا ہے کہ میں نے کلیسائے مریم میں ایک کنواری کو دیکھا کہ چاند کی طرح جھیل باہر نکلی۔ اس کے کمر میں مرصع پٹی تھی اور اس پر یہ اشعار منقوش تھے:-

| | |
|---|---|
| زنارہا فی خصرہا یطرب | وریحہا من طیبہا الحبیب |
| ووجہہا احسن من حلیہا | ولونہا من لونہا اعجب ؎۱ |

وضع کی ایجاد پر حوادث سیاسی اور اکتشافات اثری بھی متاثر ہوا کرتے تھے، چنانچہ قاہرہ کی عورتیں ہر تاریخی واقعہ کی یادگار اپنے کپڑوں پر منقوش کرلیا کرتی تھیں۔ جب آٹھویں ہجری میں سنگ مرمر کے دو ستون (عہد فاطمی کے) دریافت ہوئے تو عورتوں نے اپنے ملبوس کی تراش میں ایسی تبدیلی پیدا کردی جو طول میں دو ستونوں سے مشابہ تھی۔ بعد کو یہ طرز بہت مقبول ہوئی اور اس کا نام جرالعمود پڑ گیا۔

---

؎۱ مفہوم یہ ہے کہ اس کی کمر کی پٹی کتنی خوشنما ہے اور اس کے چہرہ کا حسن اس کے زیوروں سے زیادہ جاذب نظر ہے۔

مصر کی عورتوں نے ایک اور وضع قمیص کی ایجاد کی جس کو بہلا کہتے تھے اور چونکہ اس میں بہت زیادہ صرف ہوتا تھا اسلئے حکومت نے بمشکل تمام اس سے عورتوں کو باز رکھا۔ مقریزی کا بیان ہے کہ عورتیں اتنی بڑی بڑی قمیص بناتی تھیں کہ زمین تک لٹکتی رہتی تھی اور آستین تین تین گز کی ہوتی تھیں، ایک ایک ہزار درہم ایک قمیص پر صرف ہوجاتے تھے، پاجامہ یا ازار کا بھی یہی حال تھا چنانچہ وزیر منجک نے نہایت سختی سے اس کے خلاف کارروائی شروع کی۔ ان کی آستینیں کاٹ کاٹ دیں انکے کپڑے پھاڑ پھاڑ ڈالے اور بعض کو تو اس نے قتل بھی کرا دیا جب کہیں جاکر یہ رسم وہاں سے اٹھی لیکن اس کے مرنے پر چند دن بعد پھر اس کا رواج ہوگیا چنانچہ سیوطی نے لکھا ہے کہ ۹۲۰ھ میں بڑی آستین والی قمیصوں کے خلاف پھر احکام جاری کئے گئے۔ یہ آستینیں اتنی بڑی ہوتی تھیں کہ ہاتھ اٹھانے سے تمام گردن و شانہ، بلکہ سینہ اور پیٹ تک نظر آنے لگتا تھا

# دوزخ

## (۱)

دریا چپ چاپ بہ رہا تھا — کتنا خاموش! کتنا غمگین!....

کنارے پر مکانات ایسے اُداس نظر آتے تھے، جیسے خستہ حال فقیروں کا گروہ، جنھیں ملاح نے کرایہ نہ رہنے کی وجہ سے روک رکھا ہو! — اپنے جھکے ہوئے کاندھے ایک دوسرے سے ملائے — اپنی لاغر ٹانگیں پانی میں پھیلائے! اُن کی کھلی ہوئی کھڑکیاں حقارت آمیز حسرت سے دوسرے کنارے پر بنے ہوئے اکا دُکا اچھے مکانوں کو دیکھ رہی تھیں جو سبز سبز گھاس پر ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے مخملی فرش پر شمعدان —

ان غریب گھروں میں روشنی نہ تھی! — فسردہ خاموشی! خاموش تاریکی! تاریک اُداسی! — اور موجوں کی سسکیاں! جو آہستہ آہستہ، لاپروائی سے چلی جا رہی تھیں، ایک عالم خود فراموشی میں! زندگی کے بوجھ سے تھکی ہوئی!...

---

آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ جھینگروں کی جھنجھناہٹ ہوا میں گونجی ہوئی تھی! — آبی پودوں سے ٹکرا کر یہ "نغمہ" غضب کا سحر انگیز ہو جاتا تھا! ہوا کے رُک رُک کر آتے ہوئے ہلکے ہلکے جھونکے کبھی کبھی پانی کی سطح سے گزر کر انھیں اُس کنارے بھی پہونچا دیتے!..

دور ایک کشتی آ رہی تھی!...

کنارے پر کے ایک مکان میں ایک عورت کھڑی تھی۔ کمزور، نحیف!.. کٹہرے پر جھکی ہوئی ہاتھ سے آنکھوں پر سایہ کئے کشتی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کیونکہ ٹھیک جہاں پر کشتی تھی، آفتاب کی سنہری کرنیں پانی میں چمک رہی تھیں۔ گویا کہ کشتی سنہرے "آئینہ" پر پھسلتی چلی آ رہی تھی!...

شام کی روشنی میں اس عورت کا موم جیسا زرد چہرہ ایسا ہی چمک رہا تھا جیسی کہ خود اس کی روشنی تھی!.. دور سے ایسا صاف دکھائی دیتا تھا جیسے تاریک راتوں میں سمندر کی موجوں پر چمکتا ہوا سفید جھاگ! اس کی پُر خوف مایوس نگاہیں، مضطربانہ کچھ تلاش کر رہی تھیں! اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم تھا۔ لیکن پیشانی کی شکنیں اس کی نا اُمیدی کو صاف ظاہر کر رہی تھیں! — گاؤں کی مسجد سے اذان کی صدا بلند ہوئی!....

اس نے سر ہلانا شروع کیا گویا کہ وہ کوئی آواز سننا ہی نہیں چاہتی۔

"میں نہیں برداشت کر سکتی! میں نہیں برداشت کر سکتی!"— وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی!

لیکن نوجوان کی صدا آتی ہی رہی!....

وہ صحن میں ٹہلنے لگی۔ اس کا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ سانس زور زور سے آرہی تھی۔ آنسو اُمڈے آرہے تھے!

—— مدت سے اسے ایک تکلیف وہ مرض تھا۔ کتنے ڈاکٹروں کو اس نے دکھلایا۔ کتنی بڑی بوڑھیوں سے اس نے مشورہ لیا۔ ہزاروں منتیں مانیں۔ درگاہوں پر تدر نیاز کی۔ لیکن تکلیف کم نہ ہوئی۔ ذرا بھی آرام نہ ملا۔ اُٹھتے بیٹھتے کسی طرح بھی چین نہ ملتا! آخرکار ایک کانے بوڑھے نے اسے ایک ٹوٹکا بتایا۔ کہ ایک پوٹلی میں قبرستان کی گھاس، مرگھٹ کی خاک، کانچ کے ٹکڑے اور اپنے دو چار بال باندھ کر کسی تندرست، نوجوان عورت کی طرف جو بہتے پانی سے ہو کر اس کی طرف آرہی ہو پھینک دے۔ تب اسکا مرض منتقل ہو جائے گا!——

اور اسوقت وہی جادو کی پوٹلی وہ آنچل میں چھپائے تھی!... اور سامنے کشتی آرہی تھی!... جب سے اس نے پوٹلی باندھی تھی یہ پہلی کشتی تھی جو اس نے دیکھی!

وہ آکر کٹہرے پر جھک گئی۔ کشتی اب اتنی نزدیک تھی کہ اس کے آدمی صاف نظر آرہے تھے۔ وہ سب کے سب اجنبی معلوم ہوتے تھے۔ اگلے حصہ پر ایک مرد کھڑا لگی سے کھے رہا تھا۔ سکان ہاتھ میں لئے ایک عورت بیٹھی تھی اور اس کے پاس ایک نوجوان تھا۔

بیمار عورت کٹہرے پر اور جھک گئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سانس بہت تیز چل رہی تھی۔ زرد چہرہ سُرخ تھا آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں! وہ کشتی کے نزدیک آنیکا انتظار کر رہی تھی!

آدمیوں کی گفتگو کی آواز اب آنے لگی۔ کبھی تو بالکل صاف۔ کبھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر——

کشتی اب مکان کے سامنے تھی۔ ٹھیک اسوقت کسی نے دیاسلائی جلائی، روشنی، جھلملاتی ہوئی ایک عورت کے چہرہ پر پڑی۔ بچوں کا سا معصوم و شگفتہ چہرہ! ہونٹ تبسم میں کھلے ہوئے!... اتنا پیارا چہرہ! اتنا معصوم! اتنا خوش! وہ ابھی بالکل لڑکی تھی!...

روشنی بجھ گئی۔ ساتھ ہی کوئی چیز کشتی کے نزدیک پانی میں گری اور کشتی گزر گئی!——

---

(۲)

ایک سال بعد——

بھاری، گہری، رنگین بدلیوں میں آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ آسمان کی سرخی دریا کی ساکن سطح پر منعکس ہو رہی تھی۔ خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ جھینگر اور کیڑے خاموش تھے —— صرف موجوں اور آبی پودوں کی سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں!

دور ایک کشتی آرہی تھی!...

وہی عورت دریا کے کنارے کھڑی تھی گزشتہ سال بوڑھی دوشیزہ کی طرف پھینکنے کے بعد وہ بیہوش ہوگئی تھی!... اسکے مستحکم اعتقاد نے — اور شاید گاؤں کے نئے ڈاکٹر نے بھی — اس کے مرض میں تخفیف کردی۔ رفتہ رفتہ اس کی حالت اچھی ہوتی گئی اور آخرکار قریب قریب اسے صحت ہی ہوگئی! اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی — لیکن خوشی دیر پا نہ تھی۔ رفتہ رفتہ عجیب طرح کا غم اس نے محسوس کرنا شروع کیا۔ رہ رہ کر اسے کشتی والی دوشیزہ یاد آتی۔ اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے لڑکی اس کے آگے ہاتھ جوڑے آنسو بھری حسین آنکھوں سے التجا کررہی ہے! وہ اکثر ہچکیاں سنتی!... لڑکی زرد! لاغر! ہمیشہ اسے اپنی بڑی معصوم آنکھوں سے دیکھتی معلوم ہوتی! —

آج شام کو وہ کنارے پر آگئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھا۔ بالو پر بیٹھی تھی! رہ رہ کر اٹھتی، ادھر ادھر نظر دوڑاتی۔ اور پھر بیٹھ جاتی!...

مسجد سے اذان کی صدا بلند ہوئی!....

اس نے ڈنڈا رکھدیا۔ گھٹنے ٹیک کر دعا مانگی۔ پھر آگے بڑھی۔ اور... بغل بغل پانی میں جاکر اپنے کو گرا دیا!... موجوں نے اسے اپنی سرد گرفت میں پکڑا، اپنی تاریک گہرائی میں اسے گھسیٹ لیا اور اسے لئے ہوئے آگے بڑھ گئیں!... چپ چاپ! آہستہ آہستہ! اداس!... گاؤں سے پرے، کھیتوں سے پرے!... دور، بہت دور!...

کشتی اب بہت نزدیک آگئی تھی۔ گزشتہ سال کے وہی کچھ مسافر تھے۔ نوجوان سکان کے پاس بیٹھا تھا۔ دوشیزہ کشتی کے بیچ میں کھڑی تھی۔ ریشمی سرخ لباس پہنے! — دونوں کی شادی ہونے والی تھی!...

کشتی مکان کے پاس سے گزر گئی۔ اس نے مسکرا کر آسمان کی طرف دیکھا!... اس کے تبسم میں کتنی شیرینی تھی! کتنی مسرت! کتنی حلاوت!...

وہ گانے لگی... اس کی آنکھیں رنگین بادلوں پر جمی ہوئی تھیں اور وہ گا رہی تھی... ایسا مطمئن گیت! ایسا پرسکون گیت! مسرت سے چھلکتا ہوا! خوشی سے مہکتا ہوا! کامیابی سے سرشار!...

(ماخوذ)　　　تمنائی!

## تصحیح

جولائی کے نگار میں صفحہ ۵ کی آخری سطر میں بجائے ’رہو‘ کے صرف ’ر‘ چھپ گیا ہے قارئین درست کرلیں۔ — مینیجر نگار

# نغمۂ دل

یہ مجموعۂ کلام شاہجہاں پور کے مشہور اہل سخن جناب دلؔ کی تراوشِ قلم کا نتیجہ ہے، کتاب کی ابتدا جناب نیاز فتحپوری کے ایک بسوط مقدمہ سے ہوتی ہے، جو ضرورت سے زیادہ طویل ہے، اس کے بعد جناب عزیزؔ لکھنوی کا ایک تبصرہ ہے جو اسی قدر مختصر ہے، پھر غزلیات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، اور آخر میں چند متفرق اشعار، رباعیات اور مخمس ہیں۔

غزلیات کی ترتیب افسوس ہے کہ اسی قدیم طرز پر یعنی ردیف وار رکھی گئی ہے، اس ترتیب میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ شاعر کے مدارج کلام کا صحیح طور پر اندازہ نہیں ہو سکتا، یعنی ابتدا میں کلام کا کیا انداز تھا، اور رفتہ رفتہ اس میں کیا ترقیاں اور تبدیلیاں پیدا ہوئیں، لائق مصنف نے قدیم اور جدید کا فرق دکھانے کی غرض سے غزلوں پر "ق" اور "ج" لکھ دیا ہے، لیکن اس سے بہتر طریقہ یہ تھا کہ شروع میں قدیم کلام بلالحاظ ردیف درج کر دیا جاتا، اس کے بعد جدید غزلیں یکجا جمع کر دی جاتیں، اور غزلوں کی ترتیب زمانہ کے لحاظ سے رکھی جاتی، اس طور پر کلام کے ارتقا تدریجی کا اندازہ آسانی سے ہو سکتا تھا۔

علاوہ اس کے اگر ضخیم دواوین و کلیات کے بجائے منتخب کلام کے مختصر مجموعے شائع کئے جائیں تو یہ زیادہ مفید اور بہتر ہوگا، شاعر کا یہ کمال نہیں ہے کہ اس نے کتنا کہا، بلکہ کیا کہا، اور کیسا کہا؟ اور نہ ضروری ہے کہ اس نے جو کچھ بھی کہا وہ سب شائع کر دیا جائے، افسوس ہے کہ لائق مصنف نے انتخاب سے کام نہیں لیا، ورنہ ان کے کلام کی رونق دوبالا ہو جاتی

اگرچہ فرصت کی کمی کی وجہ سے ادبی مشاغل کا سلسلہ ایک مدت سے بند ہے، تاہم یہ سخت ناانصافی ہوگی، اگر اس قسم کے قابل قدر کلام سے اعتنا نہ کیا جائے، موجودہ حالات میں تفصیلی تبصرہ کی گنجائش نہیں، البتہ دیوان کے سرسری مطالعہ سے جناب دلؔ کی خصوصیاتِ کلام کے متعلق جس حد تک اندازہ کر سکا، اس کو مختصراً حوالہ قلم کرتا ہوں۔

جناب دلؔ کا خاص صحیفۂ سخن غزل ہے، عام طور پر غزل گوئی نہایت آسان چیز سمجھی جاتی ہے، اگر صرف زلف و کمر، خد و خال، ناز و ادا وغیرہ کی مصوری کا نام غزل ہے تو بے شبہ ہر بوالہوس غزل گوئی کا بجا طور پر دعویٰ کر سکتا ہے، لیکن واقعہ

یہ ہے کہ اس سے زیادہ نازک اور مشکل اور کوئی صنفِ سخن نہیں، ہر شخص عشق و محبت کی نزاکتوں کا اندازہ شناس نہیں ہو سکتا، اس کے لئے ذوقِ صحیح اور فطرتِ سلیم کی ضرورت ہے، جو ہر انسان کا حصہ نہیں۔ ع ہر ہوسناک نداند جام و سنداں باختن

اس بنا پر ایک غزل گو شاعر کے کلام میں سب سے پہلے جس چیز کو میری نگاہ ڈھونڈھتی ہے، وہ یہ ہے کہ شاعر نے اپنے آئینۂ محبت کو کس حد تک ابتذال کی گرد سے پاک و صاف رکھنے کی کوشش کی ہے اور اس نے جس ہستی کو اپنا محبوب نظر بنایا ہے، اس کی حیثیت صرف ایک بازاری فتنہ گر کی ہے یا اس میں کچھ لطیف معنوی محاسن بھی ہیں، ماحول سے متاثر ہونا تقاضائے فطرت ہے، جناب دلؔ نے آنکھیں کھولیں تو ملک پر امیر مینائی کا رنگ چھایا ہوا تھا، زانوے تلمذ بھی جناب دلؔ نے انھیں کے سامنے تہ کیا، لیکن چونکہ قدرت کی طرف سے طبعِ سلیم عطا ہوئی تھی، اس لئے ان کے کلام میں وہ ابتذال نظر نہیں آتا، جو عام طور پر لکھنؤ کا انداز ہے، تاہم لکھنویت کا اثر بہت کچھ نمایاں ہے، نیازؔ صاحب ایک جگہ مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"غضب خدا کا آپ سارا دیوان پڑھ ڈالئے، اور کسی ایک جگہ بھی آپ کو وصل کا مبارک لفظ نہ ملے
تمام مجموعہ چھان ڈالئے کہیں بھولے سے بھی اس (آرام جان) جانِ تمنا کا شکوہ نہ آئے"

مجھکو جناب دلؔ کی متانت اور سنجیدگی سے انکار نہیں، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس دعوے کا مقصد کیا ہے؟ کیا اس کا یہ منشا ہے کہ جناب دلؔ کا کلام لکھنویت سے بالکل پاک ہے، لکھنویت صرف وصل کا نام نہیں، جو مضامین عام طور پر لکھنؤ کے غزل گو شعرا کے سرمایہ خیال ہیں، مثلاً شمع تربت، چراغ مزار، بت سفاک، گریہ و زاری، ناز و ادا، کوچۂ قاتل، گورِ غریباں، وغیرہ ان کی جھلک جناب دلؔ کے کلام میں بھی نظر آتی ہے، اور یہ اثر زیادہ تر ان کی قدیم غزلوں میں محسوس ہوتا ہے مثلاً

دل صد چاک میں دیکھا رخِ روشن ان کا ہم نے نظارہ کیا ڈال کے چلمن ان کا
اور آشفتہ تہ خاک کرے گا ہم کو بال کھولے ہوئے آنا سرِ مدفن اِن کا

---

ہاتھ دل پر رکھ کے یہ کہنا کسی کا یاد ہے اب اسے اپنا نہ کہنا یہ ہمارا ہو گیا
جوڑا چھاہے مری تقدیر ان کی زلف کا یہ بھی بل کھائی ہوئی ہے وہ بھی بل کھائی ہوئی
چھری رکھکر گلے پر کاش قاتل آفریں کہتا ہمارے ذبح کرنے کے لئے تکبیر ہو جاتی
ترا کوچہ ہے یا دار الشفا اے غیرتِ عیسیٰ ادھر بیمار بیٹھے ہیں اُدھر بیمار بیٹھے ہیں
کھینچو چھری نقاب اُلٹ کر عتاب میں چینِ جبیں کو چین نہیں ہے حجاب میں

وقتِ خود بینی نہ دیکھیں آپ تنکر آئینہ — ہر ادائے حسن پر کھینچے گا خنجر آئینہ

اس قسم کے اور بھی اشعار ہیں جن کو طوالت کے لحاظ سے ہم قلم انداز کرتے ہیں، لیکن دو شعر اور ملاحظہ ہوں :۔

ہوا سنکی، گھٹا چھائی، چمن میں پھر بہار آئی — تمنا ہے کہ وہ گل پیرہن پہلو نشیں ہوتا

یہ بھیگی رات، یہ ٹھنڈا اساں، یہ کیفِ بہار — یہ کوئی وقت ہے پہلو سے اُٹھ کے جانے کا

کیا نیاز صاحب اب بھی اپنے دعویٰ پر قائم ہیں؟ کیا پہلے شعر میں "اس آرام جان کی تمنا" کا ذکر نہیں ہے، دوسرے شعر کا مصرع ثانی اگر وصل نہیں، تو پھر کس کیفیت کی طرف اشارہ کر رہا ہے؟

ان مثالوں سے صرف یہ دیکھنا مقصود ہے کہ جناب دلؔ کا کلام لکھنویت سے بالکل محفوظ نہیں ہے اور یہ اُستاد کے فیضِ صحبت کا لازمی نتیجہ تھا، لیکن چونکہ فطرت متین اور ذوق آشنا تھی، اس لئے جناب دلؔ اس حمام میں عام لکھنوی شعراء کی طرح بالکل برہنہ نظر نہیں آتے، اور کہیں کہیں اسی قدیم ذخیرۂ سخن میں ذوقِ سلیم کی جھلک بھی نظر آجاتی ہے، جس نے آیندہ چل کر ان کے آئینہ کلام کو لکھنویت کی آلائش سے اس حد تک صاف کر دیا کہ پڑھنے والے کو یہ کبھی یقین نہیں آسکتا، کہ یہ لکھنؤ کے کسی صحبت یافتہ کا کلام ہے، قدیم غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

وہی مستِ حقیقی ہے جو ہم بزمِ ساقی میں — شکستِ شیشۂ دل کی صدا پر وجد کرتا ہو

بڑھیں دل دینے والے خود بخود جوشِ محبت میں — سرِ بازار یوں حسنِ دلکش جلوہ آرا ہو

دلیلِ عشقِ صادق سوزِ پنہاں ہو نہیں سکتا — جلے جو شمع کی لو میں اُسے پروانہ کہتے ہیں

ذوقِ جانبازی میں یہ احساس تک باقی نہیں — دل میں پیکاں رہ گیا یا دل کو پیکاں لے چلا

خاموش دل زارِ تہِ خنجرِ قاتل — شکووں کا ہے یہ وقت کہ تسلیم و رضا کا

گو نذرِ فنا ہو گئی پروانوں کی ہستی — روشن ہے مگر نام شہیدانِ وفا کا

اس قسم کے اور بھی اشعار ہیں، جن سے جناب دلؔ کی سلامتِ مذاق کا کافی اندازہ ہوتا ہے۔

لیکن باوجود اس کے ہم کو جناب دلؔ کے کلام میں ایک خاص کمی محسوس ہوتی ہے، یعنی رقص و سرود اور جوش و مستی کا عنصریت کم نظر آتا ہے، جو عشق کی اصلی امتیازی خصوصیت ہے، چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں :۔

حسرت کا ہے نمونہ رنگِ تغزل اپنا — ہم انتہائے غم کی تصویر کھینچتے ہیں

اگرچہ فطری متانت اس موقع پر بھی قائم رہتی ہے، یعنی عام لکھنوی شعراء کی طرح جناب دلؔ علانیہ سینہ کوبی اور نوحہ گری کی حد تک نہیں پہونچتے تاہم اُنھوں نے غم کی جو تصویر کھینچی ہے وہ لکھنویت کے اثر سے بالکل محفوظ نہیں ہے، اس کا اندازہ مثالوں

سے بخوبی ہو سکتا ہے،

شبِ غم کی مصیبت بھی قیامت تا مصیبت تھی      یہ عالم تھا کہ اب نکلا مگر نکلا نہ دم میرا

جگر پھر کیوں نہ دوں ملے جوشِ گریہ تجھکو آنکھو نہیں      شبِ ہجراں بس اک تو ہے شریکِ رنج و غم میرا

عشق کا انجام حسرتناک ہے اے اہلِ دل      مٹ گئی ہر آرزو اک نقشِ دل پر رہ گیا

دل بھی مٹ جاتا تمنائیں اگر مٹنے کو تھیں      رہنے والا کون ہے کس کے لئے گھر رہ گیا

مصیبت در مصیبت میں ہوا ضبطِ غم سے اے ہمدم      ٹپکتا ہے مرے ہر زخمِ دل سے نوحہ گر ہونا

غمِ پیہم سے گھبرا کر گریباں چاک کرتے ہیں      اسی کو ہم سمجھتے ہیں شبِ غم میں سحر ہونا

مبارک ہو تجھے او ناشناسِ شانِ خودداری      مری بزمِ عزا میں بیٹھ کر اب نوحہ گر ہونا

سینہ شق ہے، رنگ فق، دل مضطرب، چشم اشکبار      ایک ضبطِ آہ سے افسوس کیا کیا ہو گیا

عشق میں ایسی ٹھوکر کھائی آس کا شیشہ ٹوٹ گیا      روزنٔ دلکو کھینچنے سے اے ہمدم جی چھوٹ گیا

اس گریۂ پیہم کی وہ ساعتِ آخر ہے      جس وقت مزاد امن آنکھوں سے جدا ہوگا

کب تک شبِ غم کوئی بدلتا رہے پہلو      تسکین کی صورت نہ ادھر ہے نہ اُدھر آتی

کافی ہے مرمٹوں کے لئے داغِ بیکسی      روشن رہے وہ شمع ہمارے مزار پر

زینتِ دل ہیں نہ ارمان نہ شوقِ اُمید      گھر ہے اُجڑا ہوا اس میں کوئی ساکن ہی نہیں

کسی کے ہجر میں ہم یوں بحالِ زار بیٹھے ہیں      کہ چہرہ زرد ہے، لب خشک ہیں رخسار بیٹھے ہیں

جوشِ نشاط کیسا دل سرد ہو رہے ہیں      عبرت کا ہے نمونہ افسردگی ہماری

اس قسم کے اور اشعار بہ کثرت موجود ہیں، جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جناب دلؔ کی طبیعت پر یاس و حسرت کا رنگ زیادہ غالب ہے، لیکن اتنا غنیمت ہے کہ ماتم سرایانِ لکھنؤ کی طرح جنازہ بردوش نظر نہیں آتے، بلکہ اکثر درد عشق کی بلند اور پاکیزہ اداؤں کی جھلک ان کے کلام میں محسوس ہوتی ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

نشترِ غم اہل ہوس کے لئے پیامِ مصیبت ہے، لیکن جناب دلؔ کے لئے اس کی خلش روح کی تازگی کا سرچشمہ ہے،

روح تازہ ہو گئی اللہ رے ذوقِ خلش      دل کا ٹکڑا بن گیا دل میں جو نشتر رہ گیا

عشق صرف ایک سطحی اور عامیانہ جذبہ نہیں ہے، بلکہ ایک رازِ عمیق ہے، جس کا اندازہ مشکل ہے۔

بارہا ڈوب کے اُبھرے مرے دل سے نشتر      راز پھر بھی نہ کھلا عشق کی گہرائی کا

نشۂ عشق پیمانۂ و ساغر کا محتاج نہیں ہے۔

جو مست حقیقی ہیں خمخانۂ اُلفت میں
ان کو کبھی پیمانہ درکار نہیں ہوتا

عشق کی اصلی شان خاک ہونے پر جلوہ گر ہوتی ہے۔

خاک ہو جانا نمودِ عشق ہے اے اہلِ دل
جل گیا پروانہ لیکن رنگِ محفل بن گیا

محبوب کے فیضِ نگاہ کا خیر مقدم ان الفاظ میں کرتے ہیں،

اے نگاہِ روح پرور آفریں صد آفریں
جانِ بسمل بن گیا، وہ درد پیدا کر دیا

کاش یہ صدائے آفریں کبھی ماتم کدہ لکھنؤ سے بھی بلند ہوتی!

عشق کا تقاضا گریہ و بکا نہیں، بلکہ پر سکوت سوز و گداز ہے

صورتِ شمع جل خموشی سے
ہے تقاضا عشق سوز و گداز

اربابِ ہوس تسکین و راحت کے طلبگار رہتے ہیں، لیکن ایک نکتہ دانِ محبت اس رمز سے واقف ہے کہ دراصل اضطراب ہی زندگی کی روح ہے۔

درحقیقت مضطرب دل کیلئے وہ موت تھی
اصطلاحِ عام میں تسکین جس کا نام تھا

عشقِ حقیقی جوش کا طالب ہے، صرف زبانی شور و غل بے سود ہے،

مثالِ نعرۂ منصور جوشش پیدا کر
عبث ہے شور انا الحق جو حکمِ دار نہ ہو

عاشق میں استعداد و صلاحیت ہے، تو معشوق کی نگاہ کرم خود بخود اُٹھ جاتی ہے، تقاضا پاسِ ادب کے خلاف ہے،

ان کی نظر کبھی تو اُٹھے گی پئے کرم
حُسنِ طلب یہی ہے، تقاضا نہ کیجئے

عشق میں ناکامیوں سے گھبرانا نہ چاہئے،

راہِ طلب میں ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی
کہتا ہے عشق ترکِ تمنا نہ کیجئے

ذوقِ نیاز عشق کی فطرت ہے اس لئے اس کو دوست کی بے اعتنائی کا گلا مند نہ ہونا چاہئے،

سنگِ درِ حبیب کو حس نہ سہی قبول کی
فرق نہ آئے اے جبیں حوصلۂ نیاز میں

آہ و فریاد عشق کی رسوائی کا نشان ہے۔

آہ سینہ میں گھٹے اُف نہ زباں سے نکلے
درد اس حد سے گزر جائے تو رسوائی ہے

دردِ دل کا انیس اور پریشانی دل کی تسکین کا سرمایہ ہے۔

درد کی شان یہی ہے کہ رہے مونسِ دل　　دل کی تسکین یہی ہے کہ پریشاں ہو جائے

عاشق کو جان دینا چاہئے، لیکن بستر پر کروٹیں بدل کر نہیں، بلکہ اس طرح کہ محبت کا نام روشن ہو جائے۔

کوچۂ یار میں مٹنا اگر اک شان کے ساتھ　　خاک ہونا تو محبت کا نشاں ہو جانا

عاشق کی اصلی زندگی راہ وفا میں اپنے کو قربان کر دینا ہے،

ہر ذرہ خاکِ دل کا اک روحِ مستقل ہو　　مٹنا رہِ وفا میں ہے زندگی ہماری

اہلِ ہوس کے معشوق کی منزل لبِ بام سے آگے نہیں بڑھتی، لیکن جناب دلؔ کے محبوبِ نظر کا مقام لبِ بام کیا عرشِ بریں سے بھی بلند تر ہے۔

کہئے تو کہہ دوں عرشِ بریں کو مقام دوست　　ہمت مگر کچھ اور ہے اپنے خیال کی

عام شعرا معشوق سے جس بے باکانہ طریقہ پر اپنی تمناؤں اور خواہشوں کا اظہار کرتے ہیں، وہ محتاج بیان نہیں، لیکن جناب دلؔ کی آرزو اس قدر نازک اور لطیف ہے کہ نگاہ شوق بھی اس کو ادا نہیں کر سکتی۔

نگاہِ شوق رہی ہمزبانِ دل لیکن　　کسی طرح نہ بنا شرح آرزو کرتے

عاشق کی حقیقی شمعِ راہ صرف اس کے دل کی آشفتگی اور ذوقِ جنوں کی سرمستی ہے، جو بلا کسی ہمدم یا رہبر کی امانت کے عشق کی تمام دشواریوں کو آسان بنا دیتی ہے۔

ہمدم کی نہیں حاجت رہبر کی نہیں پروا　　آگے ترے وحشی کے آشفتگیِ دل ہے

افسوس ہے کہ وقت کی کمی کی وجہ سے ہم کو صرف انھیں چند مثالوں پر قناعت کرنا پڑتا ہے، لیکن ان مثالوں سے کافی طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ جناب دلؔ صرف بُتِ بیدرد، اور قاتل نخوت پسند کی فسوں سازیوں کے اسیرِ دام نہیں ہیں، بلکہ عشق و محبت کی لطیف اداؤں کے بھی محرم راز ہیں، ان مثالوں سے ان کے کلام کی اخلاقی اور روحانی بلندی کا بھی کافی اندازہ ہوتا ہے یعنی ان کا عشق ہوس پرست شعرا کا عشق نہیں، جو بزدلی، پست خیالی، کم ہمتی، بے غیرتی اور نفس پرستی کی مجسم تصویر ہوتا ہے، بلکہ وہ عشق ہے جس کی فطرت صدق و وفا ہے، خلوص و ایثار جس کی سرشت ہے، جو ضبط و استقلال کا مجسمہ ہے جو موت کو زندگی سمجھتا ہے، جو خوددار، جانباز اور سرفروش ہے، جو شجاعت و تہور کا درس آموز ہے جو تسلیم و رضا کا لذت شناس ہو جو سراپا ذوق شہادت سے لبریز ہے، جو ناکامیوں کی ٹھوکریں کھا کر بھی سرشار آرزو رہتا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

ناکامیوں کے بعد بھی چھوٹا نہ ہاتھ سے　　کیا جانے کس خیال سے دامانِ آرزو

خود شعلۂ فنا سے ہم آغوش ہو گئے　　بزمِ وفا میں آج شہیدانِ آرزو

اس کا تمام محبت کی بے تابی ہے،

آساں نہیں مشاہدۂ حُسنِ جانگداز  اس انجمن میں ہمتِ پروانہ چاہئے

یعنی عشقبازی ہر بوالہوس کا کام نہیں، اس کے لئے صبر و ہمت اور ایثارِ نفس کی ضرورت ہے۔

وہ کیا گھبرائے اسے ہجومِ خرامِ حشر پرور سے  کہ جس کے شیشۂ دل کی ہے زینت چور ہوجانا

عشق اسی بلند حوصلگی کا طالب ہے۔

حُسن کی عالم فریبی گو بہت مشہور ہے  ہم مگر ایمان لائے روئے جاناں دیکھ کر

یہی وہ "روئے جاناں" ہے جو در اصل اربابِ ذوق و نظر کی پرستش کا مستحق ہے، وہ حُسن کیا جو عاشق کے روحانی احساسات کو منور نہ کردے، اور وہ عشق کیا جس میں اتنی بھی لطافت و صلاحیت و استعداد نہ ہو!

کاش ان کی رہ گزر میں پیوندِ خاک ہوتے  کچھ زندگی نہیں ہے یہ زندگی ہماری

عشق اسی جذبۂ فنا اور ذوقِ ایثار کا متمنی ہے نہ کہ بستر پر کراہنے اور رونے اور چلانے کا!

امثالِ مذکورۂ بالا سے جناب دلؔ کے کلام کی معنوی عظمت، پاکیزگی، اور بلندی کا اب تم بخوبی اندازہ کر سکتے ہو، ضرورت تھی کہ دورِ حاضر کے دیگر غزل گو شعرا سے جناب دلؔ کے کلام کا موازنہ کیا جاتا، اس وقت ان کے کلام کی خوبیاں اور زیادہ روشن ہو کر سامنے آجاتیں، لیکن افسوس ہے کہ اس قسم کے تفصیلی موازنہ کے لئے ہمارے پاس کافی وقت نہیں، ہم کو صرف اس موقع پر یہ ظاہر کر دینا ہے کہ جہاں تک عشق و محبت کے اخلاقی پہلو کی پاکیزگی اور خیالات کی شائستگی کا تعلق ہے جناب دلؔ اپنے عام معاصرین میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔

ممکن ہے کہ ایک نکتہ سنج نگاہ کو جناب دلؔ کے آئینۂ سخن میں دقیق مسائل اور حکیمانہ اسرار کے جلوے نظر نہ آئیں، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ قدرت نے ان کو ایک ذوق آشنا قلب عطا کیا ہے، چنانچہ اکثر ان کے اشعار میں بادۂ تصوف کی مستی نظر آتی ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

صوتِ سرمدی کائنات کے ہر ذرے میں ترنم ریز ہے، اس کے لئے کسی مقام کی تخصیص نہیں، صرف گوشِ دل کے وا ہونے کی ضرورت ہے۔

گوشِ دل کے لئے کچھ طور کی تخصیص نہیں  ہر جگہ ہم تری آواز سنا کرتے ہیں

کثرتِ نور بھی مانعِ نظارہ ہوتی ہے۔

کثرتِ تنویر آخر بن گئی وجہِ حجاب  پردہ اُٹھنے پر بھی اک پردا نظر آیا مجھے

رازِ عشق کی لطافت عوام کے فہم و ادراک سے بالاتر ہے اس لئے اس کا اعلان غلطی اور خلافِ مصلحت ہے۔

حق تو یہ ہے کہ خطا تم سے ہوئی اے منصور     تھیں چھپانے کی جو باتیں وہ بہ آواز کہیں

گو جمالِ حقیقت نگاہوں سے مخفی ہے، تاہم کائنات کا کوئی ذرہ بیکار نہیں ہوتا

گو رازِ حقیقت کا اظہار نہیں ہوتا     ذروں میں کوئی ذرہ بیکار نہیں ہوتا

جمالِ حقیقی کے بندۂ عقیدت کو دشت و صحرا کی خاک چھاننے کی ضرورت نہیں۔

جو مرجعِ عالم ہے اسی در کی طلب ہے     کیوں دشت نوردی کرے دیوانہ کسی کا

انسان کی حقیقت ترکیبِ عناصر سے بلند تر ہے۔

گم اپنی حقیقت ہے ترکیبِ عناصر میں     یہ پیرہنِ ہستی بے وا نظر آتا ہے

عشق جس قدر جلوۂ حسن سے قریب ہوتا جاتا ہے، اسی قدر اس کی بیخودی اور وارفتگی بڑھتی جاتی ہے: در جس قدر بیخودی بڑھتی ہے اسی قدر در اصل دوری ہوتی جاتی ہے، کیونکہ بیخودی کے عالم میں احساس قرب قائم نہیں رہ سکتا

محوِ جمال بے خود و مخمور ہو گئے     یعنی قریب ہو کے بہت دور ہو گئے

پرستارانِ حقیقت کفر و ایماں کی باہمی جنگ آرائیوں سے ہمیشہ بے تعلق رہتے ہیں۔

دُنیائے حقیقت میں آزاد تعین ہیں     ہم نے کبھی ٹکرایا کعبہ سے نہ بتخانہ

ایک پوری غزل اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔

وہ حسنِ مطلق ہے جلوہ افگن بنور جس کے شرر ادا کو دیکھا     عجیب قدرت کے ہیں کرشمے جدھر نظر کی خدا کو دیکھا

جو ڈوب کر پھر کبھی نہ اُبھرا ہوا وہی آشنائے ساحل     بقائے دائم کا اک مرقع غریقِ بحرِ فنا کو دیکھا

اسی کا نقشہ جما ہوا ہے، اسی کی اب لو لگی ہوئی ہے     نظر میں عالم تھا بے حقیقت جب اس فنا آشنا کو دیکھا

مشاہدہ ہو تو کس طرح ہو بصارتِ ظاہری ہے عاجز     گزر گیا جو خودی کی حد سے اسی نے ہر خود نما کو دیکھا

خبر نہیں انتہا کی ہم کو کیا ہو گم بیخودی نے اے دل     قدم جو رکھا رہِ طلب میں تو دور تر رہنما کو دیکھا

ان مثالوں کے بعد جناب دل کے جذبۂ عشق کی لطافت اور حقیقت شناسی سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔

جناب دل کی پاکیزہ خیالی تم نے دیکھ لی، اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کے احساس کا کیا عالم ہے، یعنی ان میں تڑپنے اور تڑپانے کی قابلیت کس حد تک ہے، وہ جو کچھ کہتے ہیں محض لفظی طلسم آرائی ہے یا اس میں کچھ سوز و اثر بھی ہے کیونکہ ہمارے نزدیک یہی چیز تغزل کی حقیقی روح ہے، بغیر اس کے ایک غزل گو شاعر کے تمام تخیلات بے کار ہیں، بدقسمتی سے لکھنؤ کی

بدولت سوز و گداز کا مفہوم گریہ و بکا سمجھ لیا گیا ہے، حالانکہ سوز و گداز کو در اصل سینہ کوبی اور فریاد و ماتم سے کوئی تعلق نہیں، یہ صرف روح کی ایک لطیف و درد مندانہ کیفیت کا نام ہے، جس سے شاعر کا کلام عام طور پر لبریز ہوتا ہے۔ اس حیثیت سے جناب دلؔ اپنے عام معاصرین سے علانیہ ممتاز نظر آتے ہیں، یعنی ان کا کلام صرف ضعف، بے حسی، اور موت کا افسانہ نہیں ہے، بلکہ اپنے اندر احساس کی کافی گرمی اور زندگی کی روح رکھتا ہے اس کا اندازہ اشعار مذکورہ بالا سے بھی ایک حد تک ہو سکتا ہے، اس موقع پر چند اشعار اور ملاحظہ ہوں:-

یہی ہیں سوزِ دلِ عندلیب کے معنے ۔۔۔ قفس تو پھونک دیا چند پر نہیں نہ سہی

یہی وہ ایثار کا شریفانہ احساس ہے جس میں روحِ انسانی کی حقیقی عظمت کا راز پنہاں ہے۔

یہ قفس کیا قفس تن کے بھی ٹکڑے اُڑ جائیں ۔۔۔ ہم سے اتنا کوئی کہدے کہ بہار آئی ہے

احساس کی شدت اور وارفتگی کی کتنی صحیح تصویر ہے!

موت کے ساتھ اہلِ ہوس کی دنیائے محبت ختم ہو جاتی ہے، لیکن ایک ذوق آشنا اور درد مند روح کی سعی طلب کا آغاز فنا سے ہوتا ہے۔

مٹا کے ہستیِ دل صرف دعا کرتے ۔۔۔ یہیں سے سعیِ طلب کی ہم ابتدا کرتے

صحرائے محبت کا ہر ذرہ تسکین و راحت کا مرکز ہے، اس لئے ایک لذت شناس دیوانگی کا دل منزل کی تلاش و حسرت سے بے نیاز ہوتا ہے۔

جو ذرۂ صحرا ہے، وہ ہے مرکزِ تسکین ۔۔۔ پابندِ جنوں حسرتِ منزل نہیں رکھتا

عشق اپنے اندر خود ایک مستقل مستی اور زندگی کی روح رکھتا ہے، اس کو شراب و ساقی کی ضرورت نہیں۔

رہیں گے مست ہمیشہ شراب ہو کہ نہ ہو ۔۔۔ ملے تو بہت ساقی اگر نہیں، نہ سہی

نشترِ عشق کی کاوش تو اہلِ ہوس کے لئے ہمیشہ ایک مستقل مصیبت اور اذیت کا سامان ہے، لیکن صاحب ذوق کیلئے بالآخر سرمایہ راحت بن جاتی ہے۔

کاوشِ پیہم بالآخر ہو گئی لطف آفریں ۔۔۔ اب وہ نشتر راحتِ دل ہے جو خوں آشام تھا

پردہ حسن اٹھتا ہے، پھر بھی طالب جمال محروم نظارہ ہے، کیونکہ وہ اس حد تک جوشِ تمنا سے مست اور سرشار ہو جاتا ہے کہ اس کا احساس نظر جاتا رہتا ہے۔

گو پردہ اُٹھا پھر بھی حیراں ہوں کدھر دیکھوں ۔۔۔ احساس نظر گم ہے اب جوشِ تمنا سے

ذوقِ جنوں کی شدت کی تصویریں الفاظ میں کھینچے ہیں۔

ہم شدتِ جنوں میں یوں خاک اُڑا رہے ہیں ۔۔۔ صحرا پہ چھا گئی ہے آشفتگی ہماری

یہ بالکل مبالغہ نہیں ہے، ہمارے نزدیک اگر احساسِ محبت میں اتنی بھی شورشِ مستانہ نہ ہو تو وہ عشق کس کام کا اب ہم چند اور اشعار بلا کسی تشریح کے نقل کر دیتے ہیں، جن سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جناب دلؔ اپنے پہلو میں ایک زندہ اور بیدار دل رکھتے ہیں اور ایک غزل گو شاعر کے لئے سب سے مقدم چیز یہی ہے۔

ہم مستِ عشق ہیں ہمیں ساغر سے کیا غرض ۔۔۔ ساقی کی چشمِ مست ہماری نظر میں ہے
ہے نقش ذرہ ذرہ پہ جوششِ سرِ نیاز ۔۔۔ کون آج سجدہ ریز تری رہ گزر میں ہے

اُٹھے تو محوِ تمنا، ملے تو غرقِ حیا ۔۔۔ نگاہِ شوق کو فکرِ مآل کار نہ ہو

وہ خدنگ روح پرور ہے جزوِ دل جو ملے دل ۔۔۔ مجھے اضطراب کیوں ہو، مجھے انتشار کیوں ہو

نظارہ سوزِ شمع تجلی سہی مگر ۔۔۔ تقلید گرمجوشی پروانہ چاہیئے

ریاضِ دہر میں ہر شاخ وگل سے لطف اُٹھا ۔۔۔ یہ شکل ساعد ساقی کی ہے وہ ساغر کی
اُٹھے نگاہ ڈھلے بادۂ نشاط افزا ۔۔۔ کہ آرزو ہے اسی کیف روح پرور کی
تڑپ تڑپ کے یہ کہتے تھے کشتگانِ نگاہ ۔۔۔ سکونِ قلب ہے جنبش کسی کے خنجر کی

مٹنے پہ بھی ہے دل کا وہ عالم کہ الاماں ۔۔۔ دنیا ہر ایک ذرے میں آباد ہو گئی
دل تھا وہ دل جو خاک ہوا راہِ عشق میں ۔۔۔ اکسیر تھی وہ خاک جو برباد ہو گئی

دامانِ دل میں جوششِ تمنا لئے ہوئے ۔۔۔ آیا ہوں اک تلاطمِ دریا لئے ہوئے
آئی بہار ماحصل دنیا لئے ہوئے ۔۔۔ ہر شاخِ گل ہے ساغر و مینا لئے ہوئے
ابتک ہیں جوشِ عشق کی ہنگامہ خیزیاں ۔۔۔ اُٹھا غبارِ قیس تو صحرا لئے ہوئے
ہر اشکِ خوں کو دیکھ رہا ہوں محیطِ غم ۔۔۔ قطرے مری نظر میں ہیں دریا لئے ہوئے

ان اشعار کو پڑھو، کیا یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ایک زندہ اور کیف آشنا روح آتش فشانی کر رہی ہے۔

ایک صحیح المذاق غزل گو شاعر کے لئے ضروری ہے کہ وہ بارگاہِ حسن کا ادب شناس ہو اور اپنی ہستی کو رضائے محبوب پر وقف کر دے، اس کو انتہائی جوشِ دیوانگی کے عالم میں بھی یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اس کی حیثیت صرف ایک طالب کی ہے، جس کا کام صرف نیاز و عقیدت ہے، جناب دلؔ کے کلام میں یہ جذبہ خاص طور پر محسوس ہوتا ہے

چنانچہ خود فرماتے ہیں:-

راہِ طلب میں جوشِ عقیدت کی شرط ہے ہو سجدۂ نیاز بہم آغوشِ نقشِ پا

ایک دوسری جگہ اسی شریفانہ جذبہ کو یعنی ظلم وستم تو حُسن کی عادت ہے، لیکن عشق کا فرض یہی ہے کہ رشتہ وفا ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے" اس طرح ادا کرتے ہیں۔

ہر تمنا امتحانِ عشق میں ہو صرفِ جور اے وفا دل یہ تیرا فرض ہو وہ خوئے دوست

حُسن کی محشر خرامیوں کے سامنے جناب دلؔ کے نیازِ عشق کی یہ شان ہے،

انھیں اس شان سے چلنا کہ اک ہنگامہ برپا ہو ہمیں ہر گام پر اے ہم نفس آنکھیں بچھا دینا

اس سے زیادہ اور کیا عقیدت کا جوش ہو سکتا ہے، لیکن نہیں ان کا جوشِ نیاز اس سے بھی آگے بڑھکر اس حد تک پہونچا ہے کہ بجائے محبوب کے سنگِ در ہی سے اپنا اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

بس انتہا ہے کہ سنگِ درِ حبیب سے ہم بیان کرتے ہیں جو دل کا حال ہوتا ہے

جوشِ عقیدت کی واقعی یہ انتہا ہے

وہ ہزاروں ٹھوکریں کھاتے ہیں لیکن ان کے ذوقِ سرفروشی اور پائے ثبات میں لغزش نہیں آتی،

کسی کے عشق میں ابتک وہی ہے جوشِ جانبازی ہزاروں ٹھوکروں پر بھی رہا ثابت قدم میرا

کیوں؟ اس لئے کہ وہ اِس رمز سے واقف ہیں کہ جس سر نے آستانِ یار چھوڑ دیا اس کی قسمت میں حوادثِ آسمانی کی ٹھوکریں کھانا ہے۔

ہمیشہ ٹھوکریں کھاتا رہے سنگِ حوادث کی وہ سر جو تیرے سنگِ آستاں سے دور ہو جائے

ایک دوسری جگہ اپنے ذوقِ نیاز کا اظہار ان سادہ لیکن موثر الفاظ میں کرتے ہیں۔

ہم کو ان سے ہے غرض دنیا ہوئی اپنی تو کیا وہ اگر نامہرباں ہوں مہرباں کوئی نہ ہو

محبوب کے جور وستم کو جس نگاہ عقیدت سے دیکھتے ہیں، وہ حقیقت میں جناب دلؔ کی صحبتِ مذاق کی ایک روشن دلیل ہے، وہ اس راز سے واقف ہیں کہ محبوب کا جور وظلم ہی دراصل اس کا لطف وکرم ہے، اس لئے وہ کسی قسم کی شکوہ طرازی کو آدابِ عشق کے خلاف سمجھتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں

جور وجفائے یار کا شکوا نہ کیجئے عشقِ وفا سرشت کو رسوا نہ کیجئے

اور ان کو اس ننگ کا احساس یہاں تک ہے کہ مرجانا گوارا ہے، لیکن شکوہ سنجی کی ذلت پسند نہیں،

خلافِ عشق ہو سرگرم فریاد و فغاں ہونا الٰہی اس سے پہلے بند ہو جائے زباں میری

درد اٹھتا ہے تو مسرت سے اچھل پڑتے ہیں کہ یہ کسی دلنواز کا پیام کرم ہے،

جب دل میں دردِ عشق اٹھا ہم اچھل پڑے سمجھے کہ یہ کرم ہے کسی دلنواز کا

ان کے نزدیک جوشِ محبت کا تقاضا یہی ہے کہ پیکانِ ستم جہاں تک ممکن ہو ذوقِ خلش کو بڑھاتا رہے۔

خلش افزا رہے پیہم یہ تحریکِ محبت ہو ملے پہلو میں گنجائش جہاں تک نوکِ پیکاں کو

خنجرِ قاتل سے جنابِ دل کو جو ذوق اور شیفتگی ہے اس کی تسکین صرف ایک وار سے نہیں ہو سکتی، چنانچہ آرزو ہے کہ دل کے ٹکڑے پھر کسی طرح باہم مل جاتے اور ذوقِ شہادت کی لذت ایک مرتبہ اور نصیب ہوتی۔

ابھی اے چارہ گر باقی ہے ذوقِ خنجرِ قاتل کسی تدبیر سے پھر پارہ ہائے دل ملا دیتا

نگاہِ محبوب سے ناوک اندازیوں کا تقاضا ان الفاظ میں کرتے ہیں

اے نگاہِ قدر انداز چلیں یوں ناوک جزوِ دل ہو کوئی پیوستِ رگِ جاں کوئی

کاش یہ ولولہ ان "بیمار دلوں" میں بھی پیدا ہو جاتا جن کو اب تک نوحہ خوانی سے فرصت نہیں!

ذوقِ ستم کی لذت شناسی ان کو اپنے زخم خوردہ دل سے تیر کے ٹکڑوں کے نکالنے کی اجازت نہیں دیتی کہ وہی حقیقت میں ایک شوریدہ مزاج کے دل کی آرائش و زینت کا سامان ہے، جو آسانی سے ہر شخص کو ہاتھ نہیں آسکتا، اس کے لئے حوصلہ اور غیر معمولی کاوش کی ضرورت ہے۔

نہ کھینچ اے چارہ گر مجروح دل سے تیر کے ٹکڑے سجایا ہے بڑی کاوش سے ہم نے اس گلستاں کو

جنابِ دل کے اس ذوقِ گلستاں آرائی کی داد دینا آسان نہیں، اس کی لطافت کو صرف صاحبِ ذوق ہی محسوس کر سکتا ہے۔

وارفتگی کے عالم میں احترامِ حسن کا احساس دل میں موجود ہے، چنانچہ آستانِ یار کے قریب پہونچ کر دفعۃً سنبھل جاتے ہیں کہ یہ ادب کا مقام ہے۔

ذروں میں کچھ کشش ہے محسوس ہو چلی اے دل سنبھل کہ پیشِ نظر کوئے یار ہے

ایک ایک لفظ پر غور کرو کسقدر روحانی کیف میں ڈوبا ہوا ہے۔

جس اخلاق و عقیدت کے ساتھ آستانِ یار پر حاضر ہوتے ہیں اس کی تصویر یہ ہے:۔

یوں لے چلا ہے دل ہمیں اس جلوہ گاہ میں لختِ جگر ہیں زینتِ دامانِ آرزو

اس سے زیادہ قیمتی اور کیا نذر ہو سکتی ہے؟
محبوب کے نقشِ پا میں بھی ان کی عقیدت پرست نگاہوں کو کیف و نشاط کے جلوے نظر آتے ہیں

ذراتِ دل نشاط سے معمور ہو گئے    فردوسِ آرزو ہے کہ آغوشِ نقشِ پا

اپنی ہستی کو رضائے دوست پر وقف کر دینے کو منزلِ مقصود کی دلیل سمجھتے ہیں۔

سمجھا ہوں اس کو منزلِ مقصود کی دلیل    دل ہے کسی کے نقشِ قدم پر مٹا ہوا

در یار پر گرنا ان کے نزدیک عشق کی معراج ہے۔

در دلبر پہ گرا میں تو مقدر نے کہا    بخودِ عشق یہ معراج ہے اُفتاد نہیں

لیکن اہلِ ہوس کی طرح ذلیل ہو کر نہیں گرتے بلکہ جوشِ مسرت اور فخر و ناز کے ساتھ جس کی تصویر یہ ہے:۔

گرے یوں ان کے سنگِ آستاں پر    جبینِ عجز پہونچی آسماں پر

پاسِ ادب کا یہ عالم ہے کہ شکوہ طراز یاں تو درکنار اظہارِ مدعا کی بھی جرات نہیں۔

حضورِ یار شکووں کا تو کیا ذکر    گراں ہے مدعائے دل زباں پر

اور اگر کبھی اس کی نوبت بھی آتی تو زبان سے نہیں بلکہ اشکوں کی خاموش روانی سے اپنی روداد وفا بیاں کرتے ہیں

اشکوں کی روانی ہے روداد وفا گویا    خاموش یہ شکوے ہیں اک شاہدِ رعنا سے

یہ ہے ذوقِ محبت کی وہ متانت اور سنجیدگی جو صرف اہلِ نظر کا خاص حصہ ہے،

ان مثالوں سے تم کو کافی طور پر اندازہ ہو گیا ہو گا کہ جناب دلؔ کے کلام میں نیاز و عقیدت اور اخلاص و وفا کی گرمی کس حد تک موجود ہے اور وہ کہاں تک بارگاہِ حسن کے ادب شناس ہیں، عام شعرا جن کی طبیعتیں نکتہ شناس نہیں ہوتیں، عقیدت کے جوش میں اکثر ابتذال اور ذلت و خواری کی حد تک پہونچ جاتے ہیں اور طرح طرح کی عامیانہ اور ذلیل حرکتیں کرنے لگتے ہیں جو عشق و محبت کی شانِ بلندی کے خلاف ہوتی ہیں مثلاً کسی کا شعر ہو

اس نقشِ پا کے سجدہ نے کیا کیا ذلیل    میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

لیکن ہم اس حد تک جوشِ عقیدت کے قائل نہیں، غیرت و خودداری عشق کی شرطِ اولیں ہے، عقیدت کے یہ معنی نہیں کہ عاشق اپنے کو بالکل پست اور ذلیل کر دے، بلکہ اس کا اصلی کمال یہ ہے کہ حسن کی مرتبہ شناسی کے ساتھ ساتھ عشق کی عظمت کا احساس بھی قائم رکھے لیکن یہ ایسا نازک مرحلہ ہے جس سے صرف محرمانِ خاص ہی کامیابی کے ساتھ گزر سکتے ہیں، جناب دلؔ کی حقیقت شناسی اور بلند نظری ناقابلِ انکار

ہو جاتی ہے، جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انتہائی جوشِ نیاز و عقیدت کے عالم میں بھی عشق کی عظمت کا احساس ان کے دل میں موجود ہے، ان کے دل کا ذرہ ذرہ جوش نیاز سے لبریز ہے، محبوب کی ایک ایک ادا پر مٹ جانے کے لئے ہمہ تن تیار ہیں عجز و اُفتادگی ان کی معراج آرزو ہے، تیرِ ستم کے ٹکڑوں سے اپنے قلب و جگر کی آرائش کرتے ہیں، دوست کا ہر ظلم ان کے لئے پیامِ رحمت ہے، راہ طلب کی ہر ٹھوکر پر ان کے مُنھ سے بجائے اُف کے آفریں نکلتی ہے، نقشِ پا ان کو فردوسِ آرزو نظر آتا ہے، کوئے یار میں ہر ہر قدم پر آنکھیں بچھاتے چلتے ہیں، یہ سب کچھ ہے، تاہم ان کا آئینۂ عقیدت ابتذال و ذلت کی گرد سے پاک ہے، بے شبہ وہ بارگاہ حسن کے خادم ہیں لیکن ایسے خادم ہیں، جس کو اپنے حسنِ خدمت پر ناز ہے، جس کی جبینِ عقیدت کے سجدے ذلت و خواری کے سجدے نہیں ہیں، بلکہ وہ سجدہ ہائے شوق و نیاز ہیں، جن پر آستان یار کو بھی فخر و وجد ہے۔

کئے ہیں سجدے یہ کس نے کہ فرطِ نخوت سے　　دماغ عرش پہ ہے تیرے آستانے کا

حُسن کو یہ سمجھنا چاہئے کہ عشق صرف اس کا ایک پرتو ہے، بلکہ اس کے اندر کچھ مستقل کیفیتیں بھی ہیں اس احساس کو ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں۔

سراپا شوق ہوں نقشِ وفا ہوں شکلِ حیرت ہوں　　مجھے بھی دیکھ او حسنِ خود آرا دیکھنے والے

یعنی صرف تو ہی نہیں ہے بلکہ میں بھی ایک قابلِ التفا چیز ہوں، گو ایک ذرہ حقیر ہی سہی۔

نگاہِ شوق میں وہ صلاحیت و استعداد ہے کہ جب جوشِ کیف میں اُٹھتی ہے تو حریم حسن کے پردہ ہائے در اُلٹ جاتے ہیں،

جلوۂ رعنا کی فطرت ہے اسی حد تک حجاب　　جب نگاہ شوق اُٹھی پردہ ہائے در اُٹھے

کاش یہ ذوقِ نگاہ کی قابلیت ان لوگوں میں بھی پیدا ہو جاتی جو حریم یار میں رسائی کے لئے درباں کی نگاہ کرم کے محتاج رہتے ہیں۔

نگاہ شوق بے شبہ اسی لئے ہے کہ جمال یار پر قربان ہو جائے، لیکن جناب دل اس کو اس شان کے ساتھ نثار کرتے ہیں کہ خود حسن کی رونق و زینت دو بالا ہو جاتی ہے۔

قربان ہو کے آج کسی کی نگاہِ شوق　　زینت فزائے حُسن خداداد ہو گئی

ان چند مثالوں سے ظاہر ہے کہ جناب دل نے باوجود جوش عقیدت کے عشق کی شانِ عظمت کو بھی قائم رکھا ہے اور یہ ان کے حُسنِ مذاق کی ایک بہت بڑی دلیل ہے۔

تفصیلات مذکورۂ بالا کی بنا پر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ جناب دل کا تغزل رندی و ہوسناکی کی تصویر نہیں ہے بلکہ قلب انسانی کے بلند اور شریفانہ جذبات و احساسات کا ایک باصرہ نواز مرقع ہے، جو ارباب ذوق کے دیدہ دل کے لئے اپنے اندر بہت کچھ سامانِ لذت رکھتا ہے، اُنھوں نے غزل گوئی کے پردے میں در اصل بلند ترین اخلاق کی دعوت دی ہے، غیرت و خودداری، ایثار و وفا، اخلاص و عقیدت، ضبط و تحمل، صبر و استقامت، سوز و نیاز، ترک خودی، ذوق فنا ان کے نہال محبت کے برگ و بار ہیں، انھیں فضائل اخلاق کے مجموعہ کا نام حقیقی عشق ہے، جو روح انسانی کی حسیات مخفیہ کو بیدار اور منور کرتا ہے، جو بزدل کو شجاع، رذیل کو شریف، پست کو بلند اور کمزور کو قوی بنا دیتا ہے، افسوس ہے کہ ہمارے شعرا کی عام بدمزاقی نے عشق کی اس روحانی اور اخلاقی حیثیت کو بالکل غارت اور برباد کر دیا، اور غزل گوئی صرف مادی جذبات کی مصوری تک محدود ہو کر رہ گئی، جس کا لازمی نتیجہ ابتذال دیتی ہے، پتھرائی ہوئی آنکھیں، کٹی ہوئی رگیں، ڈوبی ہوئی نبضیں، جانکنی کی بے چینیاں، شور ماتم، گریہ و بکا، گویا اس عشق کے یہی آثار و علائم ہیں، جو طالبانِ ذوق کو حیات ابدی کا پیام سنانا چاہتا ہے، جس کا مقصد تمھارے جسم کو نہیں بلکہ تمھاری روح اور تمھارے قلب و دماغ کو مشتعل اور بیدار کرتا ہے اس بنا پر موجودہ رنگ تغزل کی اصلاح و تہذیب کے لئے نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عشق کی روحانی اور اخلاقی عظمت و پاکیزگی کو خاص طور پر نمایاں کیا جائے، تاکہ مدعیان تغزل کو صاف نظر آجائے کہ وہ جس چیز کی تصویر کھینچ رہے ہیں اس کو در اصل عشق سے کوئی تعلق نہیں۔

ہم کو نہایت مسرت ہے کہ جناب دل نے بڑی حد تک اس فرض کو خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے اور حتی الوسع اپنی غزل گوئی کے دامن کو رکیک اور بازاری جذبات سے پاک رکھنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ ان کا کلام پڑھکر عشق کی روحانی عظمت کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے، اُنھوں نے رقیب و عدو، وصل و نفس پرستی کے عامیانہ اور شرمناک جذبات سے اپنے کلام کو پاک رکھکر لکھنؤ کے مبتذل رنگ تغزل کی ایک بڑی حد تک اصلاح کی ہے، اور اگرچہ تقاضائے زمانہ کے لحاظ سے اپنے دامن شاعری کو جناب دل، لکھنؤ کے اثر سے بالکل محفوظ نہ رکھ سکے، جیسا کہ ہم اوپر دکھا چکے ہیں، تاہم خصوصیات مذکورۂ بالا کی بنا پر ان کا کلام موجودہ ذوقِ تغزل کے لئے ایک حد تک شمع ہدایت کا کام دے سکتا ہے، جناب دل کو معلوم ہو یا نہ ہو لیکن ہمارے نزدیک وہ اس پائے کے شاعر ہیں کہ ان پر مذاقِ عامہ کی اصلاح و تہذیب کی بہت کچھ ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اور وہ موجودہ رنگِ تغزل میں بہت کچھ تغیر پیدا کرنے کی استعداد و صلاحیت رکھتے ہیں اس لئے

میں آیندہ ان کے نتائجِ فکر و خیال کو لغویت سے قطعاً منزہ اور مبرہ دیکھنا چاہتا ہوں، اُستاد اور انکے زمانہ کے مذاق کی یاد اب چھوڑ دی جائے تو بہتر ہوگا، جناب دل حریمِ محبت کے محرمانِ خاص میں سے ہیں، اس لئے انکی زبان سے اِس قسم کے اشعار سُن کر تکلیف ہوتی ہے۔

انھیں سفاک بنایا ہے تو اُنھیں میاں سمجھیں / یہ کوئی بات ہو باندھے ہوئے تلوار بیٹھے ہیں
بال کھولے اب نہ آنا بیکسوں کی قبر پر / حوصلے کچھ بڑھ چلے ہیں خاکِ دامن گیر کے
کیا یہی انصاف ہے اے قاتلِ پیماں شکن / دل کے ادھیڑے زخم چرکے ہیں تری شمشیر کے
پہلے پہل یہ شوق ہوا ہے گراں نہ ہو / نازک سہی ان کے ہاتھ میں تلوار چاہئے
جس کی خلقت میں کجی ہو وہ نہیں مٹ سکتی / بل نکل جائے تری زلف کا ممکن ہی نہیں
وہ شبِ غم کا اندھیرا، وہ بھیانک منظر / تھا اجل کو بھی تردد مرے گھر آنے میں
یہ اندازِ نگہ، یہ جور کی عادت نہیں اچھی / بہت مشہور تیری کج ادائی ہوتی جاتی ہے
ملی راحت ہجومِ یاس و غم میں خون رو رو کر / لگی دل کی بجھائی ہے تو کچھ کچھ دیدۂ تر نے

ان کو چاہئے کہ وہ اپنے ذوق و شوق کا یہی غلغلہ بلند کرتے رہیں ع

مشربِ اہلِ ذوق میں ذکرِ خودی حرام ہے

اور تشنگانِ محبت کو یہی درس دیتے رہیں۔ ع

تقاضائے وفا ہے بیکرِ ہستی مٹا دینا

اور ان کے لئے اسی عالمِ بیخبری و خود فراموشی کی سیر موزوں ہے جہاں

نالے ہیں نہ آہیں ہیں اثر ہے نہ دعا ہے

شاعر کے لئے یہی کافی نہیں ہے کہ وہ کیا کہتا ہے، بلکہ یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ وہ کیسے اور کیونکر کہتا ہے، یعنی اسکے اندازِ بیان میں کس حد تک ندرت اور دلکشی ہے، چونکہ تاثیر شعر کی جان ہے، اس لئے شاعر کا سب سے مقدم فرض یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کے لئے ایسا پیرایۂ بیان اختیار کرے، جو موثر اور دلآویز ہو، ورنہ اسکے بلند سے بلند تخیلات بھی ترانۂ بے اثر ہو کر رہ جائیں گے۔

ہمارے نزدیک شاعر کا اصلی کمال یہی ہے کہ وہ معمولی سے معمولی خیال کو اس دلکش انداز سے ادا کرے کہ سننے والے پر ایک کیفیت طاری ہو جائے حافظ کو دیکھو ان کے خیالات میں فلسفیانہ دقت اور نکتہ آفرینی بہت کم نظر آتی ہے۔ (باقی آیندہ)

# حیات وماوراحیات

اس دور کے علمارِ طبعیات میں، سر آلیور لاج بڑے مرتبہ کا شخص سمجھا جاتا ہے اور اس نے حیات بعدالموت کے متعلق جو علمی تحقیقات کی ہے، وہ خواہ کتنی ہی ناقص و نامکمل کیوں نہ ہو، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ وہ "خیال وقیاس" کا اتنا ضخیم دفتر اپنے بعد چھوڑ گیا ہے کہ اس کو ٹھکرا کر آگے گزر جانا آسان نہیں۔ وہ نہ صرف اس بات کا قایل تھا کہ مرنے کے بعد روح قایم رہتی ہے، بلکہ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ روح کا تعلق دُنیا اور اہلِ دنیا سے باقی رہتا ہے اور وہ اپنے تاثرات سے بھی مطلع کرتی رہتی ہے، چنانچہ اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے اپنے مرنے والے بیٹے کی روح سے گفتگو کی۔

بہرحال اس نے کسی روح سے واقعی گفتگو کی ہو، یا یہ خود اس کا استہوارِ ذاتی[1] (Auto Suggestion) ہو اس کے نظریوں کا مطالعہ لطف سے خالی نہیں، ظاہر ہے کہ وہ اپنے اعتقاد ویقین کی کوئی ایسی علمی توجیہ نہیں کر سکتا تھا جو انکار کی گنجایش نہ چھوڑے، اور اُس نے جو کچھ کہا ہے اپنے ذوق و وجدان کے لحاظ سے کہا ہے جس کا دوسرا نام (Common sense) ہے۔ اس لئے بحث وتنقید کے لئے اس سے زیادہ دلچسپ مشغلہ کوئی نہیں ہو سکتا کہ دوسرے کے ذوق کا مطالعہ اپنے ذوق کے لحاظ سے کیا جائے۔

وہ بھی دوسرے مفکرین کی طرح روح کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے سب سے پہلے کائنات کے معمہ کو حل کرتا

---

[1] عملِ مقناطیسی یا مسمریزم میں ایک عمل کا نام (Suggestion) ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شخص کو قوتِ ارادی سے اس حد تک متاثر کیا جائے کہ وہ عامل ہی کی خواہش کا پابند ہو جائے۔ اس کا اصطلاحی ترجمہ عربی میں عام طور پر استہواء کیا جاتا ہے جو اپنے معنی کے لحاظ سے پوری طرح اس لفظ کے مفہوم پر حاوی ہے ــــ (Auto suggestion) سے مراد خود اپنے ہی خیال سے متاثر ہو جانا ہے اس لئے اس کا ترجمہ استہوارِ ذاتی کیا گیا۔ (اڈیٹر)

چاہتا ہے اور جس وقت وہ اس حقیقت پر غور کرتا ہے کہ نوعِ انسانی نظام کائنات میں ایسے مختصر سیارہ کی رہنے والی ہے جس کو دوسرے اجرام سماوی کے مقابلہ میں کسی قسم کی کوئی اہمیت حاصل نہیں، تو دفعتاً اس کا خیال کائنات کی عظمت کے ساتھ ہی ساتھ انسانی عظمت کی طرف بھی منتقل ہوتا ہے اور اس کا دل قبول کرنا نہیں چاہتا کہ جس قوت نے یہ سب کچھ کیا ہے وہ اسے یوں دفعتہً فنا کر دے۔

اس رنگ کے سوچنے والوں کی رفتارِ خیال یہ ہوتی ہے :-

۱- انسان باوجود اس قدر ترقی کر جانے کے بھی ہنوز انتہائی مدارجِ ارتقا تک نہیں پہونچا لیکن امتدادِ زمانہ کے ساتھ یقیناً اس کو منزلِ حقیقی تک پہونچنا ہے، کیونکہ اگر یہ تسلیم نہ کیا جائے تو پھر غایت آفرینش کوئی نہ رہیگی اور یہ سب کچھ فعلِ عبث قرار پائے گا۔

۲- اگر انسان کی دُنیاوی زندگی کو دیکھا جائے تو وہ ستر، اسّی سال سے زیادہ نہیں ہیں جو اوقیانوسِ زمانہ کو دیکھتے ہوئے ایک قطرہ کے لاکھویں حصہ سے بھی کم ہے، پھر کیا انسان کو یہ عقل و فراست صرف اس لئے دیگئی ہو کہ وہ چند سال تک زندہ رہکر فنا ہو جائے اور مرنے کے بعد اس کا کوئی مستقبل متعین نہ ہو۔

۳- زندگی آتی ہے، کہاں سے ؟ کسی کو معلوم نہیں، چلی جاتی ہے، کہاں ؟ اس کی بھی خبر نہیں۔ پھر کیا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کسی شخص کا وجود عبادت ہے صرف اس مختصر مدت سے جو اس آنے جانے کے درمیان بسر ہوتی ہے۔ یقیناً نہیں، بلکہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دنیاوی حیات کوئی ایسا سلسلہ ہے جو دو چیزوں کو ملاتا ہے جن میں سے ایک ازل اور دوسری ابد ہے۔

۴- عالم طبیعی کی کوئی چیز فنا نہیں ہوتی، صرف اس کی صورتیں یا حالتیں بدلتی رہتی ہیں جن کو ہم اپنے حواس سے محسوس نہیں کر سکتے۔ اسی طرح انسان بھی مرنے کے بعد فنا نہیں ہو جاتا، بلکہ اس کے وجود کی حیثیت بدل جاتی ہے جنھیں حواس ظاہری کے علاوہ کسی اور حس سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اور جب تجربہ سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ مرنے کے بعد انسانی روح سے مخاطبت ممکن ہے تو پھر یہ مسئلہ ظن و تخمین کا نہیں رہتا بلکہ واقعہ و حقیقت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

۵- ہم ایتھر کے قایل ہیں، مادہ و قوت کے باہمی تفاعل کو مانتے ہیں، درانحالیکہ ہم کو نہ ایتھر نظر آتا ہے اور نہ کیفیت تفاعل محسوس ہوتی ہے۔

آج حرارت و نور، برق و کہربا، حرکت و مرونت وغیرہ تمام طبیعی کیفیات حقایقِ مسلمہ میں داخل ہیں، لیکن کیا

کوئی شخص اُن کی حقیقت کی علمی توجیہہ و تعلیل کر سکتا ہے؟

بعض علمار حیات کا دعویٰ ہے کہ عقل و زندگی دونوں مادہ کے وظایف میں سے ہیں، پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ مرنے کے بعد، جسم سے علٰحدہ ہونے کے بعد اس زندگی کی نوعیت بدل جائے جو اس وقت ہماری سمجھ سے باہر ہو؟

---

الغرض وہ لوگ جو معاد کے قایل ہیں اُن کی طرف سے اسی قسم کے دلایل پیش کئے جاتے ہیں، جن کا اگر تجزیہ کیا جائے تو سب کا عنصر مشترک اعتراف "جہل و لاعلمی" کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے گا۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہنا چاہئے کہ ان کے دلائل کی بنیاد صرف اس خیال پر قائم ہے کہ جس طرح ہمیں کچھ علم نہیں کہ اس وقت یہ سب کچھ کیونکر ہو رہا ہے، اسی طرح ہم نہیں کہہ سکتے کہ آئندہ جو کچھ ہوگا کیونکر ہوگا یعنی اگر انسان اس دنیا میں اپنے مادی جسم کے ساتھ زندہ رہتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ جسم فنا ہونے کے بعد بھی اس کی زندگی کسی اور صورت سے قایم رہے۔

وہ سر آلیور لاج ہوں، یا کینن ڈایل یا کوئی اور شخص علمی دُنیا میں اس کے علاوہ کوئی اور دلیل معاد کے ثبوت میں پیش ہی نہیں کی جا سکتی اور چونکہ اس نوع کے دلایل جن میں صرف امکان سے بحث ہوتی ہے مخاطب کے لئے باعث تسکین نہیں ہوا کرتے، اس لئے اُنھوں نے عملی طور پر بھی وجود روح کو ثابت کرنے کی کوشش کی اور یہاں حد تک دعویٰ کر بیٹھے کہ وہ روحوں سے گفتگو کرتے ہیں، روحیں اُن سے گفتگو کرتی ہیں اور حیات بعد الموت کا بھی تقریباً وہی نظام ہے جو اس دنیا کے عالم حیات کا ہے۔ یعنی جسم سے جدا ہونے کے بعد روحیں محبت کرتی ہیں، نفرت کرتی ہیں، کھاتی ہیں، پیتی ہیں، چلتی پھرتی ہیں اور جو تصویریں ارواح کی شائع ہوئی ہیں اُن سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ریشمی کپڑے بھی پسند کرتی ہیں، ٹیڑھی مانگ بھی نکالتی ہیں اور اونچی ایڑی کا جوتا بھی پہنتی ہیں۔

اس لئے جب معاملہ عقلی نظریوں سے گزر کر اس حد تک حواسِ ظاہری کے ماتحت آجائے تو پھر سوائے تسلیم کر لینے کے کیا چارہ ہے، اگر سوال یہ ہو کہ کیا روحوں سے گفتگو کرنے اور اُن کے ظاہر ہونے کے جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں وہ واقعی صحیح ہیں؟ کیا حقیقتاً جو صورتیں ہمیں نظر آتی ہیں یا جو آوازیں کان میں آتی ہیں وہ روحوں ہی کی ہیں؟

اس باب میں کافی تحقیق ہو چکی ہے اور نتیجہ یہ نکلا ہے کہ سو میں اسّی دعوے کرنے والے تو بالکل جھوٹے ہیں، باقی ۲۰ میں دس ایسے ہیں جو قوت مقناطیسی سے کام لیکر دوسروں کو فریب نظر میں مبتلا کر دیتے ہیں اور دس وہ ہیں جو اپنے اعتقاد و یقین سے مسحور ہو گئے ہیں۔

پھر اگر آیو رلاج وغیرہ کی انتہائی رعایت کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ ان کا شمار اسی آخر الذکر جماعت میں کیا جائے اور ان کو "سودازدہ" سمجھ کر معاف کر دیا جائے۔

اگر روحوں کو جسم سے جدا ہونے کے بعد بھی انھیں تمام منازل حیات سے گزرنا ہے جو تعلق جسم کی حالت میں ان کو پیش آئے تھے، تو پھر اس تغیر و تبدل کے معنی کیا ہوئے۔ اس دُنیا میں اس جسم کے ساتھ انھیں کیوں نہ باقی رہنے دیا گیا اور قدرت نے کیوں فضول اتنی زحمت گوارا کی۔

البتہ عقلی توجیہہ کے سلسلہ میں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، یہ امر ضرور غور طلب ہے کہ جب مادی دُنیا کی کوئی چیز فنا نہیں ہوتی بلکہ مختلف صورتیں اختیار کرتی رہتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ روح کو فانی کہا جائے۔ مگر گفتگو سب سے پہلے اس باب میں ہونی چاہئے کہ جس کا نام ہم نے رُوح رکھا ہے وہ بجائے خود کوئی جوہر ہے یا صرف عرض ہے، یعنی اس کا کوئی وجود علیحدہ پایا جاتا ہے یا اک کیفیت کا نام ہے جو عناصر کے امتزاج سے پیدا ہوتی ہے مثلاً یوں سمجھئے کہ ہم جسوقت پانی میں شکر حل کر دیتے ہیں تو پانی میں ایک کیفیت حلاوت و شیرینی کی پیدا ہو جاتی ہے، لیکن شیرینی کوئی علحدہ مستقل چیز تو نہیں، اگر ہم پانی سے شکر کو پھر علحدہ کر دیں تو یہ کیفیت جاتی رہیگی۔ پھر اگر کوئی یہ سوال کرے کہ اس حالت میں شیرینی کہاں چلی گئی تو اس کا جواب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ پانی اور شکر کے جدا جدا کر دئے جانے سے فنا ہو گئی۔

بالکل یہی صورت روح کی ہے کہ بعض مادی اجزاء کے باہمی تفاعل یا عناصر کے امتزاج سے ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کا نام زندگانی یا روح ہے اور جب وہ امتزاج باقی نہیں رہتا تو وہ کیفیت بھی فنا ہو جاتی ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ اس میں کونسا استحالۂ عقلی ہے اور ایسی معمولی بات کے سمجھنے میں کیوں پس و پیش ہوتا ہے۔

اب رہ گیا یہ سوال کہ اگر انسان کی آفرینش کا مقصد صرف یہی تھا کہ وہ چند دن کی عارضی زندگی بسر کر کے فنا ہو جائے تو اس کے پیدا کرنے ہی کی کیا ضرورت تھی، سو یہ سوال بجائے خود اتنا لغو و مہمل ہے کہ ہر شخص ادنیٰ تامل کے بعد اس کی لغویت کو سمجھ سکتا ہے۔

اگر یہ صحیح ہے کہ کائنات کی بنانے والی کوئی ایسی قادر مطلق ہستی ہے جسے خدا کہتے ہیں تو اس کی حقیقت و عظمت کو سامنے رکھکر یہ کہنے میں مطلق تامل نہیں ہو سکتا کہ اس کے نزدیک ایک کیڑا جو فراست و تعقل سے بالکل بے بہرہ ہے اور ایک انسان جو فہم و عقل کا پتلا ہے دونوں برابر ہیں اور اگر روح کے فانی تسلیم کرنے کی حالت میں خدا پر یہ الزام عاید ہو سکتا ہے کہ اس نے انسان کو پیدا ہی کیوں کیا تو ایک کیڑے کی طرف سے بھی یہ احتجاج ہو سکتا ہے کہ عقل و فہم سے بیگانہ رکھنا تھا تو کیوں وجود سے عدم میں لایا۔ اس قسم کے دلایل حقیقتاً کوئی وزن نہیں رکھتے کیونکہ

ان کا تعلق ان معتقدات اور محسوسات سے ہے جو صرف "امکان" کی بنیاد پر قائم ہیں اور حقائق کی جستجو کرنے والوں کے نزدیک محض "ممکن ہونا" کوئی چیز نہیں۔ کیونکہ امکان میں جتنی گنجائش اثبات کی ہے، اتنی ہی "نفی" کی بھی ہے۔

اب رہگیا بحث کا یہ پہلو کہ جب مادی دنیا کی کوئی چیز فنا نہیں ہوتی تو روح کو کیوں فانی مانا جائے، اس میں بھی بحث مغالطۂ منطقی پایا جاتا ہے، کیونکہ جب روح بجائے خود کوئی مستقل مادی چیز نہیں ہے تو پھر اس کا دوسری مادی اشیاء کے ساتھ کیوں ذکر کیا جائے وہ صرف اک کیفیت کا نام ہے اور کیفیات کا فنا ہوجانا ہر شخص کے نزدیک مسلّم ہے۔

انسان میں مادی چیز اس کا جسم ہے سو اسکے اجزاء بیشک فنا ہونے والے نہیں، وہ ضرور کسی نہ کسی حالت و کیفیت میں پائے جائیں گے۔ جب تک انسان زندہ ہے اس جسم میں ایک کیفیت ایسی پائی جاتی ہے جسے زندگانی یا روح سے تعبیر کرتے ہیں اور جب وہ کیفیت باقی نہیں رہتی (خواہ اس کا کچھ سبب ہو) تو اجزاء میں انحلال ہوکر وہ دوسری صورت قبول کر لیتے ہیں۔

جب جسم زیر زمین دفن کردیا جاتا ہے تو اس کے اجزاء کیڑوں میں تبدیل ہوجاتے ہیں، یعنی اس کا جسم فنا تو نہیں ہوتا لیکن وہ صورت دوسری اختیار کرلیتا ہے۔ پھر ان کیڑوں کو دوسرے بڑے کیڑے کھا لیتے ہیں، ان کیڑوں کو چڑیاں ہضم کرجاتی ہیں، چڑیوں کو دوسرے جانور کھا جاتے ہیں اور اسی طرح ازل سے یہ سلسلہ انحلال و تفاعل کا جاری ہے۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں کوئی چیز ہمیں یہ تسلیم کرنے پر مجبور نہیں کرتی کہ روح کا وجود علیحدہ پایا جاتا ہے اور جسم سے جدا ہونے کے بعد اس کے لئے بھی حیز زمان و مکاں کی ویسی ہی ضرورت ہے جیسی دوسری مادی اشیا کیلئے اگر یہ کہا جائے کہ اس کی بقاء کے لئے مکان و زماں کی ضرورت نہیں تو پھر وجود کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا اور یہ لفظ مہمل ہوکر رہجاتا ہے۔

بقاء روح و معاد کا خیال مذہب کا پیدا کیا ہوا ہے اور وہ صرف یہی نہیں کہتا کہ روح باقی رہتی ہے بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ روح پھر جسم انسانی میں داخل کی جائے گی اور قیامت کے دن وہ سب اُٹھ کھڑے ہوں گے۔

آئیے ذرا ریاضی کے نقطۂ نگاہ سے اس مسئلہ پر غور کریں۔

کرۂ زمین پر انسانی آبادی کا وجود ۵ لاکھ سال سے پایا جاتا ہے لیکن اگر اس میں مبالغہ سمجھا جائے تو آئیے ڈھائی لاکھ سال فرض کرلیں۔

اس وقت آبادی ........ ۷ ۴ ۷ انفوس پر مشتمل ہے اور اموات کی تعداد سالانہ ۶۹۸۱۳ ۳۴۳ ہوتی ہے۔

اگر گزشتہ ڈھائی لاکھ سال کے اموات کا حساب لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت عالم برزخ میں کم از کم ۳۲۵۵۳۲۵۴۸۰۱۰۰۰۰۰ روحیں چکر لگا رہی ہیں اور اگر روح کے لئے کم از کم ۱/۸ انچ کے برابر جگہ درکار ہو تو اسوقت تک روحوں نے اتنی جگہ گھیر رکھی ہے کہ اگر ان کو برابر برابر بطور فیتہ طیار کیا جائے تو ۹۰۷۰۹۳۱۴ میل ہوگی اور ۹۹ مرتبہ چاند اور زمین کے درمیان اسے لپیٹ سکیں گے اور اگر ان روحوں کو جمع کر کے کوئی ستون یا مینار بنایا جائے تو ۹۱۱ میل لمبا مینار بنے گا جسکے چاروں ضلع میں سے ہر ضلع ۶ ۱/۴ میل کا ہوگا

یہ حساب تو اسوقت تک کی روحوں کا ہوا، آیندہ معلوم نہیں کب تک کرۂ ارض قائم رہیگا اور یہ ہجوم ارواح کس حد تک پہونچے گا۔

کہا جاتا ہے کہ بچھڑی ہوئی روحیں وہاں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ لیکن کیا یہ کہنا بالکل ایسا نہیں ہے جیسے آپ کسی ریگستان کے تمام ذروں کو ہوا میں منتشر کر کے کسی ایک ذرہ سے یہ کہیں کہ جاؤ اور اس ذرہ کے ساتھ مل جاؤ جس کے پاس سے تم کو اٹھایا گیا تھا۔

اب اسی کے ساتھ اس اعتقاد کو بھی شامل کیجئے کہ حشر بالاجساد ہوگا یعنی اس دنیا میں جس جسم کے ساتھ روح متصل تھی وہ جسم پھر پیدا کیا جائے گا تو کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس کے لئے کتنی وسیع فضا کی ضرورت ہوگی اور کتنی کرور زمینوں کے برابر چٹیل میدان اس کے لئے درکار ہوگا۔

حیرت ہے کہ بقاء روح کو مان کر اس قسم کے مضحک خیالات خدا سے وابستہ کرنے میں تو تامل نہیں ہوتا لیکن سیدھی سی یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ، جو خدا ایک بار عدم سے وجود میں لایا ہے وہ پھر وجود سے عدم تک پہونچا سکتا ہے۔

# مکتوبات نیاز

آپ پوچھتے ہیں کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں ؟ معلوم نہیں میری زندگی کے کس پہلو کو سامنے رکھکر آپ نے یہ سوال کیا ہے۔

اگر مقصود میری لٹریری زندگی ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ

ساختہ ام خامہ زبانِ پری

اگر مدعا میرے جمالیاتی ذوق کو معلوم کرنا ہے تو یہ کہنا حقیقت کے خلاف نہ ہوگا کہ

غازہ نہم بر رخ خورشید و ماہ

اور اگر مراد یہ ہے کہ میرے تاثرات کا صحیح علم آپ کو حاصل ہو تو مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ

آتش بے دود فرو زندہ ام

گو بزحقیقت کے ذکر سے قصداً احتراز کرتا ہوں کیونکہ آج نہیں تو کل ساری دنیا کے ساتھ آپ خود میرے

"نیاز آخر الزماں"

ہونے پر ایمان لے آئیں گے۔ نیاز

---

خدا جانے وہ کون تھا جس نے یہ رسم ڈالی کہ کسی کو خط لکھو تو ابتداء "القاب و آداب" سے کرو، تمھیں بتاؤں کہ تم کو کیا لکھوں، مجھ سے بڑے ہوتے تو قبلہ و کعبہ لکھدیتا، چھوٹے ہوتے تو عزیز با تمیز لکھدیتا، گو تکلف سے۔ برابر کے دوست ہو اور اُس وقت کے جب ہماری اور تمھاری روحوں کے علاوہ اور سب نے "قالوا بلیٰ" کہا تھا پھر اگر میں نے کبھی اپنے آپ کو مخاطب کرنے کے لئے کوئی لفظ استعمال کیا ہو تو تمھارے لئے بھی استعمال کردوں خیر ہماری یہ تمہید اس لئے ہے کہ آیندہ سے نہ تم میرے "مکرم و محترم" ہو اور نہ میں تمھارا "مطاع و معظم"، نہ تم کچھ نہ میں کچھ۔

اچھا اب خط شروع ہوتا ہے اور براہ راست ڈانٹ سے یعنی میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم کو کس احمق نے مشورہ دیا کہ نگار اُن کو دکھاؤ اور اپنے ساتھ مجھے بھی گالیاں سنواؤ۔ غالب عرصہ ہوا محاکمہ کر چکا ہے کہ

مے بزہاد مکن عرض کہ ایں جوہر ناب
پیشِ ازیں قوم بہ شورابۂ زمزم نہ رسد

تم کو ہنوز اس قوم پر اعتبار باقی ہے۔

بہر حال وہ تو جو کچھ ہونا تھا، ہو چکا، لیکن اب مجھے ذرا تفصیل سے لکھو کہ نگار کے مطالعہ کے بعد انکی پیشانی پہ کتنی شکنیں پیدا ہوئیں، کس قسم کی گالیاں صرف فرمائیں اور کف آلود ہونٹوں نے ریش مبارک کو کتنا تر کیا۔

اللہ، اللہ، یہ بھی کیا لوگ ہیں۔ صرف احمق ہوتے تو خیر "اہل جنت" میں شمار ہو جاتا، لیکن جبث باطن کا کیا علاج جو یہاں بھی انھیں "آتش زیر پا" رکھتا ہے اور وہاں بھی "آتش در شکم" بنائے بغیر نہ رہیگا اگر واقعی دوزخ کوئی چیز ہے اور "اکل حرام" قابل تعزیر۔ میری طرف سے مولانا کی مزاج پرسی کر دو اور پوچھ لو کہ اگر در توبہ ابھی بند نہ ہوا ہو تو حاضر ہوں۔

نیاز

---

بندہ نواز ـــ مکرمت نامہ کا شکریہ ادا کروں تو کس زباں سے، نہ ادا کروں تو کس دل سے؟ ہر چند آپ کو نہ اسکی ضرورت نہ اِس کی پرواہ، لیکن میں اتنا بھی مجبور نہیں کہ مجبوری کا اظہار نہ کر سکوں۔

من چہ در پائے تو ریزم کہ سزائے تو بود
سر نہ چیزے ست کہ شایستۂ پائے تو بود

دُنیا میں لطف و کرم نئی چیز نہیں رافت و محبت گوگردِ احمر نہیں، اُلفت و ہمدردی پر عنقا نہیں۔ لیکن ایک چیز اور ہے جسے "ادا" کہتے ہیں، پھر بتائیے کہ ایسے لوگ جو احسان کرکے خود زیر بار احسان ہو جائیں کہاں ہیں؟ یہ تو خیر از راہِ رسم کہئیے یا برہنائے "جذبۂ شوق" لکھنے کو لکھ گیا، مگر اب یہ بتائیے کہ میں کیا کروں؟

آپ میری فطرت سے پوری طرح آگاہ ہیں کہ

برسرم ز آزادی سایہ را گرانیہاست

اور اسی کے ساتھ "پرکاہ" پر "کوہ شکنی" سے بھی باز نہیں آتے، یہ کیا تماشہ ہے۔ اگر سوال رد و قبول کا ہوتا تو کوئی بات نہ تھی لیکن جب زہر پی لینے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو تو کیا مجھے یہ پوچھنے کا بھی حق حاصل نہیں کہ

درگُشتنِ من اینہمہ بیباک چرائی

رہا ہوں کہ اس کے جواب میں اب کوئی اور تیر نہ صرف کر دیں۔

زیر بارِ کرم
نیاز

---

اے صاحبِ مکارمِ اخلاق کردگار!

یہ غالباً چوتھا عریضہ ہے جو خدمتِ گرامی میں پیش کر رہا ہوں اور جانتا ہوں کہ اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو پچھلے طول کا ہوا۔

ہرچہ از گریہ فشاندیم بہ نشمردن ریخت
ہرچہ از نالہ رساندیم نہ شنودن رفت

لیکن تسکین ہے تو صرف اس خیال سے کہ یہ عریضہ جواب کی توقع سے نہیں بلکہ اعلان "قطعِ امید" کے طور پر لکھ رہا ہوں اور آپ کی اس طویل خاموشی یا مسلسل بے اعتنائی کا جواب میری جانب سے زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا تھا۔

عمرت دراز باد فراموشکارِ من ؟

نیاز

---

بسوز غالب آزردہ را و باک مدار
بشرطِ آنکہ تواں گفت نامسلمانش

جتنا چاہو ظلم کرو، جس قدر جی میں آئے ستاؤ، لیکن خدا کے لئے یہ تو بتاؤ کہ یہ اس کا سزاوار تھا یقیناً تم معشوق ہو، محبوب ہو، لیکن کیا یہ کاروبار بغیر "دشنۂ و خنجر" کے چلتا ہی نہیں ؟

نظرِ بد دور، میں تمھیں ٹوکتا نہیں، کیونکہ شہر میں تمھیں اک قاتل رہ گئے ہو، بلکہ یونہی بر سبیل تذکرہ سرسری طور پر، دوراروی میں، پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا واقعی تمھاری نیت خراب ہے

ایک لطیفہ سنو — ایک بار شہنشاہ اکبر محل کے زینہ پر چڑھ رہا تھا اور بیربل بھی پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ اکبر نے جو اس وقت کسی قدر مغموم تھا پلٹ کر بیربل سے کہا کہ اگر اوپر کوٹھے تک پہونچتے پہونچتے تم مجھے نہ ہنسا سکے، تو قتل کرڈالوں گا۔ بیربل نے اپنے لطائف و ظرائف شروع کئے اور اکبر آہستہ آہستہ زینہ طے کرنے لگا۔ لیکن کسی بات پر اس کو ہنسی نہ آئی آخر جب

صرف ایک زینہ رہگیا اور اکبر کو کسی طرح ہنسی نہ آئی تو بیربل نے گھبرا کر نہایت بھیانک آواز میں اکبر سے مخاطب ہو کر کہا کہ "او ہمایوں کے بچے کیا سچ مچ تو مجھے آج ہی مار ڈالے گا" اکبر یہ سنکر ہنس پڑا اور بیربل کی جان بچ گئی۔

تو اس طرح میں بھی تم سے پوچھتا ہوں کہ کیا واقعی تم مجھے ہلاک ہی کر ڈالو گے اور میری ایک نہ سنو گے۔ اسکے جواب میں اکبر کی طرح تم نہ ہنس پڑنا کیونکہ اس کی ہنسی سے تو خیر بیربل کی جان بچگئی تھی، لیکن یہاں تو خاتمہ ہی ہو جائیگا ہاں ہاں کہو کہ میں تم کو بناتا ہوں۔ مگر میں کبھی نہ کہوں گا کہ تم نے ظلم کر کے میرا کیا بگاڑ لیا۔ یاد رکھو ایک ایک منٹ کی خبر مجھے پہونچتی ہے، تمہاری محفل میں میرا گذر نہیں، تمہاری تنہائیوں میں میرا کوئی حصہ نہیں، لیکن تمہاری جلوت و خلوت دونوں کا حال مجھ پر آئینہ کی طرح روشن ہے۔ رقیبوں ہی میں سے ایک کو راز دار بنا رکھا ہے۔ تم بغیر پوچھے "ایمن" کا نام لے دوگے، اچھا ہے، جتنی سزا بھی اس کو ملے کم ہے۔ کمبخت یہاں سے گیا تو ملا تک نہیں۔

نیاز

---

یہ جو تمام دنیا میں ۳۰ سال تک خستہ و خوار پھرنے کے بعد آپ کو گھر بسانے کا سودا ہوا ہے، سو کیوں؟ اگر "شایانِ دست و بازوِ قاتل" نہیں رہے تو پھر قاتل کی جستجو کیوں اور اگر یہ بات نہیں ہے تو پھر اسوقت تک جو کرتے رہے ہو وہی اب بھی کرو۔ دم کیوں توڑے دیتے ہو، ہاتھ پاؤں کیوں ڈھیلے ہوئے جا رہے ہیں؟

آپ نے جو شرائط شادی پیش کئے ہیں وہ اس سے زیادہ عجیب و غریب ہیں۔ یعنی آپ کو ایک ایسی عورت چاہئے جو حسن میں کوہ قاف کی پری ہو اور دولت میں راکفلر یا فورڈ کی بیٹی۔۔ خیال اچھا ہے، کیونکہ تم بھی تو اپنی بدصورتی اور افلاس میں جواب نہیں رکھتے، ہوش میں آؤ کیوں دماغ خراب ہوا ہے۔ اول تو ایسی عورت ملنا محال ہے اور اگر مل بھی گئی تو وہ مجھے چھوڑ کر تمہارے پاس کیوں جانے لگی۔ یاد رکھو بدصورت مرد کے لئے حسین بیوی سے زیادہ دنیا میں کوئی عذاب نہیں، اگر اس کو تم سے محبت نہ ہوئی (اور محبت ہونے کی کوئی وجہ نہیں) تو اس عذاب میں مبتلا رہو گے کہ خدا جانے کب تمہیں چھوڑ بیٹھے اور اگر محبت ہوگئی تو ہمیشہ اس کے غلام بنے رہو گے، کیونکہ یہی ایک صورت تمہارے لئے اعتراف محبت کی ہو سکتی ہے۔

اگر آزادی ایسی ہی ناگوار ہے، تو کوئی عورت معمولی شکل و صورت کی ڈھونڈھو، جو تمہاری قدر کرے، اور تم آئینہ میں اپنا بھی منہ دیکھ سکے۔ جھونپڑے میں رہنا اور محلوں کا خواب دیکھنا سراسر حماقت ہے —

نیاز

مطالعے الاجل -

آپ نے اچھا کیا کہ عزیزہ سلمہ کو سب سے پہلے فارسی شروع کرادی - نصاب کے متعلق کیا عرض کروں، سوائے اس کے کہ اصولاً میرے نزدیک پہلے کلاسکل فارسی پر عبور ہوجانا ضروری ہے، جدید فارسی علوم وفنون کے لحاظ سے خواہ کتنی ہی توقعات اپنے اندر رکھتی ہو، لیکن نہ جمالیاتی ذوق اس سے تحریک میں آتا ہے نہ فنی تکمیل ہوتی ہے۔ رہی نزاکت خیال سو اس کا اس زمانہ میں ذکر ہی کیا - ایران اسوقت خالص سیاسی راہوں سے گزر رہا ہے اور اس کو سوائے اقتصادیات پر توجہ کرنیکے اور کوئی کام فی الحال نہیں کرنا، اس لئے ہندوستان میں بیٹھکر صرف ایران جدید کے لٹریچر کا مطالعہ کرنا اور فارسی انشاء کی تکمیل کی توقع رکھنا بیکار ہے۔

آپ انشاء بہار عجم کے بعد گلستاں شروع کرادیجئے (گو یہ کتاب پختہ عمر میں دیکھے جانے کے قابل ہے) اسکے بعد پنج رقعہ، شبنم شاداب، رسایل طغرا، سہ نثر ظہوری اور ابوالفضل، نظم میں سکندر نامہ کے ساتھ جستہ جستہ شاہنامہ پڑھانا بھی ضروری ہے۔ غالب کی مثنویاں، عرفی وخاقانی کے قصائد بھی نگاہ سے گزرنا چاہئے - بدر چاچ کو لوگ نظر انداز کردیتے ہیں، حالانکہ وہ بھی اپنی جگہ ایک چیز ہے۔ دواوین میں سعدی، فیضی، خسرو، حافظ و نظیری کا مطالعہ ہونا چاہئے۔ صنائع و بدائع میں اعجاز خسروی خاص چیز ہے لیکن اس کے پڑھانے والے ایران میں بھی نہیں ہندوستان کا کیا ذکر - اخیر عہد میں صرف ایک صہبائی تھے، جن سے اعجاز خسروی پڑھنے کے لئے ایران کا ایک شہزادہ ہندوستان آیا تھا - میرے والد نے بھی اس کتاب کو صہبائی سے پڑھا تھا اور میں نے اپنے والد سے، پھر جب یہ تمام مواقف طے ہو جائیں اور نزاکت تخئیل سے لطف اُٹھانے کی پوری اہلیت پیدا ہو جائے تو بیدل کا مطالعہ کرنا چاہئے، جو اپنے سوا تمام لٹریچر سے انسان کو بے نیاز بنا دیتا ہے۔

فارسی کی تکمیل کے ساتھ ساتھ عربی ضروری ہے کیونکہ کلاسکل فارسی میں اس کا عنصر غالب ہے، لیکن عربی کے معنے منیتہ المصلی، شرح وقایہ، ہدایہ، اور مشکوٰۃ نہیں ہے۔ بلکہ قواعد ولغت، ادب و انشاء کی تکمیل ہے۔ جب اسمیں کچھ درک پیدا ہو جائے تو علوم مغرب کی طرف متوجہ کیجئے کہ بغیر ان کے حاصل کئے ایک آدمی مولوی، راہب، صوفی، زاہد، عاشق، گدا اگر سبھی کچھ بن سکتا ہے، لیکن انسان نہیں بنتا اور نہ اس کی ذہنی غلامی دور ہوتی ہے۔ قرآن کا مطالعہ عربی کے ساتھ ساتھ ہونا چاہئے، ابتدا میں بچوں کو کلام مجید پڑھانا سخت اصولی غلطی ہے کیونکہ اس کے مطالب نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے بچہ کا دماغ مشوش ہو جاتا ہے اور نہایت ہی مہلک قسم کی مقلدانہ ذہنیت پیدا ہونے لگتی ہے حتٰے کہ کلام مجید کا مفہوم صرف جزودان و رحل رہجاتا ہے یا پھر اسکی آیتیں زعفران

سے لکھ لکھ کر لوگوں کو بلانا۔ مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ بھی ازبس ضروری ہے اور فن حدیث کی تنقیدی تحقیق بھی، لیکن یہ باتیں بعد کی ہیں جب، ہم سے عمر متجاوز ہو جائے۔

ساتھ ہی ساتھ آپ ہندی بھی پڑھائیے اور تھوڑی سی سنسکرت بھی کیونکہ ہندوستان میں رہ کر مسلمانوں کا ہندوؤں کے کتابوں اور اُن کے علوم سے بے خبر رہنا، ناقابل معافی غلطی ہے۔ اور یوں بھی جب فلسفہ و تصوف کا مطالعہ کیا جائے گا تو ہندوؤں کا لٹریچر دیکھنا ناگزیر ہے۔ قرآن کے ساتھ ساتھ گیتا و انجیل کو نظر انداز نہ کیجئے اور جب آپ اپنے بچہ کو نماز روزہ کا درس دیں تو اسی کے ساتھ یہ بھی ذہن نشین کیجئے کہ ہندوؤں کا ناقوس و مندر بھی قابل احترام چیزیں ہیں اور رام و کرشن بھی اپنے زمانہ کے پیغمبر تھے جو ہندوستان میں مبعوث ہوئے تھے۔ مدعا یہ کہ تعلیم کے ساتھ تربیت کا خیال بھی ضروری ہے تاکہ مذہبی تنگ نظری نہ پیدا ہو۔

اگر یہ تمام مراحل آپ کے لئے دشوار گزار ہیں تو عزیز کو میرے پاس بھیج دیجئے، لیکن یہ آپ کیوں کرنے لگے جبکہ آپ کے پیر کے نزدیک میرا احول بھی اس قدر سخت کفر آلود ہے کہ کسی ایسے شخص کے حق میں جو میرے پاس اُٹھتا بیٹھتا ہے ان کی دعا بھی کارگر نہیں ہو سکتی۔ آپ نے دیکھا یہ ہیں بلند مرتبے میری نامسلمانی کے، آپ کیوں ایمان لانے لگے۔

نیاز

---

تم تو ہو بالکل وہ ، یہاں تو عاشقی میں وہ زور و طنطنہ تھا کہ جب تک بنی بنی، اور جب نہیں بنی تو تم کو معلوم ہے میں نے کیا کیا؟

دل را بزور از کفِ دلبر گرفتہ ایم

ہر چند تم ایسے لجوج ، خاکسار، فدوی قسم کے عاشق سے جو معشوق کے حضور میں اس حد تک "زمیں دوز" ہو جانا پسند کرے کہ نقش قدم سر سے گزر جائے، اس جرأت کی توقع رکھنا لاحاصل ہے، تاہم اس خیال سے کہ ہاشمی خون تمہاری رگوں میں دوڑ رہا ہے، غیرت دلاتا رہتا ہوں، ممکن ہے کسی وقت بپھر جاؤ اور اس عذاب سے نجات حاصل کر سکو

ماشاءاللہ سن وقوف کو پہونچ گئے ہو، عمر طبعی نصف سے زائد ختم ہو چکی ہے، علائق کا بار بھی کم نہیں، فرض شناسی کا بھی مدعی ہو اور دنیا کی تمام باتوں میں طبیعت پر جبر کر سکتے ہو، لیکن اس باب میں تم طفل شیر خوار بنے ہو۔

میں تم سے زیادہ اس کی فطرت سے واقف ہوں۔ شاید ہی کوئی دوسرا محبت ناشناس ایسا پیدا ہوا ہو۔

اب بھی وقت ہے کہ اس حقیقت کو جان کر، دامن بچا جاؤ، موج خون سر سے گزر جانے کے بعد اگر ہوش آیا بھی تو کیا ہوگا۔

نیاز

---

صدیقی — غزل پہونچی۔ کیا کہنا، اسی کو کہتے ہیں:۔

نہ دل جستہ و با دل آویختہ

ہر چند میں شعر و سخن سے بیگانہ ہو گیا ہوں، لیکن جب کوئی شعر، واقعی شعر، نگاہ سے گزر جاتا ہے تو اب بھی بیتاب ہو جاتا ہوں۔ موجودہ دورِ تغزل معنی آفرینی کے لحاظ سے خواہ کچھ ہو، مگر کاروبارِ محبت سے بالکل اجنبی نظر آتا ہے۔

ایک مرتبہ میں اکبر مرحوم سے ملنے الہ آباد گیا۔ ان کا بالکل آخری زمانہ تھا اور عشرت منزل میں وہ اپنی تنہا سوگوارا زندگی بسر کر رہے تھے۔ میں اکبر کا بہت ادب کرتا تھا، ان کے شاعرانہ کمال کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ والد کے دوستوں میں سے تھے اور غدر کے بعد کانپور میں برسوں دونوں کا ساتھ رہا تھا۔ وہ بھی مجھ پر بزرگانہ شفقت صرف فرماتے تھے۔ انھوں نے اپنا مطبوعہ دیوان مرحمت فرماتے ہوئے کہا کہ:۔ "میں نے طباطبائی سے پوچھا کہ آپ کو سب سے بہتر شعر میرے دیوان میں کونسا نظر آیا۔ انھوں نے جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا:۔

دُنیا کی کیا حقیقت اور ہم سے کیا تعلق
وہ کیا ہے اک جھلک ہے، ہم کیا ہیں اک نظر ہیں

اب تم بتاؤ کہ تم نے کس شعر کو پسند کیا ہے:۔

میں نے عرض کیا کہ یوں تو سیکڑوں اشعار انتخاب میں آسکتے ہیں، لیکن وہ شعر جس کو ایک بار پڑھنے کے بعد میں کبھی نہیں بھولا اور نہ بھول سکتا ہوں یہ ہے:۔

آرزو دل میں ہے اک شخص سے ملنے کی بہت
نام کیا لوں، کوئی اللہ کا بندہ ہوگا

یہ سنکر اکبر سر پکڑ کر دیر تک خاموش رہے اور پھر بولے کہ:۔ "عمر میں بالکل پہلی مرتبہ تم ایسے شخص نظر آئے ہو جس نے اس شعر کا ذکر کر کے، میرے محبوب ترین دورِ شاعری کو یاد دلا دیا"

مدعا یہ کہ میرا مشرب، تغزل کے باب میں ذرا قدامت پسند واقع ہوا ہے اور تصوف و فلسفہ طرازی میری سمجھ سے باہر ہے۔ اسی لئے فارسی میں سعدی اب بھی میرا محبوب ہے اور اردو میں میر و درد پر جان دیتا ہوں۔

زبان کی ترقی کا مفہوم صرف یہ ہے کہ جذبات کو ان کے حقیقی رنگ میں ظاہر کرنے کی اہلیت اس میں پیدا ہوجائے، تصنع اور چوچلے کا میں قایل نہیں۔

میر خالص زبان ومحاورہ کی شاعری کرتا ہے تو بھی اس رنگ کی کہ

میر نہیں پیر تم ، بکاہلی اللہ رے !
نام خدا ہو جواں ، کچھ تو کیا چاہئے

لیکن آج کل کا شاعر جب لطف زبان پیدا کرنے گا تو اس سے آگے نہ بڑھے گا کہ

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے
اک ذرا، آپ کو زحمت ہو گی

میں نے جو آپ کے کلام کو پسند کیا تو اسی لئے کہ اس میں تصنع وآورد نہیں ہے، بیجا اپج نہیں ہے، واردات قلب ہیں جن کو آپ نے سادہ الفاظ میں ظاہر کردیا ہے۔

خدا کے لئے آپ اپنے اُستاد کی تقلید کبھی نہ کیجئے اور اگر عشق نہیں کرسکتے تو شاعری عشق کرنے والوں کی سی کیجئے۔

نیاز

---

# مکتوبات نیاز

کی کتابت شروع ہوگئی ہے، اس لئے نگار میں اب اس سلسلہ کو بند کردینا ہی مناسب ہے۔ اسوقت تک تقریباً ۱۵۰ خطوط شائع ہوچکے ہیں، لیکن ان سے کہیں زیادہ شائع ہونے کو ہیں جو اب کتاب میں درج کئے جائیں گے۔

یہ کتاب نگار کے نصف سائز پر تقریباً ۴۰۰ صفحات کو محیط ہوگی، اور جناب نیاز کی تصویر بھی اس میں شامل ہوگی۔

کاغذ اور کتابت وطباعت کا بھی خاص اہتمام پیش نظر ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

# دخترِ شش روز

وہ ہنوز مصروفِ استراحت تھی۔ ایک نیم عریاں عالم میں ـــــ گردن شانہ تک کھلی ہوئی تھی اور دونوں شانے نصف سینہ تک برہنہ تھے ـــ لبوں پر مسکراہٹ تھی، آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں، نرم مخملی تکیہ میں اسکے سر کے وزن سے ہلکا سا نشیب پیدا ہو گیا تھا، گویا یہ بھی مسکرا رہا تھا۔

وہ کچھ سوچ رہی تھی، شاید کوئی خواب دیکھا تھا، وہ کوشش کر رہی تھی کہ اس کی تعبیر معلوم کرے۔

داہنے ہاتھ کی نازک انگلیاں آبنوسی مسہری پر اس طرح چل رہی تھی گویا وہ پیانو بجا رہی ہے۔ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کچھ گنگنا بھی رہی ہے، بہت مدھم سروں میں ـــ صرف اپنے ہی لئے ـــ گنگنانا کیا ہے؟ ـــ جذباتِ جنسی کی دوشیزگی کو مبہم پیرایہ میں ظاہر کرنا!

اس کا دوسرا ہاتھ معطر، سیاہ ریشمی بالوں میں چھپا ہوا تھا، کتاں کی شبنمی رنگ کی چادر میں اس کا جسم لپٹا ہوا تھا، اور چونکہ چادر کے رنگ کو اس کے جسم کے رنگ سے علیحدہ کرنے والی کوئی چیز نہ تھی اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ بالکل عریاں تھی۔

اس نے جمائی لیتے ہوئے، ہلکی سی انگڑائی لی، اس کی آنکھوں میں ابھی تک نیند کا خمار باقی تھا، کیونکہ اپنی دوسری سالگرہ کا جشن منانے کے سلسلہ میں وہ رات کو بہت دیر میں سوئی تھی ـــ دوسری سالگرہ اس لئے کہ محل کی چار دیواری میں آئے ہوئے اس کو ابھی صرف دو سال گزرے تھے اور اس سے قبل اس کے ابتدائی سولہ سال ایسی فضا میں بسر ہوئے تھے جہاں فکرِ معاش سے تنگ آکر انسان خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔
دراں جشنِ سالگرہ کے کیا معنی؟

قدرت کے بھی عجیب کھیل ہیں۔ وہ بال جو دو سال قبل صرف گرد و غبار کے لئے وقف تھے آج پھولوں میں آسودہ نظر آتے تھے وہ سر جو خس و خاشاک سے اٹا رہتا تھا، آج زریں تاج سے مزین تھا، اس کا وہ جسم

جو ہمیشہ خشک گھاس پر لیٹنے کا عادی تھا آج مخمل و کمخواب میں بھی خشونت محسوس کرتا تھا اور اس کا وہ معدہ جو گرد و اُپلوں کی آنچ پر سکی ہوئی موٹی روٹیوں کو آسانی سے قبول کر لیتا تھا، اس قدر لطافت پسند ہو گیا تھا کہ اگر دودھ بھی چبا کر نہ پیا جاتا تو سوءِ ہضم کی شکایت ہو جاتی۔ وہ پہلے ایک مفلوک الحال موچی کی بیٹی تھی اور اب ایک رئیس کی محبوبہ!

کیا وہ حسین تھی — ؟ یہ ایک احمقانہ سوال ہے۔ اگر وہ ایسی نہ ہوتی تو محلوں میں زندگی بسر کرنے والا نواب سرسوتی ندی کے کنارے ماہی گیروں کی بستی میں جا کر چار دن ٹھہرنا بھی گوارا نہ کرتا چہ جائیکہ ہفتوں!

خود اس کے محل میں سیکڑوں پری تمثال لڑکیاں موجود تھیں، پھر اس لڑکی میں وہ کیا خصوصیت تھی جس نے نواب کو اس درجہ بیتاب بنا دیا؟ — اس کا جواب نواب ہی دے سکتا ہے۔

اس نے اپنے سیاہ لانبے بال کو جو منتشر ہو جانے ہی کے لئے سنوارے گئے تھے اپنی مرمریں انگلیوں سے درست کیا اور کسی قدر کسمساتے ہوئے کروٹ لی۔ اس کی نظر کے سامنے خوبصورت تاروں کا بنا ہوا پنجرہ دریچہ کی محراب میں لٹک رہا تھا جس کے اندر ایک نہایت خوشنما چڑیا بند تھی۔ اس نے مسہری پر لیٹے لیٹے ایک فلسفی کی طرح غور کرنا شروع کر دیا۔ اس نے چڑیا کی زندگی کا موازنہ خود اپنی زندگی سے کیا۔ کچھ زیادہ فرق نہیں تھا۔ دونوں کے لئے بہترین سامان خورد و نوش، بہترین آسائش، خدمت کے لئے بہترین ملازم موجود تھے۔ رہنے کی چار دیواری بھی دونوں کے لئے نہایت خوشنما اور قابل دید تھی — مگر آزادی — اُف! آزادی کا فقدان تھا۔ محل میں آنے سے قبل دیہات کی سادہ فضا میں صبح سے شام تک اس کا مشغلۂ حیات ایک غیر معین و بے ترتیب لائحۂ عمل کے تحت ہوتا تھا۔ کسی دن وہ مچھلیاں پکڑنے ندی کے کنارے چلی جاتی اور دن بھر جال لئے کنارے پر بیٹھی رہتی اور کبھی کشتی پر سوار ہو کر ساحل سے کچھ دور نکل جاتی۔ وہ خود موسیقی سے ناواقف تھی لیکن جب گاؤں کے دوسرے لڑکے مچھلیاں پکڑتے وقت گاتے تو وہ مست و بے خود ہو کر پانی میں انگلیاں تر کر کے ساحل کے قریب اُگنے والی گھاس پر چھینٹے دینے لگتی۔ گھر کا ایندھن ختم ہونے لگتا تو وہ بانس کی ٹوکری یا ٹین کا تسلہ لے کر مویشیوں کے ریوڑ کے پیچھے پیچھے جاتی اور صبح سے شام تک اتنا گوبر سمیٹ لیتی کہ اس کے اُپلے کئی ہفتے تک کافی ہو سکیں۔ اگر کسی روز اس کے باپ کی طبیعت خراب ہوتی تو وہ اس کا ہاتھ بٹانے کے لئے کچے سوت کو بٹ دیتی۔ اس نے پرانی جوتیوں میں معمولی سلائی کرنا بھی سیکھ لیا تھا۔ کشتی میں سیر کرنے والے لوگوں کے بوٹوں پر پالش کرنا اسی کے ذمہ تھا۔ اس کا باپ ذات کا ماہی گیر لیکن پیشہ کے لحاظ سے موچی تھا۔ گاؤں میں اس کی بہت سی سہیلیاں تھیں۔ جن کے ساتھ برسات کا تمام موسم وہ جھولا جھول کر گزارتی تھی وہ ان کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر "پیا" کو یاد کرتی لیکن نہیں جانتی تھی کہ "پیا" کس کو کہتے ہیں

وہ پریم کی بنسی بڑے شوق سے سنتی مگر اس جذبے سے ناواقف تھی۔ کیونکہ پریم کے لفظ سے اس کے کان آشنا تھے۔ مگر لب ناآشنا۔ موسم گرما میں تمازتِ آفتاب سے اس کے بوسیدہ کپڑے پسینہ میں شرابور ہو جاتے۔ مگر بیاں کی عطریات کے مقابلہ میں پسینہ کی وہ بو اسے زیادہ مرغوب تھی۔ وہ کج فہم اور ناقص العقل ہونے کے باوجود اس رمز کو سمجھتی تھی کہ عطر پھولوں سے کشید کیا جاتا ہے اور پسینہ خود انسان کے جسم کا فشردہ ہے۔

محل میں اس کو کسی قسم کی تکلیف نہیں تھی۔ لیکن اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ پانی کے دو گھونٹ بھی پئے تو کنیز کے ہاتھوں سے۔ اور وہ بھی چاندی کے کٹورے میں۔ اس کی روح بعض اوقات تڑپ اٹھتی تھی اُپلوں کی آنچ پر سکی ہوئی جو اور جوار کی روٹیوں کے ساتھ تیل میں بھنے ہوئے سرسوں کا ساگ کھانے کے لئے۔ آم اسے بہت مرغوب تھے۔ لیکن اس طرح کہ رس ان سے ٹپک ٹپک کر کپڑے کو آلودہ کر دے اور وہ خود ندی کے کنارے بیٹھ کر اپنے ہی ہاتھوں سے دھو کر اس آلودگی کو صاف کر دے۔ وہ چاہتی تھی کہ جنگلی گلاب توڑتے وقت اس کی انگلی میں کانٹا چبھ جائے۔ محل کی چار دیواری میں سونے سے قبل اسکو اپنی سیج صد ہا قسم کے پھولوں سے مزین ملتی۔ اور اسے یہ سُن کر افسوس ہوتا کہ ایک بوڑھے مالی نے ان کو چنا ہے اس کا خیال تھا کہ گرمی کی سہانی راتوں میں نیند کا لطف اسی وقت آسکتا ہے جب مچھر خوب کاٹیں اور انسان بیدار ہو ہو کر سو سو جائے۔ نہ یہ کہ مسہری کے ریشمی پردے ایک مچھر کو بھی قریب نہ پھٹکنے دیں۔

یہ ضرور ہے کہ محل میں آنے کے بعد سے اس کی طبیعت کسی قدر نفاست پسند، آرام طلب اور عیش پرست ہو گئی تھی۔ تاہم بڑی بحث کے بعد اس نے نواب سے اجازت حاصل کر لی تھی کہ ہمیشہ سالگرہ کے دوسرے دن دیہاتی روایات کی یاد قائم رکھنے کے لئے وہ اپنے سابق طرزِ معاشرت کا اعادہ کیا کرے گی۔ چنانچہ آج سالگرہ کا دوسرا دن تھا۔ اور اسی لئے وہ غیر معمولی طور پر بہت زیادہ مسرور تھی۔ اس قدر مسرور کہ جوشِ مسرت میں اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ اور اسی نیم عریاں حالت میں ریشمی پردہ کو حقارت کے ساتھ جھٹکتے ہوئے مسہری سے نیچے اتر آئی۔

(۲)

وہ سیٹی بجاتا ہوا غیر ارادی طور پر کچھ سوچتا ہوا دریچہ کے قریب پہونچ گیا۔ اس کی متجسس نظریں صحنِ چمن میں کسی کو دیکھنے کے لئے بیتاب تھیں۔ اس وقت وہ خود خالص مشرقی طرز کی پوشاک میں ملبوس تھا۔ لیکن کمرے کا باقی ماحول مغرب کی حیا سوز تہذیب کے زیرِ اثر عریانیات کا مجموعہ تھا۔ بالکل ننگی عورتوں کی تصویروں سے دیواروں کو زینت دی گئی تھی۔ یونانی صنمیات کی روایاتِ قدیم کو مادی شکل میں پیش کرنے والے مرمریں و بلوریں مجسمے

جاتے تھے اور میزوں پر رکھے ہوئے تھے۔

نواب ابھی اپنے خیالات ہی میں محو تھا کہ دروازے پر لٹکنے والے پردہ میں جھنکار پیدا ہوئی اور اس کے ساتھ ہی نسوانی قدموں کی ہلکی چاپ۔ ایک کنیز اندر داخل ہوئی لیکن اس انداز کے ساتھ گویا طاق میں رکھی ہوئی کسی چینی کی مورت میں جان پڑ گئی ہے۔ اس نے شراب پیش کی اور نواب نے کوئی لفظ کہے بغیر اس آتش سیال سے اپنی تشنگی بجھائی۔

نواب کو پل پل کی خبریں مل رہی تھیں۔ کنیزیں آتی تھیں اور کہہ جاتی تھیں کہ اب محل کی چار دیواری میں دیہاتی طرز زندگی کا کون سا نمونہ پیش کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ بستر سے اٹھنے کے بعد بیگم سب سے پہلے اس تالاب پر گئی جس میں شوقین مزاج نواب نے پانی کے مختلف جانور پال رکھے تھے۔ رنگ برنگ کی خوبصورت مچھلیاں۔ راج ہنس۔ مرغابیاں۔ قازیں۔ سرخاب اور خدا جانے کیا کیا۔ اس نے عنبریں بالوں کی عطریت رخساروں پر ملے ہوئے غازہ کی خوشبو، پھولوں کے گجروں میں بسی ہوئی مرمریں گردن کی مہک۔ نرگسی آنکھوں میں تڑپنے والی سرمۂ دنبالہ دار کی ہلکی لہر۔ صندل بھری مانگ کی گلنار رنگینی۔ مصنوعی خال کی سرمگیں ملاحت اور غرض یہ کہ ہر وہ شے جس سے تزئینِ جمال ہوئی تھی۔ ملتانی مٹی اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کے ذریعہ سے لوازمتا دور کر دی۔ گدلے پانی میں اس نے غسل کیا، مچھلیوں کو پکڑا اور چھوڑ دیا۔ کبھی راج ہنس کو سر پر بٹھا لیا اور کبھی سرخاب کو، اس کے نقرئی قہقہوں سے تمام فضا معمور تھی۔ اس نے پانی کے چھینٹے دے دے کر قازوں کو ستایا۔ پھر پاس کی جھاڑیوں میں چھپ کر اس نے کھدر اور مارکین کا لباس پہنا۔ خود رو پودوں سے ہر قسم کے پھول توڑے اور یکجا گوندھ کر گلے میں پہن لئے۔ اب اس کی کلائیوں میں بجائے طلائی پٹریوں اور منقش کنگنوں کے صرف کانچ کی چوڑیاں تھیں۔ اس نے دیسی چمڑے کا گنواری جوتہ پہنا۔ اور پانی کا گھڑا سر پر رکھ کر چل پڑی۔ اپنے شاہی کمروں کی طرف نہیں بلکہ دربان کے جھونپڑے کی جانب جس کو عارضی طور پر خالی کرا لیا تھا۔ وہاں جا کر وہ چکی میں جوار پیسنے لگی اور اسی انہماک میں خدا جانے کیا گاتی رہی۔ پھر اُپلوں کی آنچ پر تین چار روٹیاں پکائیں۔ پالک کا ساگ سرسوں کے تیل میں بھونا اس نے کھانا کھا کر مٹی کے آبخورہ سے پانی پیا اور تنکوں کے سخت بستر پر تھوڑی دیر کے لئے لیٹ گئی۔ اپنے ماں باپ۔ بھائی بہن اپنی سکھیوں۔ اپنی بھینسوں اور گاؤں میں پلے ہوئے کتوں کو یاد کر کے اس نے رونا شروع کر دیا۔ اور اس کے آنسو آنچل میں جذب ہوتے چلے گئے۔

نوابؔ کو جب ان باتوں کی خبر ملتی تو وہ دل ہی دل میں افسردہ ہوتا۔ وہ پشیمان ہوتا تھا کہ ایک دیہاتی [illegible] محل میں لاکر کیوں رکھا۔ سرسوتی ندی کے کنارے اس حسین دوشیزہ کو دیکھکر اس نے خیال کیا تھا کہ یہ قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ گودڑی میں لعل کو چھپا کر رکھدیا۔ اس کو اپنے محل میں لاکر وہ خوش ہوا تھا۔ کہ قدرت کی ایک زبردست غلطی کی تصحیح کردی ہے۔ لیکن اب وہ سمجھا کہ انگارے جو یاقوت کی طرح چمکتے ہیں، دراصل یاقوت نہیں، اور یہ کہ خوبصورت خوشنما سانپوں میں بھی زہر پیدا ہوتا ہے۔ جن کی سمیت کبھی دور نہیں ہو سکتی خواہ وہ صدہا سال تک تریاق کے انبار پر کنڈلی مارے بیٹھے رہیں۔ اس نے خیال کیا تھا کہ محل کی رنگین فضا میں اس دیہاتی لڑکی کے حُسن کو چار چاند لگ جائیں گے۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ شیر کا بچہ انسان کی گود میں پل جانے کے بعد بھی اپنی بہیمانہ خصلت کو نہیں چھوڑ سکتا۔

وہ تصورات کی دُنیا میں واقعاتِ گزشتہ کا مطالعہ کرنے لگا۔ وہ ایک روز اپنے مصاحبوں کے ہمراہ مچھلی کا شکار کھیلنے گیا تھا۔ سرسوتی ندی کے کنارے اسے کشتی میں ایک نوخیز لڑکی نظر آئی پھٹے پُرانے میلے کچیلے کپڑوں میں وہ ایسی معلوم ہوتی تھی گویا سیاہ بدلیوں میں سے چاند جھانک رہا ہے۔ اس نے لڑکی کو اپنی خدمت پر مامور کرلیا۔ لیکن وہ پھولوں کو صرف آنکھ سے دیکھ لینے کا قائل نہیں تھا۔ اس لئے چلتے وقت اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ غالبًا بڈھا باپ اس ظلم و ستم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا مگر پانچسو روپے کی کثیر رقم نے اس کی زبان بند کردی۔ دولت ناممکن باتوں کو بھی ممکن کردکھاتی ہے۔

دخترِ دہقان جب شاہی محل میں آئی تو کئی روز تک ہر شے کو تعجب کی نگاہوں سے تکتی رہی۔ عرصہ تک اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ کہ کپڑے کے اندر سورج کی کرنوں جیسی چمک کس طرح پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ اس قدر ہلکے اور مہین کیوں ہوتے ہیں۔ وہ صرف پکی اینٹ کے ٹکڑوں سے پاؤں مانجھنا جانتی تھی۔ کنیزوں نے اسفنج کے ٹکڑے اور ربڑ کے جھانوے دئے تو حیران رہ گئی۔ کہ یہ کیا چیز ہو سکتی ہے اور اگر بروقت اسے منع نہ کردیا جاتا تو شاید وہ گلگونہ یا غازہ سے ایک اُنگلی بھر کر منہ میں رکھ لیتی۔ اسنے بانسری کے نغمے سنے تھے۔ ہارمونیم ستار اور رباب سے اسکے کان ناآشنا تھے۔ ناچ کا مفہوم اس کے ذہن میں صرف اس قدر تھا کہ کچھ عورتیں ایک حلقہ میں کھڑی ہوکر اور گھونگھٹ نکال کر اپنے اعضا کو ایک مخصوص طریقہ پر جنبش دیں۔ کبھی ان کا سر آگے کی طرف جھکے اور کبھی پشت کی جانب، بعض دفعہ پاؤں زمین پر زور سے مارا جائے اور بعض دفعہ ہلکا۔ اور اس تمام دوران میں وہ کچھ جھینپی سی شرمائی سی رہیں۔ محل کی بزم نشاط میں اس نے دیکھا کہ صرف ایک نوجوان عورت مجمع کے سامنے اس طرح رقص کرتی ہے کہ اکثر اس کا سینہ کمر تک اور ٹانگیں رانوں کے بالائی سرے تک برہنہ ہوتی ہیں۔ وہ بے حیائی کے اس منظر کو دیکھ کر ابتدا میں خود شرما جاتی تھی۔ وہ بمشکل سمجھ سکی

کہ آخر ناچ میں اس چیز پر کیوں زور دیا جاتا ہے کہ چھاتیاں اور کولھے بھی اپنی اپنی جگہ رقص کریں۔ مختلف قسم کے نرت دیکھ کر اس نے خیال کیا کہ غالباً رقاصہ ہوا کے سمندر میں تیرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ سمجھ نہ سکی کہ بازوؤں کو شانوں کے متوازی پھیلا کر چھوٹے چھوٹے دائرے بنانا اور اس کے ساتھ ہی انگلیوں کو اس طرح موڑنا گویا ان پر تشنج کی کیفیت طاری ہو رہی ہے کیا معنی رکھتا ہے۔ اس کے دیہاتی گیتوں میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہوتا تھا جو جذبات میں ہیجان پیدا کر کے انسان کو گناہ کی ترغیب دے۔ برخلاف اس کے یہاں شعر کا ہر مصرع بذاتِ خود ایک فحش معصیت تھا

نواب اپنے خیالات میں محو تھا اور ابھی کسی خاص نتیجہ پر نہ پہونچا تھا کہ آیندہ اس دیہاتی لڑکی کے ساتھ کس قسم کا طرزِ عمل اختیار کیا جائے۔ کہ اسے اطلاع ملی کہ بیگم گوبر کا ڈھیر سامنے رکھے ہوئے اُپلے تھاپ رہی ہیں۔ آتشِ غضب اس کے سینہ میں بھڑک اُٹھی۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس کو محل کی چار دیواری سے ہمیشہ کے لئے نکال دیا جائے وہ لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا اور دربان کے جھونپڑے کی طرف چلا گیا۔

قریب پہونچ کر اس نے دیکھا کہ محل میں رہنے والی بیگم نے گاڑھے کا لباس زیبِ تن کر رکھا ہے۔ آستینیں کہنیوں تک چڑھی ہوئی ہیں۔ اور دونوں کلائیاں نجاست سے آلودہ ہیں۔ اسے آتا دیکھ کر وہ کھڑی ہو گئی اور کسی قدر جھک کر بولی۔ "آئیے! بابوجی!"

اس کہنے کے ساتھ ہی وہ مسکرائی اور یہاں تک مسکرائی کہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ ایک عورت اور خاص طور پر شباب کے بوجھ سے لدی ہوئی عورت کا تبسم جب بڑھتے بڑھتے دلفریب مگر مدہم قہقہہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ تو بلا مبالغہ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے گویا ساغر و مینا کے باہم ٹکرا جانے سے جلترنگ کی ایک خاص نوع کا نغمہ پیدا ہو رہا ہے۔

اس نے گاؤں میں سُنا تھا کہ امیر آدمیوں سے "بابوجی" کہہ کر بات کرتے ہیں۔ اور دیہاتی معاشرت کا خیال کر کے اس نے یہی مناسب سمجھا کہ نواب کو بھی "بابو" ہی کہا جائے۔

"بابوجی! میں نے تمہارے جوتوں کو صاف کر کے چمکا دیا ہے۔ اپنے نوکر کو بھیج کر منگا لو۔"

نواب نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔ جھونپڑے کی دیوار کے ساتھ پانچ سات جوڑے جوتوں کے رکھے تھے۔ اسکی تیوری پر بل پڑ گئے۔ یہ اس کی شانِ امارت کی زبردست توہین تھی کہ ایک عورت جو اس کی زینتِ آغوش بن چکی ہو ایسے ذلیل کام کرے۔ مگر کیا کہہ سکتا تھا۔ اس نے انتہائی ضبط سے کام لے کر چند طلائی سکے اپنی جیب سے نکالے اور دخترِ کفش دوز کے سامنے زمین پر ڈال کر بولا کہ "لو یہ جوتے صاف کرنے کی اُجرت ہے۔ اسے اُٹھا لو" اس نے وہ سکے اُٹھا لئے اور چلی گئی۔ یعنی جب یہ کھیل ختم ہونے لگا تو وہ پھر حقیقت سے ہم آغوش تھی۔ (مختار)

طاہرہ دیوی شیرازی

# ریاض مرحوم

ریاض کی موت، ہندوستان کی موجودہ شاعری کو صدمہ پہونچانے والی ہو یا نہو، لیکن اخلاق شاعرانہ اُن کے اُٹھ جانے سے جتنا بھی سوگوار نظر آئے کم ہے۔

ریاض کی سب سے بڑی خصوصیت جو متقدمین شعراء میں بھی کم نظر آتی تھی، چہ جائیکہ دور متاخرین، نجابت نفس و شرافت اخلاق تھی اور یہ کہنا یقیناً غلط نہ ہوگا کہ وہ شاعر پیدا ہونے سے پہلے انسان پیدا ہوئے تھے جن کو اُن سے ملنے کا موقع نہیں ملا وہ صرف اُن کی شاعری پر سر دھنتے تھے اور جو اُن سے مل چکے تھے، وہ انکی انسانیت پر جان دیتے تھے۔ ایسے لوگ جو عمر بھر کسی سے بدگمان نہ ہوئے ہوں ایک لمحہ کے لئے بھی دل میں کسی کی طرف سے جذبۂ انتقام کو گوارا نہ کرتے ہوں اور جو ایک بار رشتۂ محبت جوڑ لینے کے بعد اس کا توڑنا کفر سمجھتے ہوں۔ کہاں پیدا ہوتے ہیں۔۔ اس ضعف و پیرانہ سالی کے باوجود بھی ناممکن تھا کہ وہ خیرآباد سے لکھنؤ تشریف لائیں اور فرداً فرداً ہر اس شخص سے جا کر نہ ملیں جس سے کچھ بھی رسم قائم ہوگئی ہے۔ یقیناً وہ مراسم بڑھانے کی کوشش نہ کرتے تھے، لیکن جو اسلوب ملنے کا ایک بار قایم ہو جاتا تھا اس کو نباہنے کے لئے وہ ہر ممکن تکلیف گوارا کر سکتے تھے۔ گرمی کی دھوپ میں پسینے سے شرابور ہو رہے ہیں، ایک ایک قدم اُٹھانا بار ہے، دم پھول رہا ہے، ہونٹ خشک ہیں، ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں، لیکن ریاض کو آنا اور ملنا ضرور خواہ وہ ایک ہی منٹ کے لئے کیوں نہ ہو۔ ان کی عمر کا آخری حصہ اقتصادی دشواریوں کی وجہ سے نہایت سختی سے بسر ہوا اور دیگر ذاتی و خاندانی افکار کی وجہ سے وہ سراپا درد و الم تھے، لیکن یہ ممکن نہ تھا کہ دوسرا اُن کی اس کیفیت کو محسوس کر سکتا۔ وہ شوخی و ظرافت، وہ رنگینی و رعنائی جو جوان سال ریاض کے "فتنہ" و "ریاض الاخبار" میں نظر آتی تھی، بالکل وہی نوّے ۹۰ سال کے بوڑھے ریاض میں بھی پائی جاتی تھی، اور حیرت ہوتی تھی کہ جس شخص کا بڑھاپا اس قدر شگفتہ ہے، اس کی جوانی کا کیا عالم رہا ہوگا۔ جن حضرات کو ریاض کی صحبت و معیت

نصیب ہوئی ہے، اُن سے پوچھئے کہ ریاضؔ کیا چیز تھے، اور وہ اپنے احباب کی زندگی میں کتنے خلا پیدا کرکے گئے ہیں۔ وہ ان کی گفتگو کا شاندار لہجہ، وہ شوخی و ظرافت اور وہ خالص ادبی رنگ کی بات چیت ——
جس وقت وہ اپنی زندگی کے گزشتہ واقعات بیان کرتے تھے تو سننے والا "لذت تقریر" میں اس قدر محو ہو جاتا تھا کہ شاید ہی کاہلان مرتاض کو یہ محویت کبھی عبادت میں پیدا ہوتی ہو۔ اور بے اختیار یہ جی چاہتا تھا کہ ریاضؔ ہر وقت گفتگو کرتے رہیں اور ہم خاموش بیٹھے سنا کریں۔
پھر جو رنگ اُن کی گفتگو کا تھا وہی اُن کی تحریر کا تھا۔ نگار میں جو خطوط اُن کے شائع ہوئے ہیں وہ آج ہی نہیں بلکہ مستقبل میں بھی خراج تحسین حاصل کریں گے۔

---

شاعر ہونے کی حیثیت سے ریاضؔ نے جو عزت و شہرت حاصل کی، اس کا ذکر فضول ہے، کیونکہ وہ اپنے رنگ کے تنہا کہنے والے تھے اور اس "انفرادیت" میں ان کا کوئی دوسرا شریک نہ تھا۔
الغرض ریاضؔ کی موت ایسا معمولی سانحہ نہیں جسے آسانی سے فراموش کیا جا سکے، اور یہ ملک و قوم کی انتہائی بدنصیبی ہوگی اگر اس نے اس جوہر گرانمایہ کی یادگار قائم رکھنے کی کوشش نہ کی۔
پھر اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک تو یہ کہ اُن کے کلیات کو شائع کیا جائے جسے وہ اپنے قلم سے مرتب کرکے چھوڑ گئے ہیں اور دوسری یہ کہ نثر اُردو پر جو احسانات انھوں نے کئے ہیں، ان کو سامنے لایا جائے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ ریاض الاخبار اور فتنہ کے فایل فراہم کرکے خود اس خدمت کو انجام دوں اور میں بہت شکر گزار ہوں گا اگر اس باب میں اہل ذوق میری اعانت فرمائیں گے۔

نیاز

---

# بہار

مولفۂ الیاس احمد ایم۔اے۔ایل ایل۔بی منصف سہارنپور

"گلدستۂ بہار" فارسی اور اُردو شعرا کے چوٹی کے کلام کا بہترین اور نایاب مجموعہ ہے۔ اس گلدستہ کے ہوتے ہوئے کسی دیوان کی ضرورت نہیں ہے۔ چیدہ چیدہ متحد المضامین اشعار ایک خاص سرخی کے تحت میں درج ہیں۔ سرخیاں سیکڑوں ہیں علم ادب میں گلدستہ بہار ایک دلکش اور دلفریب اضافہ ہے۔ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے مصرع۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں۔ ضخامت ۲۳۲ صفحے۔ قیمت معہ محصولڈاک عہ۔ ملنے کا پتہ: منیجر صاحب دار المصنفین اعظم گڑھ

# باب المراسلۃ والمناظرہ

## (ر-بیگم - از مسوری)

جولائی کے نگار میں آپ کا ایک خط شایع ہوا ہے جو مکتوب الیہ تک نہیں پہونچ سکا آپ نے جو یہ عنوان قایم کیا ہے، ممکن ہے صرف ادبی اختراع ہو لیکن اصل مکتوب کے دیکھنے کے بعد چونکہ خواہ مخواہ واقعیت وحقیقت کا سا اثر دل پر ہوتا ہے اس لئے غالبًا عنوان بھی صحیح ہوگا، پھر کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ کا یہ خط نگار کے ذریعہ سے بھی مکتوب الیہ تک نہ پہونچا ہوگا اور کیا حقیقتًا آپ کا مقصود یہ نہ تھا کہ اس ترکیب سے کوئی اسے دیکھ لے؟ بہرحال اگر یہ سب کچھ حقیقت ہے تو بہت پرلطف حقیقت ہے اور تفصیل سننے کے لئے جی بےچین ہے، لیکن آپ کیوں کہنے لگے؟

---

(نگار) عام طور پر راز چھپانے کا طریقہ یہ ہے کہ کسی سے اس کا ذکر ہی نہ کیا جائے، لیکن ایک صورت اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ اس کو مشتہر کر دیا جائے اس طریق پر کہ ہر شخص اس کا مفہوم اپنے ذوق کے لحاظ سے علٰحدہ علٰحدہ قرار دے - پھر اگر کسی میں یارائے ضبط نہ ہو یا اتنا کہنے کا بھی موقعہ حاصل نہ ہو کہ:-

یا مجال گفتن دہ یا نہ گفتہ باور کن۔

تو بہتر صورت وہی ہے، جو آخر میں عرض کی گئی — مگر خدارا، اس سے کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ میں نے یہ خط اسی اصول کو سامنے رکھ کر لکھا تھا۔

آپ نے تو خیر اسی حد تک دلچسپی لی کہ مجھ سے داستانِ محبت پوچھنے بیٹھ گئیں، میں کیا کرتا اگر آپ

بھی بعض دوسری خواتین کی طرح یہ کہہ اُٹھتیں کہ "ہو نہ ہو اس میں ہمارا ہی ذکر ہے"
یاد رکھیے کہ متعدد خواتین کے خطوط اس بارہ میں میرے پاس آئے اور ان سب نے اپنی ہی تصویر میرے
مکتوب میں دیکھی۔ درانحالیکہ ان میں سے کسی نے مجھے خط لکھنے سے باز نہیں رکھا اور اُن سے میری مراسلت

ہنوز جاری ہے
شایع شدہ مکتوب کے پڑھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اگر واقعی اس خط میں کسی حقیقت کا اظہار ہے تو
اُس کے لکھنے کا سبب صرف یہ تھا کہ مجھے آیندہ خط و کتابت سے باز رکھا گیا تھا۔ پھر میں حیران ہوں کہ وہ خواتین
جنھوں نے مجھ پر یہ ظلم روا نہیں رکھا، وہ کیونکر اپنے آپ کو اس خط کا مخاطب جان کر اک دوسرے نوع کا ستم
مجھ پر توڑنا پسند کرتی ہیں۔ سچ ہے

اسی کی سی کہنے لگے اہلِ حشر
کہیں پُرسشِ دادخواہاں نہیں

جب مقصود ظلم ہی کرنا ٹھیرا تو پھر "این و آں" کا کیا سوال — فریاد کی کوئی لے نہیں، تو حُسن شعبدہ کار کیوں
کسی "آئین" کا پابند ہو؟ انھوں نے اگر ظلم پر کمر باندھی ہے تو اب آئے اور ساری دنیا انھیں کا ساتھ دے۔

آتشم تیز بست و داماں می زنم

اب رہ گیا سوال "حقیقت" کا سوچ رہا ہوں کہ اس باب میں کیا کہوں، آج اگر کوئی "حرفِ آرزو" زبان
پر آجاتا ہے، تو دُنیا چونک پڑتی ہے اور اس میں داستان محبت کی جستجو کرنے لگتی ہے، حالانکہ کل کا دن جب
تمنا کوئی لفظ نہ بن سکی تھی اس سے کہیں زیادہ لبریزِ محبت تھا۔ مگر وہ ختم ہو گیا اور اپنے ساتھ وہ سب کچھ لے گیا
جو اس کا تھا "حال" پر گفتگو فضول ہے لگن میں خاکستر پروانہ کی کس کو پرواہ ہوتی ہے، رہ گیا مستقبل سو اسکا

اندازہ حال سے ہو سکتا ہے۔

برق یمانی بجست، بادِ بہاری نجاست
طاقتِ مجنوں برفت خیمۂ لیلیٰ کجاست

معاف فرمایئے، جو خط میں لکھا گیا تھا وہ بھی اور جو اسوقت لکھ رہا ہوں وہ بھی سب باتیں ہی باتیں ہیں، کہاں کا عشق کیسی
نہ در سینہ آتش نہ در دیدہ آب
داستان محبت —
یوں اگر آپ کو کسی کا زخم تازہ کرنے میں لطف آتا ہے تو بات ہی اور ہے

# باب الاستفسار

## حدیث پر تاریخی و فنی گفتگو

(جناب سید ابوتراب صاحب۔ حیدرآباد دکن)

نگار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ احادیث کے قایل نہیں ہیں، درانحالیکہ شریعت اسلامی کا نظام انھیں پر منحصر ہے۔ اگر وقت و مصلحت اجازت دے تو آپ اپنے تفصیلی خیالات اس باب میں قلمبند فرمایئے اور اسی کے ساتھ اگر ممکن ہو تو اصول حدیث اور فنِ حدیث پر بھی روشنی ڈالئے۔ مدعا یہ ہے کہ اس بحث کے تمام پہلو سامنے آجائیں۔

---

(نگار) ظہور اسلام سے قبل بھی اہلِ عرب کا قاعدہ تھا کہ وہ اپنے اسلاف و اکابر یا اب وجد کے مراسم و شعائر اور واقعات تاریخی کی روایات محفوظ رکھا کرتے تھے اور ان سے ہٹنا معیوب خیال کیا جاتا تھا۔۔۔ جب رسول اللہ مبعوث ہوئے اور عربستان کی ذہنی و دماغی دنیا میں انقلاب عظیم برپا ہوا تو اسی کے ساتھ اس عادت میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی یعنی روایات قدیمہ کے محفوظ رکھنے کے بجائے رسول و صحابہ کے اقوال و افعال کی روایات کو زندہ رکھنے کی کوشش کی گئی اور یہی اولین بنیاد فن حدیث کی۔

پھر چونکہ کسی واقعہ کی صحت کا دار و مدار زیادہ تر اس پر ہے کہ اس کے بیان کرنے والے نے خود اسے دیکھا ہو، یا وہ اس سے قریب تر زمانہ میں پایا جاتا ہو، اس لئے سب سے زیادہ معتبر راوی صحابہ مانے گئے،

جو رسول اللہ کے ساتھ ہر وقت اٹھتے بیٹھتے اور سفر و حضر میں ساتھ رہتے تھے، اس کے بعد تابعین کا درجہ قرار پایا جنھوں نے صحابہ کا زمانہ دیکھا تھا اور پھر تبع تابعین کا جو تابعین کے دیکھنے والے تھے وہلم جرا ——
اس لئے حدیث کے دو حصے ہوگئے ایک وہ جسے اسناد کہتے ہیں اور دوسرا متن یعنی ایک حصہ وہ جس میں یہ بتایا جائے کہ کن کن راویوں کے ذریعہ سے روایت بیان کی گئی ہے اور دوسرا حصہ خود اس واقعہ یا روایت کا۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ جب کوئی شخص کسی واقعہ کی روایت کرتا تھا تو اسے یہ بھی ثابت کرنا پڑتا تھا کہ واقعی رسول اللہ نے ایسا فرمایا یا ایسا کیا اور اس کا ثبوت اس سے زیادہ کچھ نہ ہوتا تھا کہ وہ معتبر راویوں کا سلسلہ بیان کردے۔

اس امر کی تنقید کے لئے کہ جن راویوں کے سلسلہ سے حدیث بیان کی جاتی ہے وہ معتبر ہیں یا نہیں، اور یہ کہ اخلاقی و ذہنی حیثیت سے ان کا کیا مرتبہ ہے، ایک علحدہ فن کی بنیاد پڑی جسے فن رجال کہتے ہیں[1] اور اس تنقید کا اصطلاحی نام "الجرح والتعدیل" قرار پایا۔

ظاہر ہے کہ تنقید کے سلسلہ میں بعض روایتیں زیادہ معتبر مانی گئی ہوں گی اور بعض کم، اس لئے راویوں کی حیثیت، الفاظ روایت کے اختلاف، اور سلسلۂ روایت کے لحاظ سے حدیث کی بہت سی تقسیمیں ہوئیں۔

(۱) اگر راویوں کا پورا سلسلہ نہایت معتبر ہے اور حدیث میں کوئی بات عقیدۂ مروجہ کے خلاف نہیں ہے تو ایسی حدیث کو "صحیح" کہتے ہیں۔

(۲) اگر راویوں کے سلسلہ میں کوئی راوی کم درجہ کا ہے یا اسناد مکمل نہیں ہے تو ایسی حدیث کا نام "حسن" قرار پاتا ہے۔

(۳) اگر راوی مشتبہ ہے یا نفس روایت میں کوئی بات شبہ کی ہے تو ایسی حدیث کا نام ضعیف رکھا جاتا ہے۔

(۴) اگر راوی نے قول رسول کے الفاظ کے بجائے کہیں کہیں خود اپنے الفاظ استعمال کئے ہیں تو ایسی حدیث کو مدرج کہتے ہیں۔

(۵) اگر راوی صرف ایک ہے اور اس کی روایت ضعیف سمجھی جاتی ہے تو ایسی حدیث کو متروک کہتے ہیں۔

(۶) اور اگر کوئی روایت بہ لحاظ روایت و مفہوم بالکل غلط مانی جاتی ہے تو اسکا اصطلاحی نام موضوع ہے۔

---

[1] اس فن کی مشہور کتابیں طبقات ابن سعد، طبقات الحفاظ، اصابہ، اسد الغابہ، اور کتاب الضعفا ہیں۔

پھر چونکہ احادیث میں صرف رسول ہی کے اقوال و افعال سے بحث نہیں ہوتی بلکہ صحابہ و تابعین کے حالات و اقوال کی روایت کو بھی حدیث کہتے ہیں اس لئے ایک تقسیم اور ہوئی یعنی

(۱) اگر کسی حدیث میں رسول اللہ کا ذکر ہے تو اسے مرفوع کہیں گے۔
(۲) اگر صحابہ کے اقوال و افعال کا ذکر ہے تو اس کا نام موقوف ہوگا۔
(۳) اگر تابعین کے اقوال و افعال بیان کئے گئے ہیں تو اسے مقطوع کہیں گے۔

اسناد کے لحاظ سے ایک اور تقسیم احادیث کی کیجاتی ہے۔

(۱) اگر روایت کا نہایت معتبر و غیر منقطع سلسلہ کسی صحابی تک پہونچتا ہے تو اُسے مُسند کہتے ہیں
(۲) اگر راویوں کا سلسلہ اس طرح کا ہے کہ اُن میں سے ہر ایک نے قسم و حلف کے ساتھ ہاتھ پر ہاتھ مار کر روایت بیان کی ہے تو ایسی حدیث کو مسلسل کہتے ہیں (مسلسل الحلف اور مسلسل الید)
(۳) اگر اسناد مکمل بھی ہیں اور مختصر بھی یعنی آخری راوی اور اول راوی کے درمیان بہت کم واسطے ہیں تو ایسی حدیث کو عالی کہتے ہیں۔
(۴) اگر راویوں کا سلسلہ غیر منقطع ہے تو ایسی حدیث کو متصل کہتے ہیں
(۵) اگر یہ سلسلہ بیچ سے ٹوٹ گیا ہے۔ یعنی تابعین کے سلسلہ کا کوئی راوی نہیں ہے تو منقطع کہتے ہیں
(۶) اگر کوئی بات رسول اللہ کے متعلق کسی تابعی نے بیان کی ہو اور اسے نہیں معلوم ہو سکا ہے کہ کس صحابی سے اس نے سنا تو ایسی حدیث کو مُرسَل کہتے ہیں
(۷) اگر کوئی حدیث ایسی ہو جو "عنُ فلاں" و "عن فلاں" سے بیان کی گئی ہے یعنی صرف سماعی اسناد ہے تو اُسے معنعن کہتے ہیں۔
(۸) اگر کسی حدیث میں کوئی ایک راوی بھی غیر متعین ہے۔ تو اُسے مبہم کہتے ہیں۔

اس کے علاوہ ایک اور تقسیم باعتبار طریق روایت بھی کی گئی یعنی ایک ہی حدیث کتنے لوگوں نے علحدہ علحدہ بیان کی ہے۔ یعنی

(۱) اگر کوئی حدیث علحدہ علحدہ بہت سے لوگوں نے بیان کی ہے اور وہ سب ثقہ و معتبر ہیں تو اسے متواتر کہتے ہیں۔
(۲) اگر کم از کم تین معتبر طبقوں کے راویوں نے اسے بیان کیا ہے تو مشہور کہتے ہیں۔

(۳) اگر علحدہ علحدہ دو راویوں نے روایت کی ہے تو عزیز کہتے ہیں۔

(۴) اگر ایک ہی راوی ہے تو آحاد کہتے ہیں۔

(۵) اگر صرف ایک تابعی نے روایت کی ہے تو غریب مطلق کہتے ہیں۔

ہر چند یہ تمام تقسیمیں جو بیان کی گئی ہیں ان پر تمام علماء کا اتفاق نہیں ہے اور مفہوم کے لحاظ سے ائمۂ فن باہدگر مختلف ہیں۔ لیکن ہمارا مقصود اس اظہار سے صرف یہ بتانا ہے کہ احادیث کی چھان بین میں کتنی کاوش سے کام لیا گیا اور رسول اللہ یا صحابہ کے اقوال وافعال کا صحیح علم حاصل کرنے کے لئے کس قدر بلیغ کوششیں صرف کی گئیں۔

اول اول یہ دستور تھا کہ احادیث زبانی روایت سے حاصل کیجاتی تھیں یعنی اگر معلوم ہوجاتا تھا کہ کسی شخص کو کسی حدیث کا علم ہے تو شائقین اس کے پاس جاتے تھے اور اس سے سُنکر یاد کر لیتے تھے، یا یہ ہوتا تھا کہ راوی کسی حدیث کو بیان کرتا تھا اور لوگ اسے لکھ لیتے تھے اور دوبارہ اس کو سُنا کر اگر کوئی غلطی ہوتی تو صحت کر لیتے تھے اور راوی اس کی شرح بھی بیان کر دیتا تھا۔ پھر وہ لوگ جو احادیث کو اس طرح قلمبند یا یاد کر لیتے تھے وہ دوسروں کو اسی طور سے بتاتے تھے، حتےٰ کہ رفتہ رفتہ زبانی روایت کا دستور بند ہوگیا اور تحریری روایت کا رواج قایم ہوگیا۔

جمع احادیث کی اول اول یہ صورت تھی کہ راوی یا رجال کے لحاظ سے اُن کی ترتیب قایم کی گئی، اور ایسے مجموعہ کو مُسند کہتے تھے، چنانچہ اس سلسلہ میں "مُسند احمد بن حنبل" خاص شہرت رکھتا ہے لیکن بعد کو متن کے مفہوم کے لحاظ سے ترتیب قائم کی گئی اور ایسے مجموعوں کا نام "مُصنّف" قرار پایا۔ اس قسم کے مجموعوں میں بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ خاص مرتبہ کی چیزیں سمجھی جاتی ہیں۔
علی الخصوص بخاری و مسلم جو صحیحین کے نام سے موسوم ہیں کہ اگر ایک بھی کوئی روایت ان دونوں میں پائی جائے تو پھر اس سے انکار کرنے کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہتی۔ حضرات شیعہ کے نزدیک صرف وہ روایات قابل اعتبار ہیں جو جناب علی یا اُن کے متبعین کے وساطت سے پہونچی ہیں، چنانچہ اسی اُصول کے لحاظ سے حسب ذیل پانچ کتابیں ان کے یہاں مرتب ہوئی ہیں:-

(۱) الکافی محمد بن یعقوب الکلینی کی (۲) من لایحضرہ الفقیہ محمد بن علی بابویہ القمی کی۔ (۳) تہذیب الاحکام، (۴) الاستبصار فی ما اختلف فیہ الاخبار محمد الطوسی کی (۵) نہج البلاغہ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اقوال

جناب علی کا مجموعہ ہے۔ یہاں تک جو کچھ لکھا گیا اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ کتب احادیث کی تدوین میں کتنی محنت و کاوش سے کام لیا گیا لیکن آپ حیران ہو جائیں گے جب میں یہ کہوں گا کہ باوجود اس تمام حزم و احتیاط کے بھی کتب احادیث کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں اور اُن پر آنکھ بند کرکے اعتقاد نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے متعدد وجوہ ہیں، تاریخی و سیاسی بھی اور نفسیاتی بھی۔

جس وقت آپ غور کریں گے کہ روایت احادیث کی ابتدا کب سے ہوئی تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ یہ زمانہ وہ تھا جب رسول اللہ کی وفات کے بعد، اسلام کا دائرۂ اثر وسیع ہوتا جا رہا تھا اور اس کی سلطنت و حکومت پھیلتی جا رہی تھی، مسیحی مذہب کے پیرو، موسوی مسلک کے متبعین، فلسفۂ یونان کے ماننے والے، ایران کے آتش پرست اور بودھ مذہب کے تارک الدنیا لوگ، سبھی سے مسلمانوں کو واسطہ پڑ رہا تھا اور اُن سب کے تمدن و اخلاق، مذہب و اعتقاد کے مقابلہ میں اُن کو اسلام کا مطالعہ کرنا اور اسلامی شریعت کا منضبط کرنا ضروری تھا، پھر ظاہر ہے کہ انھیں بات بات میں غور کرنے کی ضرورت ہوتی ہوگی کہ رسول اللہ کا فلاں امر میں کیا طرز عمل تھا، کیا ہدایت فرمائی تھی اور یہی وہ چیز تھی جس نے روایت احادیث کی بنیاد ڈالی۔ پھر چونکہ رسول اللہ کی آنکھ بند ہوتے ہی لوگوں میں باہم اختلاف پیدا ہو گیا تھا، اور ہر جماعت اپنی تائید میں رسول ہی کی حدیث کو پیش کرنی زیادہ موثر جانتی تھی، اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ رسول اللہ کی وفات کے بعد ہی روایت حدیث و وضعِ حدیث کی بنیاد پڑ گئی۔ کیونکہ جب دو مخالف جماعتوں میں سے ہر ایک اپنی موافقت میں حدیث پیش کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ اُن میں سے ایک ضرور کوئی جھوٹی ہوگی اگر دونوں نہ ہوں۔ پھر صحابہ کے بعد جب عہد بنی اُمیہ و بنی عباس میں مصالح سیاسی کے لحاظ سے ہر ایک جماعت کو اپنی تائید میں بہت زیادہ ضرورت نقل احادیث کی پڑنی تو اسوقت مستقل ٹکسالیں وضع حدیث کی قائم ہو گئیں اور حکومت کے اثر، روپیہ کے زور سے جس امیر و خلیفہ نے جس قسم کی حدیث کی ضرورت ہوئی فوراً ڈھلوالی۔ چنانچہ کتب تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ خود امراء کے پاس جا جا کر کہا کرتے تھے کہ اگر کسی حدیث کی ضرورت ہو تو مہیا کر دی جائے۔ اسی کے ساتھ چونکہ حدیث روایت کرنے والوں کی سوسائٹی میں بہت عزت کی جاتی تھی اس لئے لوگوں میں بالطبع یوں بھی اس طرف رغبت پیدا ہوئی۔

اسی سلسلہ میں نفس روایت کی اہمیت پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔ یعنی جو احادیث روایت کیگئی ہیں وہ بالفاظ رسول روایت ہوئی ہیں یا صرف مفہوم لے لیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کتب احادیث کی تدوین رسول اللہ

سے کم از کم دو سو سال بعد شروع ہوئی ہے اور یہ امر کسی طرح قرینِ عقل و قیاس نہیں کہ اتنے زمانہ کے بعد درجنوں راویوں کے ذریعہ سے جو روایتیں فراہم کی گئی ہیں اُن کا مفہوم بھی وہی باقی رہا ہوگا جو رسول اللہ کا مقصود تھا، چہ جائیکہ الفاظِ نبوی ـــــ ہمارا روز کا تجربہ ہے کہ ایک ہی بات مختلف لوگوں کی زبان سے خدا معلوم کیا سے کیا ہو جاتی ہے اور ہر راوی خود اپنی عقل آرائی سے کام لیکر اصل مفہوم میں ضرور کچھ نہ کچھ تصرف کر دیتا ہے۔

غور فرمائیے کہ رسول اللہ چار آدمیوں کے سامنے کسی وقت کوئی بات ارشاد فرماتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک علٰحدہ علٰحدہ اس کا ایک مفہوم قرار دیکر اس کی روایت کرتا ہے، پھر کیا یہ ممکن ہے کہ سب کے سب کسی ایک بات پر متفق ہوں یا سب نے رسول اللہ کا حقیقی مدعا معلوم کر لیا ہو، یا اُن کے الفاظ یاد رکھے ہوں۔ پھر اسی کے ساتھ جس وقت اس امر پر غور کیا جائے گا کہ اسوقت رسول اللہ کا لب و لہجہ کیا تھا، کس سلسلۂ سخن میں کیا بات ارشاد ہوئی تھی، آپ کا روئے سخن کس طرف تھا تو یہ اُلجھنیں اور زیادہ بڑھ جاتی ہیں اور کبھی کسی حدیث کے متعلق یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ رسول اللہ ہی کا ارشاد ہے۔ یہی سبب تھا کہ متقدمین صحابہ میں سے بعض اسرے سے روایت احادیث ہی کو پسند نہ کرتے تھے اور بعض محدثین نے روایت بالمعنی کو کبھی جایز قرار نہیں دیا۔ لیکن ضرورتِ زمانہ نہ روایت احادیث سے لوگوں کو باز رکھ سکی اور نہ روایت بالمعنی کی روک تھام ہو سکی۔

رسول اللہ کے بعد تاریخ اسلام میں جتنی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں، وہ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں، آپ کی آنکھ بند ہوتے ہی خلافت کے مسئلہ میں دو گروہ پیدا ہو گئے اور ہر چند بظاہر اُن میں کوئی تصادم تو نہیں ہوا لیکن دل دونوں کے علٰحدہ تھے، خلیفۂ اول کے بعد جب خلیفۂ دوم کے انتخاب کا وقت آیا تو اس اختلاف میں اور زیادہ قوت پیدا ہوئی، یہاں تک کہ خلیفۂ ثالث کے زمانہ میں یہ پوری طرح نمایاں ہو گیا اور خلیفۂ چہارم کے عہد میں کھلم کھلا ٹھن گئی، پھر غور فرمائیے کہ جب اتنی مختلف جماعتیں موجود ہوں اور علویین و خوارج، اموئین و عباسیین وغیرہ کے متصادم اغراض نے شیرازہ کو درہم برہم کر رکھا ہو اور ایک ہی سرزمین کے باشندے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں۔ تو ایسے زمانہ میں احادیث کی روایت کیا اہمیت رکھ سکتی ہے جبکہ ہر ایک اپنی موافقت میں احادیث ہی کو پیش کرتا تھا۔ اسلام میں نماز سے زیادہ اہم عبادت کوئی نہیں جسے رسول اللہ روزانہ متعدد بار ادا کرتے تھے، لیکن انھیں اختلاف روایات کے وجہ سے آج ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ رسول اللہ

رات دن میں کتنی بار نماز پڑھتے تھے اور کس طرح پڑھتے تھے، کوئی کہتا ہے کہ آپ ہاتھ کھول کر ادا کرتے تھے اور کوئی ہاتھ باندھ کر ادا کرنے کا قایل ہے۔ کوئی رفع یدین کرتا ہے، کوئی نہیں، کوئی آمین بالجہر کا موید ہے کوئی مخالف پھر جب نماز ایسی اہم چیز کا صحیح حال انھیں اختلاف احادیث کے وجہ سے نہ معلوم ہو سکا تو اور دوسری باتوں کا کیا ذکر ہے۔

آپ صحیحین کو اٹھا کر دیکھئے جو سنیوں میں نہایت معتبر کتابیں حدیث کی سمجھی جاتی ہیں، آپ کو معلوم ہوگا کہ اہم ترین مسایل میں بھی بآں ہمہ گر متعارض و مخالف احادیث ان میں پائی جاتی ہیں، چہ جائیکہ فروعی مسائل کہ اگر ان میں کوئی شخص احادیث کی پابندی کرے تو ایک ہی وقت میں کافر و مسلمان دونوں بن سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ امام بخاری وغیرہ نے وہی احادیث جمع کی ہیں جو ان کے اعتقاد و یقین کے مطابق صحیح تھیں اور یہ بھی درست ہے کہ انھوں نے کافی تحقیق و تنقید سے کام لیا، لیکن یہ دعویٰ کرنا کہ اب اس میں چون و چرا کی گنجایش باقی نہیں ہے، اُسی وقت درست ہو سکتا ہے جب یہ مان لیا جائے کہ جتنی عقل و فراست تھی وہ سب بخاری پر ختم ہوگئی اور ان کے بعد کوئی صاحب عقل پیدا ہی نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے، لیکن اگر یہ تسلیم کرنا بجائے خود عقل کے منافی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آج بھی کتب احادیث تنقید کا محل نہ قرار پائیں اور آنکھ بند کر کے اُن کو تسلیم کر لیا جائے خواہ وہ کتنی ہی معارض، کتنی ہی خلاف عقل اور کتنی ہی مضحکہ خیز کیوں نہ ہوں۔

روایت کے ساتھ ساتھ ائمہ فن نے چند اُصولِ درایت بھی مقرر کر دئے ہیں، چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے عجالۂ نافعہ میں جن اصول درایت کا ذکر کیا ہے ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ:۔

(۱) اگر کوئی روایت تاریخ مشہور کے خلاف ہو تو صحیح نہیں

(۲) اگر وقت و حال کا قرینہ اس کے خلاف ہو تو بھی باور نہ کرنا چاہئے۔

(۳) اگر مقتضائے عقل و شرع کے خلاف ہو تو بھی ایسی حدیث قابل اعتبار نہیں۔

(۴) اگر کوئی ایسی بات بیان کی جائے جو رسول اللہ کے اخلاق کے منافی ہے تو بھی اسے رد کر دینا چاہئے۔

اسی طرح امام سخاوی نے ابن جوزی سے جو اصول درایت بیان کئے ہیں وہ بھی قریب قریب اسی کے ہیں۔ لیکن آپ کتب احادیث کو اٹھا کر دیکھئے اور خود فیصلہ کیجئے کہ ان میں کتنی حدیثیں اُصول درایت کے معیار پر ٹھیک اُترتی ہیں۔ شاید ہزار میں دس بیس!

اگر احادیث کی تقسیم ان کے مطالب کے لحاظ سے کیجائے تو حسب ذیل بڑی بڑی تقسیمیں ہو سکتی ہیں۔

۱۔ تعلیم عقاید و عبادت و اخلاق۔
۲۔ پیشین گوئیاں اور قصص و حکایات۔
۳۔ احکام شریعت یا معاشری قانون۔
۴۔ مابعد الطبیعیات (یعنی حیات بعد الموت اور دوزخ و جنت، عذاب و ثواب وغیرہ وغیرہ)

ظاہر ہے کہ ان ابواب میں سب سے زیادہ محفوظ و ناقابل اعتراض باب اگر کوئی ہوسکتا ہے تو پہلا ہے، لیکن افسوس ہے کہ وہ بھی اپنی جزئیات میں اختلافات سے خالی نہیں اور روایتاً و درایتاً اس پر بھی تنقید ہوسکتی ہے۔

دوسرا باب بالکل اسرائیلی روایات سے بھرا ہوا ہے اور چونکہ عیسوی و موسوی مذہب کے اثرات رسول اللہ کے بعد بھی بہت کچھ باقی تھے اس لئے لوگوں نے ان مذاہب کی روایتوں کو نقل کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا اور اس کی توثیق کے لئے ان روایتوں کو رسول اللہ سے منسوب کردیا۔ پیشین گوئیوں کی حدیثیں جتنی ہیں وہ سب ناقابل اعتبار ہیں، کیونکہ ہر زمانہ میں ہر شخص نے اپنے اغراض و مقاصد کے لحاظ سے ایسی حدیثیں گھڑ کر مطلب برآری کرنا چاہی ہے۔

احکام شریعت کے متعلق بھی احادیث میں بکثرت اختلاف و تضاد پایا جاتا ہے اور اسی لئے اسلام کی فقہ میں کئی اسکول ہوگئے ہیں۔ پھر چونکہ ہر اسکول اپنی تائید میں احادیث ہی پیش کرتا ہے اس لئے لامحالہ ان سب کو موضوع قرار دیا جائے گا، کیونکہ اب یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ واقعی رسول اللہ نے کیا ارشاد فرمایا تھا۔

وہ احادیث جو مابعد الطبیعیات سے متعلق ہیں وہ بھی یکسر موضوع ہیں اور اسلام میں جو غیر مذاہب کے عناصر شامل ہوگئے تھے اُن کے زیر اثر یہ سب کچھ بعد کو بڑھایا گیا ہے۔ کیونکہ اس سلسلہ میں جو کچھ بیان کیا جاتا ہے، وہ اس سے مختلف نہیں ہے جو مذاہب قدیمہ کے خرافیات میں پایا جاتا ہے۔

ان حالات کے ماتحت اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ یا تو تمام کتب احادیث کو سامنے رکھ کر از سر نو جدید معیارِ تنقید کے لحاظ سے پوری طرح ریسرچ کیا جائے اور واقعی جو احادیث رسول اللہ کی ہوں انھیں متعین رکھ کر باقی کو نظر انداز کردیا جائے اور اگر یہ ممکن نہیں ہے (اور یقیناً ممکن نہیں ہے کیونکہ ہمارے یہاں کے علماء کو نہ اس کا سلیقہ ہے نہ ضرورت) تو پھر محفوظ صورت یہ ہے کہ اسلام و اصول اسلام کا مطالعہ احادیث سے بالکل علیحدہ ہوکر کیا جائے۔

کسی قول یا فعل کو رسول اللہ سے منسوب کردینا اتنی بڑی ذمہ داری کا کام ہے کہ دوسری تیسری صدی

ہجری میں امام بخاری وغیرہ تو اس کو بیباکانہ انجام دے سکتے تھے جب عقول انسانی زیادہ ترقی یافتہ نہیں اور مذہب کے مفہوم سے قدامت پرستی وتجسّس پرستی جدا نہ ہوئی تھی، لیکن آج اس زمانہ میں جبکہ علوم وفنون کی ترقی نے خدائی کے ہزاروں چھپے ہوئے راز بے نقاب کردئیے ہیں یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم کوہ قاف کے متعلق رسول اللہ کی اس حدیث کو صحیح باور کرلیں گے کہ وہ ایک زمرد کا پہاڑ ہے جس کے انعکاس سے آسمان نیلگوں نظر آتا ہے اور جس کے چاروں طرف فرشتے زنجیریں ڈالے ہوئے بیٹھے ہیں، اور جب وہ زنجیریں کھینچتے ہیں تو زلزلہ آجاتا ہے۔

پھر چونکہ کتب احادیث اسی قسم کے خلاف عقل باتوں سے بھری پڑی ہیں اس لئے اب دو ہی صورتیں رہجاتی ہیں یا تو انھیں رسول اللہ سے منسوب کرکے رسول کی توہین کیجئے یا احادیث سے قطع نظر کرکے منکر بخاری ہونے کا الزام گوارا فرمائے۔ میں چونکہ رسول اللہ کی ذات گرامی کو بخاری وغیرہ سے ارفع سمجھتا ہوں، اس لئے ظاہر ہے کہ میں احادیث کا قایل کیونکر ہو سکتا ہوں۔

# مطبوعات موصولہ

**تاریخ مرثیہ گوئی**

یہ مختصر سا رسالہ ہے جس میں جناب حامد حسن قادری نے مرثیہ گوئی پر تنقیدی اظہار خیال کیا ہے۔ ابتدا میں عربی و فارسی کی مرثیہ گوئی کے نہایت ہی مختصر بلکہ مقتصر ذکر کرتے ہوئے اُردو مرثیہ گوئی کے سلسلہ میں خاندان انیس کو لے لیا ہے اور اسی پر یہ رسالہ ختم ہو جاتا ہے۔ مختلف مرثیوں کا اقتباس بھی پیش کیا گیا ہے۔

چونکہ یہ کتاب جناب قادری نے بہت عجلت میں لکھی ہے (جیسا کہ دیباچہ میں انھوں نے خود ظاہر کیا ہی) اس لئے ظاہر ہے کہ اسے ناکمل ہونا چاہئے۔ ہمیں حیرت ہے کہ قادری صاحب نے اسکول کے پبلشروں کے تعمیل ارشاد میں اپنے ذوق و استعداد کی رسوائی کیونکر گوارا کی۔ یہ کتاب گیا پرشاد اینڈ سنز آگرہ سے مل سکتی ہے۔

**ہندوستانی لسانیات**

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ام۔ اے، پی۔ ایچ ڈی، سے ناظرین نگار ناواقف نہیں۔ نگار کے دور وسطےٰ میں آپ کے تحقیقی ادبی مضامین اکثر نگار میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ کتاب آپ ہی نے تصنیف کی ہے اور موضوع کے لحاظ سے بالکل نئی چیز ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کے پہلے حصہ میں زبان کے مقاصد اور اس کے ارتقاء پر اصولی گفتگو کرتے ہوئے زبانوں کی تقسیم پر بحث کی ہے اور دوسرے حصہ میں اُردو کی آفرینش اس کی تدریجی ترقی اور مستقبل پر ناقدانہ و محققانہ روشنی ڈالی ہے۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب موصوف کا موضوع ہمیشہ سے تحقیق زبان ہی رہا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ انھوں نے اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہوگا وہ ایسی چیز نہ ہوگی جو ہر جگہ مل سکے، جابجا نقشے دے کر ہندوستان کی مختلف زبانوں کی وسعت و انتشار کو بھی سمجھایا گیا ہے اس کی قیمت ۱۲ عہ ہر چند حجم کے لحاظ سے زیادہ ہے۔ لیکن کتاب کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اس کو اور زیادہ گراں ہونا چاہئے تھا۔ یہ کتاب مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد سے مل سکتی ہے۔

**جامعۂ عثمانیہ کے فرزندوں کی اُردو خدمات** ۴۴ صفحات کا رسالہ ہے جس میں ڈاکٹر محی الدین قادری صاحب نے بتایا ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کے طلبہ نے اس وقت تک اُردو زبان کی کیا خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت تک وہاں کے فارغ التحصیل طلبہ نے مختلف علوم و فنون کی (مطبوعہ و غیر مطبوعہ) ۲۴۵ کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں زیادہ حصہ تاریخ، جغرافیہ و معاشیات کا ہے، اس کے بعد تذکرہ پر زیادہ توجہ صرف کی گئی اور پھر شعر و شاعری پر۔۔۔ طبیعیات، کیمیا اور ریاضی کی کتابیں بھی فہرست میں نظر آتی ہیں اور فلسفہ و اسلامیات کی بھی ـــــ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ہندوستان کی کسی اور درسگاہ نے اتنی قلیل مدت میں اسقدر اہم خدمات انجام دی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جامعۂ عثمانیہ نے دکن میں ایک نئی روح پیدا کر دی ہے اور اگر وہاں کا ماحول جمالیاتی ذوق پیدا کرنے کا زیادہ اہل ہوتا تو اس میں کلام نہیں کہ یہی خدمات خدا جانے کتنی اہمیت اختیار کر لیتیں۔

**Les Contes Du Hub Tarang.** میاں خوب محمد چشتی احمد آبادی ایک صوفی تھے جو سولھویں صدی عیسوی میں پائے جاتے تھے۔ یہ شاعر بھی تھے۔ انھوں نے صوفیانہ رنگ کی مثنوی خوب ترنگ کے نام سے ۱۵۱۵ء میں لکھی تھی۔ اس کو جناب ڈاکٹر محی الدین قادری صاحب نے ایڈٹ کر کے شایع کیا ہے۔ ابتدا میں مختصر سا دیباچہ بھی فرانسیسی زبان میں تحریر کیا گیا ہے جس میں مصنف کا نہایت مختصر سا حال دیکر مثنوی کی تقسیم پر بحث کی ہے۔ اگر اس دیباچہ کا ترجمہ اُردو میں بھی کر دیا جاتا تو اہلِ ملک کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوتا۔ تحقیق زبان کا ذوق رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں۔

**محمد رسول اللہ** یہ ایک لکچر ہے جو جناب محمد ابراہیم صاحب سب جج نے ڈیرہ غازی خاں میں بتقریب جلسۂ یوم النبی پڑھا تھا۔ اس کا موضوع یہ ثابت کرنا ہے کہ رسول اللہ نے بنی نوع انسان پر کیا احسانات کئے اور فاضل لکچرر نے اس میں زیادہ تر رسم غلامی کو سامنے رکھ کر اس موضوع پر بحث کی ہے۔

رسالہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قابل مقرر کا مطالعہ اس باب میں بہت وسیع ہے اور تاریخی و تمدنی حیثیت سے بحث کا کوئی پہلو انھوں نے نہیں چھوڑا ہے۔ اسوقت تمام دُنیا جس چیز کے لئے بیتابانہ دوڑ رہی ہے وہ آزادی ہے اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس شاہد کی سب سے پہلی جھلک جس نے دکھائی وہ

محمد کی ذات تھی۔

مضمون نہایت قابلیت سے لکھا گیا ہے اور ہر شخص کے نگاہ سے گزرنے کے قابل ہے۔ یہ رسالہ دفتر بلاغ امرتسر سے ۳ر کے ٹکٹ بھیجنے پر مل سکتا ہے۔

**مذہب باب و بہا حصۂ اول** امامیہ مشن کا سولھواں تبلیغی رسالہ ہے جس میں مذہب باب و بہا کے نشو و نما پر بحث کرتے ہوئے اس مسلک کے بانیوں کی کمزوریوں کو دکھایا گیا ہے، ظاہر ہے کہ ایک تبلیغی رسالہ میں سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے، اپنی آنکھ کا شہتیر نکالنے سے پہلے دوسروں کی آنکھ کا تنکا نکالنا ہمیشہ سے مبلغین مذاہب کا شعار رہا ہے۔ چونکہ ہم اصولاً تبلیغ کے سخت مخالف ہیں خواہ وہ مسلمانوں کی طرف سے ہو یا ہندوؤں کی طرف سے اس لئے افسوس ہے کہ ہم اس کے مطالعہ کی سفارش نہیں کر سکتے۔ اس کی قیمت ۵ر ہے اور سکریٹری امامیہ مشن لکھنؤ سے مل سکتا ہے۔

**چراغ امین** جناب فکری سلطان پوری کے نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جناب فکری اپنے آپ کو اصغر و جگر کا تتبع ہونا ظاہر کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ ایک کے "اسرار سخن" اور دوسرے کے رندانہ ولولہ کو اپنے کلام سے ظاہر کر سکیں۔

فکری صاحب آج کل کے نوجوان شعراء میں سے ہیں اور کافی اہلیت ترقی کی رکھتے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ انھوں نے اپنا مجموعہ شایع کرنے میں غیر معمولی عجلت سے کام لیا اور ایک اُن پر کیا موقوف ہے اسوقت ہر نوخیز اہل قلم اسی خبط میں مبتلا ہے اور طلب شہرت کے جذبہ سے بیتاب ہو کر وہ کبھی اس حقیقت پر غور نہیں کرتا کہ کسی تصنیف کے شایع کرنے کا زمانہ عمر کے چالیس سال گزر جانے کے بعد آتا ہے ۔۔۔ اس کی قیمت عہ ہے اور کنور احمد اعتبار حسین خاں ہارمیؤ ضلع سلطان پور سے مل سکتا ہے۔

**مساوات اسلامیہ** ۹۶ صفحات کا رسالہ ہے جسے جناب شبیر محمد قادری کاکوروی نے مرتب کیا ہے موضوع نام سے ظاہر ہے۔ اس زمانہ میں جبکہ ہندوؤں میں چھوت اچھوت کا مسئلہ پیش ہے یہ کتاب بہت برمحل ہے اور مسلمانوں کے سامنے درس عبرت و بصیرت پیش کرتی ہے۔ کہ وہی قوم جس نے سب سے پہلے تفریق نسل و امتیاز کو مٹانا چاہا تھا، وہی آج اس میں مبتلا نظر آتی ہے ۔۔۔ کتاب مطالعہ کے قابل ہے۔ قیمت ۶ر ہے اور مؤلف سے نظیر آباد لکھنؤ کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

**ہمدرد صحت دہلی** ایک طبی ماہوار رسالہ ہے جو کچھ عرصہ سے دہلی سے شایع ہو رہا ہے۔ اس نے حال ہی میں اپنا "اعادۂ شباب" نمبر ۲۰۰ صفحات پر شایع کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بہت محنت سے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ اس میں "تجدید شباب" پر علمی و اصولی بحث بھی پائی جاتی ہے اور عملی و تجربی بھی۔ یادش بخیر ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب کے بھی تین مضمون اس میں نظر آتے ہیں، جو اسوقت ہندوستان کے واحد "مجدد شباب" ہیں اور جنھوں نے حال ہی میں لکھنؤ کے ایک صاحب پر تجدید شباب کا آپریشن کر کے اپنی خداقت فن کو سب سے تسلیم کرالیا ہے۔ اس کا معمولی اڈیشن ۶ ؍ میں ہمدرد منزل لال کنواں دہلی سے ملسکتا ہے۔

**موتی** مجموعہ ہے حکیمانہ و شاعرانہ اقوال کا جسے سید یوسف بخاری صاحب دہلوی نے مرتب کر کے نہایت پاکیزہ طباعت و کتابت کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ابتدا میں جناب اختر انصاری کا تعارف نامہ ہے اور پھر راشد الخیری صاحب اور خواجہ حسن نظامی صاحب کا تبصرہ۔۔ اس کے بعد قابل مولف نے ایک مقدمہ کے ذریعہ سے "اقوال" کے فلسفہ و تاریخ کو پیش کیا ہے اور پھر اقوال کا انتخاب ہے۔ انتخاب جو سو سے زاید عنوانوں پر مشتمل ہے بہت دلچسپ و مفید ہے۔ اچھا ہوتا اگر ہر قول یا فقرہ کے سامنے یہ بھی ظاہر کر دیا جاتا کہ کہاں سے لیا گیا ہے۔ اس کی قیمت ۱۲ ؍ ہے اور جناب سید محمد بخاری سے گلی امام، جامع مسجد دہلی کے پتہ پر ملسکتا ہے۔

**قانون مباشرت** یہ کتاب ڈاکٹر فضل مبین احمد صاحب دہلوی نے مرتب کی ہے۔ موضوع نام سے ظاہر ہے لیکن ۴۰۰ صفحات میں زیادہ سے زیادہ ۴۰ صفحات اصل موضوع پر نظر آتے ہیں باقی صفحات جنسی کمزوریوں اور ان کے علاج کے لئے وقف ہیں۔ آلات جنسی کی طبی تشریح بھی ذریعۂ نقوش ظاہر کی گئی ہے اور ممسکات و ملذذات وغیرہ کے ساتھ ساتھ بعض امراض سوداوی کا علاج بھی بتایا ہے۔ اگر اس کتاب سے نسخوں کو نکالدیا جائے تو کتاب صرف چند صفحات کی رہجائے اسلئے ہماری رائے میں اس کا نام بجائے "قانون مباشرت" کے اگر "مجموعۂ نسخہ جات" رکھا جاتا تو زیادہ موزوں تھا۔ اب رہا یہ امر کہ نسخے کیسے ہیں اس کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے جبکہ اسی قسم کے سیکڑوں نسخے ہر طبی رسالہ اور ہر طبی کتاب میں آج کل نظر آتے ہیں طباعت و کتابت اچھی ہے لیکن چار روپیہ قیمت بھی بری نہیں۔ یہ کتاب دفتر معارف طبیہ رودگران دہلی سے مل سکتی ہے۔

**محبت کے پھول** ترجمہ ہے ٹیگور کے ڈرامہ کا جسے جناب فرید مچھلی شہری نے اردو میں منتقل کیا ہے۔ ترجمہ بہت صاف و شگفتہ ہے۔ البتہ ایک آدھ جگہ فارسی اردو کے اشعار استعمال کئے گئے ہیں وہ بے محل ہیں۔ قیمت ۸ ؍ ہے اور ۹۲ بلند ہو، الہ آباد کے پتہ سے ملسکتا ہے۔

# کیوپڈ و شاعر

## شاعر:-

اے کماں دارِ محبت اے شرارِ دل فروز — اے کہ تیری ہر نظر صد جلوۂ محفل فروز
تیرے تیروں سے جبینِ حسن پر سوداغ تھے — تیرے ترکش کی ہدف تھی لیلیٔ محمل فروز
تھیں ثریا کے تبسم میں تری انگڑائیاں — کسب کرتا تھا تری ضو سے مہِ کامل فروز
ہر ترنم تیرا سازِ حسن کی تھی زندگی — راہِ اُلفت میں تری ہر ہر ادا منزل فروز
رہبری سے تیرے طوفاں کیسے کیسے مٹ گئے — تو اندھیری رات میں اک شمع تھا ساحل فروز

شورشوں سے تیری رونق عشق کی محفل میں تھی
آگ تھا تو اور تیری ہی آگ سب کے دل میں تھی

اب مگر کچھ سرد سی ہے گرمیٔ بازارِ عشق ، — عرصۂ ہستی میں گویا بند ہے پیکارِ عشق
ظلمتیں مایوسیوں کی دل پہ ہیں چھائی ہوئیں — کارفرما اب نہیں آتے نظر انوارِ عشق
اب مسلط ہیں نگاہِ عشق پر لاکھوں حجاب — اب کسی سینے میں پنہاں ہی نہیں اسرارِ عشق
کیا خبر تھی ایک دن یوں انقلاب آجائے گا — آہ کیا معلوم تھا بدلیں گے یوں اطوارِ عشق
حُسنِ عشوہ ساز کی نذریں نہیں ہوتیں قبول — اب کہیں بھی منعقد ہوتا نہیں دربارِ عشق
اب درائے کارواں سے وادیاں خاموش ہیں — اب نہیں پیوست پائے راہرو میں خارِ عشق
اب کہاں وہ شورشِ دار و رسن کی شوخیاں — زنگ ہی زنجیر میں خالی پڑی ہے دارِ عشق
چھن گیا فطرت سے کیا وہ رتبۂ عالی ترا — آہ کیا تیروں سے ترکش ہوگیا خالی ترا!

**کیوپڈ:۔**

مجھ کو فطرت نے بنایا پاسبانِ زندگی ‏— میرے قدموں میں بچھایا گلستانِ زندگی
خواب سے اجسام کو بیدار میں نے کر دیا ‏— ہر نظر سے میری لرزا آسمانِ زندگی
نصب میں نے اس کے خیمے تا بہ منزل کر دئے ‏— جب چلا میرے قدم پر کاروانِ زندگی
حسن سے سجدے کرائے میں نے پائے عشق پر ‏— عشق کو میں نے بنایا رازدانِ زندگی
بلبلِ بیتاب کو میں نے دیا درسِ فغاں ‏— باغ میں گل کو بنایا نغمہ خوانِ زندگی
بیستوں اور نجد میں قائم ہوا رایت مرا ‏— جمع جس کے سائے میں تھا اک جہانِ زندگی

یوں مرتب زندگی جاودانی میں نے کی
عالمِ حسن و وفا پر حکمرانی میں نے کی

میرے ہی جلووں سے ہاں معمور تھا بازارِ حسن ‏— میرے ہی کاشانے کا اک نام تھا سرکارِ حسن
مصر اور یونان میں قائم کئے میں نے محاذ ‏— خسروی میں عشق کی برپا ہوئی پیکارِ حسن
منکرانِ عشق کو چو رنگ میں نے کر دیا ‏— خون اس کا پی لیا جس نے کیا انکارِ حسن
میں نے قوموں کے دلوں میں پھونک دی غیرت کی آگ ‏— چھا گئی افراد پر رخشانیِ آثارِ حسن
شام کو میں نے سجائی زلفِ رنگینِ شفق ‏— صبح کو میں نے بنایا مطلعِ انوارِ حسن
میں نے کی جنسِ وفا ارزاں بساطِ دہر پر ‏— میرے ناخن سے کھلا ہر عقدۂ دشوارِ حسن
مشرق و مغرب میں میخانے نئے قائم کئے ‏— کارفرما ہر طرف تھا جذبۂ سرشارِ حسن
حسنِ برہم کا مٹا ڈالا غرورِ عشوہ ساز ‏— عشق کے دل کو کیا میں نے امانت دارِ حسن

دہر میں بعد خدا فرمانروائی تھی مری
روح کی قوت سے دنیا میں خدائی تھی مری

عالمِ فانی میں آیا رفتہ رفتہ انقلاب ‏— نوحۂ ماتم سے بدلا نغمۂ چنگ و رباب
ابرِ ظلم گرد دہر پر لعنت ہوس کی چھا گئی ‏— حسن اب ناکام تھا اور عشق تھا ناکامیاب
خود غرض قوموں نے اپنی حق پرستی چھوڑ دی ‏— ذہن پر چھڑکی گئی مینائے باطل سے شراب
مادی راہیں بنائیں قافلوں نے ہر طرف ‏— ہو گیا یوں جادۂ روحانیت کا سدِ باب

حُسن کی آنکھوں میں اک خوابِ تغافل بھر گیا
عشق کا دل ہو گیا تشویش بے جا سے خراب

میں نے ترکش پر نظر ڈالی تو وہ خالی ملا
سرد ہو کر رہ گیا میری نظر کا التہاب

لوٹ لی اہلِ ہوس نے آہ وہ دنیا مری
حرص و پندار و خودی کے ڈالکر لاکھوں حجاب

تیر و پیکاں کے تصور سے بھی تھرّاتا ہوں میں
اب ہوس کے تیر اپنے دل پہ خود کھاتا ہوں میں

دیکھ وہ اک نوجواں مستِ بہارِ آرزو
جس کی نظروں سے عیاں ہو اضطرارِ آرزو

عشقِ صادق پہلے اسکی روح میں بیدار تھا
اب شبِ تاریک ہے اور خوابِ تارِ آرزو

عشق کے جذبوں سے پہلے تھا مقدس اسکا دل
اب اسے کہتی ہے دُنیا جرم کارِ آرزو

پہلے نازش تھی اسے سرگرمیِ جذبات پر
اب یہ ہے اعمالِ بد سے شرمسارِ آرزو

آرزو کی اس کے ہاتھوں ہو گئی مٹی خراب
کھو دیا اس کے تلوّن نے وقارِ آرزو

اب ہوس کی چھا رہی ہیں قلب پر تاریکیاں
پہلے اس کے دل میں روشن تھا شرارِ آرزو

تیر میرے کُند ہیں ترکش مرا بیکار ہے
اب مجھے خود تیر اندازی سے اپنی عار ہے

اب بھی اک ہستی فروغِ عالمِ ایجاد ہے
اب بھی اک دل زندگی کی آگ سے آباد ہے

اب بھی ہیں اک روح میں اسرار کی چنگاریاں
اب بھی اک سینہ فساد و حرص سے آزاد ہے

وہ تری ہستی ہے اے شاعر وہ پیکر ہے ترا
واقفِ رازِ غمِ عالم ہے اور ناشاد ہے

جانتا ہوں تو نے دُنیا کو جگایا خواب سے
گونج اُٹھی تیری صدا تاروں میں مجھ کو یاد ہے

وہ امانت آج میں تفویض کرتا ہوں تجھے
دل ترا جس کی تپش سے مائلِ فریاد ہے

محرمِ کاشانۂ الہام ہے تیری صدا
قوتوں پر روح کی قائم تری بنیاد ہے

کام جو مجھ سے نہیں ممکن اُسے انجام دے
جاگ اے شاعر کہ دُنیا خستۂ بیداد ہے

تیرے قبضے میں متاعِ دو جہاں دیتا ہوں میں
لے تجھے یہ تیر ترکش اور کماں دیتا ہوں میں

محمد صادق ضیاؔ۔ چینوٹی

# مشاہدات

سحر کے نور کا عالم لئے نگاہوں میں — ضیا بکھیرتا جاتا ہے کوئی راہوں میں
لبوں میں عنچۂ عہدِ شباب رخشاں ہیں — بہار جھوم رہی ہے حسین باہوں میں

---

شباب و شعر کی طغیانیوں کا ساماں ہے — نظر نظر میں شبِ ماہتاب غلطاں ہے
بنا ہوا ہے ہر اک عضو موجِ صہبا سے — تمھاری ذات طلسمِ بہارِ خنداں ہے

---

شام تھی اور شام کی تاریکیوں میں ہمنشیں — ساحلِ دریا پہ محوِ سیر تھی اک نازنیں
اُس کا پیکر، شام اور دریا حقیقی چیز تھے — بن گئے لیکن یہ سب مل جل کر اک خوابِ حسیں

---

اک سُبک رفتار لڑکی پیکرِ موجِ نسیم — اُس اندھیرے باغ کی اک کنج تنہا سے ندیم
آرہی تھی سایہ کی مانند اور دھندلی فضا — کر رہی تھی پیش مستقبل کی دنیائے عظیم

---

جب سیہ راتوں میں کالے بادلوں کے درمیاں — آنکھ جھپکاتی ہیں رہ رہ کر فلک پر بجلیاں
کپکپاتی روشنی کی مختصر ساعت میں بھی — دیکھ لیتی ہے نظر کتنے طلسماتی جہاں

عدم

# اعتماد

جتنا بھلاؤ گے مجھے
اتنا ہی یاد آؤں گا میں

ہے پردہ دارِ اعتنا بے اعتنائی عشق میں
ہوتی ہے بنیادِ وفا ہر بیوفائی عشق میں
جوہر شناسِ عشق ہے نا آشنائی عشق میں

ہستی ربابِ عشق کی
مضرابِ خاموشی سے ہے
شمعِ وفا کی زندگی
بادِ فراموشی سے ہے
نقشِ مرادِ عشق ہوں مٹ کر ابھر جاؤنگا میں
جتنا بھلاؤ گے مجھے
اتنا ہی یاد آؤں گا میں

---

دل کا سکوں لیجاؤں گا
دل سے بھلا کر دیکھ لو
داغِ جگر بنجاؤں گا
دامن بچا کر دیکھ لو
آنکھوں ہی میں چھپ جاؤں گا
آنکھیں چرا کر — دیکھ لو
ربطِ حبیب و آرزو... ٹوٹے، نہ ٹوٹا ہے کبھی
جذب لطیفِ رنگ و بو... چھوٹے، نہ چھوٹا ہے کبھی
سو بار بھی کھو دو، مگر!
کھویا نہیں جاؤں گا میں
جتنا بھلاؤ گے مجھے —

---

قیدیٔ زنجیرِ وفا!
دل بھی ہے اور دلدار بھی،
پابند جذبِ عشق ہیں،
مجبور بھی مختار بھی
اس میکدے میں ایک ہیں
مدہوش بھی، ہشیار بھی
پروانہ ہوں اور بالیقیں — پروانہ کر دونگا تمہیں
دیوانہ ہوں اور ایک دن
دیوانہ کر دوں گا تمہیں

---

بیتابیٔ دل کی قسم
تم کو بھی تڑپاؤں گا میں
جتنا بھلاؤ گے مجھے

بے خوابیاں دیکر مجھے
بے خواب ہو جاؤ گے تم
بیتابیاں دے کر مجھے
بیتاب ہو جاؤ گے تم
خلوت سے آؤ گے نکل جس روز چھپ جاؤنگا میں
جتنا بھلاؤ گے مجھے
اتنا ہی یاد آؤں گا میں

---

آخر تو ہوں چشم آشنا خواب پریشاں ہی سہی
باقی تو ہے کوئی کشش ربطِ گریزاں ہی سہی
دیکھو تو - پوسکار فو میر اگریباں ہی سہی

روش صدیقی

---

# نگار کے گزشتہ سالوں کے پرچے

حسب ذیل قیمت پر معہ محصول مل سکتے ہیں

ستمبر ۱۹۲۳ء ۴ر- اکتوبر ۴ر- جنوری ۱۹۲۴ء ۴ر- فروری ۴ر- مارچ ۴ر- اپریل ۴ر- مئی ۴ر- جون ۸ر- اگست ۴ر- جنوری ۱۹۲۶ء ۴ر- مئی ۴ر- جون ۴ر- اکتوبر ۴ر- نومبر ۴ر- دسمبر عہ- مارچ ۱۹۲۶ء ۴ر- اپریل ۴ر- مئی ۴ر- جون ۴ر- دسمبر ۱۹۲۸ء ۸ر- فروری ۱۹۲۹ء ۴ر- مارچ ۴ر- جون ۸ر- مارچ ۱۹۳۰ء عہ- مئی ۴ر- ستمبر ۴ر- اکتوبر ۴ر- نومبر ۴ر- دسمبر ۴ر- مئی ۱۹۳۱ء عہ- جولائی ۳ر- اگست ۳ر- ستمبر ۴ر- اکتوبر ۲ر- نومبر ۳ر- دسمبر ۲ر- جنوری ۱۹۳۲ء ۱۲ر- فروری ۴ر- مارچ ۴ر- اپریل ۸ر- مئی ۴ر- جون ۴ر- جولائی ۴ر- اگست ۴ر- ستمبر ۴ر- اکتوبر ۴ر- نومبر ۴ر- دسمبر ۴ر- جنوری ۱۹۳۳ء عہ- فروری ۴ر- جولائی ۴ر- اگست ۸ر- ستمبر ۸ر- اکتوبر ۴ر- دسمبر ۴ر-

منیجر نگار لکھنؤ

# آئندہ جنوری ۱۹۳۵ء کا نگار

دہلی و لکھنؤ اسکول کی تمام اصناف شاعری پر ایک بے مثل بسیط تبصرہ ہوگا اور یہ کہنا غالباً مبالغہ نہ ہوگا کہ اس سے قبل آپ کو کسی رسالہ میں نہ کسی مبسوط تصنیف میں اتنا مفصل تذکرہ دونوں اسکولوں کی شاعری کا یکجا نظر آیا ہوگا۔

ضخامت کے متعلق کوئی فیصلہ ابھی تک نہیں ہو سکا، کیونکہ تمام مضامین جو معیار پر صحیح اتریں گے وہ سب کے سب درج کئے جائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ اس کا حجم سیکڑوں صفحات تک پہونچ جائے۔ اس ایک پرچہ کی قیمت علیحدہ دو روپیہ سے کم نہ ہوگی، اس لئے آپ اپنی خریداری جاری رکھئے تاکہ یہ مجموعہ آپ کو بلا کسی مزید صرف کے مل سکے

منیجر نگار لکھنؤ

# لمعات

اللہ اللہ، رنگ ہے کیا تسکین افزا، ویرانوں کا — دانشِ حیراں ڈھونڈھ رہی ہے نقشِ قدم دیوانوں کا
گیتی کے نظارے گم ہیں، حسنِ ازل کے جلووں میں — ہستی اک مجموعہ ہے کچھ بھولے ہوئے افسانوں کا
سوزِ محبت یکساں تھا، وہ خاک اُڑے، یہ خون ہوا — دل ہی کی یہ ہمت تھی یہ کام : تھا پروانوں کا

اخترؔ دنیا بھیدوں سے معمور ہے اتنی، کیا کہئے
ہستی کوئی صداقت ہے یا عنواں ہے افسانوں کا

---

نکتہ چیں بھی ہے، ستم کیش و خود آرا کوئی — خامشی ہی سے کرے شرحِ تمنا کوئی
لاکھ ہر سانس میں ہو موت کا ہنگامہ بپا — دل سے جاتی ہے مگر حسرتِ دنیا کوئی
ننگ ہے اے نگہِ شوق وہ نظارۂ حسن — آپ جب تک نہ ہو مجبورِ تماشا کوئی
ذکرِ ماضی مگر اس حال میں کس طرح سنوں — نہ کہے مجھ سے یہ افسانہ خدارا کوئی
سعیِ اظہار سے کیا فائدہ اے حسرتِ دل! — دردِ پنہاں کو نہ سمجھے گا، نہ سمجھا کوئی
غم اُٹھانے پہ بھی سمجھا نہ مآلِ ہستی — سطح بیں، دہر میں مجھسا بھی نہ ہوگا کوئی

کیا کہوں بیکسیِ عالمِ ہجراں اخترؔ
دے تسلی بھی جو مجھ کو نہیں اتنا کوئی

---

چارہ کیا تھا رسمِ ابنائے زماں دیکھا کئے — ہم دلِ برباد کو محوِ فغاں دیکھا کئے
دل نے کی اک آہ، اور پھر جل کے خاکستر ہوا — اور ہم حسرت سے سوئے آسماں دیکھا کئے

رہبر دی میں کچھ اُٹھائے ناتوانی کے ستم — اور کچھ رنگِ جفائے ہمرہاں دیکھا کئے
چھوٹتی ہے کسکو ہمدم گردشِ رنگِ طرب — دامنِ ہمت تہِ سنگِ گراں دیکھا کئے
اور ہم سے بیکسوں کا کون ہوتا غمگسار — آپ ہی ہم اپنے مٹنے کا سماں دیکھا کئے
شاید اس طرزِ ستم کا نقطۂ آخر ہے موت — زندگی بھر دل کو صرفِ امتحاں دیکھا کئے
زندگی بھر دل نے پائے زخمِ تازہ کے مزے — اُن کو اپنے حال پر یوں مہرباں دیکھا کئے
چارۂ آخر کار کیا تھا ہم اسیرانِ قفس! — برق کے سائے میں اپنا آشیاں دیکھا کئے
زندگانی تھی ہماری گرچہ اک موہوم نقش — اس سُبک روحی پہ اُن کو سرگراں دیکھا کئے
زندگی محض اک تصور اور دنیا محض وہم — عمر بھر خوابِ بہشتِ جاوداں دیکھا کئے

چین جیتے جی نہ ہم کو مل سکا اختر کہیں
ہر جگہ روئے زمیں پر آسماں دیکھا کئے

اختر

---

## بہار

۲۳۶ صفحات کی نہایت ہی خوشنما چھپی ہوئی کتاب ہے جس میں جناب الیاس احمد صاحب ام اے، ال ال بی منصف سہارنپور نے تقریباً ۲۰۰ عنوانات پر بہترین اُردو فارسی شعروں کا انتخاب یکجا کر دیا ہے۔ ہر چند اس نوع کا انتخاب کوئی نئی چیز نہیں ہے لیکن اس سے قبل جتنی کوششیں کی گئیں ان میں دو نقص پائے جاتے تھے، ایک یہ کہ تنوع موضوع کے لحاظ سے وسیع استقصار نہیں کیا گیا اور دوسرے یہ کہ ذوق کی پاکیزگی کا بھی کم لحاظ رکھا گیا ۔ یہ کتاب دونوں نقایص سے پاک ہے یعنی انسانی زندگی کے تقریباً تمام پہلو سامنے رکھکر انتخاب کیا گیا ہے اور کتنا اچھا انتخاب کیا گیا ہے کہ بقول غالب اگر الیاس احمد صاحب کے "دل کا معاملہ" رسوائی کی حد تک پہونچ جائے تو کچھ دور نہیں۔ قیمت عہ اور ملنے کا پتہ معارف پریس اعظم گڑھ

## رہنمائے تعلیم جوبلی نمبر

ماسٹر جگت سنگھ صاحب پنجاب کے اُن لوگوں میں سے ہیں، جن کو اُردو زبان کی خدمت کا شوق عشق و شغف کی حد تک حاصل ہے۔ ایک ربع صدی سے زاید زمانہ گزرا کہ انھوں نے اپنا رسالہ جاری کیا اور اس میں اتنی تدریجی ترقی کی کہ پنجاب کے دورِ حاضر میں جبکہ خاص نمبروں کے نکالنے کا شوق وہاں جنون کی حد تک پہونچ گیا ہے، انھوں نے بھی جوبلی نمبر شایع کر کے اپنی محنت و کاوش کی ایک غیر فانی مثال دنیائے ادب میں قایم کر دی یہ نمبر صفحات کے لحاظ سے ایک ضخیم کتاب، مضامین کے لحاظ سے ایک مرصع دفتر اور تصاویر کی حیثیت سے ایک دلکش مرقع ہے۔ آیندہ جنوری کا پرچہ وہ ربع صدی نمبر کے نام سے اسی شان کا نکال رہے ہیں اور غالباً فروری نمبر جناب قبل شاہجہانپوری کی شاعری کیلئے مخصوص ہوگا

# فہرست مضامین مجموعۂ استفسار و جواب

(١) غوازی مصر حشیشنون، اخوان الصفا (٢) گریۂ جنین (٣) قمری مہینے (٤) بوہرہ (٥) اصطلاحات تصوف کا ترجمہ
(٦) ابوالعلاء المعری (٧) عبداللہ پاشا فکری (٨) نورجہاں کا ایک شعر (٩) فن کاغذ سازی (١٠) عرب کا بازار بردہ فروشی (١١)
نظام شمسی کا آفتاب (١٢) اقسام عالم - جبر و اختیار (١٣) ہلالی پرچم (١٤) سورج کا وقت طلوع و غروب بڑا نظر آنا اور کم گرم ہونا
(١٥) بالشویزم (١٦) باب و بہاء (١٧) نباتات کا تنفس (١٨) جراحی اور مسلمان (١٩) خواب کی حقیقت اور تعویذ وغیرہ (٢٠)
لفظ حد کا بالتشدید استعمال (٢١) دستوریت (٢٢) بندوق - بارود - محکمۂ آبکاری (٢٣) بحر مردہ (٢٤) نامہ بر کبوتر (٢٥)
یورپ کی وسیع ترین زبان (٢٦) سعد بن وقاص کا مزار (٢٧) معاد و خلود طبیعیات کے زاویۂ نگاہ سے (٢٨) اجراء اخبارات
کی تاریخ (٢٩) عالم خیال اور رشک و رقابت (٣٠) خواتین ترکی اور تعلیم (٣١) نیستی سے ہستی کا امکان، درس نظامی کی
تاریخ (٣٢) طبقۂ نسواں اور غزل گوئی (٣٣) برج بابل (٣٤) طبقۂ فاسسٹ کی وجہ تسمیہ (٣٥) آفتاب کے
داغ (٣٦) سامری کون تھا (٣٧) کیا روح خدا کا نام ہے (٣٨) نوٹ کے اجراء کا فائدہ (٣٩) ممی کے پستہ قد محسوس
ہونے کا سبب (٤٠) چند الفاظ کی تحقیق (٤١) باغ ارم کی حقیقت (٤٢) فلسفۂ محبت (٤٣) متنبی کی وجہ تسمیہ (٤٤)
سسیم تلغراف (٤٥) میقات حج (٤٦) بندقیہ کی حقیقت (٤٧) طبقۂ متاولہ (٤٨) اصحاب کہف (٤٩) بھوت پریت
(٥٠) فلسفۂ اجتماع (٥١) جان بل (٥٢) کس کا شعر ہے (٥٣) سال کبیسہ حساب گرگوری میں (٥٤) انڈیا آفس لائبریری
(٥٥) سالویشن آرمی (٥٦) ہار کا سبب (٥٧) عین الزمان طرابلسی (٥٨) تطابق سنہ ہجری و عیسوی (٥٩) کرامات
غوث الاعظم (٦٠) حافظ شیرازی اور تیمور کی ملاقات (٦١) چند الفاظ کے معنے (٦٢) طاعت و حج اکی تمنا (٦٣) داغ و امیر
(٦٤) الپ ارسلان (٦٥) معجزہ و کرامات سے انکار (٦٦) صدور محال کا امکان (٦٧) پردہ اور تعلیم نسواں (٦٨) مریخ
کی حقیقت (٦٩) ایران کا صفوی خاندان اور قاچاری حکومت (٧٠) منصور حلاج (٧١) آنکھ اور چال کی تشبیہ (٧٢)
معجزہ و کرامات (٧٣) آنسہ می کا شعر منثور (٧٤) گریۂ معصوم (٧٥) چند اصطلاحات کا ترجمہ (٧٦) ابوالعتاہیہ کے متعلق
چند سوالات (٧٧) فرقۂ معتزلہ کے مختلف فرقے (٧٨) ایک برہم مستفسر کے چند استفسارات (٧٩) کھدر، جن - تعویذ، اردو لغت

(۸۰) بت غالیہ سو (۸۱) اسمائے نجوم (۸۲) بروج اسمار کی حقیقت (۸۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۸۴) ہسپانیہ و اُندلس
(۸۵) حکومت مصر (۸۶) اسماعیلیہ مذہب (۸۷) اعداد متحابہ (۸۸) ادبیات (۸۹) ستاروں کی تعداد (۹۰) بوقلمون (۹۱)
کلام مسیح (۹۲) علی محمد باب (۹۳) مذہب وعقل (۹۴) طوفان نوح (۹۵) دیباچہ کی اصلیت (۹۶) رامائن و مہابھارت
(۹۷) ابدالی اور درانی (۹۸) قلعۂ گوالیار (۹۹) سید جلال (۱۰۰) خلفاء عباسیہ مصر (۱۰۱) نیولا اور اجرام فلکی (۱۰۲)
مرزا عبدالقادر بیدل (۱۰۳) تاج فروش نیشاپور (۱۰۴) تشبیہات چشم (۱۰۵) عرب میں گودنے کا رواج (۱۰۶) دہلی کی [illegible]
وقوع (۱۰۷) طبقۂ نسواں اور تعلیم (۱۰۸) چند اصطلاحات کا ترجمہ (۱۰۹) شاعری کی بعض اصطلاحیں (۱۱۰) عربی میں تقسیم
علوم (۱۱۱) حقیقت و مجاز (۱۱۲) عالم الیقین و عالم جبروت (۱۱۳) چند اصطلاحات شاعری (۱۱۴) صلوٰۃ الوسطیٰ (۱۱۵)
ظفر کا غیر مطبوعہ کلام (۱۱۶) اوزون فردوسی (۱۱۷) تاناشاہ (۱۱۸) تھیاسوفکل سوسائٹی (۱۱۹) ینگی چری (۱۲۰) فیروزہ حصا
(۱۲۱) برہمو سماج (۱۲۲) ہستناپور (۱۲۳) اڑھائی دن کا جھونپڑا (۱۲۴) مثنوی مولانا روم کا ایک شعر (۱۲۵) پرانا قلعہ
داتا گنج لاہوری (۱۲۶) تغزل اور اصطلاح صوفیہ (۱۲۷) منصور حلاج اور غرقابی فرعون (۱۲۸) بعض الفاظ کے معنے۔
(۱۲۹) کس کا شعر ہے (۱۳۰) کیکاؤس و کیخسرو (۱۳۱) ملا دوپیازہ کی قبر (۱۳۲) میر شیر علی افسوس (۱۳۳) کیا زیب النساء
کے شعر ہیں (۱۳۴) فری میسن کیا ہے (۱۳۵) الف لیلہ (۱۳۶) شیخ بدر عالم۔ شیخ بایزید (۱۳۷) زبان اُردو کی ابتداء سہرا
(۱۳۸) عشق و محبت (۱۳۹) دوسرے کروں میں آثار حیات (۱۴۰) اسلام کے متفرق فرقے اور فرقۂ اعتزال (۱۴۱) انگلی سلام
(۱۴۲) استعارے کی شاعری (۱۴۳) امیر دوست محمد خاں (۱۴۴) حافظ کے دو شعر (۱۴۵) ہم اسداللہم و ہم اسداللہیم
(۱۴۶) فرقۂ اسماعیلیہ (۱۴۷) ابن رشد و شیخ الرئیس (۱۴۸) ابوالفضل کی قبر اور غالب کا ایک شعر (۱۴۹) عرفی اور
شاہزادہ سلیم (۱۵۰) زحل۔ ارانوس۔ نپتون (۱۵۱) عمر انسانی (۱۵۲) نسبتی تھانیسری (۱۵۳) عہد اسلام کے سکے
(۱۵۴) سرطان (۱۵۵) ملکۂ چین (۱۵۶) سورۂ فاتحہ (۱۵۷) ہالہ اور مد و جزر (۱۵۸) مونٹ کارلو (۱۵۹) حالی کا
ایک شعر (۱۶۰) نظریۂ کہرب (۱۶۱) انسولین (۱۶۲) ارتقائے انسانی کی دوسری منزل (۱۶۳) قصر الحمراء (۱۶۴)
بعض اصطلاحات کا ترجمہ (۱۶۵) ارسطو کا مدفن (۱۶۶) یاجوج ماجوج (۱۶۷) مثنوی کا ایک شعر (۱۶۸) ہندی اور
عربی شاعری (۱۶۹) نیو پلوٹنزم (۱۷۰) بیدل کے بعض اشعار (۱۷۱) مثنوی کا ایک شعر (۱۷۲) اپریل فول (۱۷۳)
مشتری (۱۷۴) امریکہ کی دولت۔

# نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہوتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے۔ ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ عہ
بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

| جلد ۲۶ | فہرست مضامین اکتوبر ۱۹۳۴ء | شمارہ ۴ |
|---|---|---|

ملاحظات ———— ۲
عہد وسطی کے فنون لطیفہ اور اسلام ———— ۹
تمہارا مسلک اور میرا مسلک ———— ۲۰
نغمۂ دل ———— مرزا احسان احمد بی اے، ال بی ———— ۲۳
استدراک جناب دل شاہجہانپوری ———— حکیم ضمیر حسن خاں دل شاہجہانپوری ———— ۲۶
موجودہ ترقی فقط ایک دھوکا ہے ———— محمد عثمان ام۔ اے۔ بی ال۔ وکیل ہزاری باغ ———— ۳۴
تراب شاہ ———— طالب صفوی ———— ۴۲
مکتوبات نیاز ———— ۴۹
باب المراسلۃ والمناظرۃ ———— ۵۵
باب الاستفسار ———— ۶۶
منظومات ———— عدم، روش، اختر، یحیٰی، نظرت، شمیم ———— ۷۰

# نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

| جلد ۲۶ | اکتوبر سنہ ۱۹۳۴ء | شمار ۴ |
| --- | --- | --- |

# ملاحظات

## عورت — تعلیم — پردہ

گزشتہ ماہ کے ملاحظات میں ہم نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ ظاہر کیا تھا کہ مغربی تعلیم کا اثر ہندوستان کی عورت اور خصوصیت کے ساتھ مسلمان عورت پر کتنا خراب پڑ رہا ہے، لیکن چونکہ بحث کچھ تشنہ رہ گئی تھی اس لئے آج کی صحبت میں ہم اس کو مکمل کر دینا چاہتے ہیں۔

اس سے قبل ہم نے یہ ظاہر کیا تھا کہ جو نصاب تعلیم اور جو اسلوب تربیت نسوانی مدارس میں رائج ہے اس سے مغربی بیباکی و بے حجابی بلکہ زیادہ صاف الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ بے حیائی و بے شرمی کی تکمیل تو ضرور ہو جاتی

ہے۔ لیکن آزادی کا وہ جذبہ جو خودداری و صیانتِ نفس کو مستلزم ہے پیدا نہیں ہوتا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ موجودہ طریقِ تعلیم کا سب سے بڑا نقص ایک اور یہ بھی ہے کہ وہ عورت میں بیجا خودنمائی اور ناروا زیبایش و آرایش کا احساس پیدا کرتا ہے اور اُس بلندیِ اخلاق کی طرف مائل ہونے کی مہلت ہی نہیں دیتا جس کو اگر عورت سے علحدہ کر دیا جائے تو وہ اس خوش رنگ پھول سے زیادہ کچھ نہیں رہتی جو صبح کھلتا ہے اور شام تک مرجھا جاتا ہے۔

اس لئے اب بحث طلب امر یہ ہے کہ اگر عورت کو تعلیم دینا ضروری ہے تو وہ کس قسم کی ہونی چاہئے اور نیز یہ کہ کیا پردہ کی موجودہ پابندیاں دور کئے بغیر عورت کوئی ذہنی و دماغی ترقی کر سکتی ہے یا نہیں۔

ہر چند یہ دونوں مسئلے اس قدر پامال و فرسودہ ہیں کہ ان پر بحث کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا، لیکن چونکہ میری رائے ان مسایل میں ایک حد تک سب سے علحدہ ہے اس لئے اس کا ظاہر کرنا غالباً فایدہ سے خالی نہ ہوگا۔

یوں تو اصولاً میں تعلیم کا موافق اور پردہ کا مخالف ہوں، لیکن موجودہ ترقی یافتہ نسل نے جو ترقی یافتہ نظرئے اس باب میں قایم کئے ہیں ان سے مجھے سخت اختلاف ہے۔ میرے نزدیک ایک عورت کی تعلیم کا یہ معیار کہ وہ انگریزی اچھی لکھ پڑھ سکتی ہے، غزل خوب کہتی ہے یا یہ کہ فسانے اور عشقیہ مضامین لکھنے میں مہارت تامہ رکھتی ہے، اتنا ہی غلط ہے جتنی پردہ کے باب میں یہ سختی کہ اس کو قدرت کی ان تمام نعمتوں سے محروم کر دیا جائے جن سے فائدہ اُٹھانا اسکا فطری حق ہے۔

عورت کے لئے تعلیم ضروری ہے لیکن صرف اس حد تک کہ وہ اپنے حقوق مردوں سے حاصل کر سکے اور مردوں کے حقوق ادا کرنے کی اہلیت اس میں پیدا ہو جائے۔ اس کی تعلیم و تربیت کا سنگِ بنیاد صرف یہ خیال ہونا چاہئے کہ اگر ملک و وطن کی خدمت کا تمامتر انحصار مردوں پر ہے تو وہ اُن مردوں کی ماں ہے اور اگر کوئی قوم ناکارہ افراد کی وجہ سے فنا ہو سکتی ہے تو بھی اس کی تمامتر ذمہ داری اس کی آغوشِ تربیت پر عاید ہوتی ہے۔ اُس کے حقوق مردوں پر یہ ہیں کہ وہ اپنے اخلاق بلند کرنے کے لئے اُن سے عزم و احترام کا مطالبہ کرے اور مردوں کے حقوق اس پر یہ ہیں کہ وہ اپنے بلند اخلاق سے کام لیکر انھیں ملک و قوم کی خدمت کا اہل بنائے۔ دنیا کا یہ نظریہ کہ عورت محبت کئے جانے کے قابل ہے نہایت خطرناک نظریہ ہے اور اسی نے عورت کو اس کے مرتبہ سے گرا دیا۔ صحیح نظریہ صرف یہ ہے کہ عورت عزت و احترام کی چیز ہے اور اگر اس سے محبت کی جا سکتی ہے تو صرف وہی جو احساسِ مجد و شرف کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔

مرد عورت کے باہمی تعلق کی بنیاد اگر محض محبت پر رکھی جائے تو یہ صرف جذبات کا کھیل ہوگا اور جذبات بھی وہ جو یکسر انفرادی تشخصاتِ احساس سے وابستہ ہیں اور اجتماعیات سے انھیں کوئی واسطہ نہیں، پھر اول تو یہ جذبات بجائے خود ناپائدار چیز ہیں اور اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ ساری عمر کا ساتھ دینے والے ہیں تو بھی

اس سے عورت کا وہ احساسِ مغلوبیت دور نہیں ہو سکتا جو قدرتاً ایک مرد کے مقابلہ میں اس کی دلکشی و رعنائی کے انحطاط پذیر ہونے کے احساس سے پیدا ہونا چاہئے۔

سب سے بڑی اور اصولی غلطی یہی ہے کہ مرد عورت کا مطالعہ اس کی ظاہری ساخت سے شروع کرتا ہے اور اکثر و بیشتر اسی جگہ ختم کر دیتا ہے، درانحالیکہ خود اپنی طرف سے جو چیز پیش کرتا ہے وہ اس کا بطون ہے۔ یعنی اگر وہ کسی عورت کے حسن و جمال کی تعریف کرتا ہے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ اس کی عوض میں ایک محبت کرنے والا دل پیش کر رہا ہے۔ پھر ایک وقت عورت پر ایسا آتا ہے، جب وہ خود یا مرد کے طرزِ عمل سے مجبور ہو کر یہ سمجھنے پر مجبور ہوتی ہے کہ مرد نے واقعی یہ سودا نہایت گراں قیمت پر طے کیا تھا اور اس احساس کے ساتھ ہی قدرتاً اس میں پستی و مغلوبیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا اثر اس کی اولاد پر پڑنا ناگزیر ہے۔

برخلاف اس کے اگر مرد و عورت کے تعلق کی بنیاد ہی بجائے محبت کے عزتِ نفس و احترام اخلاق پر قایم ہو تو کبھی یہ عدم توازن پیدا نہیں ہو سکتا اور عورت بھی اس خیال کو سامنے رکھ کر اپنا سر بلند رکھ سکتی ہے کہ مرد نے جو چیز اس سے طلب کی وہ وہی تھی جو خود اس نے دی، یعنی اگر اُس نے اپنی مردانہ سیرت کے تمام برکات اس کے سامنے پیش کر دئے تھے تو عورت نے بھی اپنا حُسن نہیں بلکہ اپنی نسائیت اس کے لئے وقف کر دی تھی جو مرد کی بڑی سی بڑی قربانی کی قیمت قرار دی جا سکتی ہے۔

---

پھر قبل اس کے کہ نسوانی مدارس کی تعلیم و تربیت پر توجہ کی جائے، ضرورت اس امر کی ہے کہ مرد خود اپنی تربیت میں وہ صلاحیت پیدا کرے جو عورت کو صحیح معنی میں عورت بنانے والی ہے اور اس کے دل سے یہ خیال دور کر دے کہ وہ کمزور ہے، کم عقل پیدا ہوئی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کسی گھر میں کئی بھائی بہن ہیں تو والدین اکثر و بیشتر لڑکوں کی طرفداری کرتے ہیں اور لڑکیوں کو اُن کے ہاتھ سے مار کھاتے ہوئے دیکھ کر بجائے برہم ہونے کے خوش ہوتے ہیں۔ لڑکا باہر سے آتا ہے اور اپنی بہن پر حکومت کرتا ہوا آتا ہے، وہ غریب اس خیال سے کہ اگر اس کے حکم کی تعمیل نہ کی تو وہ مار بیٹھے گا اور پھر کوئی اس کی فریاد سننے والا نہیں ہے، طوعاً و کرہاً چاکرانہ اسکی خدمت کے لئے طیار ہو جاتی ہے۔ والدین سمجھتے ہیں کہ اس طرح لڑکی کو گھر کا کام کرنے کی عادت ہوتی ہے، اور اس طرف خیال منتقل نہیں ہوتا کہ جس لڑکی میں ابتدا ہی سے مغلوبیت و مظلومیت کی یہ عادگی پیدا کی جا رہی ہے وہ جوان ہو کر اپنے شوہر کے مقابلہ میں جذبۂ خودداری کیونکر قایم رکھ سکتی ہے اور اس سے کب یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی اولاد میں آزادی کا صحیح جذبہ پیدا کر سکے گی۔ ہندوستانی عورت کی زندگی کا تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ شروع سے آخر تک رونے کڑھنے، خدمت کرنے اور دوسروں کی خاطر اپنے جذبات کا خون کرنے کے لئے

پیدا ہوئی ہے۔ جب تک اس کی شادی نہیں ہوتی اس کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ چاکرانہ طور پر بھائیوں کی خدمت کرے، گھر کا کام سنبھالے اور جب عقد کے بعد شوہر کے سپرد کی جاتی ہے تو اس حیثیت سے گویا وہ کنیز ہے، ادنیٰ خادمہ ہے جسکا فرض سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ مرد کی خوشنودی کے لئے خواہ وہ کتنی ہی ناجایز کیوں نہ ہو اپنے جذبات و احساسات کا خون کرتی رہے ــــ یقیناً خدمت بُری چیز نہیں، گھر کا کام کرنا معیوب نہیں، شوہر کی اطاعت و فرمانبرداری ضروری ہے، لیکن مراعات و حُسنِ سلوک کے انداز سے، احساسِ خودداری و جذبۂ غیرت کے ساتھ ساتھ، یعنی اس خیال سے نہیں کہ وہ اسپر مجبور ہے بلکہ اس خیال سے کہ مرد اس باب میں اُس کا محتاج ہے۔ پھر غور کیجئے کہ آج کتنے خاندان ہیں جہاں عورت سے مساویانہ سلوک روا رکھا جاتا ہے اور کتنے مرد ہیں جو عورت کے جذبات کا لحاظ کرکے اپنے اوپر کسی قسم کا جبر اختیار کرتے ہوں ــــ الغرض ہندوستان میں عورت کی ہستی کوئی ایسی چیز نہیں جو تکمیل تہذیب و معاشرت میں برابر کا حصہ لینے والی ہے، بلکہ اُسے بھی منجملہ دیگر اسباب و ذرایع کے ایک ذریعہ و سبب سمجھا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں اسکی اہمیت کیا قایم ہوسکتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ جدید تعلیم نے مغربی عورت کے اندر یہ احساس پیدا کردیا ہے کہ وہ مرد کی محکوم رہنے کے لئے پیدا نہیں ہوئی، لیکن چونکہ وہ مرد کے مظالم کو زمانۂ نامعلوم سے برداشت کرتی چلی آرہی تھی اس لئے یہ احساس اسکے اندر ایک انتقامی جذبہ پیدا کررہا ہے اور اب وہ بھی اسی جبر و استبداد سے کام لینا چاہتی ہے جسکی وہ شکار رہ چکی ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ ہندوستان میں جہاں عورت کی داستانِ مظلومیت کہیں زیادہ قدیم و دردناک ہے تعلیم کا اثر اسپر کیا ہوگا اور یہ ردِّ عمل جو ناگوار صورت بھی اختیار کرے کم ہے ــــ اس لئے اب ہمارے سامنے یہ سوال نہیں ہے کہ عورت کو تعلیم دیجائے یا نہیں کیونکہ وہ تو بہر حال ہوکر رہیگی بلکہ غور طلب امر یہ ہے کہ اس سیلاب کیلئے کونسی راہ ایسی نکالی جائے جو ہمارے نظامِ معاشرت کو تباہی سے بچالے۔ مغربی اصولِ تعلیم کے نتائج ہمارے سامنے موجود ہیں اور یوروپ کی عورت کی ذہنیت بھی ہم سے پوشیدہ نہیں، پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس کا نتیجہ وہاں کچھ اور ظاہر ہو، یہاں کچھ اور ــــ علاوہ اس کے اب یہ مسئلہ قیاس و نظریہ کی حد سے گزر کر عمل و نتیجہ کی صورت میں ہمارے سامنے آگیا ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ مغربی تعلیم نے ہندوستان کی عورت میں کیسی خطرناک ذہنیت پیدا کردی ہے اسلئے میں اسکا سخت مخالف ہوں کہ اس تجربہ کو جاری رکھا جائے اور صرف اس امید پر زندگی بسر کیجائے کہ ممکن ہے اعلیٰ تعلیم ان نقایص کو دور کرسکے، کیونکہ جس چیز کو اعلیٰ تعلیم کہا جاتا ہے اسنے مردوں کی ذہنیت میں کیا قابلِ فخر تغیر پیدا کیا ہے کہ عورتوں کی اصلاح کی توقع اس سے ہوسکے۔

میری رائے میں لڑکیوں کی ابتدائی تعلیم کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہر کتاب ان کے سامنے مادری زبان میں پیش کیجائے اور ان کے لئے ایک خاص نصاب ایسا مقرر کیا جائے جس میں مذہب و اخلاق کے سوا اور کچھ نہ ہو، لیکن مذہب سے میری مراد وہم پرستی نہیں بلکہ وہ نفسیاتی تعلیم ہے جو حُسنِ اخلاق و اصلاحِ معاشرت کی طرف مایل کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ اُن کو فرایضِ خانہ داری اور نسوانی صناعیوں سے بھی آگاہ کرنا ضروری ہے کیونکہ بغیر اس کے وہ اپنے حقیقی فرایض ادا کرنے کی اہل نہیں بن سکتیں۔ علوم و فنون کی طرف زیادہ توجہ

کرنے کی ضرورت نہیں، البتہ تاریخ و جغرافیہ کے مبادیات اور ریاضی کا اتنا حصہ جو گھر کے حساب کتاب کے لئے ضروری ہے، یقیناً انھیں معلوم ہونا چاہئے ۔ انتشار طبیعت سے جہاں تک ممکن ہو بچانا چاہئے اور عشقیہ فسانوں کا مطالعہ بھی ان کو ممنوع ہونا چاہئے ۔ اگر پانچ سال کی عمر سے لڑکی کی تعلیم شروع کی جائے تو زیادہ سے زیادہ دس سال کی عمر تک یہ تمام مراحل آسانی سے طے ہو سکتے ہیں ۔ اسکے بعد یہ غور کرنا چاہئے کہ اس کا دماغ کس طرف مایل ہے اور فطرتاً زیادہ کس علم و فن کی طرف مایل ہے، اگر اس کا میلان کسی ایسے فن کی طرف ہے جو اس کو آزادی دینے والا ہے تو اس کو دور کرنا چاہئے اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر تمام سہولتیں اسکی تکمیل کے لئے فراہم کرنا ضروری ہیں ۔ غیر زبانوں کا مطالعہ لیکن اس حد تک کہ انکی معلومات میں اضافہ ہو نا مناسب نہیں اور فنونِ لطیفہ میں نقاشی ہی ایک ایسی چیز ہے جو عورت کی پاکیزگی جذبات کا ساتھ دینے والی ہے، رہی موسیقی سو اسکی تکمیل کا زمانہ شادی کے بعد آتا ہے اور اسکی ذمہ داری تمامتر اُن کے شوہروں پر عاید ہونی چاہئے ۔

---

یہ درست ہے کہ عورت کی تعلیم میں پردہ کی پابندیاں بڑی حد تک حارج ہوتی ہیں، لیکن پردہ اُٹھا دینے کا جو مفہوم آج کل عام طور پر پیش نظر ہے وہ بھی درست نہیں ۔ پردہ کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ وہ عورت کے قواء جسمانی و قواء ذہنی کے نشو و نما میں حارج ہوتا ہے، یعنی گھر میں ایک جگہ محصور رہنے کی وجہ سے اسکی صحت بھی خراب ہو جاتی ہے اور اسکو اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کا بھی موقعہ نہیں ملتا، لیکن اگر اس نقصان کی تلافی صرف اس طرح ہو سکتی ہے کہ اسکا پردہ توڑ کر مردوں کی سوسائٹی کا آلۂ تفریح بنا دیا جائے، تو اس سے بدرجہا بہتر یہ ہے کہ عورت جہل و بیماری ہی کی حالت میں فنا ہو جائے ۔ اسلامی پردہ اور غیر اسلامی پردہ کی بحث بیکار ہے، دیکھنا یہ ہے کہ زمانہ کا اقتضا کیا ہے اور معاشرتی مصالح کیا چاہتے ہیں ۔ سو اس میں کلام نہیں کہ اگر ایک طرف زمانہ کا اقتضا یہ ہے کہ عورت کا پردہ توڑ دیا جائے تو دوسری طرف ہماری تہذیب معاشرت اس امر کی بھی مقتضی ہے کہ عورت کو بلکل عام نہ بنا دیا جائے اور اس توازن کا قیام تعلیم سے زیادہ تربیت پر منحصر ہے، عورت کا پردہ دور کرکے یہ توقع رکھنا کہ وہ جایز حدود سے آگے قدم نہ بڑھائے گی مشکل ہے، کیونکہ آزادی کی لذت کبھی نہ پوری ہونے والی لذت ہے اور اسکی کوئی انتہا مقرر کرنا از بس دشوار ہے، اس لئے قبل اس کے کہ عورت کو اس لذت سے آشنا کیا جائے، اس میں یہ صلاحیت پیدا ہو جانا ضروری ہے کہ وہ خود اپنے مرتبہ و فرایض کو پہچان سکے اور یہ صرف اس تربیت سے پیدا ہو سکتی ہے جو والدین کے گھر میں اسے حاصل ہو نہ کہ اس تعلیم سے جو اسکولوں میں دیجاتی ہے —— اس لئے مسئلۂ تعلیم سے زیادہ اہم سوال تربیت کا ہے اور اسکی تکمیل اسی وقت ہو سکتی ہے جب مرد اپنے طرز عمل میں تبدیلیاں پیدا کریں اور عورت کے اخلاق بلند کرنے کے لئے اس کی وہی عزت کریں جو اس سے چاہی جاتی ہے، ورنہ عورت کو ایک بار آزاد ہو کر مرد سے "انتقام لینا ضرور ہے"، خواہ وہ اس جذبہ کے ماتحت کتنی ہی ادنیٰ سطح پر کیوں نہ آجائے

## اُردو —— ہندی

جس طرف دیکھئے اسکولوں میں کالجوں میں "ترقی اُردو" کی انجمنیں قایم ہو رہی ہیں اور مادری زبان کی خدمت کا آوازہ ہر چہار طرف

سے بلند ہوتا ہوا سنائی دیتا ہے۔ غالباً اس لئے کہ ہندوؤں نے اُردو سے اپنی بیگانگی کا اظہار کرکے ہندی کی ترقی کو اپنا نصب العین قرار دے لیا ہے۔ بہرحال سبب یہ ہو یا کوئی اور اس جذبہ کے قابل قدر ہونے میں انکار نہیں، بشرطیکہ یہ کوشش کوئی عملی شکل بھی اختیار کرے اور باہمی نفرت و اشکراہ کی کوئی صورت نہ پیدا ہو۔ مگر افسوس ہے کہ اُردو کی ترقی تو اتنی نظر نہیں آتی جتنی ہندو مسلمانوں کی باہمی مغایرت بڑھتی جاتی ہے اور میں اسکو ملک کی حد درجہ بدنصیبی سمجھتا ہوں —— اگر مسلمان ہندوؤں سے اس لئے برہم ہوں کہ انھوں نے کیوں ہندی زبان اور ہندی رسم الخط کو اختیار کیا تو انکی سخت غلطی ہے کیونکہ یہ دور ہندوؤں کے نہضت و بیداری کا ہے اور وہ اپنی ہر چیز کو خاص ملکی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں پھر اُردو جسکی ترکیب میں بڑا عنصر غیر ملکی بلکہ خالص اسلامی زبانوں کا ہے، کیونکر انکے لئے قابل برداشت ہوسکتی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنی قدیم روایات تہذیب کو زندہ کرنے کے لئے اُس زبان اور اُس رسم الخط کو استعمال نہ کریں جس میں اُنکا تمام قدیم ذخیرہ پایا جاتا ہے۔ جسوقت مسلمانوں کی حکومت تھی ہندو فارسی پڑھتے تھے اور ان کی غلامانہ ذہنیت نے اس احساس کو مٹا دیا تھا کہ حکومت کی زبان اختیار کرنا گویا اپنی ملکی و قومی تہذیب کو قربان کر دینا ہے، پھر اب جبکہ مسلمانوں کی حکومت کو مٹے ہوئے ایک زمانہ ہو چکا ہے اور اسکے بعد وہ (ہندو) دوسری قائم ہونے والی حکومت کو بھی اپنے زیر اثر لا چکے ہیں، یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ اپنے دورِ غلامی کی کسی یادگار کو قائم رہنے دیں اور اب بھی وہ اُردو کی حمایت کرتے رہیں جس کا ایک ایک لفظ اُن کے گزشتہ دورِ مغلوبیت کی یاد دلانے والا ہے —— کہا جاتا ہے کہ اس تفریق و اختلاف کو مٹانے کے لئے ضرورت ہے کہ مسلمان اُردو سے فارسی و عربی کے ثقیل الفاظ نکالدیں، لیکن میری رائے میں یہ تدبیر کوئی نتیجہ نہیں پیدا کر سکتی کیونکہ اگر مسلمان اب بجائے فارسی و عربی کے سنسکرت کے الفاظ استعمال کرنے لگیں تو بھی ہندو اسوقت تک توجہ نہیں کر سکتے جب تک رسم الخط ہندی کا نہ اختیار کیا جائے۔ کیونکہ اُن کے لئے صرف اُردو زبان ہی قابل نفرت و اشکراہ نہیں ہے بلکہ اسکا رسم الخط بھی منبوض ہے کیونکہ وہ عربی کی نقل ہے اور اس خیال کے ساتھ ہی اُنکے وہ تمام جذبات ہیجان میں آجاتے ہیں جو مذہبی عناد و مخالفت اور اُنکے گزشتہ دورِ محکومیت سے وابستہ ہیں چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی زبان کو سنسکرت سے ملاتے جاتے ہیں یعنی اگر وہ اُردو کو ترک کر چکے ہیں تو اسی کے ساتھ یہ بھی پسند نہیں کرتے کہ مسلمان ان کی زبان کو اختیار کریں —— بہرحال مسلمان اگر یہ چاہتے ہیں کہ ہندو پھر اُردو کی طرف مائل ہوں تو یہ خیال محال ہے، اسلئے اب اگر کوئی صورت اُردو کی ترقی کی (بلکہ میں تو بقا کا لفظ استعمال کرونگا) ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ مسلمان ہی اسکی نشر و اشاعت میں حصہ لیں اور جو بوجھ انھوں نے ہندوؤں پر ڈال رکھا تھا اس کو خود ہی اُٹھائیں۔ لیکن افسوس ہے کہ جہاں مسلمانوں کی عملی زندگی میں اور بہت سے صفر نظر آتے ہیں، وہیں ایک صفر یہ بھی پایا جاتا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ظاہری چیخ پکار بھی زیادہ عرصہ تک قائم رہ سکے گی —— میں نے جو کچھ عرض کیا ممکن ہے بانیانِ "انجمن ترقی اُردو" کو پسند نہ آئے، لیکن کوئی حقیقت محض اس لئے کہ وہ تلخ ہے چھپائی نہیں جا سکتی۔ وہ حضرات جن کا تعلق دنیائے صحافت یا تصنیف و تالیف سے نہیں ہے اُنکو مسلمانوں کی بے حسی کا صحیح علم نہیں ہو سکتا لیکن جو چند افراد بدقسمتی سے اس مشغلہ میں مبتلا ہیں اُن سے پوچھئے کہ اُردو زبان کس دور سے گزر رہی ہے اور اس کے نام لیوا کس طرح زندگی بسر کر رہے ہیں —— ہندوستان

میں مسلمانوں کی تعداد آٹھ کروڑ سے زیادہ ہے، لیکن اُن کے کتنے اخبار کتنے رسایل اس وقت پائے جاتے ہیں اور جو پائے جاتے ہیں وہ کس عالم میں ہیں؟ اس کا بیان حد درجہ دردناک و تکلیف دہ ہے۔ ہندوؤں کا میلان ہندی کی طرف گزشتہ بیس سال کے اندر ہوا ہو لیکن اسی قلیل مدت میں جو ترقی انکی صحافت نے کی ہو، اسکو دیکھکر حیران رہجانا پڑتا ہو ــــ ہندی کا بد نصیب سے بد نصیب رسالہ کوئی ایسا ہوگا جسکی اشاعت ہزاروں سے کم ہو اور اردو کے بہترین معیاری رسایل کے خریدار سیکڑوں سے متجاوز نہیں ہوتے، ہندی کتابیں ہزاروں کی تعداد میں ہر سال نکل رہی ہیں اور ایک ایڈیشن شایع ہوا نہیں کہ دوسرے ایڈیشن کی طیاریاں ہونے لگتی ہیں، لیکن اردو تصانیف کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی کتاب کے دو سال کے اندر بھی ایک ہزار خریدار پیدا ہو جائیں تو سمجھ لیجیے کہ بڑا کمال ہو گیا ــــ پھر کیا یہ حیرتناک امر نہیں کہ ایک طرف تو آپ کے احساس کا یہ عالم ہو کہ ہندوؤں کی علاحدگی کو بھی آپ یہ سمجھتے ہیں گویا آپ کا کوئی حق انھوں نے چھین لیا ہو اور دوسری طرف غیرتِ عمل کا یہ حال ہو کہ ہندو تو ہندو خود آپکو بھی اپنے فرض کا احساس نہیں ــــ میں پوچھتا ہوں کہ وہ لوگ جو اردو کے حامی ہیں، وہ خود کتنی قربانیاں اس حمایت میں کر رہے ہیں؟ کیا اپنے قلب پر ہاتھ رکھکر کہہ سکتے ہیں کہ اردو رسایل و تصانیف کی خریداری پر جتنی رقم صرف کرتے ہیں کیا وہ اس رقم کے دسویں حصہ کے بھی برابر پہونچتی ہے جو سیر و تفریح میں اُڑ جاتی ہے اور کیا ان کا انتہائی ذوقِ علم و ادب اس سے آگے کبھی بڑھا ہے کہ اپنے کسی دوست یا عزیز سے عاریتاً لیکر کسی رسالہ یا تصنیف کو پڑھ لیا کریں ــــ حقیقت یہ ہے کہ اس نوع کی انجمنوں کا قیام صرف تفریحی اُپج ہو اور اس ریا و نمود و نمایش کے علاوہ کچھ نہیں جو اس زمانہ میں "فیشن" کے نام سے موسوم کی جاتی ہو۔ ہندوستان کی اور یونیورسٹیوں کا ذکر نہیں، لاہور، لکھنؤ، الہ آباد، اور آگرہ کو لیجیے جہاں مسلمان طالب علموں کی تعداد کثرت سے پائی جاتی ہو، کہ ہزار میں ایک طالب علم بھی ایسا نہیں جو اردو رسایل یا اردو تصانیف کے مطالعہ کا شوق رکھتا ہو، بلکہ اکثر کا تو یہ حال ہو کہ وہ اپنی مادری زبان کا مطالعہ تہذیب و سنجیدگی کے خلاف سمجھتے ہیں۔ برخلاف ہندو طلبا کے کہ اگر وہ دن میں آٹھ گھنٹہ اپنی کورس کی کتابوں میں صرف کرتے ہیں تو ایک گھنٹہ ہندی رسایل کیلئے بھی نکالتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو انکی اشاعت بڑھے۔

انگریزی داں جماعت کا خیال ہو کہ اردو کے رسایل نہایت ذلیل ہوتے ہیں اور انکا مطالعہ کرنا وقت ضائع کرنا ہو۔ اول تو ان کا یہ خیال ہی سرے سے غلط ہو، کیونکہ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے انکو اردو سمجھنے کا سلیقہ ہی نہیں اور ہو کیونکر جبکہ وہ اُدھر آنکھ اُٹھا کر دیکھنا بھی اپنی توہین سمجھتے ہوں۔ لیکن اگر تھوڑی دیر کیلئے اسکو صحیح باور کر لیا جائے تو بھی میں پوچھ سکتا ہوں کہ کیا اس کے ذمہ دار ہمارے تعلیم یافتہ افراد نہیں ہیں اور کیا انکا فرض نہیں ہو کہ وہ اپنی زبان کی خدمت کریں ــ لیکن استغفر اللہ میں کس سے پوچھتا ہوں؟ اُنسے جو قومیت کے جذبہ سے معرّا، اجتماعیت کے اصول سے نا آشنا اور وطنیت کے مفہوم سے قطعی ناواقف ہیں ــ وہ جن کی تہذیب دوسروں سے گدائی کی ہوئی اور جنکی عزتِ نفس اک جنسِ گم گشتہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

میں ۹ ستمبر کو حیدرآباد پہونچا اور آج ۲۷ ستمبر کی سہ پہر ہے یہیں مقیم ہوں یہاں کے خنک و خوشگوار موسم اور جاں بخش و جانفزا سرد ہواؤں میں بھی لکھنؤ کی گرمیاں یاد آرہی ہیں اور تڑپ رہا ہوں کہ کسی طرح جلد سے جلد پھر اپنے اُسی زاویۂ خموشی میں پہونچ جاؤں جسکی ویرانیاں بھی مجھے عزیز ہیں، لیکن محبت کی زنجیروں کا کیا علاج جو یہاں پہونچکر میرے پاؤں میں ڈالدی جاتی ہیں بہرحال رہائی کا وعدہ تو کسی نہ کسی طرح حاصل کرلیا ہے لیکن اکتوبر کے دوسرے ہفتہ میں۔ اس اظہار کی ضرورت صرف اسلئے محسوس ہوئی کہ ممکن ہے اس دوران میں بعض احباب کے خطوط کا جواب بر وقت نہ دے سکا ہوں، اور وہ اس تعویق و تاخیر کو بجائے مجبوری کے میری سرکشی پر محمول کریں۔

نیاز

# عہد وسطیٰ کے فنون لطیفہ اور اسلام

فرانسیسی زبان میں (Elie Faure) کی ایک کتاب آرٹ کی تاریخ پر چار جلدوں میں شائع ہوئی ہے، جس کا ترجمہ انگریزی میں (Walter Pach) نے کیا ہے۔

پہلی جلد قدیم آرٹ پر ہے، دوسری عہد وسطیٰ سے متعلق ہے، تیسری میں عہد نشاۃ سے بحث کی گئی ہے اور چوتھی میں موجودہ دور کا ذکر ہے۔

یہ تصنیف انشاء کی بلندی، جوش تحریر اور نزاکت خیال کے لحاظ سے بجائے خود ایک بے مثل نمونہ آرٹ کا ہے اور اس کے دیکھنے کے بعد ماننا پڑتا ہے کہ ایسی چیز صرف ایک فرانسیسی دماغ ہی پیش کرسکتا تھا۔

میں نے اس کتاب کے بعض ابواب کو بیسیوں مرتبہ دیکھا اور ہمیشہ اس نیت سے کہ اس کا ترجمہ اردو میں کیا جائے، لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سارا وقت اس کی لذت انشاء میں صرف نہ ہوگیا ہو اور اسے اپنی زبان میں ظاہر کرسکنے کی ہمت پیدا ہوئی ہو۔ اس کے خوبصورت و شاندار الفاظ، اس کی نازک ترکیبیں جو فرانسیسی نثر کی انشاء کی خصوصیات میں داخل ہیں، یقیناً کسی اور زبان میں منتقل نہیں ہوسکتیں اور اس لئے اگر میں آج کی صحبت میں اس کے ایک باب کا ترجمہ پیش کررہا ہوں تو اس خیال سے نہیں کہ میں اس کا ترجمہ کرنے میں کامیاب ہوا ہوں، بلکہ صرف اس لئے کہ جو لوگ مجھ سے زیادہ اہل ہیں وہ اسکا مطالعہ کریں اور اگر اردو میں بھی اس کی انشاء کی تمام خصوصیات کو قائم رکھنا ممکن ہے تو ضرور اس کی کوشش کریں کیونکہ اگر یہ کتاب تمام و کمال اردو میں آجائے تو میں اس کو معجزۂ ادب سمجھوں گا۔

اسکی چاروں جلدیں سو روپیہ میں تھیکر کمپنی بمبئی سے مل سکتی ہیں، لیکن اگر کوئی صاحب یہ صرف برداشت نہ کرسکیں تو مجھ سے عاریتاً لے سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ ترجمہ کرنے کی اہلیت پہلے مجھ پر ثابت کردیں۔ نیاز

دو مذہب باہم متقابل ہو جاتے ہیں اور ڈرامہ شروع ہو جاتا ہے، لیکن یہ حقیقت نظر انداز نہیں ہو سکتی کہ اسلام جن خیالات کو مغربی تہذیب و تمدن کے سامنے پیش کر رہا تھا وہ بہ لحاظ نتائج اُن خیالات سے کہیں زیادہ تھے جنھیں مسیحیت اسوقت تک مشرقی تہذیب کے سامنے پیش کر چکی تھی۔

اسلام، جس نے ایک بے لاگ مذہب کا بدویانہ جوش پیدا کر کے غریب لیکن آزاد عربوں کو کرۂ زمین کی تسخیر پر آمادہ کر دیا تھا۔ وہ اسلام جس کے پیرو خیموں کے سوا کوئی گھر نہ رکھتے تھے اور جن کا منتہائے نظر خواب کی سی لانہایت دنیا کو اپنے بادپا گھوڑوں کی رفتار اور گرد و غبار کا طوفان لے آنے والی ہوا کے ساتھ مسخر کرنا تھا۔ ہاں وہی اسلام عہد وسطیٰ میں اس آرزوئے ناتمام کو لیکر نمودار ہوا جس کے سمجھنے کی جتنی کوشش کی جاتی ہے اسیقدر وہ ہمیں عمان مستقبل میں غرق کرتی چلی جاتی ہے۔

جب فرمانروائے روم جسٹی نین نے پایۂ تخت یونان کی درسگاہوں کو بند کر کے ماہرین فنون اور علما کو سلطنت سے نکال دیا (یہ تقریباً وہی زمانہ تھا جبکہ گریگوری اعظم نے پلاطینی کتبخانہ جلا کر خاک کر دیا تھا) تو وہ ایران کی دولت ساسانی کی ہی آغوش تھی، جس نے ان تمام خانماں برباد یونانیوں کو پناہ دی۔ حقیقت یہ ہے کہ یاوری قسمت کی بھی بعض عجیب و غریب شاندار مثالیں ملتی ہیں۔ جب سرزمین رستم و اسفندیار پر اہل عرب کا استیلا ہوا اور وہ گنج بادآورد کے مالک ہوگئے تو یہی عرب تھے جنھوں نے قدیم تہذیب کے اندر جدید یوروپ کی بنیاد ڈالی یعنی جسوقت فضائے مغرب پر ظلمت کی گھٹائیں چھا رہی تھیں اُسوقت خلفائے اسلام یونیورسٹیاں کھول رہے تھے۔ نہریں جاری کر رہے تھے "جنات عدن" کی داغ بیلیں ڈال رہے تھے، مساحت، ریاضی، جغرافیہ و طب کا احیا کر رہے تھے۔ اور مفتوحہ ممالک کو کاروانسراؤں، مساجد اور محلات کی تعمیر سے آراستہ بنا رہے تھے، گویا ایک تاریک پس منظر میں الف لیلہ کی کوئی داستان طیار کی جا رہی تھی۔

عرب ذہنیت کا محیر العقول کمال یہ تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی گئی اپنی خصوصیت ہاتھ سے نہیں دی اور باوجود اپنی طرف سے کوئی نئی بات پیدا نہ کرنے کے تمام اذہان پر غالب رہی۔ عرب کی یہ ہنگامہ آرا بدویانہ لیکن متحد ذہنیت جو اخلاقی حدود سے بے نیاز اور مادی قیود سے مبرا تھی، محض اسی خصوصیت کی وجہ سے اپنے اور مفتوح اقوام کے خصائص میں ربط پیدا کر کے مغلوب قوموں کو انھیں متحدہ خصائص میں جذب کر لیتی تھی۔ مصر میں قبطی، مغرب اقصیٰ اور ہسپانیہ میں بربر، ایران میں عجمی اور ہند میں ہندوستانی بنکر اسلام نے نومسلم قوموں کو اپنی اپنی طبیعت کے موافق اس جوش و خروش کے اظہار سے کبھی باز نہیں رکھا جو وہ ان قوموں میں پیدا کر دیتا تھا، الغرض اسلام جہاں کہیں

بھی پہونچا وہ لوگوں کے دلوں کا مالک بن کر رہا۔

جب رسول اللہ کی وفات کے بعد ابوبکر نے اعلان جہاد کیا تو مصر و شام کے فاتحین نے بازنطینی اور قبطی گرانئس میں جو بھی ان کے سامنے آئے اپنے مذہب کے اثرات قایم کرنے میں کبھی تامل نہ کیا۔ انھیں اس بات کی کوئی پرواہ نہ تھی کہ پہلے کوئی مقام کتنا مقدس اور کس قدر متبرک تھا۔ وہ جہاں پہونچے مخلی بالطبع ہوکر رہے بچے اور گرانئس کے در و دیوار پر جو تصاویر نظر آئیں ان پر انھوں نے رنگ پھیر کر قبلہ رُخ دیوار میں ایک محراب کھود لی اور اسی جگہ عبادت میں مشغول ہوگئے۔ مصری۔ یونانی یا رومی خرابوں میں جہاں کہیں اُن کو پُرانے ستون یا فیلپائے ملے انھوں نے جمع کرکے سر اور پایہ کا خیال کئے بغیر قطار اندر قطار نصب کر دیا اور اندرونی صحن میں فوارہ کے اردگرد وضو کے لئے متوازی قطاروں پر مخروطی شکل کی محرابیں قایم کر دیں۔

اس حال پر تین صدیاں گزر جاتی ہیں اور دورِ فتوحات ختم ہوجاتا ہے یعنی اسلام حدِ ایران سے کوہستان پیری نیز تک پھیل جاتا ہے اور خانہ بدوش عرب اپنی ولایات مفتوحہ میں جو طاقتیں انہیں سست پڑگئی تھیں انھیں از سرِ نو بیدار کرتا ہے۔ اور اس بات پر آمادہ ہوجاتا ہے کہ اپنی روح عمل سے مفتوحہ اقوام و ملل کے قوائے عمل میں بیداری پیدا کردے۔ تمام نخلستان جو افریقہ کے ریگستانوں اور ہسپانیہ میں پھیلے ہوئے تھے، سفید سفید شہروں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جو کنگورے دار فصیلوں سے محصور ہیں، جلدی جلدی محلات و قصور مع سایہ دار درختوں کے پیدا ہوتے جاتے ہیں جن کی راحت بخش ٹھنڈ میں آرام و آسائش حاصل کرنے کے لئے ریگزار عرب کا سفر کرکے امراء آتے ہیں۔ اور اب جو فوج یا قافلہ ریگ رواں کے بے پایاں سمندر کو عبور کرکے آتا ہے تو اُسے سرابی منظر کے بجائے ایک گلابی یا نیلگوں دھندلکا نظر آتا ہے جس کے ہلکے پردہ میں مکانوں کی کرسیاں۔ محلوں کے پشتے گول ستون اور مینار جھلملاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

مسلم روح عین اُسوقت بھی جبکہ وہ بزعم خود اپنی مالک آپ تھی، کبھی اس قابل نہیں ہوئی کہ سراب یا ٹھنڈے سایہ سے زیادہ کسی چیز پر قابض ہوسکے۔ یہ سایہ بھی وہ سایہ تھا جو ایک ساعت کے لئے شعلوں کی دو چادروں کے درمیان جس پر سے فاتحین اسلام گزرے پیدا ہوجاتا تھا۔

جب مسلمانوں کے سیلاب عظیم کی رو ختم ہوگئی جب وہ آرزوئیں جو ہمیشہ ان کے آگے آگے موج دریا کی طرح چلتی تھیں کسی بحر ذخار یا سلسلۂ کوہستان، یا بائزنطیم کی دیواروں یا فرنگی فوجوں کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکیں تو انھیں کسی اور راستہ کی تلاش ہوئی، اور چونکہ اب افق بھی مسدود ہوگیا تھا، اس لئے انھوں نے آسمان کی طرف

سر اُٹھایا اور اس طرح وہ بھی بائزنطینی گنبدوں کی صورت میں نمودار ہوئیں اور کبھی مصری محلات کی چھتوں کی شکل میں محلات شاہی کے جلوخانوں کی بھاری بھاری نیم دائرہ محرابیں ٹوٹ چکی تھیں اور ان کی جگہ اوپر کی طرف رخ کرنیوالی شکستہ محرابوں نے لے لی تھی اسی طرح گنبد کے دائرہ نے بھی مخروطی صورت اختیار کرلی تھی اس کی وضع قدیم آشوری طرز کی ہوگئی تھی جو قبل اسلام آل ساسان کے ایران میں رائج تھی ۔ یہ بیک بیضوی وضع کے گنبد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بنانے والوں کی آرزوئیں ہیں جو فضا میں بلند ہوکر غائب ہوجانا چاہتی ہیں گنبد کے نچلے حصہ کو تنگ کردیا گیا یہاں تک کہ یہ معلوم ہی نہ ہوسکے کہ وہ کہاں سے شروع ہوا ہے ۔ اور اس طرح گویا لامحدود کائنات کے معلق ہونے کا راز سمجھ میں آجائے جو دسویں صدی کی ابتدا میں ستون غائب ہوجاتے ہیں کیونکہ گرجاؤں کی عظیم سادگی کو دیکھ کر ان کے دل میں ریگستان کا تصور پیدا ہوتا تھا اور تدریجاً انھیں اس طرف مایل ہوجانا چاہئے تھا، چنانچہ اس کے بعد ہی گنبد کے ساتھ ساتھ گرجا کی شکل کے بلند مینار بھی قائم ہوگئے جن سے موذنوں کی صدائیں بلند ہوتی ہیں ۔ ترکوں نے جن کا ذوق ایرانی ظروف کے نقوش سے زیادہ وابستہ تھا ۔ پھیلے ہوئے گنبدوں کی بائزنطینی گولائی قائم رکھی جو خود تو سیاہی مائل سرو کے جھنڈ میں چھپے ہوئے ہوتے تھے لیکن ان کے بلند مینار فضا میں اُبھرے ہوئے نظر آتے تھے ۔ اسی طرح ترک گویا غیر شعوری طور پر بائزنطیم کے جاہ وجلال اور شان وشوکت کا وارث بن گیا اور اس نے نہ ان رنگین پتھروں کے سلسلہ کو دیکھا جو نور صبح کے ساتھ جگمگا اُٹھتے اور ظلمت شب کے ساتھ ماند پڑجاتے ہیں ۔ نہ ان کی نظر ان طلائی گنبدوں پر پڑی جن کی سطح پر رات ہونے تک آتش شفق کے شعلے کھیلتے رہتے ہیں ۔ لیکن ترکوں کو چھوڑ کر تمام مسلم ماہرین فن تعمیر مصر سے لیکر ہسپانیہ تک سربلند غرفوں اور لمبوترے گنبدوں کی طرف فطرتاً مائل رہے اور جو اظہار ہنرمندی کے لئے گنبدوں کی تقسیم وسطی حصص مساجد کی ترتیب اور ہتھیاروں کی وضع قطع بھی بدلدیتے تھے چنانچہ انھیں کبھی گول بناتے تھے کبھی چوکور، کبھی ہشت پہلو کبھی صاف اور کبھی ابردار بناتے تھے ۔ مصری مساجد البتہ روح صحرا کی طرح ہمیشہ سادہ اور صاف رہیں لیکن مغرب اقصیٰ اور ہسپانیہ کی مساجد میں سیاہ وسفید پتھروں کے بنے ہوئے محرابدار چھتے رائج ہوئے اور گول ستونوں کی بلندی بھی دگنی ہوگئی گویا وہ کھجور کے درخت تھے جن کی چوٹیوں سے ان کے لمبے لمبے پتے نکلتے ہیں ۔ قرطبہ کی عالیشان مسجد جو اس زمانہ میں تعمیر ہوئی تھی جب مسلمان اپنے دین پر سختی کے ساتھ قائم تھے، قریب قریب ایسی معلوم ہوتی ہے جیسا کوئی گنجان جنگل ۔ اس کے سایوں میں بیٹھ کر جو خاموش روشندانوں کی مسلسل قطاروں کے باعث اور بھی زیادہ تاریک ہوگئے ہیں انسان کو خیال گزرتا ہے کہ وہ کسی ایسی ہیبت ناک دنیا میں پہونچ گیا ہے جس کا ادراک محال ہے ۔

(۲)

مغرب اقصیٰ کے ماہرین فن تعمیر اپنے محرابدار چھتوں کی وضع قطع میں کافی تفریق پیدا کردیتے تھے۔ایک ایوان سے دوسرے ایوان کا منظر، ایک حجرہ سے دوسرے حجرہ کی صورت شکل، مسجدوں کی تعمیر، قصور شاہی کا نقشہ باہمد گر مختلف ہوا کرتا تھا۔اندلس کے محلات الحمرا ایسی تعمیریں ہیں جہاں انسان کو سرخ، سنہرے، سیاہ، زمردیں یا فیروزی ایوان بھی نظر آتے ہیں اور ستونوں پر قایم ہونے والے عظیم الشان دالان بھی اور جہاں آراستہ باغات بھی ہیں اور شفاف مرمریں حوض بھی۔ ذی روح چیزوں کی تصاویر سے اقصائے مغرب کے ماہرین تعمیرات کا ذہن قطعی خالی تھا لیکن وہ یکسانیت رفع کرنے کیلئے اس امر کی سخت کوشش کرتے تھے کہ خطوط کے اختلاف سے خوبصورتی ودلکشی پیدا کی جائے چنانچہ قوسی محرابوں کے گوشے اندر کی طرف جھکنے لگے اور جھکتے جھکتے محراب کی صورت ایسی ہوگئی جیسے گھوڑے کے نعل۔ پھر محراب کو تنگ کیا گیا اور سامنے کا حصہ کم کرکے اس کے خطوط منحنی کردئے گئے۔کناروں پر محراب درمحراب بنائی گئی۔ یا شہد کی مکھی کے چھتہ کی طرح چھوٹے چھوٹے خانے بنائے گئے اور حاشیوں پر استرکاری کرکے بیل بوٹوں سے مزین کردیا گیا۔جب یہ کام بھی عام ہوگیا تو پچی کاری کا رواج ہوا اور پتھروں کو کھود کھود کر پھول پتیاں نصب کی گئیں۔

جب خطوط کے ذریعہ سے نقش ونگار بنانے کا کام کمال کو پہونچگیا تو اس کی دسترس سے مسجد بھی نہ بچیں اور یہاں بھی فرش سے لیکر گنبد کی چوٹی تک نقش ونگار نظر آنے لگے۔اور عربوں کو کافی فرصت مل گئی کہ وہ اپنے بیل بوٹوں میں نئی نئی ترکیبیں اور نئی نئی باتیں پیدا کرتے۔ پرپیچ وخم گلاب کی بیلوں۔ مختلف ہندسی شکلوں، خوبصورت کتبوں اور طغروں میں انھوں نے اپنے ذوق آرایش کو صرف کردیا اور خطوط کے انحنا، اس کی عمودیت اور پیچ وخم کو اس قدر ترقی دی گئی کہ وہ مربعوں، دائروں، موٹی لکیروں، بیضوی شکلوں سے جیومیٹری کی سخت اور صحیح شکلوں تک پہونچ گئے اور وہ چیزیں جو دیوار سے علیحدہ ہوتی تھیں مثلاً منبر وغیرہ ان پر بھی جالیوں اور پرپیچ وخم خطوط کے ذریعہ سے نقش ونگار بنائے گئے گویا معلوم ہوتا تھا کہ دیواروں اور محرابوں کو کسی نے غرفوں سے آنے والی روشنی کو تقسیم کرنے اور بعض اوقات گنبدوں اور گاؤدم میناروں کو ڈھانکنے کے لئے مشجر اور چکن کے تھان پھیلادئے ہیں۔ جیومیٹری کی شکلوں کے ذریعہ سے آرائش وزیبائش کا فن خودبخود کبھی پیدا نہیں ہوسکتا تھا بلکہ وہ نتیجہ تھا مظاہر قدرت کے مطالعہ کا اور یقیناً اس نے اول اول کوئی نہایت سادہ شکل اختیار کی ہوگی، چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ گلکاری کا کام پھول پتیوں کا گلدستہ بنانے سے پیدا ہوا، جیسا کہ قاہرہ کی

جامع ابن طولون کی محرابوں کے اطراف میں بنے ہوئے پھول بوٹوں سے ظاہر ہوتا ہے اور یہ وہ وقت تھا جبکہ فتوحات کے بعد عربوں کا تخیل کسی قدر راحت پسند ہو گیا تھا اور اسے نازک ہونے کی فرصت ملگئی تھی جب چوتھیں صدی نے اپنا ضابطۂ آرائش و زیبائش وضع کیا تو اسوقت تخئیل عرب بہت بلند ہو چکی تھی۔ جب لوازم فن آرائش و زیبائش میں کثیر الاضلاع و کثیر الزوایا اشکال کا استعمال رائج ہوا تو عرب جیومیٹری دانوں نے اس امر کی کوشش کی کہ اس سے ایسے عام اُصول اخذ کئے جائیں کہ وہ ان اشکال سے عام زیبایش و تزئین کا کام لے سکیں چنانچہ اس وقت سے عربی فن نقاشی ایک صحیح و مستقل فن بن گیا اور اسنے اتنی ترقی کی کہ تصورات ربانی کو بھی انھیں اشکال میں متشکل کرکے دکھادیا۔

عربی روحانیت ریگستان میں پیدا ہوئی جہاں صرف فضائے بسیط کی حکومت ہے اور جس کا نہ کوئی آغاز ہے نہ انتہا اس لئے انھوں نے بیل بوٹوں میں اتنی ترقی کی کیونکہ ان بیلوں کی بھی نہ کہیں ابتدا ہے نہ انتہا اور ان کو دیکھ کر نگاہ کا کسی ایک جگہ جاکر رک جانا محال ہے۔ یہ بیل بوٹے کیا ہیں گویا عالم ملکوت کی وہ آوازیں ہیں جنکو اول اول ہم کسی اور جگہ سے پیدا ہوتے ہوئے محسوس کرتے ہیں لیکن جب غور کرتے ہیں تو وہ اپنی ہی آواز معلوم ہوتی ہے ــــ فن بھی خود زندگی کی طرح سے اصول ارتقار کا پابند ہے، اگر تکمیل فن کی خواہش کے بجائے سائنٹفک تحقیق کا ذوق رکھدیا جائے تو اس کے اندر جد و جہد فنا ہو جائے گی اور اس کا جوش و خروش سرد پڑجائے گا اگر ریاضیات کو آرٹسٹ کے حلقۂ عمل میں داخل کیا جائے گا تو وہ ماہرین فن کے ہاتھوں میں صرف ایسا اوزار بن کر رہے گا جس کا مقصد فن تعمیر کی منطقی حیثیت نمایاں کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا کیونکہ اگر کسی قوم کا فن تعمیر اسے سنگ تراشی یا بت تراشی سے روکتا ہے تو اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ وہ ہمیشہ بے معنی خطوط کا غلام رہیگا اور اس کے اندر کبھی زندگی پیدا نہ ہوگی۔

(۳)

یہ سچ ہے کہ عربوں نے آرٹسٹ کو کبھی مجبور نہیں کیا کہ وہ ذی روح مخلوق کی تصویریں بنانے سے قطعی پرہیز کرے۔ اور بعض اوقات اس قسم کی تصویریں اسپانیہ اور مراکش کے مساجد و قصور کی دیواروں پر نظر بھی آتی ہیں تاہم تمام موحد قوموں کی طرح جو ریگستانوں میں بنیں قوم عرب بھی ذی حیات چیزوں کی اشکال و صور سے نفور ہونے میں صرف اپنی جبلت کی متابعت کرتی تھی۔ مذہب جبلت کو صرف دور انحطاط و زوال میں دبا تا ہے لیکن جب طاقتیں عروج پر ہوتی ہیں تو جبلت مذہب کو بھی اپنے ساتھ کھینچ لے جاتی ہے۔ مصر و شام کے فنون اسلامیہ میں

وہی ریگستان کی عُریانیت، وہی ریگستان کی اُداسی اور وہی ریگستان کی شان وشوکت پائی جاتی تھی، مغرب اقصیٰ اور ہسپانیہ کے ٹھنڈے حجروں کی گہرائیوں میں خلفاء آکر حکماء و فلاسفہ کی باتیں سنتے تھے اور جب ان کے فوجی رسالے فتوحات ملکی اور تاخت وتاراج کے بعد واپس آتے تھے تو یہ آکر لیموں کے درختوں کی خوشبو سے متمتع ہوا کرتے تھے۔ اسلامی فن ایسا معلوم ہوتا تھا گویا جمے ہوئے خون میں سونے کی اینٹیں رگڑ رگڑ کر اس سے کام لیا گیا ہے۔ ہندوستان میں اس فن نے مادی دنیا کی تمام موجودات کو حکم دیدیا کہ وہ سیلاب کی طرح چاروں طرف سے امڈ کر آئے اور اس میں شامل ہو جائے۔ اور ایران میں تو یہ فن گویا ایک خیابان گل دریاحین تھا۔ سرزمین ایران کو مشرقی سواحل بحرۂ روم کے ریتلے میدانوں یا اُندلس و مراکش کی وادیوں سے کوئی مشابہت نہیں جہاں سخت ظلمت اور آگ کے شعلوں میں ہمیشہ جنگ ہوتی رہتی ہے۔ جانب غرب ان بالائی علاقوں میں جو وسطی ریگستان کے حدود پر واقع ہیں اور سطح آب سے تین ہزار میٹر بلند ہونے کی وجہ سے گرد وغبار سے بہت دور اور اسی قدر ستاروں سے قریب ہیں، ہوا میں بلور کی سی صفائی پائی جاتی ہے۔ نسیم جانفزا کے جھونکوں میں یہاں کے سفید مرغزار اور گلابی سبزہ زار ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ایسے بھیگے نظر آتے ہیں جیسے نم آلود ریشم کے تھان۔ اور فصل بہار سے موسم خزاں تک یہاں کے کشادہ لالہ زاروں اور کھیتوں میں ہلکے سبز رنگ سے لیکر سنہرے زرد رنگ تک تمام قسم کے موہوم رنگوں کا ایک طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ آسمانوں میں جہاں کبوتر اُڑتے رہتے ہیں اور بادلوں میں وہ تمام ہلکے اور نازک رنگ موجود ہوتے ہیں جو اوائل فصل بہار میں نظر آتے ہیں۔

جب کوئی ان شہروں کے قریب پہونچتا ہے تو وہاں کے بیضوی یا بلند ارکرخی گنبد۔ اور ان کے بلند مینار جو سرو اور سال کے درختوں میں سے اُبھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عجیب وغریب مناظر پیش کرتے ہیں گویا نیلے، فیروزی، پیازی، سبز اور زرد رنگوں کو شبنم میں گھول کر افق کی سطح پر تصویریں بنائی گئی ہیں۔ اس نظارہ کا لطف اس آرٹسٹ کو خوب معلوم ہے جس نے براہ کارواں صحرا کے نخلستانوں کی سیر کی ہے۔ شکستہ دیواریں، پھٹے ہوئے گنبد اور مینار جن پر سیاہ سفید خطوط کے نقش ونگار محو ہوتے جارہے ہیں۔ لیکن یہ جو روغن ان پر چڑھایا گیا ہے، وہی قدیم کلدانی روغن ہے جو ایران قدیم نے چین کو بتایا اور جو تاتاری ترکتازوں کے ساتھ پھر ایران میں آگیا۔ یہ البتہ ابھی تک شیشہ کی طرح پوری آب وتاب کے ساتھ درخشاں ہے۔ سنہری گلکاریوں اور سفید کتبوں پر جو مختلف قسم کے پھول بوٹے بنے ہوئے ہیں ان میں ان بنفشئی، نیلے، سفید، لاکھی اور زرد رنگوں کی جھلک عجیب لطف پیدا کرتی ہے روغنی مسالہ کی تہ میں جڑے ہوئے دروازوں کی بلند چوٹیوں کے نیچے

فیروزوں، نیلم پاروں اور لاجورد کے مدہم رنگوں کی چمک کے باعث ایک متحرک خط شعاعی دکھائی دیتا ہے اندر کی جانب گنبدوں کی مدور خوشنمائی میں بیل بوٹوں کا جال بچھا کر اس میں ایسے شاخسانے نکالے گئے گویا آویزے لٹک رہے ہیں۔ بعض گنبدوں کے اندر شیشہ کی ایسی لوحیں نصب کی گئی جن سے چاروں طرف کرنیں پھوٹی پڑتی ہیں۔

قدیم زمانہ میں لوگ عجمی قالین دیواروں پر آویزاں کیا کرتے تھے جو ایسے معلوم ہوتے تھے گویا قلبہ رانی کرنے کے بعد سیاہی مائل زمین میں سبد ہائے گل پامال کردئے گئے ہیں، لیکن سولھویں صدی کے آخر میں جب شاہ عباس اعظم صفوی نے اصفہان کی تعمیر کا حکم دیا تو ان قالینوں کی جگہ چمکدار روغنی اینٹوں نے لے لی۔ اُس وقت ایران میں جو طبقہ اہل فن کا پیدا ہوا اسے اُن لوگوں کی ہدایات اور مشوروں پر چلنا پڑا جنھوں نے روغنی مساجد کو تمام دولت زینت و زیبائش بخشی تھی۔ تاکہ جہانگیر، نورانی اور خصوصاً بہزاد کے موقلم کی جنبشوں سے اسلامی فن کو غیر معمولی علوئے مرتبت و رفعت حاصل ہوجائے، حرفت کوزہ گراں نے بھی جو دنیا میں سب سے قدیم اور پائدار پیشہ ہے، فن اسلامی کو اپنی طرف سے ضروری حصہ دیا۔ اس کی آراستگی جس میں ذی روح کی تصویریں زیادہ نہیں ہوتیں اپنی دلکش نوعیت کے لحاظ سے یقیناً بہت بلند ہے۔ ان ظروف پر گل ریاحین لہلہاتے ہوتے ہیں، آسمان کی وسعتیں مع اپنے مرواریدی امواج سحاب کے نظر آتی ہیں اور سمندر کی پہنائیاں مع اپنی درخشاں سطح کے منقوش ہوتی ہیں۔ رنگین خطوط، رنگ کے چھینٹوں، پھولوں کے دستوں اور مختلف رنگوں کے اختلاط باہمی سے ایسے ایسے مناظر نقش کئے جاتے ہیں کہ تصور مسحور ہوجاتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ نقاشان عجم کا یہ چمنستان جس طرح اچانک وجود میں آیا تھا اسی طرح وہ بہت جلد افسردہ ہوگیا کیونکہ اس نے ضرورت سے زیادہ خوشبو اور درخشانی صرف کردی تھی۔ یہ گویا ایک طلسمی خواب تھا جس کی مختصر سی فرصت میں ہندوستان کے تمام جذبات نفسانی، عجم کے تمام سلیقے اور تکلفات، چین کا تمام بطی السیر سائنس اور عرب کے تمام شاندار پرستانی خواب شامل ہوگئے تھے۔

عرب کے ریگستانوں سے لیکر جزائر جاپان تک اور مغرب اقصیٰ سے لیکر ہندوستان تک عجمی مصوری کے خزانوں کو لئے ہوئے ایرانی نقاشی ایک بحر عمیق کے مانند ہے جو تمام خواہشات نفسانی، جملہ کیفیات نشہ و سرور اور قدیم اقوام و ملل کی تمام آزاد و موثر خیال آرائیوں کا معجون مرکب ہے۔ وہ ایک باغ عدن تھا جہاں پھولوں بھرے مرغزاروں میں شیر پھرتے تھے۔ جہاں سبز سرخ اور نیلگوں ریشمی پوشاکوں میں مرد و حور

کے نقوش قالینوں پر نظر آتے تھے۔ عجمیوں کے لئے تو جسقدر بھی پھول ہوں اتنے ہی کم ہیں۔ تمام پتوں پہ پھول ہیں۔ تمام قالینوں میں پھول ہیں۔ جہاں دیکھو وہاں پھول ہی پھول ہیں۔ بڑے بڑے پھول جن کے نقوش ان کاسہ ہائے چینی میں بھی موجود ہیں جن میں خواتین عجم طلائی چمچوں سے قند وگل کھایا کرتے تھے۔ میدانی مناظر کی تصاویر میں جہاں سرخ، سبز اور سنہرے رنگ ایسی قدرتی ہم آہنگی پیدا کردیتے ہیں کہ فرشِ تصویر پر بزمِ فرشِ مخملیں کا گمان ہوتا ہے شوخ و طناز خوبصورت راہوار گردنیں خم کئے سرپٹ دوڑتے نظر آتے ہیں۔ ہر مرکب پر ایک صاحبِ فخر و ناز راکب سوار ہے۔ کلائی پر ایک باز ہے اور ایک درخشاں طرۂ دستار ہوا میں لہرا رہا ہے۔ محلات و قصور کے جلوخانے فردِ گل و ریاحین سے مشجر بنے ہوئے ہیں۔ ان کی روغنی ابردار دیواروں پر جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔ ان کی چھتیں بلوریں ہیں فرش رنگین قالینوں کا ہے، جہاں طلائی طاؤس اپنی زمردیں دُمیں پھیلائے ہوئے ہیں۔ باغات ہیں جن میں جگہ جگہ سنگ سماق اور سنگ یشب کے گملے نصب ہیں۔ آب شفاف کے فوارے ہیں جو فضا میں موتی اُچھال رہے۔ درجہ بدرجہ پشتے ہیں، خیابانیں ہیں۔ اور بروج ہیں جن کے رنگ گلابی، آسمانی یا دودھیا ہیں۔ شب کی تاریک گہرائیوں میں بھی یہ ایسے چمکتے ہیں جیسے طلوعِ آفتاب کے وقت برف۔ جب شام ہوتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک طائفۂ اربابِ نشاط کنارِ آب بیٹھا ہوا نغمۂ و سرود میں مصروف ہے، پختہ پھلوں کی فرحت بخش خوشبوئیں دماغ میں پہونچتی ہیں جو درختوں میں پتوں کے اندر چھپے ہوئے چمکتے ہیں اور نکلتا ہوا چاند تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ستاروں کے ہار سے کوئی سچا موتی ٹوٹ کر گرا ہے......

یہ تمام دلفریب مناظر موئے قلم سے کھینچے گئے ہیں اور ان میں چمکدار رنگ بھرے گئے ہیں۔ ان میں تاریک رات کی معصومیت اور دن کی روشنی موجود ہے۔ یہاں الف لیلہ کے تمام وہ قصے موجود ہیں جو داستان گویانِ باستانی کے خواب و خیال میں آئے تھے۔ اور جنھیں وہ شام سے صبح تک خیمہ کے نیچے حلقہ جما کر بیٹھے ہوئے خوشمزاج مسافروں کو سنایا کرتے تھے۔

یہاں عجیب و غریب قومیں ہیں جو بحیثیت مجموعی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ بعض وہ ہیں جو پشمینہ کی سفید عباؤں اور چغوں کے نیچے سرخ و سبز ریشم کی پوشاکیں پہنتے ہیں اور جو اپنے گھوڑوں کے ساز کو زرد جواہر سے مزین کرتے ہیں۔ یہ لوگ اسلحہ بناتے ہیں اور ان میں جواہرات جڑتے ہیں۔ وہ ابردار اور منقش ظروفِ مسی میں اپنا پانی رکھتے ہیں۔ ان کو صرف خاموشی و سکوت میں غور و خوض کرنا آتا ہے اور جو کبھی ہنسنے پر آتے ہیں تو قہقہوں سے آسمان سر پر اُٹھا لیتے ہیں۔ اور جو کبھی کھانے پینے کا دور آتا ہے تو نوشا نوش میں

اپنی فطری متانت و سنجیدگی کو بھی بالائے طاق رکھدیتے ہیں۔ ان کو نہ موت کی پروا ہے نہ زندگی کی فکر۔ ان کے استغراق و تصور کی بہشت میں حوریں آباد ہیں۔ ان کے شدید جوش مذہبی کا سوائے ان کی سخت کاہلی اور جمود کے اور کوئی چیز مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وقت ان کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا۔ اور وہ اپنے معابد کو اسی لاپروائی سے منہدم ہوجانے دیتے ہیں جسقدر جوش و خروش سے انھوں نے ان کو تعمیر کیا تھا۔

موسم کی شدتوں۔ فطرتوں کے زبردست تضاد اور بدویانہ زندگی نے ان کو توازن روحی سے جس کو ہم اس قدر عزیز رکھتے ہیں سبے پرواہ کردیا ہے۔ دولتمند آدمی سو سو عورتیں رکھ سکتا ہے مفلس و نادار کے پاس چاہے ایک بھی نہ ہو۔ اس طرح گویا نفسیاتی تجرید اور بدترین بہیمیت کے مابین ایک زبردست فصل ہے جو کبھی پر نہیں ہو سکتا۔ لیکن مغربی قومیں اس خلا کو اس طرح پُر کرلیتی ہیں کہ وہ ان تمام شاہراہوں کو طے کرجاتی ہیں جنہیں بہیمانہ زندگی سے آگے بڑھکر شجاعانہ زندگی کی منزل تک پہونچنا لازم ہے۔ ان مغربی اقوام میں ہمکو وہ مشرقی قومیں بھی شمار کرلینا چاہئے جو بلحاظ نسل اسی جماعت سے تعلق رکھتی ہیں جس سے یوربین قومیں متعلق ہیں۔

بیشک یہی وجہ ہے کہ ایرانیوں نے جن کے ذہن غالباً اسقدر وسیع نہیں تھے جتنے سامی النسل قوموں کے اپنے تاریخی کارناموں سے کبھی انحراف نہ کیا اور ہمیشہ ارض النہرین کے قدیم تمدنوں کا کچھ نہ کچھ اثر مستقبل میں پیدا کرتے رہے۔ اور غالباً یہی وجہ تھی کہ ساسانی اور اسلامی ایران کے درمیان فنون عجم کا سلسلہ برابر جاری رہا۔
اس میں شک نہیں کہ ایک رومانی مذہب بغیر بت پرستی کے ہی کام چلا سکتا ہے اور بجائے بتوں کو ترقی دینے کے معصوم روح کو ترقی دینا بہتر ہے مگر بت شکن شہنشاہوں کی حمایت میں جو یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ اگر تصاویر کا تعلق مذہب سے نہیں تھا تو فنون لطیفہ کا تو تھا اور وہ ان کو ترقی دیا کرتے تھے۔ بہت کمزور ہے۔ کیونکہ فن کو فن کے لحاظ سے اختیار کرنا چاہئے اور اس کو اس امر کا پابند کرنا کہ وہ ایک ہی سرچشمہ سے سیراب ہو ایسا ہے جیسے تمام سرچشموں کا پانی دفعتاً خشک کردیا جائے۔

اگر بت پرستی بائزنطیم کو نہیں بچا سکی تو اس کا باعث یہ تھا کہ بائزنطیم شہر یونان کا ایک سڑا ہوا پھل تھا مگر وہ بت پرستی ہی تھی جس نے مصر و یونان اور ہندوستان کو بنا دیا، جس نے قوم قوط کے انقلاب سیاسی کی زنجیریں کھول دیں۔ اطالیہ اور فلینڈرس میں دور بیداری پیدا کردیا اور جو یوروپ میں تمام گزشتہ صدی کے قابل تعریف اور اہم دور تحقیق و تدقیق کو وجود میں لائی۔ تمام پائدار تمدن بت پرستی ہی کے بطن سے پیدا ہوئے اور یہ مطالبہ ہرگز درست نہیں ہوسکتا کہ انسان ہمیشہ ریگستان میں رہا کرے جبکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خود ریگستان کے لوگ نخلستانوں

کی پناہ تلاش کرتے ہیں۔

یہ خیال درست نہیں کہ بت پرست قوموں نے خود کو اصنام پرستی سے آزاد کر لیا تھا بلکہ فی الحقیقت انھوں نے بت پرستی ہی کے ذریعہ سے نجات حاصل کی تھی، یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے اصنام پرستی کے ذریعہ سے دنیا میں معقولات کا سلسلہ جاری کیا۔ کیونکہ وہ تجزیہ و تحلیل کا ایک بے نظیر ذریعہ تھا۔ جو لوگ سوائے روح کے اور کسی چیز کو تسلیم نہیں کرتے وہ بھی اپنے آپ کو نفسیاتی بتوں سے علحدہ نہیں کر سکے۔ اور اس لئے یہ کہنا کہ انھوں نے بت پرستی نہیں کی غلط ہے۔

بت سازی خیال انسانی کے لئے ایک سہارا ہے اور یہ سہارا اس خیال کو حدودِ حقیقت کے اندر قائم رکھتا ہے، اور اسی کے ساتھ تخیل انسانی میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ بت پرستی تجربہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور اس کے ذریعہ سے عمل کی طرف لے جاتی ہے۔ جب ہمارا توازن متزلزل ہو جاتا ہے تو ہم بتوں کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ان سے دعائیں مانگتے ہیں کہ وہ ہم کو نظم و ضابطہ سکھائیں تاکہ ہم پھر از سر نو زندہ ہو جائیں اور جب صحرا میں پیدا ہونے والے انبیاء و رسل کا بتایا ہوا خیال گرد و غبار کے سوا کچھ باقی نہ رہیگا تو اسوقت بت پرستی ہی دنیا کو بچائے گی۔

# نگار کے گزشتہ سالوں کے پرچے

## حسب ذیل قیمت پر معہ محصول مل سکتے ہیں

ستمبر سنہ ۲۲ء ۴ر۔ اکتوبر ۴ر۔ جنوری سنہ ۲۴ء ۴ر۔ فروری ۴ر۔ مارچ ۴ر۔ اپریل ۴ر۔ مئی ۸ر۔ اگست ۴ر
جنوری سنہ ۲۶ء ۴ر۔ مئی ۴ر۔ جون ۴ر۔ اکتوبر ۴ر۔ نومبر ۴ر۔ دسمبر ۸ر۔ مارچ سنہ ۲۷ء ۴ر۔ اپریل ۴ر۔ مئی ۴ر۔ جون ۴ر
دسمبر سنہ ۲۸ء ۸ر۔ فروری سنہ ۲۹ء ۸ر۔ مارچ ۸ر۔ جون ۸ر۔ مارچ سنہ ۳۰ء ۸ر مئی ۴ر۔ ستمبر ۴ر۔ اکتوبر ۴ر۔ نومبر ۴ر۔ دسمبر ۴ر
مئی سنہ ۳۱ء ۸ر۔ جولائی ۳ر۔ اگست ۳ر۔ ستمبر ۴ر۔ اکتوبر ۳ر۔ نومبر ۳ر۔ دسمبر ۳ر۔ جنوری سنہ ۳۲ء ۱۲ر۔ فروری ۴ر
مارچ ۴ر۔ اپریل ۴ر۔ مئی ۴ر۔ جون ۴ر۔ جولائی ۴ر۔ اگست ۴ر۔ ستمبر ۴ر۔ اکتوبر ۴ر۔ نومبر ۴ر۔ دسمبر ۴ر۔ جنوری سنہ ۳۳ء ۸ر
فروری ۴ر۔ جولائی ۴ر۔ اگست ۸ر۔ ستمبر ۴ر۔ اکتوبر ۴ر۔ دسمبر ۴ر۔

منیجر نگار۔ لکھنو

# تمہارا مسلک اور میرا مسلک

تمہارا مسلک ایک آہنی درخت ہے جو اپنی غذا تقلید کی مٹی سے حاصل کرتا ہے اور جس کی شاخیں عادت و استمرار کی قوت سے نشو و نما پاتی ہیں۔

میرا مسلک ایک بادل ہے جو فضا میں آزادانہ تیرتا ہے، پانی بن کر برستا ہے، نہر و دریا بن کر سمندر میں مل جاتا ہے اور پھر کہر بن کر ہر طرف چھا جاتا ہے۔

تمہارا مسلک، ایک مضبوط بُرج ہے جس کو نہ آندھیاں جنبش میں لا سکتی ہیں اور نہ زلزلہ۔

میرا مسلک، ایک نرم و نازک درخت ہے جو ہر طرف جُھک جاتا ہے اور جس کی لچک مسرت و سرور پیدا کرتی ہے۔

تمہارا مسلک، تمہارا قدیم مذہب ہے جو نہ تم میں کوئی تغیر پیدا کر سکتا ہے نہ اپنے اندر اور میرا مسلک میری بدعت و اختراع ہے جس کی چھان بین میں ہر صبح و شام کرتا رہتا ہوں۔

---

تمہارا مسلک یہ ہے کہ تمہارا قوی تمہارے ضعیف کو ہلاک کر دے، تمہارا پُرفن خرد ایک سیدھے سادے شخص کو تباہ و برباد کر دے۔

میرا مسلک یہ ہے کہ میں اپنے کھیت خود کاشت کروں اور خود انھیں کاٹوں، خود اپنا مکان تعمیر کروں اور اپنے کپڑے خود بُنوں۔

تمہارا مسلک جاہ و ثروت کا حصول ہے اور میرا مسلک اعتماد نفس،

تمہارا مسلک شہرت و نمائش کی جستجو ہے اور میرا مسلک یہ ہے کہ ان دونوں کو ساحل ابدیت پر ذرہ ریگ سے زیادہ وقعت نہ دوں۔

تمہارا مسلک، سلطنت و ملوکیت کے لئے کوشش کرتا ہے اور میرا مسلک ملک و ملت کے لئے استقلال حریت طلب کرنا۔

تمہارا مسلک یہ ہے کہ رات دن دیبا و حریر کا خواب دیکھا کرو اور میرا مسلک صرف روح کی پاکیزگی چاہتا ہے خواہ جسم عریاں ہو۔

تمہارا مسلک یہ ہے کہ بڑے بڑے وظائف و خطابات حاصل کرو اور میرا مسلک قوم کی خدمت کرنا ہے۔

---

تمہارا مسلک یہ ہے کہ اجتماعی، قانونی، دینی قاموس، اور سیاسی معلومات مرتب کرتے رہو اور میرا مسلک مبادیات قلب و روح کو پیش کرتا ہے تمہارا مسلک کہتا ہے کہ فلاں عورت جمیل ہے، فلاں قبیح، فلاں فاضل ہے اور فلاں جاہل لیکن میرا مسلک کہتا ہے کہ "ہر عورت ہر مرد کی ماں ہے، ہر عورت ہر مرد کی بہن ہے اور ہر عورت ہر مرد کی بیٹی"

تمہارا مسلک بتاتا ہے کہ "فلاں چور ہے، مجرم ہے، قاتل ہے، سرکش ہے"

میرا مسلک کہتا ہے کہ "چور، سرمایہ داری کی پیداوار ہے، مجرم کا خالق خود ظلم ہے۔ قاتل، مقتول کا حلیف ہے، اور سرکشی نتیجہ ہے قدامت پرستی کا"

تمہارا مسلک "ماہر و فیلسوف کا متجسس ہے، عالم و فاضل کی جستجو میں مبتلا ہے"

میرا مسلک "ایک محبت کرنے والے دل، ایک مخلص دماغ اور قربانی کرنے والے ہاتھ کا متمنی ہے۔

تمہارا مسلک کہتا ہے کہ "فلاں موسوی ہے، فلاں عیسوی، یہ ہندو ہے، وہ مسلمان"

میرا مسلک کہتا ہے کہ "دنیا میں صرف ایک ہی مذہب ہے، محبت مطلق ۔۔ اور اسی کی یہ سب شاخیں ہیں جن میں کوئی فرق نہیں"

تمہارا مسلک "کافر و مشرک فاسق و زندیق، شیعی و خارجی" کی چھان بین میں مصروف ہے اور میرا مسلک "ضعیف و کمزور، بیکار و مفلس، مجروح و معذور کی خدمت میں منہمک ہے۔

تمھارا مسلک غنی و فقیر، آقا و غلام کی تفریق کا حامی ہے اور میرا مسلک بتاتا ہے کہ ہم سب فقیر ہیں اور غنی صرف حیات ہے، ہم سب سایل ہیں اور صاحب عطا ہماری زندگی ہے۔

---

تمھارا مسلک بتاتا ہے کہ قوموں کی تشکیل سیاسی انجمنوں، سیاسی تقریروں اور سیاسی معاہدات سے ہوتی ہے اور میرے مسلک میں تعمیر قومیت صرف عمل سے ہوتی ہے۔

تمھارا مسلک کہتا ہے کہ "قوموں کا مجد و شرف اکابر ملوک سے وابستہ ہے اور سکندر و قیصر، ہنی بال و نپولین کا ذکر نہایت فخر کے ساتھ کرتے ہو۔

میرا مسلک کہتا ہے کہ" اکابر یہ نہیں ہیں بلکہ وہ کنفوشس و بودھ ہیں، افلاطون و سقراط ہیں، غزالی و رومی ہیں"

تمھارا مسلک کہتا ہے کہ قوت نام ہے تیغ و تفنگ کا، ہوائی جہازوں اور بحری اسطولوں کا، بم کا، زہریلی گیس کا۔

میرا مسلک کہتا ہے کہ قوت نام ہے حق و صداقت کا اور تیغ و تفنگ سے غالب آنے والے ایک دن مغلوب ہو کر رہیں گے۔

الغرض تمھارا مسلک اور ہے، میرا مسلک اور!

---

# نغمۂ دل

(گزشتہ سے پیوستہ)

لیکن ایک ایک شعر ارباب ذوق کو تڑپا دیتا ہے، اس اعجاز و اثر کا حقیقی راز صرف انداز بیان کی جدت و لطافت ہے، غرض شاعرانہ حیثیت سے انداز بیان اور طرز ادا کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اسکو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جناب دل کے کلام میں یہ خصوصیت خاص طور پر نمایاں نظر آتی ہے، جس کا اندازہ ایک بڑی حد تک ان اشعار سے بھی ہوتا ہے، جو ان کے محاسن معنوی کے سلسلۂ تنقید میں اوپر نقل ہوئے ہیں، اس موقع پر چند خاص مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ایک اسیر قفس کی زندگی جس مجبوری اور بیچارگی کے عالم میں گزرتی ہے، اس کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

افسوس اک اسیر قفس کی تمام عمر    وقفِ نظر شناسی صیاد ہو گئی

"نظر شناسی صیاد" کی ترکیب نے ایک معمولی سے خیال کو جسقدر موثر اور دلکش بنا دیا ہے، اس کو ہر صاحب ذوق محسوس کر سکتا ہے۔

ناکامانِ زندگی جس طرح بہار کامرانی کی خیالی نقش آرائیوں سے اپنے افسردہ قلوب کو تسکین دیتے رہتے ہیں، اس کی کیفیت اس طرح بیان کرتے ہیں۔

بہلا رہے ہیں اپنی طبیعت خزاں نصیب    دامن پہ کھینچ کھینچ کے نقشہ بہار کا

محبوب کے دامن جھٹکنے کا انداز کوئی غیر معمولی خیال نہیں، لیکن جناب دل کا پیرایۂ بیان قابل داد ہے۔

سرِ طور ایک برقِ حسن لہراتی نظر آئی    ذرا شوخی سے جھٹکا تھا کسی نے اپنے داماں کو

جناب وِل اکثر تشریح کی بجائے اشاروں سے کام لیتے ہیں، جن سے طرز ادا میں ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے، یہ ان کا خاص انداز معلوم ہوتا ہے مثلاً

بیخودِ عشق ہیں دل مائل فریاد نہیں ہم پہ گزرا تو بہت کچھ ہے مگر یاد نہیں

دیکھو "بہت کچھ" کے اشارے سے اور پھر اس پر "یاد نہیں" کے ٹکڑے نے جو دلکشی اور اثر پیدا کر دیا ہے وہ تشریح کی صورت میں ناممکن تھا۔

کہنے کی ہے کیا حاجت احوال شبِ فرقت گزرا ہے جو کچھ ہم پر تم نے بھی سنا ہوگا

"تم نے بھی سُنا ہوگا" کے ٹکڑے نے ایک معمولی سی بات میں غور کرو جان ڈالدی ہے، کہا کچھ بھی نہیں لیکن دراصل سب کچھ کہہ گئے۔

ہم کو بے چین کئے جاتے ہیں ہائے کیا شے وہ لئے جاتے ہیں

بجائے "کیا شے" کے اگر صاف کہدیتے تو شعر کی تمام بلاغت برباد ہو جاتی، ابتدائے محبت کی غیر متعین کیفیت "ہائے کیا شے" نے جس خوبی کے ساتھ ادا کی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

اگرچہ جناب وِل کے اندازِ بیان میں کوئی غیر معمولی جدت اور ندرت موجود نہیں ہے، تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے طرزِ ادا میں ایک خاص روانی و برجستگی اور صفائی و دلآویزی عام طور پر محسوس ہوتی ہے، اس کا ایک خاص سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے جو زبان اختیار کی ہے وہ غزل کے لئے نہایت موزوں اور مناسب ہے، یعنی صاف، شیریں، سادہ اور تصنع و تکلف سے پاک ہے اگرچہ فارسیت سے بھی ذوق آشنا معلوم ہوتے ہیں، لیکن اس رمز سے واقف تھے کہ غزل کی لطافت ثقیل اور نامانوس فارسی ترکیبوں کی متحمل نہیں ہوسکتی، چنانچہ بجز ہلکی اور شیریں ترکیبوں کے ان کا کلام اس ثقالت سے پاک و صاف ہے، لیکن سادگی کے ساتھ ساتھ حتی الوسع شاعرانہ رنگینی کا بھی لحاظ رکھتے ہیں، اس کا اندازہ کافی طور پر اشعار مذکورۂ بالا سے ہر صاحب ذوق بآسانی کرسکتا ہے، مزید مثالوں کی چنداں ضرورت نہیں۔

غزل گو شعرا میں اکثر مسلسل واقعہ نگاری کی صلاحیت بہت کم ہوتی ہے، اور یہ اُردو غزل گوئی کا ایک بڑا نقص ہے کہ باہم اشعار میں کوئی معنوی تعلق نہیں ہوتا، اگرچہ واقعہ نگاری اور تسلسلِ خیال کیلئے اور اصناف سخن مثلاً مثنوی، قصیدہ وغیرہ موجود ہیں تاہم غزل میں بھی تسلسلِ خیال سے کام لیا جائے تو

بہتر ہے، جناب دلؔ کے کلام میں اکثر عشق و محبت کی مختلف کیفیات کی مسلسل مصوری کی مثالیں نظر آتی ہیں، جن سے ان کی قوتِ نظم کا اندازہ ہوتا ہے، مثلاً ابتدائے عشق کی ایک کیفیت مسلسل غزل میں بیان کی ہے، جس کا مطلع یہ ہے۔

یاد ہے اے ہمنشیں وہ بھی زمانہ یاد ہے　　دل کا آنا یاد ہے پہلو سے جانا یاد ہے

ایک دوسری غزل میں جس کا مطلع یہ ہے

کسی کی یاد تھی آنکھوں سے اشک ڈھلتے تھے　　اسی خیال میں ہم کروٹیں بدلتے تھے

محبوب کی یاد کی تصویر کھینچی ہے۔

اس سلسلہ میں وہ غزل جس میں جناب دلؔ نے اپنا نذرانہ خلوص و عقیدت پیک یار کی معرفت بھیجا ہے خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہے، جس سے ان کے جوشِ محبت اور گرمی نیاز کا اندازہ ہوتا ہے اس غزل کا مطلع یہ ہے۔

شکیب و ضبط بھی اے پیکِ یار لیتا جا　　پلٹ چلا ہے تو دل کا قرار لیتا جا

افسوس ہے کہ طوالت کے لحاظ سے ہم ان غزلوں کو مکمل نقل نہیں کرسکتے، ناظرین خود ملاحظہ فرمالیں۔

اس مجموعہ کے آخر میں چند رباعیات اور مخمس ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب دلؔ صرف غزلگو نہیں ہیں، بلکہ اور اصنافِ سخن پر بھی قادر ہیں، اور اپنے خیالات و جذبات کا اظہار نہایت روانی اور صفائی کے ساتھ مختلف طریقوں سے کرسکتے ہیں، چونکہ ان میں کوئی نمایاں خصوصیت نظر نہیں آتی، اور طوالت کا بھی خوف ہے، اس لئے ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں، اور جناب دل سے رخصت ہوتے ہوئے اتنا عرض کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ باوجود ان کے شاعرانہ فضل و کمال کے، باوجود ان کی متانت اور سنجیدگی کے باوجود ان کی اخلاقی بلندی اور پاکیزہ خیالی کے ان کی لکھنویت اب تک میری نگاہوں میں کھٹکتی ہے، جو ان کے عارضِ کمال کا ایک بدنما داغ ہے۔

مرزا احسان احمد (بی اے، ال ال بی)

# مکتوبات نیاز

رعایتی قیمت میں وہی لوگ حاصل کرسکتے ہیں جو عاً پیشگی بھیجدیں گے محض پیشگی نام لکھا لینا مفید نہیں ہوسکتا۔ منیجر نگار

# استدراک جناب دل شاہجہانپوری

نغمۂ دل پر جناب نے اپنا قابل قدر وقت صرف کرکے جس فاضلانہ انداز سے ایک بسیط مضمون لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور پھر "کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ" کو پیش نظر رکھکر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جو حقیقتاً کسی بحث پر مبنی نہیں ہے بلکہ صرف باہمی تبادلہ خیال کی حیثیت رکھتا ہے۔

جناب نے مقدمہ میں حضرت نیاز کے مقدمہ کی بابت تحریر فرمایا ہے کہ "ضرورت سے زیادہ طویل ہے"۔ میرے خیال میں جناب کا مدعا یہ ہے کہ مقدمہ میں صرف شاعر کے کلام یا اس کے حالات سے بحث کرنا چاہئے۔ اور شاعری پر گفتگو کرنا غیر ضروری طوالت ہے اگر واقعی مفہوم یہی ہے تو اکثر دواوین کے مقدمات نہ صرف طویل بلکہ لاطائل سمجھے جائیں گے اور اس حقیقت سے آپ ہی کو زیادہ واقف ہونا چاہئے۔ پھر جناب نے تحریر فرمایا ہے کہ غزلیات کی ترتیب قدیم طرز پر ردیف وار رکھی گئی ہے اس ترتیب میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ شاعر کے مدارج کلام کا صحیح طور پر اندازہ نہیں ہو سکتا یعنی ابتدا میں کلام کیسا تھا رفتہ رفتہ اس میں کیا ترقیاں یا تبدیلیاں ہوئیں، میرے محترم دوست، میں نے اس امتیاز کے لئے حرف قؔ اور جؔ لکھنا کافی سمجھا اس صورت میں اہل نظر کے لئے قدیم اور جدید کلام سمجھنے میں کوئی دقت باقی نہیں رہتی۔ کلام کے ردیف وار ہونے میں یہ زحمت پیش آتی ہے کہ اگر کسی غزل کے دیکھنے کی ضرورت ہو تو کل دیوان کی ورق گردانی ضروری ہو جاتی ہے۔ جناب تحریر فرماتے ہیں کہ "اگر ضخیم دواوین کے بجائے منتخب کلام کے مختصر مجموعے شائع کئے جائیں تو زیادہ مفید اور بہتر ہو۔ شاعر کا یہ کمال نہیں ہے کہ اس نے کتنا کہا بلکہ کیا کہا اور کیسا کہا"۔ جناب کے خیال سے اس قدر اتفاق مجھ کو ضرور ہے کہ پست اور عامیانہ اشعار ضرور خارج کر دئے جانے چاہئیں لیکن شدت کے ساتھ انتخاب مصنف کی قدرت سے باہر ہے ہر شعر مصنف کی عرق ریزی کا نتیجہ ہوتا ہے وہ اپنی

نظر میں اکثر کو بہتر سمجھتا ہے ایسی حالت میں یہ کام اس کے بس کا نہیں اگر کسی دوسرے نقاد کو یہ خدمت سپرد کی جائے تو وہ انتخاب اسی نقاد کے مذاق کا مجموعہ ہو جائے گا ہر سخن سنج کی پسند جدا ہے۔ دور گزشتہ کا ذکر ہے ایک مشاعرہ میں کسی شاعر کے کلام پر جناب غالب ایک شعر کو تین مرتبہ پڑھوا کر داد سخن دیتے ہیں جسکیم مومن خاں خاموش ہیں اسی غزل میں جب شاعر دوسرا شعر پڑھتا ہے جناب غالب خاموش ہو جاتے ہیں اور مومن خاں اس شعر کو کئی مرتبہ پڑھوا کر داد دیتے ہیں۔ میرے دیوان پر معارف میں مولوی عبدالسلام صاحب ندوی، تاج آگرہ میں جناب سیماب اکبرآبادی اور حمایت اسلام لاہور میں حضرت ریاض خیرآبادی جب اظہار خیال فرماتے ہوئے منتخب اشعار پیش کرتے ہیں تو ان میں سے اکثر ایک دوسرے کے انتخاب سے مختلف ہوتے ہیں۔ شوق سندیلوی نے اپنی سولہ غزلوں پر ستائیس مشاہیر سے اصلاح لی بعد ازاں اس کو اصلاح سخن کے نام سے چھپوا دیا آپ نے بھی اسے ملاحظہ فرمایا ہوگا، پھر کیا یہ امر حیرت انگیز نہیں کہ ایک استاد شعر کو قلم زد کر دیتا ہے اور دوسرا اسی شعر پر دو صاد بناتا ہے یہ ہے اختلاف مذاق دنیاء شاعری کا اور یقیناً یہ سخت غلطی ہے کہ دیوان کسی ایک شخص کی رائے پر انتخاب کے بعد طبع کرایا جائے۔ بعض حضرات ایسے ہیں جن کے دل پر سرور انگیز تخئیل اثر کرتی ہے۔ بعض یاس آفریں مضمون کو پسند کرتے ہیں کسی کے لئے نغمہ باعث دلکشی ہے اور کوئی نالہ و زاری پسند کرتا ہے، کہیں رنگ تصوف ہے اور کہیں فلسفہ۔ اگر دیوان صرف یاس آفریں خیالات کا مجموعہ بنا دیا جائے تو شگفتہ طبائع کی نظروں میں وہ کلام مرثیہ ہو جائے گا اور اگر نشاط انگیز کلام انتخاب کیا جائے تو صاحب درد کی نظروں میں بے کیف ہوگا۔ آگے بڑھ کر جناب تحریر فرماتے ہیں کہ "ماحول سے متاثر ہونا تقاضائے فطرت ہے جناب دل نے آنکھیں کھولیں تو ملک میں امیر مینائی کا رنگ چھایا ہوا تھا، انہوں نے تلمذ نہ کیا تو انھیں کے سامنے نہ کیا لیکن چونکہ قدرت کی طرف سے طبع سلیم عطا ہوئی تھی اس لئے ان کے کلام میں وہ ابتذال نظر نہیں آتا جو عام طور پر لکھنؤ کا انداز ہے۔ تاہم لکھنویت کا اثر بہت کچھ نمایاں ہے نیاز صاحب نے ایک جگہ مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے غضب خدا کا آپ سارا دیوان پڑھ ڈالئے اور کہیں ایک جگہ بھی آپ کو وصل کا مبارک لفظ نہ ملے تمام مجموعہ چھان ڈالئے کہیں بھی اس آرام جان تمنا کا ذکر نہ آئے مجھکو جناب دل کی متانت اور سنجیدگی سے انکار نہیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس دعویٰ کا مقصد کیا ہے کیا اسکا یہ منشا ہے کہ جناب دل کا کلام لکھنویت سے بالکل پاک ہے، لکھنویت صرف وصل کا نام نہیں جو

مضامین عام طور پر لکھنؤ کے غزل گو شعراء کے سرمایہ خیال ہیں۔ مثلاً شمع تربت۔ چراغ مزار بت سفاک گریہ و زاری۔ ناز و ادا۔ کوچۂ قاتل۔ گور غریباں وغیرہ ان کی جھلک جناب دل کے کلام میں بھی نظر آتی ہو اور یہ اثر ان کی قدیم غزلوں میں محسوس ہوتا ہے" اس کے بعد آپ چند شعر نقل فرماتے ہیں اور اسکے بعد لکھتے ہیں کہ:۔

" اس قسم کے اور بھی اشعار ہیں جن کو طوالت کے لحاظ سے ہم قلم انداز کرتے ہیں دو شعر اور ملاحظہ ہوں "

ہوا سکی گھٹا چھائی چمن میں پھر بہار آئی — تمنا ہے کہ وہ گل پیرہن پہلو نشیں ہوتا
یہ بھیگی رات یہ ٹھنڈا سماں یہ کیف بہار — یہ کوئی وقت ہے پہلو سے اُٹھ کے جانیکا

کیا نیاز صاحب اب بھی اپنے دعوے پر قائم ہیں کیا پہلے شعر میں آرام جان تمنا کا ذکر نہیں، دوسرے شعر کا مصرعہ ثانی اگر وصل نہیں تو پھر کس کیفیت کی طرف اشارہ کر رہا ہے" یہ صحیح ہے کہ میری شاعری نے ایک لکھنوی اُستاد کے آغوش میں تربیت پائی تاہم مجھ کو تغزل میں عریانی اور رنگ ناسخ پسند نہیں آیا ممکن ہے کہ جناب کو وہ رنگ محسوس ہوتا ہو جس کو آپ لکھنوی کہتے ہیں اس امر کا آپ کو خود اعتراف ہے کہ یہ رنگ قدیم غزلوں میں نمایاں ہے۔ منت پذیر ہوں کہ جناب نے مخلصانہ پیرایہ میں مجھ کو آگاہ کیا مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ الفاظ مذکور کے استعمال کو لکھنویت سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے جبکہ شعراء دہلی کے کلام میں بھی بکثرت یہ الفاظ منظوم نظر آتے ہیں بہ نظر اختصار چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

اصغر۔ وہ مست ناز جو مجھ پر عنایاں نہ کرے — لحد کا پھول چراغ سر مزار نہ ہو
غالب۔ خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں — چراغ مردہ ہوں میں بے زباں گور غریباں کا
اصغر۔ محو ادا و ناز ہے یوں ہمہ تن نیاز سے — پوچھ صنم پرست سے کیفیت ناز عشق
ذوق۔ تھا کوچۂ قاتل میں شہادت کا دفینہ — کھودا جو کنواں گنج شہیداں نکل آیا
" یارب ہو دل کی خیر کہ کچھ کر رہے ہیں آج — چشم و نگاہ عشوۂ و ناز و ادا اصلاح
" میں جو شہید ہوں لب خندان یار کا — کیا کیا چراغ ہنستا ہے میرے مزار کا
" جن کی نظر چڑھا تر ار رخسار آتشیں — اُن کا چراغ گور نہ تا حشر گل ہوا
" ابکی دل لوں تو پھر اس بت قاتل کو نہ دوں — جان دوں مال دوں ایمان دوں پر دل کو نہ دوں
" نہیں آتا نہ آئے رحم لے ذوق اس ستمگر کو — بلا سے خوش تو ہوتا ہے وہ میری آہ و زاری سے

میرے اشعارِ مرقومہ بالا کی بابت اگر جناب یہ تحریر فرماتے کہ سطحی اور پامال ہیں تو ایک حد تک صحیح تھا لیکن شمعِ تربت چراغِ مزار اور کوچۂ قاتل کو بالکل لکھنؤی چیز سمجھنا درست نہیں۔ فصحاء دہلی کے یہاں بکثرت اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ ہر لفظ کا استعمال اپنے محل پر متین اور بے محل استعمال ہونے پر خلافِ مذاق ہو جاتا ہے۔ میری رائے میں مجرد مستی اور رقص کا لفظ اُردو تغزل میں پسندیدہ نہیں لفظ مستی لغت میں ہوشیاری کے مقابل اور دوسرے مذموم معنی کا حامل ہے اسی طرح رقص کا لفظ اکثر محل پر مطربۂ عشوہ گر کی تصویر پیش کر دیتا ہے جب وجد کا متین لفظ موجود ہے تو رقص کا لفظ بے محل کیوں استعمال کیا جائے یہ میرا خیال ہے اگر کوئی صاحب ان الفاظ کے استعمال کو پسند فرماتے ہیں تو ان کی رائے ہے لفظ وصل کے استعمال سے مجھ کو انکار نہیں بشرطیکہ جماع کے مفہوم پر نظم نہو۔ معذور ہوں کہ دنیائے شاعری میں مجھ کو صراحۃً اس مبارک لفظ کے استعمال کا موقع نہیں ملا، میں وصل سے ناآشنا ہوں، ہمیشہ مہجور رہا ہر شاعر کو اپنی بیتی کہنا چاہئے مجھ کو انبساطی مضمون نظم کرنے کا کم موقع ملا اکثر فریادِ عاشقانہ جو مرثیہ کی حد تک نہ پہونچے میرا انداز ہے میرے محبوب کی بارگاہ میں رقیب کا بھی گزر نہیں گلۂ رقیب سے بھی ناآشنا ہوں میرے دو شعر نقل فرما کر جناب نے اظہارِ خیال فرمایا ہے، کہ اگر وصل نہیں تو کس کیفیت کی طرف اشارہ ہے۔ جناب نیاز نے اپنے مقدمہ میں لفظ وصل پر اظہارِ خیال فرمایا ہے مفہومِ وصل کی بابت کوئی تذکرہ نہیں کیا صفحہ پانچ میں جناب نے تحریر فرمایا ہے "لیکن باوجود اسکے ہمکو جناب دل کے کلام میں ایک خاص کمی محسوس ہوتی ہے یعنی رقص و سرود اور جوش و مستی کا عنصر بہت کم نظر آتا ہے جو عشق کی اصلی امتیازی خصوصیت ہے" یہ صحیح ہے کہ میرے کلام میں سرور انگیز مضامین کم ہیں لیکن مجبور ہوں کہ میں نے فضاءِ شاعری میں اکثر نالہ کشی کی کبھی انبساط کا موقع ملا تو حالتِ وجد طاری ہوئی، رقص سے ناآشنا ہوں اسی طرح خمخانۂ محبت میں بدمستی سے بھی بے خبر ہوں، اگر گستاخی نہ سمجھی جائے تو عرض کروں کہ جناب نے عشق کی اصلی امتیازی خصوصیت سرور و رقص جوش و مستی کیوں قرار دی ہے عشق کی تعریف ملاحظہ ہو:۔ "عشق۔ بسیار دوست داشتن چیزے۔ نزد بعض اطبا مرضیت از قسم جنوں کہ از دیدن صورت حسین پیدا میشود و عبدالرزاق شارح ظہوری از شرح اسباب و فتوحات الحکم نقل کردہ است کہ عشق ماخوذ است از عشقہ و آں نباتے ست کہ انرا سیلاب گویند چوں بر درختے پیچد آں را خشک کند۔ ہمیں حالت عشق است بر ہر دلے۔ کہ طاری شود جسم را زرد کند"۔ یہ تعریف رقص و سرود کے منافی ہے، اہلِ لغت کی تعریف سے قطع نظر کیجئے، کامیاب عاشق ضرور رقص و سرود کا

شیدا نظر آئے گا اور ہیولیٰ پیکر غم۔ تغزل صحیح کو جس حد تک میں سمجھا ہوں یہ ہے کہ تخیل شاعر مضامین مجاز میں عُریاں نظر نہ آئے، محاکات تصوف اور وہ فلسفہ جس کو تغزل برداشت کرے نظم کرنا چاہئے۔

جس رنگ کو جناب نے لکھنوی خیال فرمایا ہے اس کی جانچ کے لئے آیئے دیکھیں تو سہی شعرا دہلی کے کے یہاں بھی مثالیں ملتی ہیں یا نہیں سب سے پہلے خواجہ میر درد کے دیوان پر نظر پڑتی ہے جن کا مذاق شاعری متانت سے لبریز اور ابتذال سے پاک سمجھا جاتا ہے فرماتے ہیں:۔

کبود چرخ دیکھا تو سواری کے نہیں قابل
مہ نو سے ہے پیدا عیب اسکی بدر کابی کا

دل اُس مژہ سے رکھیو نہ تو چشم راستی
اے بے خبر ہرا ہے یہ فرقہ سپاہ کا

جوں چاہئے اس طرح بیاں ہم سے نہوگا
کر اپنے دہن ہی سے تو وصف اپنی کمر کا

میرے بھی طرف تو کبھی آ جا مرے یوسف
بڑھیا کی طرح میں بھی خریدار ہوں تیرا

کرے کیا فائدہ ناچیز کو تقلید اچھوں کی
کہ تم جانے سے کچھ ادلا تو گوہر ہو نہیں سکتا

دیکھ کر حال پریشاں عاشقان زار کا
بانکے معشوقوں نے رسم زلف اب دی ہی اُٹھا

وہ مو کمر کہیں یہ ہوا بے حجاب رات
تھا شغل زلف دل کو عجب پیچ تاب رات

گر کھنچے کھنچے چلتے جان اپنی تیغ کھوئے
کوئی زندہ دل کرے ہے اس مزہ شو بعت

تا نگہ یہ دل یاں دونوں طرف سے دوڑے
دو نٹ مقابل آئیں جس طرح ریسماں پر

اگرچہ دخترز کے ہے محتسب درپے
جو ہو سو ہو پرا سے اب تو یار کہتے ہیں

اگر مجھ سے ملئے کبھو عیب کیا ہے
نہ بد وضع تو ہے نہ بدکار میں ہوں

اے رگ ابر پہ مژگاں بھی اگر ٹک برسیں
ایک پل میں کئی تالاب تو بھر جاتے ہیں

اگر میں نکتہ رسی سے ترا دہاں پاؤں
کمر کو چاہوں تو اسکے تئیں کہاں پاؤں

دور ہوں آمادہ میخوارگی یہ مے پرست
سر اگر کاٹے انھوں کا محتسب مثل کدو

داشد کبھی تو درد کے بھی ساتھ چاہئے
بند قبا سے کھولئے اے گلبدن گرہ

گر مسیحا نفسی ہے یہی مطرب تو خیر
جی ہی جاتے ہیں چلے تیری ہر اک تان کے ساتھ

جیتا کسی کو چھوڑے نہ یہ گانٹھ زہر کی
زلف سیہ وہ سانپ ہے جسکا ہے من گرہ

کلک آتش کیا کرنے یوں قہقہے
چیونٹیوں کے گھر سدا ماتم رہے

شبخون کے لئے فلک پھر رہے ہے
کھینچے ہوئے تیغ کہکشاں سے ہے

بدنام کر رہے ہے دختر رز
مغ اس کو نکال اپنے یاں سے

مشتاق اگر ترا کچھ لکھتے تو کیا عجب ہے
ہوں مثل نرگس آنکھیں پیدا ابھی قلم سے

کچھ اور رنج و غم کے سوا سوجھتا نہیں
آتا ہے جبکہ یاد وہ کنج دہاں مجھے

کیوں تیغ تری دشمنی رکھتی ہو میرے ساتھ
مجھ کو تو نہیں کام کسی کی بھی کمر سے

کیا جانئے کس کس کے تئیں آہ ڈسیں گی
زلفوں نے تو بیطرح یہ اب چھوڑے ہیں کالے

یا تو وہ راتیں تھیں یا اب یہ دنوں کا پھیر ہے
ہاتھ اب لگتے نہیں تب پاؤں دبوایا گئے

وہ دخت رز کہ جیلتی پھرے اک جہان کو
سنتے ہیں درد پاس بھی اک رات رہ گئی

تو چونکتا عبث ہے کسی بات کے لئے
میں آگیا ہوں صرف ملاقات کے لئے

دنیا وہ فاحشہ ہے کسی سے نہیں بچی
دیکھا جسے تو اُس کے یہ مردار ساتھ ہے

نہیں ہے بے سبب یہ خندۂ دنداں نما ترا
کسی کے تو لہو پینے پہ یعنی دانت رکھتا ہے

زبس درد جدائی نے ترے بند دکھوا ہے
اگر آزار بھی ہوتا ہے تو درجع مفاصل ہے

اب فرمائیے یہ وہی مذاق ہے یا نہیں جس کو آپ لکھنوی مذاق کہتے ہیں اچھا اب جناب ذوقؔ دہلوی کے کلام پر بھی نظر ڈالی جائے جن کے دیوان کا بیشتر حصہ اسی مذاق میں ہے۔ مثلاً چند شعر پیش کئے جاتے ہیں

اس نزاکت پر نظر آتا کہ وہ رشک پری
بال بھی باندھے جو مسی پر تو زلف حور کا

دفن ہے جس جا پہ کشتہ سرد مہری کا تری
بیشتر ہوتا ہے واں پیدا شجر کافور کا

دانت یوں چمکے ہنسی میں رات اُس مہ پارہ کے
میں نے جانا ماہ تاباں پارہ پارہ ہوگیا

دیکھنا اے ذوقؔ ہونگے آج واں لاکھوں کے خون
پھر جمایا اس نے لعل لب پہ لاکھا پان کا

ترے جوڑے کے کھلنے نے مرا دل لستان بنا
عجب تقدیر نے عقدہ وہاں کھولا یہاں باندھا

اس لعل لب کے بوسے لئے ہمنے اسقدر
سب اُڑ گئی مسی کی دھڑی دو گھڑی کے بعد

طفل اشک ایسا گرا دامان مژگاں چھوڑ کر
پھر نہ اُٹھا کوچۂ چاک گریباں چھوڑ کر

صید دل کو کیونکہ چھوڑے جبکہ دکھلائے ہو تو
مچھلیاں دست حنائی میں مری جاں چھوڑ کر

سرخئی پاں دیکھ لے زاہد جو دنداں پر ترے
اُٹھ کھڑا ہو ہاتھ سے تسبیح مرجاں چھوڑ کر

تیرے دنداں سی زیب کی دیکھی جو بہار
اوس سی پڑ گئی گلشن میں گلِ سوسن پر

یہ جتنے سرو ہیں سب اسکے قدِ پر زہر کھاتے ہیں
چمن میں سبز کیونکر ہو نہ جائیں سر سے پاؤں تک

تاب دنداں نہ دکھا بزم میں تو ہنس ہنس کر
کوئی کھا جائے نہ ہیرے کی کنی خوب نہیں

کس نزاکت سے ہے دیکھو اتحاد حسن و عشق
زلف واں شانے پہ لٹکی درد یہاں شانے میں

دنبالہ سے سرمہ کے دھواں ہیں تری آنکھیں
کہہ بیٹھیں نہ کچھ سیف زباں ہیں تری آنکھیں

خالِ سرمہ کا تمھیں چاہئے زیبائش کو
اخترِ سوختہ ہے اپنا ہی زیبا ہم کو

تم مسی ملکر نہ غرفہ سے نکالا منھ کرو
اور نہیں گر مانتے۔ تو جاؤ کالا منھ کرو

جب دیکھے اسکو تھام کے دل بیٹھ جائے ذوق
جب ناز سے کھڑا ہو وہ رکھ کر کمر پہ ہاتھ

جوں نبضِ شاخ تو نہ چلا انگلیاں طبیب
رکھ رکھ کے نبض عاشقِ تفتہ جگر پہ ہاتھ

کھائے داغِ آتشیں رخسار سے
کم نہیں دل مرغِ آتش خوار سے

اے مہ رُخِ روشن کی دکھا تاب مجھے
چاہئے بہر کفن چادرِ مہتاب مجھے

کشتہ ہوں میں کس چشم سیہ مست کا یارب
ٹپکے ہے جو مستی مری تربت کے شجر سے

نہیں مژگاں کی دو صفیں گویا
اک بلا اک بلا سے لڑتی ہے

لیتے ہیں شب وصل میں ہم اُن کے جو بوسے
وہ لب پہ سحر رنگ مسی کو نہیں پاتے

چنی تو نے افشاں جو اے مہ جبیں ہے
ستاروں میں کیا کیا چناں اور چنیں ہے

آتشِ خورشید سے دیکھا نہیں اُٹھتے دھواں
آ کھڑے ہو بام پر تم بال سکھلاتے ہوئے

نعل شکل مہ نو جب ترے توسن کو لگے
چار چاند اور فلک پر مہ روشن کو لگے

بعد مُردن بھی خیالِ چشمِ فتاں ہی رہا
سبزۂ تربت مرا وقفِ غزالاں ہی رہا

تو آنکھ میں نہ سرمۂ دنبالہ دار دے
مفتونِ چشم کو نہیں اک بار مار دے

چھلا نہیں تو چھلے کا گل لے نگار دے
کچھ تو نشانی اپنی مجھے یادگار دے

ہزار دم ہیں اسے یاد تو نے دیکھا ذوق
گیا وہ غیر کے گھر تجھ کو ٹال کے کیسا

کرتی ہے زیر برقع فانوس تاک جھانک
پروانے سے ہے شمع مقرر لگی ہوئی

پہونچا تھا شب کمند لگا کر وہاں رقیب
سچ ہے حرامزادے کی رسی دراز ہے

جناب غالبؔ جن کا دیوان فلسفۂ عشق اور جذبات سے لبریز ہے اور دھول دھپا تک پہونچکر خود ہی پیش دستی کرنے لگے ہیں فرماتے ہیں:—

پینس پہ گزرتے ہیں جو کوچہ سے وہ میرے     کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

مرزا داغؔ دہلوی کا کلام اکثر عریاں ہے بہ نظر اختصار صرف ایک شعر پیش کرتا ہوں۔

حوروں کا انتظار کرے کون حشر تک     مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں

دور حاضر کے مشاہیر دہلی صرف زبان کے پھیر میں پڑے ہوئے ہیں بکثرت نمونہ کلام اس رنگ میں ہے جسکو جناب "لکھنوی" کہتے ہیں، بہ نظر طوالت قطع نظر کرتا ہوں اب ہمارے کرم جناب اصغرؔ گونڈوی کے کلام پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے اپنے منتخب دیوان میں فرماتے ہیں،

بکھری ہوئی ہو زلف بھی اس چشم مست پر     ہلکا سا ابر بھی سر میخانہ چاہیے
اس رخ رنگیں سے آنکھیں سینکئے     ڈھونڈئے اب آتش ایمن کہاں
زاہد سادہ لوح کو وہم تھا اشتباہ تھا     مصحف رخ سے حل ہوا مسئلۂ جواز عشق
جلوۂ رنگیں اتر آیا نگاہ شوق میں،     ہم لطافت جسم کی اسے یمتن دیکھا کئے
نقش قدم رہیں اسی جان بہار کے     اک پنکھڑی پڑی ہے لحد پر گلاب کی
سب مزے کردئے خورشید قیامت نے خراب     میری آنکھوں میں تھا وہ روئے دلآرام ابھی
ہستی غیب سے گہوارۂ فطرت ......     خواب میں طفلک عالم ہے سراسر مدہوش
اے دل شوخ وحیلہ جو زیر کمین رنگ و بو     طائر قدس کو بھی دے دانگہ مجاز میں
جہاں بھی میری نگاہوں سے ہو چلا معدوم     ارے بڑا غضب اے چشم سحر کار کیا
موج نسیم صبح کے قربان جائیے     آئی ہے بوئے زلف معنبر لئے ہوئے

الغرض محض الفاظ نہ لکھنوی ہوتے ہیں نہ دہلوی، بلکہ ان کا محل استعمال لکھنوی نہ غیر لکھنوی شاعر کی خصوصیت کو ظاہر کرسکتا ہے بشرطیکہ آنکہ پہلے یہ امر باور و تسلیم کرلیا جائے کہ لکھنؤ میں کوئی جذباتی شاعر پیدا ہی نہیں ہوا اور دہلی میں سوائے حقیقی عشق کرنے والوں کے کسی اور نے شاعری کی ہی نہیں ورنہ یوں تو جس طرح ابتذال سے امیرؔ و میرزاؔ کا کلام خالی نہیں بالکل اسی طرح ناسخؔ و پیروان ناسخ کے یہاں بھی صحیح عاشقانہ جذبات مل سکتے ہیں۔

حکیم ضمیر حسن خاں ولؔ شاہجہانپوری

# موجودہ ترقی فقط ایک دھوکا ہے

افسوس ہے کہ خوش اعتقاد لوگ، موجودہ زمانہ کی "ترقیٔ موہوم" سے مرعوب ہو کر، انسان کی موجودہ ترقی کا صحیح اندازہ لگانے سے بالکل قاصر ہیں۔ علم تمدن کا ہر ماہر، نہایت آسانی سے قطعی طور پر یہ ثابت کر سکتا ہے کہ مسئلۂ ارتقاء (Evolution) کو نظر انداز کر بھی دیا جائے، تو صرف بہتر غذا، اچھا ماحول، اور عمدہ تعلیم و تربیت کی بنا پر، انسان کی موجودہ حالت بہت کچھ سدھاری جا سکتی ہے۔ وہ اپنی مدلل گفتگو سے تمھیں اس بات کے ماننے پر مجبور کر دے گا کہ "افراط و تفریط" "سرمایہ داری" اور "مزدوری" کے جھگڑوں کی وجہ صرف ایک ناقص اقتصادی اصول ہے۔ وہ تم سے یہ بھی منوا چھوڑے گا کہ انسان باوجود "قصور دار" ہونے کے موجودہ زمانہ کی "منظم بے ترتیبی" (Ordered Disorder) سے اسی درجہ بری الذمہ ہے جس قدر ایک پتنگا (جو غیر ارادی طور سے شمع پر جل مرتا ہو) الزام خودکشی سے۔ وہ، بطور مشاہدہ، بین طریقہ سے تمھیں دکھا دے گا کہ ایک بازی گر کی توانائی اور چستی اور ایک مفلوج شخص کی خمیدہ پیٹھ میں جو فرق ہے وہ مشروط ہے، نہ کہ فطری۔ اس کے علاوہ، علم معاشرت کا ماہر یہ بھی ثابت کر دکھائے گا کہ انسان کی مذموم ترین خصلت اور ناپسندیدہ ترین حرکت "طبعزاد" یا جبلّی" نہیں، بلکہ وہ — نتائج ہیں اُن "مدافعانہ حملوں" کے جو ہماری "خود ساختہ سماجی پابندیاں" ہمارے فطری اوصاف پر کرتی رہتی ہیں۔

وہ شخص جو "انقلاب پسند" ہو، یا وہ شخص جو کھلے میدان میں لڑنے سے احتراز کرتا ہو، یا وہ شخص جو، خواہ مخواہ تلوار کے زور سے مذہب پھیلانے پر تُلا ہوا ہو، یا وہ شخص جو گوشت کھانے سے پرہیز کرتا ہو اور ہمیشہ نباتات ہی پر گزر کرتا ہو، — ڈاکٹر ہو یا وکیل، پادری ہو یا اصولِ اخلاقیات کا معلم، ورزش میں طاق ہو، یا سپاہی ہو، شکاری ہو، یا موجد، سیاست داں ہو یا ... کوئی بھی ہو — سب کے سب ایک آدھ نسخہ انسان کی ترقی و بہبودی کے لئے پیش کرتے ہیں، اور تقریباً ان لوگوں کی ہر مجوزہ اصلاح، دائرۂ امکان کے اندر ہی

ہوتی ہے۔ اور ایک نہ ایک بُرائی کی بیخ کنی ہی کے لئے مخصوص ہوتی ہے.... لیکن ان لوگوں کے نظریہ کے مطابق "ترقی" کا معیار، ہر مجوزہ اصلاح کا عملی طور پر پورا ہو جانا، اور ہر فردِ بشر کا "دماغی" اور "جسمانی" ترقی کے اُس بلند ترین کنگرہ پر پہونچ جانا ہے، جس پر بہت ہی تھوڑے لوگ اب تک بدقت تمام پہونچ سکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھیں، ایک مصلح کے "تگ و دو" کے لئے ایک وسیع اور لق و دق میدان نظر آتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان کے لئے بہت سی عظیم الشان منازل مقصود ہیں، جن کی دشوار گزار گھاٹیوں کے عبور کرنے کا شوق ہر اولوالعزم شخص کے دل میں موجزن ہے۔ اور اسی لئے انسان کے واسطے ترقی کا ہر دروازہ کھلا ہوا ہے!—— لیکن افسوس ہے کہ موجودہ انسانی نسل کا کوئی فرد بھی بامِ ترقی کے اُن سر بفلک چوٹیوں (جن کی جانب وہ روزِ ازل سے للچائی نگاہوں سے دیکھتا رہا ہے) کے گرد پا کو بھی نہ پا سکا!

تاہم، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "اگر" ہم سب کے سب کمرِ ہمت باندھ کر اول الذکر مصلح کے بتائے ہوئے راستہ کو شروع سے آخر تک طے کر لیں، تو یقیناً دُنیا ترقی کے میدان میں بہت دور نکل جائے!... لیکن نہ تو یہ "اگر" امید افزا معلوم ہوتا ہے،..... نہ وہ "اگر" کہ "اگر آسمان گر پڑے تو چڑیاں پکڑ لوں!" سچ تو یہ ہے کہ انسان اُس بتائے ہوئے دشوار گزار راستہ پر کبھی گامزن نہ ہوگا، اس کی ہمت اور قوت ارادی، اس کام کے لئے ناکافی ہے، اور وہ صحیح معنی میں ان مقاصد کے پورے ہونے کا سچے دل سے متمنی بھی نہیں ہے کیونکہ ہماری تمنائیں اکثر و بیشتر "سطحی خواہش" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔

تم اگر کسی سے یہ پوچھو کہ "کیا تو بہتر انسان بننا چاہتا ہے؟" تو وہ نہایت دیانتداری سے جواب میں "ہاں" کہیگا۔ یا تم اگر کسی سے یہ پوچھو کہ "تم ایک لاکھ روپیہ لوگے؟" تو وہ بھی بصد آرزو "ہاں" کہیگا۔ لیکن وہ دیانت دار انسان، جو ایک "بہتر انسان" بننا چاہتا ہے، اپنے سابق طرزِ عمل کی لکیریں اب تک پیٹتا نظر آتا ہے! اور وہ آوارہ گرد جو ایک لاکھ روپیہ کی تمنا رکھتا ہے، دس شلنگ بھی کمانے کی زحمت گوارا کرنا پسند نہیں کرتا! یہی وجہ ہے کہ بیشمار لوگ، جو تمام عمر لاکھوں روپیہ کی وراثت کے ملجانے کی اُمید پر زندگی کی گھڑیاں گنتے رہے، جب مرے تو اس طرح کہ کبھی پانچ پاؤنڈ بھی بہ یک وقت ان کے پاس جمع نہ ہو سکا۔ اس سے انکار نہیں کہ ایسی مثالیں بھی ہیں کہ اکثر فقیر پھٹے پُرانے اور بوسیدہ گودڑیوں میں دم توڑتے ہیں، لیکن ان کی جھولیاں اشرفیوں سے پُر ہوتی ہیں،.... جس کی وجہ صرف یہی ہے کہ اُن کی خواہش روپیہ کے جمع کرنے کی اسقدر زبردست ہوتی ہے کہ وہ اپنے ارادے میں کامیاب رہتے ہیں۔

علم اقتصادیات کا ماہر جانتا ہے کہ جب تک کسی چیز کی مانگ نہ ہو، اس کا مہیا ہونا ناممکن ہے۔ اور یہ مقولہ، سیاست، اخلاقیات اور زندگی کے ہر شعبہ کے لئے صادق آتا ہے۔ کسی چیز کا فراہم ہو جانا "طلب صادق" پر منحصر ہے۔ اس لئے محض تمناؤں کے ہجوم اور زبانی جمع خرچ سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ کسی قوم یا فرقہ نے ابتک تربیت گاہِ تمدن کی ابتدائی تعلیم اور تشکیل سے باہر قدم نہیں نکالا ہے ..... اور اس معمولی سی ترقی کے مدارج بھی، کسی "جذبہ رفاہ عام" کے ماتحت نہیں، بلکہ تعصبات ضد، اور وحشت بربریت کے ذریعہ سے طے ہوئے ہیں۔ انگلستان کے سنہ ۱۸۳۲ء کے ریفارم بل کو دیکھو..... کیا یہ اس امر کی تشریح نہیں کرتا کہ "تعلیمیافتہ جماعت"، ایک ایسے سیاسی اصلاح کے نافذ کئے جانے پر جس کی ضرورت بین اور ناگزیر ہو، آپس میں لڑ مریں اور یہ مسودۂ قانون اس وقت تک "قانون" بنکر نافذ نہ کیا جا سکا، جب تک برمنگھم کے "شرفا" نے سینٹ جیمس کے مذہبی حلقہ کے "شرفاء" کا، فوجی ساز و باز کے ساتھ گلا گھونٹنے کا انتظام نہ کرلیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس کا نفاذ ابتک نہ ہوا ہوتا اگر اس کے "مفاد" کے منطقی بحث و مباحثہ کے علاوہ، "طاقت" اور "زور" سے کام نہ لیا گیا ہوتا..... ملکہ الیزبتھ کی طرح ہوش گوش رکھنے والا خود مختار اور مطلق العنان حکمراں کالج کے اُن سن رسیدہ طلباء کی جماعت کثیر کی بہ نسبت (جو سنہ ۱۸۸۴ء کے قبل تک اپنے "قدیمی استحقاق" کی بناء پر حکومت کرتے چلے آتے تھے، اور جو سنہ ۱۸۸۴ء کے بعد سے، جب "حق رائے زنی" ہر بالغ شخص کو عطا ہوا کبھی بہتر طریقہ سے حکومت کرتا۔

موجودہ زمانہ میں اُن فلسفیوں کی جگہ، جو ہر فعل کی اصلیت اور خوبی وہ اس کے افادی نقطۂ نظر سے جانچتے تھے (Fabian Society) نے لے لی ہے۔ اس سوسائٹی کے شایستہ، باضابطہ اور سکون پسند طریق عمل کے قابل قبول ہوجانے کا واحد ذریعہ بس یہی ہے کہ ہر فرد بشر اس کے اصول پر ٹھنڈے دل سے غور کرے، سمجھے اور بے چون و چرا قبول کرے۔ لیکن آج (Fabianism) کا نام اُنھیں مقامات میں جہاں آج سے تیس برس پہلے لفظ (Socialism) "قاتل" اور "فتنہ پرور" کے مرادف سمجھا جاتا تھا، کیوں اسقدر عزت سے لیا جاتا ہے؟ اس لئے نہیں کہ دُنیا کی سرمایہ دار حکومتوں کو اس سوسائٹی کے "حسن تدبیر" پر غور و خوض کرنے کا اور عمل پیرا ہونیکا ذرہ برابر بھی خیال ہو..... بلکہ اس لئے کہ انھوں نے اپنے "طریق عمل" سے تشدد، تہدید، اور استبداد کے عناصر کو نکال کر، مفلس اور قلاش عوام الناس کی "انقلاب پسند جماعت" کی صدائے احتجاج کا صرف قلع قمع ہی نہیں کر دیا بلکہ موجودہ نظام حکومت، اور طرز تمدن کو اس واحد خطرے سے، جس سے وہ حقیقتاً خائف تھے بالکل بےفکر بنا دیا!

بلاشبہ اگر اقوام عالم، آج بھی (Fabians) کے طریق عمل پر کاربند ہوجائیں، تو اس کی پابندی اتنی ہی سختی کے ساتھ کی جائے گی، جس طرح، موجودہ زمانہ میں قوانین ملکیت کی۔ اور (Fabians) کا "اُصول" عمل قانون" کی حیثیت اختیار کریگا اور اس کے مخالفین یا تو جُرمانہ دینے پر مجبور کئے جائیں گے، یا کم از کم بیچ کر فروخت کردئے جائیں گے، یا بالآخر انھیں ـ جس طرح موجودہ قوانین کی عدول حکمی پر سزا ملتی ہے ـــ پھانسی دیدی جائے گی۔

لیکن سرِدست، سرمایہ دار طبقہ (Fabians) کے ان "اُصول" کو "قوانین" کی اہمیت حاصل کرتے ہوئے نہ دیکھ کر ..... ان سے خایف نہیں ہے۔ لیکن، برخلاف اس کے یہ طبقہ غارتگروں اور قاتلوں کی خفیہ سازشوں سے ڈرتا ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ یہ طبقہ حتی الامکان، اس حقیقت کو طشت ازبام ہونے نہیں دیتا کہ بالآخر اُن ذرایع میں جو یہ (یعنی سرمایہ دار طبقہ) "حقوق ملکیت" (Proprietary rights) کے استحفاظ کے لئے استعمال کرتا ہے، اور اُن ذرایع میں جو ایک "بم انداز" (Bomb Thrower) اپنے ذاتی خیال کے مطابق انسان کے فطری اور پیدایشی حقوق کے استحفاظ کے لئے استعمال کرتا ہے ـــ جہاں تک اخلاقی فرائض کا سوال درپیش ہے ـــ کچھ بھی فرق نہیں۔

سرمایہ دار حکومت، (Fabian Society) کی پیٹھ "شاباش" کہکر ٹھوکتی ہے۔ برخلاف اس کے مساوات عامہ کا علمبردار (Socialists) ـــ جو کھلے الفاظ میں یہ کہدیتا ہے کہ مساوات عامہ کے حاصل کرنے کے لئے وہ انقلاب چاہیئے جس میں "انقلاب پسند" جماعت مخالف جماعت کو جو ڈرانے، دھمکانے اور مارنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتی "گمراہ کن" تصور کیا جاتا ہے۔ اور اُس کو قید سخت اور محنت شاقہ کی سزا شاید اس غرض سے دی جاتی ہے کہ سرمایہ دار حکومتوں کی "عدم تشدد دانہ لنترانیوں" کے پول کھل جائیں اور ان قیدیوں کو معلوم ہوجائے کہ سرمایہ دار حکومتیں یوں لاکھ عدم تشدد کا سبق اپنی زبان سے رٹا کریں، اور دوسروں کو حفظ کروانے کی کوشش کیا کریں، لیکن جب کبھی ان کے نام و نمود کو ایک ہلکی سی ٹھیس بھی لگ جائے یا لگ جانے کا اندیشہ ہو، تو یہ (یعنی سرمایہ دار حکومتیں) فوراً "عدم تشدد" کے ازبر سبق کو دفتر پارینہ کا کرم خوردہ باب سمجھ کر صاف بھول جاتی ہیں اور پھر "تشدد" و "استبداد" کے حربوں سے کام لینے لگتی ہیں۔

تو کیا ہم "صلح جو" اور "سکون پسند" ذرائع کے توسل سے نسل انسانی کی ترقی کا خیال اُٹھا دیں ؟ اور "بم اندازی" اور "خفیہ سازشوں" پر اُتر آئیں ؟ ـــ نہیں ـــ یہ دونوں طریقے بیکار ہیں۔

لیکن، غالباً بم انداز کا یہ کہنا حق بجانب ہوگا "کیا تم نے ابھی ابھی اس کا اعتراف نہیں کیا ہے کہ کوئی چیز بغیر لاٹھی کے زور کے نہیں حاصل ہوتی؟ کیا Gladstone کو یہ تسلیم نہ کرنا پڑا تھا کہ (Irish Church) کی مخالفت توپ سے بھڑکی گئی نہ کہ غیر متعصبانہ جذبات (Kilmainham) کے اثر سے؟

ہم کو ان سوالات کا جواب بیوقوفی اور بزدلے پن سے "نفی" میں نہیں دینا چاہئے...... حقیقتاً "بم انداز" کے قول کا مجھے اعتراف ہے.... بلکہ یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ فطرتِ انسانی کا تقاضا یہی ہے کہ اگر کسی مساواتِ عامہ کے سب سے زبردست حامی کے پاس کچھ اپنی ذاتی جائداد ہو تو اُس کا طرزِ عمل بھی قدیم زمینداروں سے — ہرگز جداگانہ نہ ہوگا۔

غور سے دیکھا جائے تو پارلیمنٹ میں، "مخالفین کی صف بندی" کو "جنگ" پر صرف اسی قدر امتیاز حاصل ہے، جتنا ایک ایسی فوج کو (جو بغیر لڑے بھڑے ہتھیار ڈالدے) Waterloo اور Trafalgar پر! — — میں ان مندرجہ بالا "اعترافات حقیقت" کا ہدیہ

(۱) ان (Fenians) کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جنھوں نے سادہ لوح آئرلینڈ کے باشندوں سے — جو اُن کے مظالم سے تنگ آکر امریکہ میں پناہ گزیں ہوئے تھے — اس غرض سے روپیہ وصول کیا کہ اُنھیں کے پس ماندہ رشتہ داروں پر وہ نیز ان کے سیاسی و مذہبی عقائد پر آئرلینڈ پہونچ کر حملہ کیا جائے۔

(۲) و نیز اُن خفیہ پولیس حضرات کی خدمت میں جو سیدھے سادھے کم عمر مزدوروں کو بہکا کر، پاس ہی کے کسی لوہار کی دوکان سے "بم" لانے کو کہتے ہیں، اور بعدہٗ وہ اُنھیں گرفتار کر کے سزائے دائم الحبس دلواتے ہیں۔

(۳) و نیز اُن بری، اور بحری سپہ سالاران فوج کی خدمت میں جو دشمنوں کے شرائط اور پیامِ صلح کو ٹھکرا کر ایک آخری "ناقابلِ قبول شرط التوائے جنگ" (Ultimatum) پیش کر کے گولہ اور بارود کے منہ برسانے لگتے ہیں۔

لیکن کیا فائدہ کہ انسان بجائے "نرمی" اور "انسانیت" کے "سختی" اور بجائے "غور و خوض" کے "جلد بازی" اور "ناعاقبت اندیشی" سے کام لے؟ کیا آج انگلینڈ آئرلینڈ کے قلعوں کے مسمار کر دئے جانے سے بہتر حالت میں ہے؟ یا کیا اس خیال کی ذراسی بھی گنجائش ہے کہ ایک ایسی قوم کو جو بھیڑ بکریوں کی طرح

مظالم برداشت نہ کرے اور بعدہٗ چند ایسے مستقل مزاج مصلحین کی سرکردگی میں اُن تینوں اول الذکر اشخاص کے سروں کو قلم کردے اس انقلاب سے کچھ بھی فائدہ ہوا ہوگا۔

فرض کرو کہ (Gun powder plot) کامیاب ہوتا اور (Fawkes) کا خاندان ہمیشہ کیلئے تخت شاہی پر جلوہ افروز ہو جاتا تو کیا اس رد و بدل سے انگلستان کی موجودہ قومی یا انفرادی حالت میں ذرہ برابر بھی فرق ہوتا؟ ...... نہیں۔

فرانس میں "مجرموں" کے سر کاٹنے کی مشینوں (Guillotine) کا استعمال انسانی تحمل اور برداشت کی حد سے زیادہ کیا گیا۔ اس لئے اگر (Marie antoinette Fouquier) کی طرح اپنے قاتلوں سے یہ پوچھتی کہ "کیا میرا سر قلم کرنے سے تمھیں روٹیاں سستے داموں ملیں گی؟" تو اسکا یہ سوال ہرگز بے محل نہ ہوتا..... فرانس کو اس خونریزی سے کیا ملا؟ ...... امریکہ ہی کی طرف دیکھو! یہ مانا کہ وہاں نہ تو (Star Chamber) ہے، اور نہ ایسے جاگیردار ہیں جنھیں جاگیریں بشرط خدمات جنگ دی گئی ہوں۔ مگر امریکہ میں لکھپتی اور کروڑپتی ہیں جن کے کارخانجات برقی تار اور مسلح نوکروں سے گھرے ہوئے ہیں۔ کیا امریکہ کی "جنگ آزادی" کے اُن نتائج کو جو آج ظہور میں آرہے ہیں اگر (Washington) اور (Franklin) قبل سے جانتے ہوتے تو کیا وہ اس کی حمایت کرتے؟ ہرگز نہیں۔

جو کام کرامول، قیصر اور نپولین اپنے زبردست شاہی اقتدار اور رعب داب کے باوجود نہ کرسکے وہ چند جوشیلے اور تلون مزاج جرائم پیشہ ہرگز نہیں کرسکتے۔

ایک گمراہ، اور بد باطن یہودی بھی ــــ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے ابتک لوگوں کو بغاوت پر خفیہ طور سے اُبھارتا رہا ہو ــــ یہ تسلیم کرنے میں شاید پس و پیش نہ کرے گا کہ کتّا اپنی قے کی ہوئی غذا کو دوبارہ کھانے پر فطرتاً مجبور ہے، اور اسی طرح سور بھی فطرتاً مجبور ہے کہ دھلنے کے بعد وہ کیچڑ میں لوٹے..... بعینہ اسی طرح ہم لوگوں کو یہ ماننا پڑے گا کہ جب تک انسان کی فطرت نہ بدل دیجائے، وہ، باوجود "اصلاحات" اور "انقلابات" کے "اصنام" ہی کا پرستار اور حرص و ہوا ہی کا بندہ بنا رہیگا

انسان کی ابتدائی ترقی جس نے موجودہ زمانہ میں ایک ایسی تہذیب اور طرز معاشرت قائم کر رکھی ہے جس کا دار و مدار محض تجارتی مفاد کے اُصول پر ہے! لفظ "ترقی" کے صحیح مفہوم کی صرف تسمیہ ہے .... لیکن انسان کی "حقیقی ترقی" کا دور بھی آکر رہیگا.... اور سچ تو یہ ہے کہ یہ ابھی سے ہم لوگوں کو

"پیغام فنا" کی بھی دھمکی دے رہا ہے۔ موجودہ "ترقی موہوم" کے تعمیری عناصر مثلاً "جنگ" اور "مقابلہ" "حقیقی ترقی" کے دور میں بجائے سود مند ثابت ہونے کے، انسان کے لئے اسی قدر تخریبی اور مہلک ثابت ہوں گے جس طرح وہ اوصاف جو شیر کو۔ جب تک وہ جنگل میں رہتا ہے۔۔۔ "جنگل کا بادشاہ" کہے جانے کے قابل بناتے ہیں، اور جب وہ آبادی کی طرف رُخ کرتا ہے، تو اُنھیں اوصاف کی وجہ سے وہ بندوق کا نشانہ بنا دیا جاتا ہے!

اس طویل بحث کے بعد اب ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ انسان کی اجتماعی زندگی (Social Life) کا انحصار "بلند مقاصد" اور "عقل سلیم" پر ہے۔ "جنگ" اور مقابلہ گرچہ ترقی کے "دور اولین" میں بہترین افراد کو منتخب کرنے کے لئے نہایت کار آمد ذرائع ثابت ہوئے.... تاہم "مزید ترقی" کے دور میں یہ بہت ہی تباہ کن اسباب تنزل بن جائیں گے، دور کیوں جاؤ اُن اقسام کے حیوانات اور نباتات ہی کو دیکھو جو صدیوں کے انتخابات کے نتائج ہیں، دفعتاً جب سلسلۂ انتخاب متروک ہو جاتا ہے، تو وہ "وحشی" اور "خود رو" ہو جاتے ہیں۔ بعینہٖ اسی طرح جب "جنگ" "مقابلہ" اور "حرص و ہوا" کی گرم بازاریاں زوروں پر ہوں گی، تو ان کا اصلی مطلب (یعنی قوم و ملت کے بہترین افراد کو منتخب کرنا) فوت ہو جائے گا، اور وہ موجودہ نظام مملکت اور طرز تمدن کے ضامن ہونے کے بجائے، تخریبی پہلو اختیار کر لیں گے، اور ترقی کی راہوں میں روڑے اٹکائیں گے اور موجودہ تہذیب ۔۔۔ جو تجارتی مفاد کے اُصول پر قایم ہے، (Commercial Civilization) اور موجودہ طرز تمدن اس سرعت سے "مائل بہ تنزل" ہوں گے کہ دیکھنے والا یہ دیکھ کر کہ صدیوں کی ترقیاں چشم زدن میں پیوندِ خاک ہو گئیں، انگشت بدنداں رہ جائیگا!

ایسے ایسے اتفاقات من گڑھت قصے نہیں ہیں،...... بلکہ اوراق تاریخ بھی شاہد ہیں کہ قبل اسکے کہ عوام الناس، ترقی کے اُن مدارج پر پہونچ سکیں، جو اعلیٰ ترین اور ارفع ترین انسان کے لئے مخصوص ہیں، انحطاط نے اُنھیں آ دبایا ہے۔

اس لئے ہم لوگوں کو یہ خیالِ خام اپنے سروں سے بالکل نکال ہی دینا چاہئے کہ انسان کی موجودہ نسل کامل "ترقی" کی صلاحیت رکھتی ہے۔

ہمیں وہم و گمان ہوتا ہے کہ ہم ترقی کر رہے ہیں۔ کیونکہ جب کبھی ہم کو کسی غلطی کا احساس ہوتا ہے تو اسکا انسداد کر دیتے ہیں۔ اور اسی لئے ہم ترقی..... کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں... حالانکہ ہم یہ بھول جاتے ہیں

کہ بہت سی برائیاں جن کی ہم گرفت کر سکتے ہیں، وہ زمانہ دراز کے خفیہ گر مسلسل انحطاط کے نتائج ہیں؛ جو اب "امراض کہنہ" کی شکل میں ظاہر ہوئے ہیں!...... ظاہر ہے کہ ہم لوگوں کی ناکمل اصلاحیں "کہنہ امراض" کو اچھا نہیں کر سکتیں...... اور رونا تو اس کا ہے کہ زندگی کے جن جن شعبوں میں ہم مائل بہ تنزل ہیں وہاں ہمارے عمدہ اور قابل صد تحسین عادات و اطوار، حرکات و سکنات خود ہماری نظروں میں برے معلوم ہونے لگتے ہیں اور بر خلاف اس کے بری باتیں بھلی معلوم ہونے لگتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم "ترقی" کے دھوکے میں اچھی چیزوں کے عوض بری چیزوں کو اختیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم لوگوں کی سیاسی تباہی ہمارے بڑے ہی پرجوش مصلحین قوم ہی کے ہاتھوں ہونے کو ہے۔

(ماخوذ از برنارڈ شا) محمد عثمان۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ال وکیل ہزاری باغ

# تراب شاہ

## (۱)

جمیل اور میں ساتھ ساتھ منصفی کے امتحان میں شریک ہوئے لیکن تقدیر کی ستم ظریفی سے جمیل ایل ایل۔بی میں فرسٹ ڈویزن میں پاس ہونے کے باوجود منصفی کے امتحان میں فیل ہوگیا اور میں قانون سے طبعًا متنفر ہونے کے باوجود کانپور کا منصف بنا دیا گیا۔ اب یہ نہ پوچھئے کہ مجھ نوگرفتار بلا نے شروع کے دو تین سال کس طرح کاٹے۔ کالج کی آزاد فضا میں سرکاری ملازمت عبارت تھی تعیش و حکمرانی سے لیکن عالم تخیل سے دنیائے حقیقت میں آنے کے بعد معلوم ہوگیا کہ یہاں حاکم رہکر محکوم اور مسرور رہکر مغموم بننا پڑتا ہے۔ کوئی تجویز لکھی اور دل میں پنکھے لگ گئے کہ کہیں ملزم اپیل نہ کر دے جو حکامانِ بالا کے بے پناہ اعتراضات سے دوچار ہونا پڑے۔ معائنہ کا دن آیا اور جان سن سے نکل گئی۔ پیشکار کو ہدایتیں کی جارہی ہیں کہ دیکھئے صاحب مسلیں بے ترتیب نہ ہونے پائیں میز کی چادر پر روشنائی کا دھبہ نہ پڑے۔ خلاصہ یہ ہے کہ علیگڈھ یونیورسٹی کے ماحول سے متاثر ہونے کے باوجود کانپور کے قیام میں آزادانہ زندگی بسر نہ کرسکا۔ بڑی مشکل یہ تھی کہ جن حضرات سے ملنے کو دل چاہتا تھا ان سے ملنا آئینِ حکمرانی کے خلاف تھا اور جن سے ملنا ضروری تھا وہ ملنے کے قابل نہیں تھے۔ شروع شروع میں شوکت۔ انوار وغیرہ سے پینگ بڑھائے دو دو بجے رات تک برج بھی ہوا پک نک پارٹی بھی ہوئی جشن کئے لیکن ادہر تو عوام الناس میں یہ مشہور ہوگیا کہ منصف صاحب بالکل صاحبزادے ہیں "ہو حق" کے علاوہ کچھ نہیں آتا اور ادہر حکامانِ بالا نے تنبیہ کی غرض مجبور ہو کر یہ رنگ بدلنا پڑا متین و سنجیدہ بنے تو مابقہ ایسے حضرات سے ہوا جن کا مطمحِ نظر وجاہت دنیوی حاصل کرنا تھا۔ آج کیا منشی عثمان صاحب طلعت زماں تشریف لا رہے ہیں۔ وجہ تشریف آوری پوچھئے تو ایک نیازمندانہ

انداز سے سر جھکا کرارشاد فرمائیں گے "جی کچھ نہیں یونہی سلام کرنے حاضر ہو گیا" حالانکہ اس "جی کچھ نہیں" کا مطلب یہ ہے کہ خانصاحب خان بہادری کے خطاب کی دھن میں ہیں اور اسی لئے ہر حاکم کی (خواہ وہ منصف ہی کیوں نہ ہو) دربار داری کی جاتی ہے۔ ان سے فرصت ملی تو لالہ ہری چند داس آنریری منصف نے کرم فرمایا۔ جناب اس لئے تشریف لاتے ہیں کہ ان کی آنریری منصفی میں رخنہ اندازی نہ ہونے پائے اور جناب کا تمام تر وقت یہ ثابت کرنے میں گزرتا ہے کہ خود بدولت ہندو مسلم تعصبات سے بہت بالاتر ہیں بلکہ کچھ فطری رجحان دینِ اسلام کی طرف ہے حالانکہ ان کے رقیب محمد زماں خاں براہین قاطعہ سے ان کا مسلم کش ہونا ثابت فرماتے ہیں۔ ایک صاحب ہیں فاروق احمد خاں دیکھنے میں سیدھے سادھے مگر ان کے کاٹے کا منتر نہیں خدا جانے کتنے حکام کو بدنام کرکے کانپور سے نکلوا چکے ہیں۔ ان کا کام ہے حکام کا آلۂ تفریح بن جانا۔ شعر اچھا خاصہ موزوں پڑھ سکتے ہیں مگر جب پڑھیں گے توڑ مروڑ کر تاکہ لوگوں کو بے ساختہ ہنسی آجائے انگریزی انٹرنس تک پڑھے ہیں لیکن اوریجنل ناول کو اورنجیل ناول پڑھ کر ایک معصومانہ انداز سے اورنجیل کے معنے بھی پوچھیں گے تاکہ ان کے بھولے ہونے میں کسی کو شک نہ رہے۔ کبھی کسی مقدمے میں سفارش نہیں کریں گے مگر کچہری میں آپ کے بچے کی دوا لیکر یا کوئی مضحکہ انگیز عذر پیش فرما کر اپنی صورت ضرور دکھا جائیں گے اور اپنے ادنےٰ تبسم سے بے تکلفی کا ثبوت دیکر فریقین سے یا کم ازکم مدعا علیہ سے کچھ نہ کچھ وصول فرمالیں گے۔ خود انصاف فرمائیے کہ اس قسم کے لوگوں سے میری کیا دلچسپی ہو سکتی تھی اور اپنی جگہ پر اندازہ فرمائیے کہ اس بے کیف زندگی میں ایک مقدمے کے سلسلہ میں جمیل صاحب کا کانپور آنا میرے لئے کس حد تک طرب انگیز ثابت ہوا ہوگا؟

(۲)

جمیل آئے تو پورا ایک دن بقول نظیری "سخن گزشتہ" اور "گلہ ہائے دراز" کی نذر ہو گیا۔ اب تک کانپور نہ آنے کی شکایت ہوئی سال میں دو تین دفعہ آنے کے وعدے ہوئے۔ وکالت اور منصفی کے عیوب شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ بیان کئے گئے اور آخر کار باتوں کا ذخیرہ ختم ہو جانے کے بعد انداز استغنا کے ساتھ آرام کرسیوں پر دراز ہو گئے۔ دونوں کو احساس تھا کہ آج باتیں بہت کافی کی جا چکی ہیں مگر کبھی کبھی میں بحیثیت میزبان اور جمیل بحیثیت مہمان یہ خیال کرکے کہ یہ خاموشی فریقین پہ بار نہ ہو طرح طرح کے لایعنی سوالات کرکے اس طلسم سکوت کو توڑتے رہتے تھے۔ جمیل کے ساتھ تنہا رہنے کی خواہش کے

باوجود دل چاہتا تھا کہ کوئی تیسرا شخص آجائے اور "جمیل تمھارے یہاں کھانا کون پکاتا ہے"، "عباس تم نے یہ میز کتنے میں خریدی" کے بجائے کوئی دلچسپ گفتگو شروع ہو سکے اور ایسی حالت میں فاروق صاحب کا آنا بسا غنیمت معلوم ہوا۔ فاروق صاحب نے معمولی تعارف کے بعد جمیل صاحب کے کانپور تشریف لانے پر یہ مصرع پڑھ کر اظہار ابتہاج فرمایا اور حسب معمول اس مصرع کو مصرع نہ رہنے دیا۔ ع وہ آئیں گھر میں ہمارے یہ خدا کی قدرت ہے اس مصرع نے یادش بخیر حامد حسین کی یاد تازہ کر دی اور میں نے ذرا مسکرا کر جمیل سے کہا "ہمارے خانصاحب بھی دوسرے حامد ہیں۔ موزوں شعر پڑھنا تو گویا قسم ہے" فاروق صاحب اپنے ہم مشرب کا ذکر سن کر فرمانے لگے "عباس صاحب یہ حامد کون بزرگوار ہیں؟" میرے جواب دینے سے قبل جمیل صاحب نے اپنی بپتا شروع کر دی "حضرت کیا عرض کروں کہ حامد کتنی خوبیوں کا شخص تھا بس یہ سمجھئے کہ لاجواب تھا۔ نشانہ بے مثل و بے نظیر تھا آئینہ مسلم یونیورسٹی میں بھانت بھانت کے جانوروں پر پھبتیاں وہی چست کرتا تھا ہاں شعر و شاعری سے طبیعت کو لگاؤ تھا۔ دیکھئے ڈاکٹر اقبال کی کبھی اے حقیقت منتظر والی غزل یاد تھی لیکن اسے بھی جب پڑھا غیر موزوں مگر صاحب کیا آدمی تھا واللہ صحیح معنوں میں دوست کہے جانے کا مستحق۔ فرسٹ ایر سے ہم لوگوں کا ساتھ ہوا اور آخر تک اس طرح نباہی کہ باید و شاید۔ کیوں عباس تراب شاہ والے معاملے میں اس کا ساتھ دینا یاد ہے؟" تراب شاہ کا نام آنا تھا کہ میں اپنی ساری متانت و سنجیدگی بھول کر بے اختیار ہنسنے لگا۔ میں نے ہنسی کو روکنے کی ناکام سعی کر کے کہا "تراب شاہ نام قوم مسلم" جمیل صاحب نے اضافہ فرمایا "ولدیت نامعلوم عمر تخمیناً ۴۰ سال" اور اس تشریح کے بعد ہم لوگوں نے مصنوعی متانت و سنجیدگی سے باری باری حسب ذیل حلیہ بیان کرنا شروع کیا "دوہرا بدن گندمی رنگ" "خونیں آنکھیں ڈاڑھی چڑھی ہوئی" "ماتھے پر تلوار کا نشان داہنے رخسار پر ایک بڑا سا مستہ" "زیادہ تر گیروے لباس میں رہتا ہے مگر کبھی کبھی انگریزی کپڑے بھی پہن لیتا ہے" فاروق نے ذرا تنگ ہو کر دریافت کیا "جمیل صاحب کیا تراب شاہ کوئی خدا رسیدہ فقیر تھے" "جی فقیر وقیر تو کچھ بھی نہیں تھے ہاں ایک نامی گرامی ڈاکو ضرور تھے۔ آپ نے کبھی فرخ آباد کے مشہور ڈاکو داراب شاہ کا نام سنا ہے؟ بس یہ تراب شاہ انھیں کا بھتیجہ مشہور تھا لیکن صاحب اس کے کارنامے داراب کے کارناموں سے کہیں زیادہ وقیع ہیں" "اجی کہیں زیادہ!" میں نے پر وثوق لہجہ میں کہا "یہ سمجھئے کہ علیگڑھ یونیورسٹی کا بچہ بچہ اس سے کانپتا تھا۔ مضبوط سے مضبوط قفل کمروں میں ڈالے جاتے تھے مگر پھر بھی آئے دن یہ فریادیں سننے میں آتی تھیں کہ تراب شاہ کمرے کا قفل توڑ کر روپیہ پیسہ سوٹ بوٹ کھانے پینے کا سامان

نکال لے گیا اور لطف یہ ہے کہ ـــ "تراب شاہ کا وجود ہی نہ تھا"، جمیل نے بات کاٹ کر کہا۔ "مگر" فاروق صاحب بولے "جب اس کا وجود ہی نہیں تھا تو اس نے یہ چوریاں کیونکر کیں اور اس کا حلیہ آپ حضرات کو کیوں حفظ ہے؟ مگر صاحب اس کا وجود تھا ضرور اگرچہ وہ وجود تخیلی ہی کیوں نہ ہو اور حق تو یہ ہے کہ وجود تخیلی ازدیاد شہرت کا سبب ہوتا ہے۔ سری کرشن کو دیکھئے نا۔ اگر ان کو محض پیغامبر اعظم تسلیم کر لیا جاتا تو وہ عوام الناس کے دلوں کو اتنا مسخر نہیں کر سکتے تھے جتنا ان کی خیالی تصویر نے کرشن بھگوان بن کر کیا۔ حضرت غوث الاعظم کی شخصیت بحیثیت مصنف غنیۃ الطالبین یا بحیثیت ایک صوفی صافی کے اتنی جاذب نہیں ہے جتنی قطب ربانی محبوب سبحانی محی اموات خواجۂ کائنات کے اضافہ سے ہو جاتی ہے۔ پھر کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ خیالی کرشن بھگوان' یا فرضی 'محبوب سبحانی' نے کارہائے نمایاں انجام نہیں دئے؟ کیا آپ اس سے انکار کر سکتے ہیں کہ ان "جلیل القدر ہستیوں نے لاکھوں عقیدتمندوں کی بیماری کو مبدل بہ صحت ناامیدی کو مبدل بہ اُمید کر دیا؟ جب یہ باتیں قابل تسلیم ہیں تو پھر تراب شاہ کی تخیلی ہستی سے انکار کیوں کیجئے اور اس کے کارناموں پر ایمان لانے سے کیوں ابا کیجئے؟ فاروق صاحب نے انداز معصومانہ سے سوال کیا، عباس صاحب آپ کی فلسفیانہ تقریر تو ہمارے سمجھ میں آئی نہیں اب یہ فرمائیے کہ کیا واقعی تراب شاہ ایک فرضی نام تھا اور آخر یہ نام رکھا کس نے؟" "مجھسے سنئے" جمیل نے مسکرا کر کہا "عباس اور میں ایک دن بغیر اجازت لئے ہوئے قریب شام مچھلی کا شکار کھیلنے گئے۔ ہوا تیز تھی کوئی مچھلی لگی نہیں ہم نے سوچا لاؤ نہا ہی ڈالیں۔ بنسیاں اور کپڑے کنارے پر رکھدئے اور جھم سے نہر میں کود پڑے۔ پیراک ہم دونوں اچھے تھے میر مچھلی کے شاگردان خاص میں شمار ہوتا تھا دور تک پیرتے ہوئے چلے گئے واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کوئی صاحب کپڑے اور بنسیاں غائب کر گئے ہیں۔ پہلے تو یہ سمجھ کر کسی بے تکلف دوست نے کرم فرمایا ہے دو چار آوازیں مرتضےٰ خاں وغیرہ کو دیں پھر لاکھوں قسمیں خدا اور رسول کی دیں اظہار ناراضگی کیا اس قسم کے تکلیف دہ مذاق کرنے والے پر تبرا بازی ہوئی شدید انتقام کی دھمکیاں دی گئیں مگر جب کوئی تدبیر کارگر نہوئی تو چار و ناچار کنارے پر آکر بیٹھ گئے۔ عباس اس زمانے میں شرلاک ہومز کے افسانے بہت شوق سے پڑھا کرتے تھے انھوں نے یہ ترکیب بتائی کہ رات کے دس بجے تک یہیں بیٹھے رہو اس کے بعد یونیورسٹی چلدو کوئی پوچھے تو کہدینا کہ عینک کا فریم بدلوانے شہر گئے تھے وہاں سے قلعہ کی طرف ہوتے ہوئے واپس آرہے تھے راستے میں ایک لمبے تڑنگے بدمعاش نے کپڑے وپڑے سب اتروا لئے خیر صاحب کوئی گیارہ بجے کے قریب باب الرحمۃ پہونچے۔ سپاہی نے پہلے تو یہ ہیئت کذائی دیکھکر اندر

آنے سے روکا لیکن جب نام دریافت کیا اور ہماری فرضی داستان سنی تو ہمیں لئے ہوئے پروو ائس چانسلر صاحب کی کوٹھی میں چلا گیا۔ ہم نے یہاں بھی اپنی بپتا دہرا دی۔ پہلے تو پرو وائس چانسلر صاحب کو کچھ یقین نہیں آیا فرمانے لگے آپ کو پولیس میں بیان دینا ہوگا لیکن اگر آپ سارا حال مجھ سے بیان کر دیں تو میں اس معاملہ کو ختم کر دوں گا لیکن جب ہم دونوں نے بیان دینا بھی منظور کر لیا تو وہ کچھ نرم پڑ گئے دو بڑے توس منگوا کے دئے اور کہنے لگے اس وقت تو آپ اپنے کمرے میں جائیں صبح ۸ بجے تشریف لائیے کوتوال شہر آپ کے بیان لیگا۔ میں سوچا کر بُرے پھنسے اور میں نے عباس سے کہا بھی کہ میاں صبح ۸ بجے سے پیشتر پرو وائس چانسلر صاحب سے سارا حال بیان کر دو بہت کریں گے کچھ جرمانہ کر دیں گے خیر اس پولیس کی پکڑ دھکڑ سے تو بہتر ہے مگر صاحب یہ تو ـــــ" جمیل کو اتنی دیر تک مصروف تکلم دیکھ کر مجھے غبطہ ہونے لگا تھا میں نے بات کاٹ کر کہا "جی ہاں میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے شرلاک ہومز ثانی کا لقب عطا فرمائیگے مگر خدا کے لئے فاروق صاحب آپ ہی بتائیں کہ اگر میں جمیل کے کہنے پر عمل کر لیتا تو کیا حشر ہوتا بغیر پاس کے شہر جانا پہلا جرم ۱۱ بجے تک واپس نہ آنا دوسرا جرم پرو وائس چانسلر سے غلط بیانی کا ارتکاب تیسرا جرم کہئے یونیورسٹی سے نکالے جانے میں کیا کسر باقی رہجاتی ؟ پولیس کو بیان دینے میں کوئی خطرہ ہی نہ تھا بڑے شہروں میں ایک آدھ بدمعاش رہتے ہی ہیں کوتوال شہر کو ہم پر غلط بیانی کا شبہ کیوں ہونے لگا تھا اور اس کے علاوہ ـــ" "للہ بات نہ کاٹا کرو" جمیل نے ذرا جھنجلا کر کہا "مجھے قصہ تو ختم کر لینے دیا ہوتا ہاں صاحب خلاصہ یہ ہے کہ میں نے عباس کی رائے پر چلنا بہتر سمجھا اور صبح ہی صبح اپنے روم فیلو حامد کو بھی اس راز میں شریک کر لیا۔ حامد کو توال شہر کے دور کے رشتہ دار تھے اور ان سے کافی مدد ملنے کی توقع تھی۔ ٹھیک آٹھ بجے پرو وائس چانسلر صاحب کی کوٹھی میں داخل ہوئے کوتوال صاحب ہم لوگوں کو حامد کی وجہ سے جانتے تھے نہایت نرمی سے تمام داستان بیان کرنے کو کہا۔ ہم نے لہجہ میں سوز و گداز پیدا کر کے اپنی بپتا سنائی فرمانے لگے اس کا حلیہ آپ کو یاد ہے۔ یہاں پر میں رکا مگر عباس نے خدا جانے کس کتاب میں کس شخص کا حلیہ دیکھا تھا کہ تیزی کے ساتھ وہی حلیہ بیان کرنا شروع کر دیا جو ہم لوگ کچھ دیر پیشتر آپ کو سنا چکے ہیں۔ جب داہنے رخسار پر بڑے سے مسہ کا ذکر کیا تو کوتوال صاحب کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک پیدا ہو گئی ارشاد ہوا کہ آپ بالکل درست فرماتے ہیں موضع بنول پور میں جو ڈکیتی ہوئی تھی اس کے سلسلہ میں جو کیدار نے بیان کیا تھا کہ ایک ڈاکو کے گال پر بڑا سا نشان تھا غالباً

بوکھلاہٹ میں وہ مسئلہ کو نشان سمجھا ہلکا۔ چوکیدار تو اس کا فرضی نام بھی بتاتا تھا۔ تراب شاہ تو نام نہیں بھتا عباس نے ذرا مسکرا کر کہا۔ کوتوال صاحب نے مشکوک نظروں سے عباس کو دیکھا فرمانے لگے نام آپ کو کیونکر معلوم ہوا۔ عباس نے بلا کسی جھجک کے کہنا شروع کیا جی کیا عرض کروں جب ہملوگ چلنے لگے ہیں تو اس نے کہا تھا کہ اگر پولیس میں رپورٹ کرنا تو تھانیدار سے کہدینا کہ اگر تمھیں ناکوں چنے نہ چبوائے تو راجپوت کا لڑکا نہیں اور تراب شاہ نام نہیں۔ اب تو کوتوال صاحب کی برہمی کی کوئی انتہا نہیں رہی کہنے لگے صاحبزادے تمھارے تراب شاہ ایسے سینکڑوں آدمی کالے پانی بھجوا چکا ہوں وہ ہے کیا چیز۔ کوتوال صاحب تو برہم ہو رہے تھے اور ہمارے پرو وائس چانسلر صاحب خندۂ زیرلب فرما رہے تھے۔

میں ڈرا ہو کہ کہیں عباس کے آخری فقرے سے وہ کھٹک نہ گئے ہوں اور اس لئے چپ چاپ اجازت لیکر واپس چلا آنا بہتر سمجھا۔ دوسرے دن حامد سے معلوم ہوا کہ پرو وائس چانسلر صاحب اپنے ایک چپراسی کو ساتھ لیکر کوتوال صاحب کے پاس گئے ان کا خیال تھا کہ چپراسی نے ان کی بیگم صاحبہ کا نیکلس چرایا ہے مگر چپراسی لاکھوں قسمیں کھاتا تھا اور کہتا تھا کہ کل شب کو میں نے ایک آدمی کو جس کے گال پر بڑا سا مسّہ تھا آپ کی کوٹھی کے پاس دیکھا تھا کوتوال صاحب اس بیان پر بہت ہنسے کہنے لگے فرمائیے جناب اب یہ لڑکوں کا مذاق تھا یا اصلیت ؟ میری عمر پولیس کی ملازمت میں بسر ہوئی ہے میں ایک نظر میں پہچان لیتا ہوں کہ کون آدمی سچا ہے اور کون جھوٹا۔ اگر آپ کے خیال کے مطابق میں عباس اور جمیل کے بیان کو مذاق پر محمول کروں تو یہ نیکلس کا واقعہ ان کے بیان کی تائید کرتا ہے آپ ہی فرمائیں کہ آخر چپراسی کو تراب شاہ کا حلیہ کیسے معلوم ہوا ؟ اسے بھی جانے دیجئے نول پور کے چوکیدار کو کیا غرض تھی کہ وہ فرضی حلیہ بیان کرتا ؟ اس کے علاوہ میں نے اپنے طور پر حامد سے بھی دریافت کیا یہ قسمیں کھاتے ہیں کہ عباس اور جمیل کے بیان میں مذاق کا شائبہ بھی نہ تھا۔ آپ کی خوشی ہے تو میں چپراسی پر تشدد کرنے کے لئے طیار ہوں مگر یہ یاد رکھئے کہ نیکلس کا ملنا منحصر ہے تراب شاہ کی گرفتاری پر اور وہی ہوا کہ کوتوال صاحب کے تشدد کے باوجود چپراسی نے اعتراف جرم نہیں کیا۔ نیکلس کا قصہ مشہور ہونا تھا کہ تراب شاہ کالج کی چاردیواری کے علاوہ شہر میں بھی بہت کافی مشہور ہو گئے۔ کہیں نقب زنی ہوئی تراب شاہ کا ذکر خیر موجود کوئی قتل ہوا قاتل تراب شاہ فرض کئے گئے۔ یونیورسٹی کے کسی طالب علم کی کوئی چیز گم ہوئی تراب شاہ ملزم ٹھہرائے گئے۔ اسی زمانہ میں ایک مقامی اخبار نے تراب شاہ کے کچھ مجیر العقل

واقعات بھی سپرد قلم فرمائے تھے مثلاً تراب شاہ روپیہ کو دو انگلیوں سے توڑ سکتا ہے اس کا روسیدوں سے ساز باز ہے نہایت معتبر ذریعہ سے اطلاع ملی ہے کہ اس کے پاس کئی سو بندوقیں بھی ہیں غرض سال ڈیڑھ سال تک ایک ہنگامۂ عظیم برپا رہا متعدد کانسٹبلوں نے بارہا اسے شہر کی گلیوں میں چلتے پھرتے دیکھا لیکن گرفتار آخر وقت تک نہ کر سکے اور جب دو تین ماہ تک کوئی نیا جرم نہیں ہوا تو ارباب حل و عقد نے بجائے خود یہ طے کر لیا کہ تراب شاہ کا انتقال ہو گیا۔ جتنے واقعات تھے وہ سب کم و کاست عرض کر دئے اب تراب شاہ کی حقیقی یا فرضی ہستی کا بہتر فیصلہ آپ خود فرما سکتے ہیں؟ فارق صاحب کچھ فرمانے والے تھے کہ میں بول اٹھا "مگر جمیل تم نے ایک خاص واقعہ بیان نہیں کیا۔ فاروق صاحب ایک دن ہمارے کمرے کا بوا کے امین کسی ضرورت سے شہر گیا واپس آیا تو سراسیمہ و بدحواس میں نے پوچھا خیر تو ہے بوکھلائے ہوئے کیوں ہو، کہنے لگا میاں ڈگی تال کے پاس ایک آدمی ملا تھا جسکے گال پر بڑا سا مستہ تھا مجھسے پوچھنے لگا تم عباس صاحب یا جمیل صاحب کو جانتے ہو میں نے کہا کیوں تمھیں کیا کام ہے کہنے لگا کام کیا جب ملنا تو کہدینا کہ تراب شاہ نے سلام کہا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ شاید کسی چیز کو چرانے کے لئے بوا نے یہ قصہ گڑھ لیا ہو مگر ہمارے کمرے سے ایک تنکا بھی چوری نہ گیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ بوا کا یہ بیان کہاں تک صحیح ہے اور کیا واقعی کوئی شخص ایسا موجود تھا جس کا حلیہ ہمارے بیان کردہ حلیہ سے ملتا تھا؟ فاروق صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "عباس صاحب کیا خوب کہا ہے غالب مرحوم نے کہ "عالم تمام ایک حلقۂ دام خیال ہے" اور جمیل اس مصرع پر بے اختیار ہنسنے لگے۔

طالب صفوی

# مکتوبات نیاز

گزشتہ ماہ کی اشاعت میں آیندہ سے اس سلسلہ کے بند کرنے کا اعلان کیا گیا تھا، لیکن ناظرین کے اصرار پر اسے دسمبر تک اور قایم رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ غالباً اس وقت تک مکتوبات کتابی صورت میں ناظرین تک پہونچ جائے گی۔

نیاز

---

وہ جام و مینا کی سرگوشیاں، وہ صحنِ چمن میں درختوں کی گل پوشیاں، وہ ہلکی ہلکی پھوار، وہ رندانِ بدمست کا ہنگامۂ "بادہ بیار"! —— آہ کیا پوچھتے ہو

رات کس درجہ یاد آئے ہو تم

بجلی چمکتی تھی اور تمہارا تبسم نگاہوں میں پھر جاتا تھا، سرو شمشاد ہوا سے جھومتے تھے اور تمہاری رعنائیاں آنکھوں کے سامنے آجاتی تھیں، ساغر میں شراب چھلکتی ہوئی دیکھتا تھا اور تمہاری آنکھوں کا تصور ستانے لگتا تھا —— اور ——

گل دیدمے در روئے ترا یاد کردمے

پھر بتاؤ، تمھیں بتاؤ کہ

فریب خوردۂ نیرنگِ وعدہ ہائے توکیست ؟

وہ —؟ جن کے پاس بے بُلائے پہونچ جاتے ہو۔ یا میں ——؟ جس کے حق میں ایفاءِ عہد کی تم نے قسم کھالی ہے۔

اے، لاحول ولاقوۃ، کہاں کا جام و سبو، کیسی بادہ خواری!

آشفتگی کجا و ہوائے چمن کجا

تم نہ آئے تو ساری رات اسی اہتمام کے تصور میں کٹ گئی، جی چاہا کہ تمھیں بھی ستاؤں، یعنی تم پر

ظاہر کردوں کہ

تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی

ہوئی، اور خوب ٹھاٹھ سے ہوئی، لیکن اُس تنگ ظرفی کا بُرا ہو کہ جھوٹ بولنے کی بھی سمائی نہیں ——— یہ بیکسی کی آخری حد ہے۔ اب بھی اگر تم کو رحم نہ آئے تو خدا تم پر رحم کرے۔

نیاز

---

الفت پناہا، مودت دستگاہا،

گرامی نامہ پہونچا، سینہ پر رکھا، آنکھوں سے لگایا، اور دیر تک سوچتا رہا کہ آپ کے الطاف بے پایاں کا اعتراف کیونکر ممکن ہے۔ اگر روح القدس اپنی زبان مجھے دے بھی دیں، تو خضر و الیاس اپنی عمریں کیوں دینے لگے اور اگر یہ دونوں باتیں ممکن ہوں تو بھی اس کا کیا علاج کہ یہ اندازۂ تاثر میرے نزدیک دہ بھی ناقص ہے اور یہ بھی مختصر! آپ فرمائیں گے کہ یہ سب تکلف و تصنع ہے، میں عرض کروں گا

زخود بجوئے کہ مارا چہ دردل افتادست

آپ کہیں گے کہ یہ شاعری ہے میں کہوں گا "آداب عرض ہے"

بہرحال آپ کو نہیں معلوم، میں جانتا ہوں کہ آپ کا یہ التفات کیا مجھے کافر بنائے بغیر چھوڑتا ہے؟

زندہ و سلامت رہئے اور اسی انداز سے

عمر محبت دراز، رشتۂ الفت رسا!

نیاز

---

لاحول ولاقوہ، مصائب سے گھبراتے ہو، آلام و افکار سے پریشان ہوتے ہو، اور یہ نہیں دیکھتے کہ تم اتنے "اچھے" کیوں ہو۔

تونالی ازغلۂ خار و تنگری کہ سپہر

سر حسین علی بر سناں بگرداند

زمانہ کا دستور ہمیشہ سے یہی چلا آیا ہے، اچھوں کی زندگی سدا یونہی بُری بسر ہوتی ہے، پہلو میں دل رکھتے ہو تو دکھ اٹھانا پڑے ہی گا، شکوہ و شکایت بیکار ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ تم جن کے لئے تباہ ہو، وہی تم سے بیزار ہیں، جن کی دوستی میں تم برباد ہوئے

وہی تمھارے دشمن ہیں، لیکن کیا یہ تجربہ تمھاری یا دنیا کی فطرت کو بدل دے گا۔ وہ نہیں تو اور ہزار ہیں تمھاری نیکی سلامت چاہئے، دشمنوں کی کیا کمی ـــــ سونا ہونے کا دعویٰ ہے تو بار بار تپایا جانا ضرور۔

روئے کشادہ باید و پیشانی فراخ
آنجا کہ لطمہ ہائے ید اللہ می زنند

میں ذاکر صاحب سے ابھی تک نہیں مل سکا اور ملوں بھی تو کس اُمید پر، جانتا ہوں کہ زبان سے "نہیں" کبھی نکلے گا نہیں اور دل کبھی "ہاں" کرنے کا نہیں۔

نیاز

---

مسکیں خبر از لذتِ آزار نہ دارد
خارم کن و در رہگزرِ چارہ گرم ریز

غالبؔ کا یہ شعر مجھے بہت زمانہ سے یاد ہے، مگر جو بحث آپ نے پیش کی ہے وہ کبھی میرے خیال میں بھی نہ آئی تھی۔

آپ پوچھتے ہیں کہ دوسرے مصرع میں لفظ "کن" بالفتح پڑھا جائے یا بالضم، یعنی اسے "کندن" کا امر سمجھا جائے یا کردن کا ـــــ میرے نزدیک ہر وہ شخص جس کو فارسی زبان اور غالبؔ کے ذوق شعری کا صحیح علم ہے، اس کے ذہن میں بھی کبھی یہ اختلافی صورت نہیں آسکتی، معلوم نہیں آپ کے احباب کو کیوں یہ خلش پیدا ہوئی۔

شاعر کا مقصود یہ کہنا ہے کہ ـــــ "چارہ گر جو مجھے صبر و ضبط یا ترک محبت کی ہدایت کرتا ہے تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ غریب لذتِ آزار سے آگاہ نہیں، اس لئے اے خدا تو اسے بھی اس آزار سے آشنا کر دے تاکہ وہ اپنی پند و نصیحت سے باز آجائے"

اس مفہوم سے غالباً آپ کو بھی انکار نہ ہوگا، پھر خود فیصلہ کیجئے کہ اس صورت میں یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ "مجھے کانٹا بنا کر چارہ گر کی راہ میں ڈال دے" یا یہ کہ "میرا کانٹا نکال کر اس کی رہگزر میں ڈال دے"

ظاہر ہے کہ نہ رہگزر سے مراد واقعی رہگزر ہے اور نہ خار سے مراد واقعی خار بلکہ ایما و اشارہ ہے چارہ گر کی زندگی اور آزار محبت کی طرف، اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ "مجھے کانٹا بنا کر اس کی راہ میں ڈال دے" تو ظاہر ہے کہ خیال خار و رہگزر کے لغوی معنی کی طرف منتقل ہوگا جو مقصود نہیں، لیکن بصورت دیگر

مفہوم میں وہی معنوی رنگ پیدا ہو جائے گا جو شاعر ظاہر کرنا چاہتا ہے۔
علاوہ اس کے "مجھے کانٹا بنا کر راہ میں ڈالدے" کہنا اسوقت زیادہ موزوں ہوتا، جب جذبۂ انتقام بھی اس میں شامل ہوتا لیکن پہلے مصرعہ میں لفظ "مسکین" اس خیال کے منافی ہے۔ اسی کے ساتھ "فارسیت" کا اقتضا بھی یہی ہے کہ اسے کندن کا صیغۂ امر قرار دیا جائے۔ نیاز

---

آپ بھی سن لیجئے اور اُن سے بھی کہہ دیجئے کہ اعترافِ محبت کوئی گناہ نہیں کہ اس کی تعزیر میں آزمایش و امتحان کے مبادیات طے کرنا ضروری ہوں۔ غالب کہتا ہے

خجلت نگر کہ در حسنا تم نیافتند
جُز روزۂ درست ز صہبا کشودۂ

گر یہاں تو انشاء اللہ نامۂ اعمال بالکل کورا ہی ملے گا، وہاں کم از کم ایک روزہ تو تھا خواہ وہ شراب ہی سے کیوں نہ کھولا گیا ہو، گر یہاں تو ساری عمر اس حسرت میں بسر ہوئی کہ شراب ہوتی تو روزہ رکھا جاتا ——
بہرحال اُن سے محبت کرتا ہوں اور بالکل بے وجہ، اس لئے نہ مجھے دلیل لانے کی ضرورت اور نہ انہیں امتحان لینے کی —— وہ مجھے بلاتے ہیں شکریہ، لیکن اگر میرا آنا "شرطِ وفا" قرار دیا جاتا ہے تو کہہ دیجئے

میں نہیں جانتا وفا کیا ہے

وہ خود تو مارے معشوقیت کے میری ایک بات نہ مانیں اور میں پس پس کے برابر گرد رہ بنا چلا جاؤں خوب!۔
اُن سے کہدیجئے کہ اگر وصلِ لیلیٰ کی شرط یہی ٹھہری ہے

تو استغنا مرا با حسرت و یاس

آج سے نہ وہ میرے محبوب، نہ میں ان کا چاہنے والا ——

لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

نیاز

---

کرم فرمائے بندہ ——
کل جعفر صاحب کی تحریر سے معلوم ہوا کہ آپ میری طرف سے لبریز شکایت ہیں، خیر، یہاں تک تو

کوئی مضایقہ نہ تھا، لیکن سنا گیا ہے کہ آپ نے مجمع احباب میں بعض ایسے الفاظ سے بھی یاد کیا جو نقطوں سے یکسر بیگانہ تھے۔ حیرت ہے کہ آپ نے کیوں اسقدر التفات فراواں سے کام لیا۔

آپ میرے بزرگ ہیں میرے بزرگوں کے ملنے والے ہیں، پیرزادے ہیں، حسنی الحسینی سید ہیں، میں کیا کہہ سکتا ہوں سوائے اس کے کہ اس وقت تک تو میں اپنے آپ کو ایسا مکار و فریبی نہیں سمجھتا تھا لیکن اب چونکہ آپ ایسا فرماتے ہیں، اس لئے ویسا بنجانے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔

گفتہ بودی ہمہ زرقند و فریبند فسوس
سعدی آں نیست ولیکن چو تو فرمائی ہست

چونکہ جناب کی اس توجہ کا شکریہ لازم تھا اس لئے یہ چند سطریں سپرد قلم کی گئیں، ورنہ اس سے منشاء حاشا، و کلا یہ ظاہر کرنا نہیں کہ میں کچھ اصلاح کی طرف مائل ہو گیا ہوں یا یہ کہ آپ کی بدعاؤں نے مجھے مآل کے طرف سے خایف بنا دیا ہے۔ یہاں تو جو بیراہ روی اول دن اختیار کر لی تھی، بحمد اللہ وہی ابتک قایم ہے۔

آپ کے مذہب و ایقان کی بلندی سے نا واقف نہیں لیکن اپنے متعلق کس زبان سے عرض کروں کہ

کردہ ام ایمان خود را دستمزد خویشتن
می تراشم پیکر از سنگ و عبادت می کنم
لکم دینکم ولی دین

خاطی و گنا ہگار
نیاز

---

تو یہ کہئے آپ مجھ سے خفا ہیں! اور صرف اس لئے کہ میں نے آپ کے اُسی ایک خط کا جواب کیوں نہ دیا جو جواب طلب نہ تھا۔

بندۂ خدا، یہ تو سوچو کہ تم ۲۷ر کو لکھ رہے ہو کہ "میں ۲۸ر کو جا رہا ہوں" پھر میں تمھیں "خدا حافظ" کہتا بھی تو کس پتہ پر؟ میں انتظار میں تھا کہ منزل مقصود تک پہونچ جانے کے بعد تم پھر مجھے اطلاع دوگے اور میں دعائیں، یا گالیاں جو کچھ دینا ہیں اسی وقت تفصیل سے دے لوں گا۔ مگر یہ خبر نہ تھی کہ خدا کی بارگاہ

تمک پہونچ کر انسان میں خود بھی "پندار خدائی" پیدا ہوجاتا ہے، جس کا بڑا کارنامہ صرف "بیجا" بن جاتا ہے۔
بہرحال شکر ہے کہ آپ مع الخیر اس مذہبی سفر سے واپس آگئے، آپ اگر خفا ہیں تو زیادہ سے زیادہ یہ کیجئے کہ تبرکات میں سے مجھے کچھ نہ دیجئے، لیکن کسی بندہ کو دائرۂ بندگی سے خارج کر دینا کہاں کی شانِ خداوندی ہے! ــــ مدعا یہ کہ مجھ سے بولئے خواہ وہ کتنی ہی برہمی کے ساتھ ہو اور مجھ کو خط لکھئے خواہ اسمیں گالیاں ہی گالیاں کیوں نہ ہو۔
آپ سے ملنے کے بعد ہی تو یہ معلوم ہوا ہے کہ اہرمن بھی ایسی بُری چیز نہیں، پھر یہ خفگی بیکار ہے۔

نیاز

---

کرمی۔

آپ نے جس مضمون کی طرف مجھے متوجہ کیا ہے، وہ میری نگاہ سے گزر چکا ہے۔ لیکن آپ میرے مسلک سے پوری طرح آگاہ ہیں اور اس لئے مجھ سے یہ توقع رکھنا کہ اس کا جواب دوں بیکار ہے۔

مہ نور می فشاند و سگ بانگ می زند

اور فرمائیے آپ کے مشاغل کا کیا رنگ ہے؟ وہی ساری دنیا کا غم لئے ہوئے پھرنا اور ایک لفظ شکایت کا منہ سے نہ نکالنا ــــ!

اے خوشا عمرے کہ صرفِ راہِ استغنا شود

لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ سے زیادہ اس رمز کا سمجھنے والا مجھے تو کوئی دوسرا نظر آیا نہیں۔
اگر قربانیاں کرتے کرتے کوئی ہستی کبھی خود دیوتا بن سکتی ہے، تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ سے بڑا دیوتا پیدا ہونا اس صدی میں ممکن ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ آپ کا انکسار اسے بھی تسلیم نہ کرے گا۔

نیاز

---

# باب المراسلۃ والمناظرۃ

## (اصغر گونڈوی کی شاعری)

ادیب محترم دامت افادالکم ـــــ مجھے اس بات کا اعتقاد ہے کہ آپ اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں جو اپنی رائے کے خلاف کوئی صدا بلند ہوتے ہوئے سن نہیں سکتے۔ آپ کا طرز عمل شاہد ہے کہ اگر کسی نے آپ کو گالیاں بھی دی ہیں تو آپ نے اس کو بھی شائع کر کے معقول جواب دیا ہے لہذا میں اس کی امید نہیں رکھتا کہ آپ اس مضمون کو محض اس لئے واپس کر دیں گے کہ یہ آپ کے ریویو کا جواب ہے۔ آپ اس کی مخالفت میں جو چاہے وہ نوٹ لکھدیں لیکن براہ عنایت اپنے رسالہ میں جگہ دیکر اپنی اخلاقی جرأت کا ثبوت دیجئے۔ اور مجھے رہین منت بنائیے مضمون کسی قدر طولانی ضرور ہے لیکن اس سے بہت زیادہ طولانی مضامین آپ کے رسالہ میں نکل چکے ہیں

نیاز کیش

شمس الدین

---

مندرجہ بالا کتاب پر نگار ماہ جون ۱۹۳۴ء میں اڈیٹر کا ریویو میری نظر سے گزرا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کم فرصتی کی وجہ سے اڈیٹر صاحب نے پوری کتاب نہیں دیکھی۔ یہ رائے ان کی بیشک صحیح ہے کہ پہلی ہی نظر میں ذاتیات کا گمان کر کے اس کتاب کی نسبت خراب رائے قایم ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص شروع سے آخر تک کتاب دیکھ جائے گا تو مجبوراً اس کو اپنی رائے بدلنا پڑے گی اس سبب سے کہ کتاب

بھرے ہیں اصغر صاحب کہیں بھی مخاطب نہیں ہیں اور نہ ان کو براہ راست چیلنج دئے گئے ہیں بلکہ چیلنج انکے مداحین کو دئے گئے ہیں جنھوں نے ایک ہنگامہ اٹھا کر اصغر صاحب کے مقابلہ میں تمام شعرا کو ذلیل کر کے انصاف پسند لوگوں کے دلوں کو تکلیف پہونچائی ہے۔

میں اُسی کتاب کے صفحہ ۸۴ و ۸۵ سے ایک فقرہ سرکوب صاحب کا لکھتا ہوں " دنیا جو چاہے سمجھ لے لیکن حقیقت میں میں اصغر صاحب کے خلاف نہیں ہوں بلکہ اُن لوگوں کے خلاف ہوں جو اصغر صاحب کی شاعری سے بخوبی واقف ہیں پھر بھی ان کو خلاف واقعہ بڑھاتے ہیں" اور صرف اسی ایک فقرے پر موقوف نہیں ہے بلکہ تمام کتاب اس قسم کے مضامین سے بھری ہوئی ہے کہ اصغر صاحب کی مخالفت محض اُن کے مداحوں کی وجہ سے ہوتی ہے جو اصغر کے مقابلے میں مشاق اور قادر الکلام شعرا کی توہین و تذلیل کرتے ہیں۔ اصغر کے دوستوں کو تو اصغر کی توہین ناگوار ہوتی ہے لیکن کسی دوسرے کو باکمال شعرا کی توہین و تذلیل اصغر ایسے شخص کے مقابلہ میں جو ایک نشست میں دو ایک شعر بھی نہیں کہہ سکتے ناگوار نہیں ہوسکتی۔ کتاب کو شروع سے آخر تک دیکھ کر ایک شخص بھی یہ رائے قائم نہیں کرسکتا کہ سرکوب کو یا اس کتاب کے کسی مضمون نگار کو اصغر سے کچھ ذاتی مخاصمت ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ معرض بحث میں اصغر صاحب ہی ہیں اس سبب سے نتیجہ جو نکلتا ہے وہ اصغر ہی کے خلاف نکلتا ہے اسی دھوکے میں اگر اڈیٹر صاحب نے بغیر کتاب کو شروع سے آخر تک دیکھے ذاتی مخاصمت کا گمان کر لیا۔

ہم اڈیٹر صاحب کے نہایت ممنوں ہوں گے اگر وہ اصغر صاحب یا اُن کے دوستوں سے دریافت کر کے کوئی واقعہ ایسا لکھ دیں جس سے اس کا شبہ بھی ہوسکے کہ سرکوب صاحب کو اصغر صاحب سے کوئی ذاتی رنج یا خصومت ہے۔ بستر کی کسی اشاعت میں ایک مضمون سرکوب صاحب کا شائع ہوا ہے جسمیں انھوں نے یہ لکھا ہے کہ میرا اور اصغر کا ساتھ تین برس تک انڈین پریس میں رہا ہے اس درمیان میں میرے اور ان کے تعلقات ایسے خوشگوار رہے ہیں کہ کسی قسم کی شکر رنجی تو در کنار کبھی کسی معاملہ میں رائے تک میں بھی اختلاف نہیں ہوا لیکن مجھکو یہ کہنے میں بھی باک نہیں ہے کہ اصغر صاحب نہایت کم مشق شاعر ہیں اور فن شعر سے بالکل ناواقف۔

اصغر صاحب بھی اس کو مانتے ہیں کہ مجھ سے اور سرکوب صاحب سے کوئی ذاتی خصومت نہیں ہے اڈیٹر صاحب خود ان سے دریافت کر سکتے ہیں۔

بھلا سرکوب ایسے بے نیاز شخص کو کسی سے ذاتی خصومت شاعری کے معاملہ میں کیا ہو سکتی ہے جس کو خود شہرت کی پرواہ نہ تعریف کی۔ ان کا کلام قریب قریب ہر ادبی رسالہ میں شائع ہوا کرتا ہے لیکن اُن کے نام سے نہیں بلکہ دوسروں کے نام سے، یہ الزام اُن پر بہت صحیح ہے کہ وہ اپنے نام سے کچھ نہیں کہتے بلکہ دوسروں کو اشعار کہہ کر بلا معاوضہ دیدیا کرتے ہیں جس سے اصغر صاحب بھی بخوبی واقف ہیں اگر کسی کی فرمایش سے کچھ اپنے نام سے کبھی پڑھتے بھی ہیں تو اُس کو محفوظ نہیں کرتے اس وقت ایک مصرع بھی اُن کے پاس محفوظ نہیں ہے لوگ اُن پر اعتراض کیا کرتے ہیں کہ آپ ان جواہر پاروں کو کیوں ضایع کر دیتے ہیں تو اُس کا جواب یہی ملتا ہے کہ یہ میرے جذبات نہیں تھے بلکہ دوسروں کی فرمایش سے مجبور ہو کر میں نے کہا تھا اسکے حکم کی تعمیل ہو گئی پھر اب ان کے رکھنے کی کیا ضرورت ہے غرض یہ کہ اُن کا مزاج ہی ایسا نہیں ہے کہ اُن سے شاعری میں کسی سے ذاتی خصومت ہو سکے۔ یہ جھگڑا ذاتی خصومت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ وہ اصغر کی قابلیت سے اچھی طرح واقف ہیں اور مداحان اصغر جو اصغر کو باکمال شعراء پر ترجیح دیتے ہیں وہ اُن کو ناگوار ہوتا ہے۔

اس سے اڈیٹر صاحب بھی واقف ہیں کہ اصغر کے مداحوں نے کیا ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ نگار ہی کے کسی اشاعت میں مرزا احسان احمد کا مضمون شایع ہوا ہے جس میں اصغر کے مقابلے میں شعرائے لکھنؤ کے ذلیل کرنے کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا گیا یہاں تک الفاظ ہیں کہ "اصغر لکھنؤ کے گزشتہ و موجودہ شاعروں سے بہتر ہیں" مرقع میں ذوقی صاحب نے جو زہر اگلا ہے اس سے بھی غالباً اڈیٹر صاحب ناواقف نہ ہوں گے اس میں بھی یہاں تک لکھا گیا ہے کہ جس حدِ کمال پر شعرائے سابقہ و حال کی شاعری ختم ہو جاتی ہے وہاں سے اصغر کی شاعری شروع ہوتی ہے کیا کسی کی تعریف کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ اس کے مقابلے میں استادانِ گزشتہ و موجودہ ذلیل کئے جائیں۔ اسی "اصغر کی شاعری حصۂ اول میں اڈیٹر صاحب بیخود فیض آبادی کا مضمون ملاحظہ کر لیں کہ انھوں نے یہ لکھا ہے کہ اصغر امام المتغزلین پیغمبر ذوقِ سلیم ہیں انھوں نے بڑے بڑے عفاریت سخن کو میدان شاعری میں پچھاڑ دیا ہے اور مخالفین اصغر کو جو گالیاں دی ہیں وہ بھی دیکھ لیں۔ خبیث۔ کمینہ۔ کم ظرف۔ شیطان علیہ اللعن کا شاگرد سب کچھ بنا دیا ہے (مضمون نمبر ۱ دیکھئے) یہ مداحان اصغر کی تہذیب ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب اصغر کے موافقین اور مخالفین دونوں کے مضامین اس کتاب میں بطور سوال و جواب کے ہیں تو کوئی شخص کیسے یہ رائے قایم کریگا کہ اصغر کی ذاتی مخاصمت کی بنا پر

یہ کتاب مرتب کی گئی ہے اڈیٹر صاحب کے نزدیک سرکوب صاحب تو انسان نہیں ہیں لیکن مداحان اصغر انسان ہیں۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ اس میں اصغر صاحب کا کچھ قصور نہیں ہے تو مخالفین اصغر کا بھی کچھ قصور نہیں ہے کیونکہ وہ اصغر صاحب سے کتاب بھر میں کہیں مخاطب نہیں ہیں بلکہ اُن کے مداحان سے مخاطب ہیں۔ اثر اس کا اصغر صاحب پر پڑے یا کسی اور پر وہ تو مداحان اصغر کی خبر لیتے ہیں۔ مشکل تو یہ ہے کہ اگر انسانیت سے مداحان اصغر سے کہا جاتا تھا کہ بابا کسی شخص کی ایسی تعریف نہ کرو جو دوسرے کو ناگوار ہو تو بگڑ جاتے تھے اور کہتے تھے کہ اصغر کی تعریف ابھی ہوئی کہاں قیامت تک اگر تعریف ہو گی تب بھی ایک شمہ اُن کی حمد وثنا کا بیان نہ ہو سکے گا۔ ایسا گروہ جو زبان اور محاورے کی غلطیوں کو اضافۂ زبان سمجھے جو شعر کی خامیوں کو عمق خیال کرے جو غلط اور ناقص شعروں کی تاویل کر کے اپنی سمجھ پر فخر کرے اور دنیا کو ناقابل اور نافہم خیال کرے اس کی سرکوبی سوائے اس کے اور کسی طرح نہیں ہو سکتی تھی کہ اُن لوگوں کو چیلنج دیدیا جائے کہ اچھا اصغر کو میدان امتحان میں لائیے تاکہ آپ کی سمجھ کا امتحان ہو جائے کہ جب آپ کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اصغر کا شعر ہے اُسوقت آپ اُس کو پیغام خداوندی سمجھتے ہیں یا جب نہیں معلوم ہوتا اُس وقت بھی آپ اصغر کے شعر کی تعریف کرتے ہیں چنانچہ اصغر کی ایک غزل کے جواب میں جس کی تعریف میں علی گڑھ میگزین میں بہت مبالغہ کیا گیا تھا اُسی قسم کے اشعار بہت کم وقت میں کہکر ان کے مداحوں کے سامنے پیش بھی کر دئے گئے ہیں جو اسی کتاب کے صفحہ ۲۵ و ۳۶ میں ہیں اصغر کی بیجا تعریف کر کے عرش پر چڑھانے ہی کا یہ نتیجہ ہوا کہ اصغر کے دماغ میں یہ بات سما گئی کہ ہیچو من دیگرے نیست، اور لطف یہ کہ اپنی قابلیت کے ثبوت میں اصغر صاحب صرف یہی بات پیش بھی کرتے ہیں کہ میری تعریف بڑے بڑے لوگ کرتے ہیں لیکن جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ تعریف تو بہت سے وجوہ کی بنا پر ہو جاتی ہے آپ میں کچھ ذاتی جوہر بھی ہے یا نہیں تو اسکا جواب صرف خاموشی میں ملتا ہے۔ اصغر کا غرور اور مداحان اصغر کا جوش توڑنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ ان کا راز شاعری فاش کر دیا جائے اس کو ذاتی مخاصمت سے تعبیر کرنا ہٹ دھرمی ہے اگر کسی شخص کو اخلاقی سبق دیا جائے کہ ہر شخص کی اُسی قدر تعریف کرو جس کا وہ مستحق ہے اور دوسروں کی تذلیل کر کے دنیا کو رنج نہ پہونچاؤ تو آپ اس کو ذاتی مخاصمت سمجھیں گے۔

اب رہگئی یہ بات کہ مداحان اصغر نے جو خلاف واقعہ ان کو بڑھایا اس کے جوابات ہو چکے تھے اسکی کیا ضرورت تھی کہ وہ سوال وجواب ایک کتاب کی صورت میں ایک جا کر دئے جائیں اس سے تو

یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اصغر کے ذلیل کرنے کے واسطے یہ کام کیا گیا اور اسی کو خصومت کہتے ہیں تو یہ اعتراض بھی وہی شخص کرے گا جس نے غور سے وہ پوری کتاب نہ پڑھی ہو گی جو شخص غور سے پڑھے گا اسکو مداحانِ اصغر کا کیرکٹر معلوم ہو جائے گا کہ واقعہ سے انکار کرنے میں ان کو کچھ باک نہیں ہوتا غلط بیانی اور دروغ گوئی میں شیر ہوتے ہیں۔ طالب علم نے جو یہ لکھا کہ مداحان اصغر باوجود چیلنج دینے کے کبھی اصغر صاحب کو میدان امتحان میں نہیں لائے اس کی نسبت ایک مداح نے جس نے اپنا نام راستگو رکھا ہے یہ لکھدیا کہ یہ بالکل جھوٹ واقعہ ہے اور سراسر اصغر صاحب پر بہتان ہے (مضمون نمبر ۳ دیکھئے) یہ ظاہر ہے کہ کسی اخبار کے پرچے کوئی کہاں سے تلاش کر کے بروقت لاتا لہذا وہ مضامین اکٹھا کر دئے گئے تاکہ بروقت ضرورت پیش ہوا کریں۔ غرض یہ کہ اس کتاب کی ترتیب کا باعث بھی مداحان اصغر ہوئے اگر وہ غلط بیانی اپنا شیوہ نہ قرار دیتے تو کتاب بھی مرتب نہ ہوتی۔ سرکوب نے کتاب کے ترتیب کی غرض جو دیباچے میں لکھی ہے اس کو بھی دیکھ لیجئے اس سے بھی اصغر صاحب کے ساتھ کوئی ذاتی خصومت نہیں پیدا ہوتی بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ ہنگامۂ اصغر کو روکنے کی غرض سے کتاب مرتب ہوئی ہے میں اس کو یہاں لکھے بھی دیتا ہوں۔

"میں نے اس امید پر اس مجموعے کو مرتب کیا ہے کہ شاید مداحانِ اصغر کو یہ خیال آجائے کہ اب ہماری شرم و حیا کے چرچے ملک میں بہت زیادہ ہونے لگے لہذا اخباروں اور رسالوں کے صفحات کو الگ کر کے اپنی غیرت داری کا زیادہ ثبوت نہ دینا چاہئے۔"

غرض یہ ہے کہ سرکوب صاحب کو کوئی ذاتی مخالفت اصغر صاحب سے نہیں ہے لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ مداحانِ اصغر کی بیجا سختیوں اور ترجیح بلا مرجح سے ان کو ایک قسم کی ضد ضرور پیدا ہو گئی ہے کہ ہم اصغر کے کل راز رفتہ رفتہ کھولدیں گے ابھی پہلا حصہ ہے دوسرے اور تیسرے حصہ میں اس سے زائد راز اصغر صاحب کے کھلیں گے۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ سرکوب کے نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اصغر کی دل آزاری اور اُن کے ذلیل کرنے کے لئے یہ کتاب مرتب کی گئی ہے اس کا جواب تو یہی ہے کہ اصغر کے نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت چھوٹے آدمی ہیں پھر وہ کیوں اس قدر بڑھائے جاتے ہیں۔ بندہ پرور اس کتاب کے واسطے یہ نام نہیں ایجاد کیا گیا بلکہ یہ اُن کا بہت پُرانا تخلص ہے اس کتاب کی ترتیب سے بہت قبل

ان کی نظمیں سرکوب کے نام سے اودھ پنچ وغیرہ میں موجود ہیں ایک شخص کے دو تخلص کوئی نئی بات نہیں ہے بہت لوگوں کے ایسے تخلص تھے۔ نواب مصطفےٰ خاں کا تخلص شیفتہ بھی تھا اور حسرتی بھی اگر آپ کتاب دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو جائے کہ کہاں پر وہ سرکوب تخلص کرتے ہیں اور کہاں پر حامد۔

میری رائے میں اڈیٹر صاحب کا یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ اصغر صاحب سنجیدگی اور انسانیت کی وجہ سے چیلنج کو قبول کر کے میدان امتحان میں نہیں آتے اور اُن کے نہ آنے سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ وہ شعر نہیں کہہ سکتے۔ میں یہی عرض کروں گا کہ یہ اڈیٹر صاحب کی نیک نفسی ہو ورنہ واقعہ یہی ہے کہ اصغر صاحب اپنی کمزوری کی وجہ سے میدان امتحان میں نہیں آتے اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ آپ تو محض قیاس کی بنا پر کہتے ہیں اور جس شخص نے ان کی کمزوری اور شعر کہنے سے عاجز رہنے کا راز کھولا ہے اس نے تجربہ کیا ہے۔ تین برس تک اس کا اور اصغر صاحب کا ساتھ ایک ایسے ادبی کام میں رہا ہے جس میں شعر کہنے کی بھی ضرورت ہوتی تھی وہاں پر انسانیت کو کام میں لانے کا کوئی سوال نہیں تھا کیونکہ نوکری کا معاملہ تھا لہذا اُس کا تجربہ اڈیٹر صاحب کے قیاس سے کہیں زیادہ وقیع ہے یہ زبردستی ہے کہ آپ اپنے قیاس کو کسی کے تجربے پر ترجیح دیں اور اگر اڈیٹر صاحب اس کو نہ مانیں گے تو ہم مجبوراً وہی عرض کریں گے جو مخالفین اصغر نے اس کتاب میں لکھا ہے کہ جس شاعر کو اڈیٹر صاحب سنجیدہ انسان سمجھتے ہوں اس کو اسی قسم کے چیلنج دیکر دکھا دیں کہ وہ میدان امتحان میں نہیں آتا اور اپنی ناقابل برداشت بدنامیوں کے زہر کو شربت کے گھونٹ کی طرح پی جاتا ہے تو ہم مان لیں گے کہ اڈیٹر صاحب کی رائے صحیح ہے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ اڈیٹر صاحب کی جرارت ہی نہ ہوگی کہ کسی مشاق شاعر کو وہ اس قسم کے چیلنج دیدیں اس سبب سے کہ ڈریں گے کہ وہ میدان امتحان میں آکر ان کو ذلیل کر دے گا۔ ایسی جرأت صرف اُسی شاعر کی نسبت ہو سکتی ہے جس کی کمزوری اور عاجزی کا یقین ہو اور یقین بغیر تجربے کے نہیں ہو سکتا چونکہ سرکوب صاحب کو تجربے سے یقین ہو گیا تھا اس وجہ سے مداحان اصغر کو چیلنج دیئے گئے اور ان کے تجربے کو لوگوں نے صحیح مان لیا۔

کیا انسانیت کے خلاف یہ نہیں ہے کہ باکمال شاعروں کی اپنے مقابلہ میں توہین کرائی جائے لیکن اس سے اصغر صاحب کبھی نہیں چوکتے کبھی بحث کر کے ان سے دیکھئے کہ وہ اپنے مقابلہ میں کسی کو سمجھتے ہیں۔ جب تک گنجائش تھی اسوقت تک اصغر صاحب پر جو اعتراضات ہوتے تھے ان کے

جواب لکھنے میں انسانیت کو دخل نہیں دیا جاتا تھا اب جب سوائے اس کے اور کوئی گنجایش نہ رہی کہ اصغر میدان عمل میں لائے جائیں تو عصمت بی بی بے چارگی " ہو کر سب کے سب انسان بن گئے۔ اگر اڈیٹر صاحب کو کسی شخص کی بابتہ ذاتی تجربہ ہوجائے کہ وہ شعر کہنے سے عاجز ہے اور اس کے امتحان میں نہ آنیکا سبب لوگ اس کی انسانیت ظاہر کریں اس وقت تو اڈیٹر صاحب اس کی انسانیت کے قایل نہ ہونگے لیکن سرکوب صاحب پر یہ ظلم کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ذاتی تجربے کو کوئی چیز نہ سمجھیں اور اڈیٹر صاحب کے قیاس کو صحیح سمجھ کر اصغر کی انسانیت کے قائل ہوجائیں۔ اڈیٹر صاحب کے اُصول کے مطابق تو ہر جاہل شخص اپنے عالم ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے اور اڈیٹر صاحب کو اس کو عالم ماننا پڑے گا اس سبب سے کہ جہل اور علم کا فیصلہ صرف امتحان کر سکتا ہے اور امتحان اڈیٹر صاحب کے نزدیک خلاف انسانیت ہے لہذا جاہل کو عالم ماننا انھیں واجب ہوجائے گا۔ اڈیٹر صاحب کوئی انسان خواہ ملک سیرت ہی کیوں نہ ہو کسی بات پر قدرت رکھتے ہوئے اس بات کے متعلق اپنی بدنامی ہرگز گوارا نہیں کر سکتا۔ مضمون چونکہ طول ہوگیا ہے اس وجہ سے ہم اس مبحث کے شواہد پیش کرتے ہوئے اس وقت اس لئے ڈرتے ہیں کہ اڈیٹر صاحب طوالت کا الزام رکھکر مضمون کو واپس کردیں گے لہذا اڈیٹر صاحب سے صرف اتنی استدعا کرتے ہیں کہ وہ کتاب کو شروع سے آخر تک دیکھ جائیں۔ چھوٹی سی کتاب ہے تین گھنٹے سے زاید وقت ان کا نہیں خراب ہوگا اگر کتاب دیکھنے کے بعد بھی ان کی رائے یہی قائم رہے کہ اصغر انسانیت کی وجہ سے میدان عمل میں نہیں آتے تو دوسرے حصہ کا انتظار کریں جس میں اس کا پتہ دیا گیا ہے کہ اصغر کی کونسی غزل کس کی کہی ہوئی ہے اور اس کا ناقابل تردید ثبوت بھی ہے۔

بعض لوگ جن کے دماغ فوٹوگراف ہیں اصغر صاحب کے کہنے سے یہ کہتے پھرتے ہیں کہ سرکوب صاحب تخریبی کام کر رہے ہیں اور اصغر صاحب کے مداح تعمیری کام کرتے ہیں اگر تعمیری کام کے یہی معنی ہیں کہ دنیا کو دھوکا دیا جائے اور ایک شخص جو سیر بھر کا ہے وہ من بھر کا کر کے دکھایا جائے اور تخریبی کام یہ ہے کہ اُس دھوکے سے لوگوں کو آگاہ کر دیا جائے تو میری رائے میں دنیا کو تخریبی ہی کام کرنا چاہئے۔ تخریبی کام تو یہ ہے کہ کسی اچھے کام میں خرابی ڈالی جائے اس کو کوئی انصاف پسند اچھا کام نہیں کہہ سکتا کہ واقعہ کے خلاف کوئی شخص بڑھایا جائے اور دوسرے باکمال حضرات اُس کے مقابلے میں گھٹائے جائیں۔

بعض آدمی جو یہ کہتے ہیں کہ اگر اصغر اپنے کو اپنے دوستوں کے ذریعہ سے بڑھاتے ہیں تو اپنے

کو آپ بھی بڑھائے یہ کیا ضرورت ہے کہ آپ ان کو گھٹا کر آپس میں رنجش پیدا کیجئے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کون سی اخلاقی تعلیم ہے کہ اگر کوئی شخص دنیا کو دھوکا دیتا ہے تو آپ اس کے دھوکے کو کیوں طشت ازبام کرتے ہیں آپ بھی دنیا کو دھوکا دیجئے۔ مان لیجئے کہ آپ کو معلوم ہے کہ ایک شخص دوسروں سے غزل کہلا کر پڑھتا ہے تو کیا آپ اس کے اس راز کو فاش نہ کیجئے گا بلکہ خود بھی دوسروں سے غزل کہلا کر پڑھئے گا اصل میں اسوقت جو اصغر صاحب کی بابت بحث ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ ایک فریق تو ان کی شہرت پر جاتا ہے دوسرا فریق اپنا ذاتی تجربہ بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر بر ے تجربے کو تم غلط سمجھتے ہو تو اس کا امتحان کر لو آپ کہتے ہیں کہ امتحان انسانیت کے خلاف ہے پھر آخر فیصلہ ہو تو کیسے ہو۔ عجب زبردستی ہے کہ اپنے تجربے پر خاک ڈالو اور جو ہم کہتے ہیں اس کو بلا دلیل مانو۔

ہم اس کو مانتے ہیں کہ اڈیٹر صاحب کو یہ کتاب دیکھ کر تکلیف ہوئی ہوگی لیکن ان کو سرکوب صاحب کی بھی تکلیف کا احساس ہونا چاہئے کہ جس شخص کی قابلیت سے وہ واقف ہوں اس کی نسبت ایسے الفاظ دیکھ کہ وہ گزشتہ اور موجودہ شاعروں سے بہتر ہے کس قدر تکلیف ہوئی ہوگی اور اس تکلیف سے متاثر ہو کر اگر انھوں نے اصغر کا راز کھول دیا تو کیا گناہ کیا۔

اس وقت تک اس کتاب پر آٹھ دس اخباروں اور رسالوں میں میں نے ریویو دیکھے سوائے اڈیٹر نگار کے اور کسی کا ریویو میں نے اس کتاب کے خلاف نہیں دیکھا ممکن ہے جیسے انھوں نے بغیر کتاب کے دیکھے قیاس پر ریویو کر دیا ایسا ہی اور بھی کسی نے کیا ہو لیکن میری نظر سے نہیں گزرا غرض یہ کہ جن لوگوں نے کتاب کے اندر رہ کر رائے قایم کی ہے وہ اس کتاب کے خلاف نہیں ہوئے - ہر انصاف پسند کی یہ رائے ہے کہ اس کتاب نے اصغر کا راز افشا کر کے ملک پر احسان کیا ہے اور ریجا نمایش کرنے والوں کا سد باب کر دیا ہے۔ ان مضامین کے یکجا ہو جانے سے اصغر کی اصلی قابلیت ظاہر کر دینا ہر شخص کے لئے آسان ہو گیا ہے اور لوگوں کو اس کا سبق حاصل ہو گیا ہے کہ کسی شخص کی تعریف کرنے میں اس کو حد سے زیادہ نہ بڑھانا چاہئے۔

سرکوب صاحب خود انسان ہوں یا نہوں لیکن یہ تو اڈیٹر صاحب کو ماننا پڑے گا کہ انھوں نے مداحانِ اصغر کو انسان بنا دیا اس سبب سے کہ جب سے کتاب نکلی ہے اصغر صاحب کی مداحی بند ہو گئی ہے اور اس کی اُمید نہیں ہے کہ کتاب کو دیکھکر کوئی غیرت دار اصغر کی ایسی مداحی کرے جس میں

استادان گزشتہ یا موجودہ کی توہین وتذلیل ہو اور یہی مقصد اُس کے مرتب کرنے کا تھا کہ مداحان اصغر انسان بن جائیں معلوم نہیں اڈیٹر صاحب کس کو اچھا سمجھتے ہیں انسان کو یا انسان گر کو۔

جیسا متعلم ہوتا ہے معلم ویسی ہی تعلیم دیتا ہے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ مداحان اصغر پر انسانیت کا اثر نہیں ہوتا تو غیر انسان بن کر انھوں نے سب کو انسان بنا دیا۔ ہر کام کے نتیجہ پر غور کرنا چاہئے سرکوب صاحب کو جیسی اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی ہے شاید ہی کسی کو ہو کہ ہنگامہ اصغر کو انھوں نے فرو کر دیا اور مداحان اصغر کی زبان بند ہو گئی۔

---

(نگار) اس طویل مراسلہ کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

(۱) سرکوب الہ آبادی نے اپنی کتاب جو "اصغر گونڈوی کی شاعری" کے عنوان سے شایع ہوئی ہے اصغر پر کوئی حملہ نہیں کیا بلکہ خطاب ان لوگوں سے ہے جو ان کی حمایت میں دوسرے شعراء کو بُرا کہتے ہیں۔

(۲) اصغر صاحب واقعی شاعر نہیں ہیں یا یہ کہ اگر ہیں تو بہت کم مشق۔

(۳) سرکوب صاحب بہت بے نیاز شخص ہیں اور باوجود بہترین شاعر ہونے کے وہ اپنے آپ کو شاعر کہلانا پسند نہیں کرتے، اس لئے انھیں اصغر صاحب سے کیا عناد ہو سکتا ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ پہلے میں نے اس کتاب کو بالاستیعاب نہیں پڑھا تھا لیکن دوبارہ جب مراسلہ نگار صاحب کے اصرار پر میں نے اسے پڑھ لیا، تو بھی کسی دوسرے نتیجہ پر نہیں پہونچا۔

اگر معاملہ صرف اصغر کے مداحوں کا تھا (جیسا کہ مراسلہ نگار صاحب لکھتے ہیں) تو پھر اصغر صاحب اور ان کی شاعری کو درمیان لانے کی کیا ضرورت تھی، لیکن چونکہ اصل مقصود تو یہی ظاہر کرنا تھا کہ اصغر کو شعر کہنا نہیں آتا، اس لئے تمام مباحث سے نتیجہ یہی ایک نکالا گیا ہے۔ پھر مجھے اس سے اتفاق نہیں کہ اصغر صاحب اگر شعر اچھا نہیں کہتے تو خواہ مخواہ ان کی شاعری کو سراہا جائے، میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ مداحانِ اصغر، اپنے ممدوح کو اچھالنے کے لئے دوسروں کی توہین وتذلیل کریں اور یقیناً میرے نزدیک یہ امر بھی پسندیدہ نہیں کہ اصغر صاحب (اگر وہ واقعی شاعر نہیں ہیں) اپنے آپ کو شاعر کی حیثیت سے پیش کرنے پر اصرار کریں۔ لیکن یہ تمام باتیں اس کو کیونکر مستلزم ہو سکتی ہیں کہ اصغر کی شاعری کے سلسلہ میں اصغر کی ذات کو سامنے لایا جائے۔

اس سلسلہ میں سرکوب یا کوئی اور نقاد یہ کہہ سکتا ہے کہ جب بحث یہ آن پڑے گی کہ اصغر شعر کہنا جانتے ہیں یا نہیں تو لا محالہ ان کی ذات اس میں شامل ہو جائے گی ــــ یہ توجیہہ بالکل درست ہے لیکن مجھے گفتگو اسی میں ہے کہ اول تو اس بحث کے اُٹھانے کی ضرورت ہی نہیں اور اگر ہو تو اسکے لئے کوئی قوی دلیل موجود ہونا چاہئے ــــ چیلنج قبول نہ کرنا، یا مشاعرہ میں سب کے سامنے غزل نہ کہہ سکنا یا طرح پر غزل کہنے میں پس و پیش کرنا، یہ ایسے دلایل نہیں ہیں کہ اصغر کے غیر شاعر ہونے کے ثبوت میں کوئی وزن رکھ سکیں۔

ایک شاعر کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہر وقت ہر شخص کی فرمایش یا ہر طرح پر شعر کہنے کے لئے طیار ہو جائے، بلکہ میرے نزدیک ایک حقیقی شاعر کبھی اس کی پابندی کر ہی نہیں سکتا، اور جو لوگ اس "دلے برندش" قسم کی شاعری پر قدرت رکھتے ہیں وہ اکتسابی شاعر ہیں اور زیادہ سے زیادہ انھیں "متشاعر" کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے اصغر کے خلاف اس نوع کے دلایل پیش کرنا، میرے نزدیک اُنکی شاعرانہ اہلیت کو اور زیادہ مستحکم کرنا ہے نہ یہ کہ انھیں اُن کے شاعر نہ ہونے کے ثبوت میں پیش کیا جائے۔

یہ ہو سکتا ہے کہ اصغر پُرگو شاعر نہ ہوں اور ان کا دماغ بہت کم شاعری کی طرف متوجہ ہوتا ہو، لیکن سوال یہ ہے کہ جس وقت ان پر شاعرانہ کیفیت طاری ہوتی ہے (خواہ وہ سال میں ایک ہی بار کیوں نہ ہو) تو شعر کیسا کہتے ہیں ــــ اور اس صورت میں زیادہ سے زیادہ ہم یہی کر سکتے ہیں کہ صرف ان کے کلام پر رائے زنی کریں نہ یہ کہ سرے سے ان کے شاعر ہونے ہی کا انکار کر دیں۔ اگر سرکوب صاحب کے پاس کوئی ثبوت اس امر کا ہوتا کہ اصغر نے اس وقت تک جو کچھ کہا ہے وہ فلاں شخص کی فکر کا نتیجہ ہے تو بیشک دوسری بات تھی، لیکن محض چیلنج یا طرح وغیرہ کے جھگڑوں کو سامنے لاکر ایسا حکم لگانا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

اصغر صاحب کا کلام اس وقت تک جتنا شائع ہو چکا ہے اس کے دیکھنے کے بعد ایک شخص حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ وہ شاعر پیدا ہوئے ہیں اور جب وہ کوئی شعر کہتے ہیں تو کسی خاص جذبہ سے متاثر ہو کر کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ کسی شخص کا شاعر پیدا ہونا یا جذبات سے متاثر ہو کر کوئی شعر کہنا اسکو ضروری نہیں قرار دیتا کہ جب وہ کوئی شعر کہے تو اچھا بھی ہو اور اس میں کوئی غلطی نہ پائی جائے، اسلئے بحث کا دائرہ محدود ہو کر صرف اتنا رہجاتا ہے کہ اصغر کا کلام کیسا ہے اور اس پر اگر دیانت دارانہ تنقید کی جائے تو کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔

میں اصغر کی شاعری کے متعلق ایک سے زاید بار اپنی رائے کا اظہار کر چکا ہوں اس لئے اس کے تکرار کی ضرورت نہیں، لیکن مجملاً ومختصراً سلسلۂ سخن میں اس موقعہ پر بھی اتنا ظاہر کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ اصغر صاحب جذباتی شاعر ہیں، فطرت کی طرف سے شاعرانہ دماغ لیکر آئے ہیں، اور جب اپنے تاثرات ظاہر کرنے کے لئے ان کو موزوں الفاظ مل جاتے ہیں تو بے مثل شعر کہہ جاتے ہیں۔ لیکن جب وہ اسمیں کامیاب نہیں ہوتے تو شعر بھی ناقص رہجاتا ہے۔

مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اصغر صاحب کے خلاف یہ ہنگامہ زیادہ تر مذہبی اختلاف کی بنا پر ہے یعنی سرکوب صاحب چونکہ شیعہ پارٹی کے سردار ہیں اس لئے وہ اصغر صاحب کی مخالفت کرتے ہیں جنھوں نے الہ آباد پہونچکر ایک جماعت شیعوں کی سنیوں کے خلاف فراہم کر لی ہے ــــ میں اس باب میں سوائے اظہار افسوس کے اور کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ میرے نزدیک ایک انسان کا بدترین جذبہ یہی ہے کہ وہ اختلاف مذہب کی بنا پر دوسرے انسان کا دشمن ہوجائے اور اگر اس میں کچھ بھی شائبۂ صحت ہے تو میں سرکوب صاحب سے تو نہیں، کیونکہ مجھے ان کی خدمت میں نیاز حاصل نہیں ہے لیکن اصغر صاحب کی بارگاہ میں ضرور عرض کروں گا کہ وہ اپنی انسانیت کو اس نوع کے ذلیل و رکیک جذبہ سے مجروح نہ کریں کیونکہ ایک حقیقی شاعر کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ حقیقی معنی میں انسان بھی ہو اور انسانیت کا اقتضا یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ اختلاف مذہب کی بنا پر کسی کی مخالفت کرے۔

اگر شیعہ جماعت کی طرف سے واقعی کوئی زیادتی ہو، تو بھی اصغر صاحب کو انتقام کی پست سطح پر اُتر آنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو صوفی منش انسان ہیں اس لئے ان سے زیادہ اس رمز کو کون سمجھ سکتا ہے کہ :-

خوش بود فارغ ز بند کفر و ایماں زیستن
حیف کافر مردن و آوخ مسلماں زیستن

---

# دو ادبی شاہکار

# باب الاستفسار

## ایک ادبی بحث

کچھ عرصہ ہوا جناب درد شاہجہانپوری نے اپنی حسب ذیل غزل اشاعت کے لئے میرے پاس بھیجی:-

اُف کہ بربادیِ دل جی سے بھلاتے ہی بنی — پھر تری انجمنِ ناز میں آتے ہی بنی
یاد اب تک ہے وہ نیرنگِ جنوں کا عالم — ہر قدم پر سرِ پرجوش جھکاتے ہی بنی
ہائے اس چشمِ ندامت کے وہ خاموش گلے — شکوۂ جور و ستم دل سے بھلاتے ہی بنی
توبہ تھرا اُٹھی جب سامنے ساقی آیا — بادہ پیتے ہی بنی جامِ اُٹھاتے ہی بنی
رحم کر رحم نہ چھیڑ اب دلِ مغموم کا ذکر — اُف وہ بستی جسے ویرانہ بناتے ہی بنی
آگیا فرق یہ کیوں آج تری فطرت میں — وقتِ حیرت تجھے کیوں سامنے آتے ہی بنی
چیخ اُٹھے، جب غمِ کونین سے دونوں عالم — کچھ سمجھ کر ہمیں یہ بار اُٹھاتے ہی بنی
ہائے مجبوریِ دل یاد کوئی جب آیا — نالہ کرتے ہی بنی اشک بہاتے ہی بنی
پردۂ گل سے کیا کس نے تقاضائے نظر — دھجیاں جیب و گریباں کی اُڑاتے ہی بنی
یاد جب آئی وہ کھوئی ہوئی دنیائے قفس — آگ گھبرا کے نشیمن کو لگاتے ہی بنی

ہر خلش میں تھا کچھ اس رنگ کا اے درد سکوں
آرزومندِ ستم دل کو بناتے ہی بنی

میں نے ان کو جواب میں لکھا کہ غزل خوب ہے لیکن ردیف کا اقتضاء یہ ہے کہ مفعول ہر جگہ مؤنث ہو

اور آپ نے مونث و مذکر دونوں اس ردیف کے ساتھ استعمال کئے ہیں اس لئے مطلع کیجئے کہ اساتذہ کا طرزِ عمل کیا رہا ہے۔

وزؔد صاحب نے جواب میں داغؔ کی ایک غزل لکھ کر بھیجی جس میں واقعی تذکیر و تانیث کی کوئی تفریق نہ تھی، میں نے پھر لکھا کہ ولؔی صاحب سے دریافت کیجئے کہ اساتذۂ لکھنؤ نے اس کی پابندی کی ہے یا نہیں۔ اس کا جواب وزؔد صاحب کی طرف سے یہ ملا:۔

محترمی۔

سلام مسنون۔ تاخیرِ جواب کا باعث میری علالت تھی جناب کا استفسار قبلہ ولؔی صاحب کی خدمت میں پیش کیا تھا وہ فرماتے ہیں کہ "مصدر کی علامت یائے معروف سے بدل کر فصحائے دہلی بولتے ہیں اور مصدر کو بجائے فعل استعمال کرتے ہیں جیسے مٹھائی کھانی تھی لیکن فصحائے لکھنؤ کہتے ہیں کہ مصدر، اسم مذکر ہے اور کوئی اسم مذکر یائے تانیث کی تصریف قبول نہیں کرتا اس لئے مٹھائی کھانا لکھنا چاہئے لیکن فصحائے لکھنؤ کے کلام میں اکثر مثالیں اس کلیہ کے خلاف ملتی ہیں۔

ناسخؔ۔ اگر دہلیز چھونے کی تجھے تعزیر دینی تھی ہمارے ہاتھ بندھوا اپنے دروازے کے بازو سے

اثیرؔ۔ آنکھ اس کو کھولنی بھی دشوار ہوگئی ہے چلئے چمن میں نرگس بیمار ہوگئی ہے

جلالؔ۔ جب اُٹھ کے جاتے کہ دم توڑتے دمِ نزع جو ہونی تھی وہ تمھارے ہی روبرو ہوتی

حضرت داغؔ کا یہ شعر

ذلتِ عشق ہے وہاں عزت شکوۂ آبرو سے کئے نہ بنی

یہاں نہ بنی کے ساتھ بات مقدر مانی جا سکتی ہے مگر

"جب رگ کا خون بن گئی دم پر چاکِ دل کو رفو کئے نہ بنی"

میں مصرعۂ اولیٰ کے ساتھ کوئی لفظ مقدر نہیں سمجھا جا سکتا۔ میری رائے میں یہ مسئلہ زبان سے متعلق ہے اور زبان کے لئے کوئی قاعدہ نہیں۔ تاہم میں حضرت نیاز کی تاہلانہ رائے کو اپنی رائے پر ترجیح دیتا ہوں۔" معلوم کرکے مجھے بھی بتانا"، امید ہے کہ جناب رائے عالی سے سرفراز فرمائیں گے۔

میں نے اپنے پچھلے خط میں جناب سے دریافت کیا تھا کہ آپ موجودہ شعراء میں سب سے زیادہ کس کو پسند فرماتے ہیں غالباً گرامی نامہ تحریر فرماتے وقت آپ کو اس استفسار کا خیال نہیں رہا میں اعادہ کرتا ہوں تغزل میں تنوعِ خیال سے کیا مقصود ہے ہندی شاعری اس نقطۂ نظر سے اُردو شاعری سے بہتر ہے یا کمزور۔ مسائل ذیل کو تغزل سے کیا تعلق ہے اور اگر نہیں ہے تو مستند شعراء کے کلام میں اس قسم کے اشعار کیوں ملتے ہیں۔

جبر و اختیار۔ بے ثباتی دنیا۔ انسان اور اس کی حقیقت۔ شکوۂ فلک۔ شکوۂ بے مہری زمانہ۔ مے و مینا۔

حافظ کا دیوان اس قسم کے مسائل سے بھرا پڑا ہے مولانا شبلی "حیات حافظ" میں ان کو تنوعِ خیال کی مثالوں میں درج کرتے ہیں۔ اُردو شاعری میں بھی متقدمین سے لیکر متاخرین تک سب ہی اس پر کاربند نظر آتے ہیں برخلاف اس کے ہندی غزل میں یہ مسائل دیکھنے میں نہیں آتے۔

مجھ پر جناب کی بڑی نوازش ہوگی اگر شرح و بسط کے ساتھ اس استفسار پر روشنی ڈالیں۔

نیاز کیش
دَرد

---

(نگار) اس خط کے پڑھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر ضرور پہونچا کہ اس محل پر اہل دہلی و اہل لکھنؤ دونوں نے تذکیر و تانیث کے اختلافات سے اعتنا نہیں کیا ہے، لیکن مجھے اطمینان ابھی تک نہیں ہو سکا ہے اور اسلئے میں اساتذۂ فن سے اپیل کرتا ہوں کہ اس باب میں وہ اپنی رائے سے مستفید فرمائیں۔

---

دَرد صاحب کے دیگر استفسارات کا جواب درج ذیل ہے:۔

(۱) موجودہ غزلگو شعراء میں، حسرت موہانی سے زیادہ میں کسی کو پسند نہیں کرتا۔

(۲) تغزل میں تنوعِ خیال کا تعلق صرف انھیں جذبات سے ہونا چاہئے جو عشق و محبت کی دنیا کے لئے مخصوص ہیں اور یقیناً ہندی شاعری اس لحاظ سے زیادہ دلکش ہے اُردو شعراء نے فلسفہ و تصوف وغیرہ

خدا جانے کیا کیا شامل کر کے غزل کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔

جبر و اختیار، شکوۂ زمانہ، بے ثباتی دنیا وغیرہ سب کی غزل میں کھپت ہو سکتی ہے، بشرطیکہ دائرۂ سخن وہی عشق و محبت ہو اور اس کی پوری پابندی اگر کسی نے کی ہے تو وہ صرف سعدیؔ ہے۔ حافظؔ کا ذوق صرف رندانہ غزل گوئی ہے اور ایک بدمست رند جوش و ولولہ میں سبھی کچھ کہہ جاتا ہے، لیکن اس کو معیاری تغزل نہیں کہہ سکتے۔

اُردو فارسی شاعری کا فرق اس باب میں یہ ہے کہ فارسی زبان کی شیرینی و وسعت ہر مسئلہ کو کسی نہ کسی طرح کھینچکر عشق و محبت سے ملا سکتی ہے اور اُردو میں اس کی گنجایش نہیں۔

# نور و نار

## گزارش:۔

پیاری مرے خلوص بھرے آنسوؤں کا نور
میرے جنوں کا راگ، مرے عشق کا سرور
پہونچا ہے دور کے کسی روشن دیار میں
حُسنِ ازل کے دائمی فردوس زار میں
جس سرزمیں کو زہرہ و ناہید ہیں رواں
جا کر جہاں ٹھہرتے ہیں تاروں کے کارواں
اُس سرزمیں سے آئی ہے تو میرے دیس میں
موسیقیوں کی روح ہو عورت کے بھیس میں
آئی ہے تا کہ ٹھہرے یہاں رات کے لئے
میرے غریب دل کی مدارات کے لئے
گو تو ہے ایک پیکرِ محسوس جانِ من
آنکھیں ہیں تیرے حُسن سے مانوس جانِ من
لیکن ترا وجود طلسمِ خیال ہے
تخلیق رنگ و نور کی حدِ کمال ہے
آنکھیں تری بنی ہیں فرشتوں کے زہد سے

---

اے کہکشاں سے اُتری ہوئی پاک نازنیں
ہیں تیرے انتظار میں اُس دیس کے مکیں
جا میرے غمکدے میں نہیں کچھ بجز الم
ہے میری کائنات محبت کا تلخ غم
جا اپنے رنگ و نور سے معمور گھر میں جا
اس غمکدے سے دور "مسرت نگر" میں جا

---

## جواب:۔

اے اُلفت و نیاز کے پابند نوجوان
بہتر ہے ارضِ نور سے یہ تیرا خاکداں

میرے وطن میں عشرتِ جاوید ہے مکیں　　　بے شک جمالِ زہرہ و ناہید ہے مکیں
میرے وطن میں نور کے چشمے بھی ہیں رواں

---

بے فائدہ گروہ "بیابانِ نور" ہے　　　اُس نور زار میں مرا دل غم سے چور ہے
اُکتا گئی ہوں نور سے ہے نار کی تلاش　　　جذباتِ آتشیں کے تپش زار کی تلاش
تیری جنوں نواز نگاہیں عجیب ہیں　　　ڈوبی ہوئی گداز میں آہیں عجیب ہیں
آئی ہوں تیری چاہ میں کتنی دور سے　　　برباد کر نہ مجھ کو عبث ذکرِ نور سے

آغوشِ اشتیاق میں اس طرح لے مجھے
بس اپنے دل کی آگ سے تو پھونک دے مجھے

**عدم**

---

# فراق

مگر مجھے تری قسم
ہنوز تجھ سے دور ہوں

مرے نیازِ عشق سے          بسا ہے آستاں ترا
مری شمیمِ شوق سے          کھلا ہے گلستاں ترا
ہر اک خواب ہے مرا          اگرچہ رازداں ترا

جنوں فشانیاں مری
ترے قریب ہیں بہت
بہت کہانیاں مری
تجھے حبیب ہیں بہت

مگر مجھے تری قسم          ہنوز تجھ سے دور ہوں

اگرچہ جذبِ عشق سے
جہاں ہے تو وہاں ہوں میں
نہاں ہوں کائنات سے
ترے لئے عیاں ہوں میں
تو نور ہے میں طور ہوں
تو راز ہے بیاں ہوں میں

مری طواف گاہ ہے          ہر ایک رہگذر تری
وہیں گیا ہے دل مرا          جہاں گئی نظر تری

مگر مجھے تری قسم
ہنوز تجھ سے دور ہوں

حدود کا نشاں ہو کیوں
سجودگاہِ عام میں
مغائرت کا ذکر کیا
حدیقۃ السلام میں
کچھ امتیازِ "ما و تو"
نہیں ہے اس نظام میں

حریمِ نازِ دوست میں          کچھ احتساب ہی نہیں
جہاں حبیب ہے وہاں          کوئی حجاب ہی نہیں

مگر مجھے تری قسم
ہنوز تجھ سے دور ہوں

تصورات کے خدا
تصورات میں ہے تو!
تخیلات کی دعا
تخیلات میں ہے تو!
مری حیات تجھ سے ہے
مری حیات میں ہے تو

مرے ہر اک خواب میں          ترا خیال ہی تو ہے
مرے ہر اک خیال میں          ترا وصال ہی تو ہے

مگر مجھے تری قسم
ہنوز تجھ سے دور ہوں

روش صدیقی

# فردوسِ خیال

آسماں رات کو تاروں سے بھرا ہوتا ہے　　　ہاں جب ایسے میں کوئی نغمہ سرا ہوتا ہے

میں کسی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہوں

چاندنی رات میں جب مست ہوا چلتی ہو　　　جیسے پنکھا کوئی مخمور پری جھلتی ہے

میں کسی دوسری دُنیا میں چلا جاتا ہوں

گرمیوں کی شب پُرکیف کے سناٹے میں　　　گلفروشوں کی جب آتی ہیں حسیں آوازیں

میں کسی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہوں

فصلِ باراں میں جب آتی ہو گھٹا گھر گھر کے　　　اور جذبات اُبھرتے ہیں دلِ کافر کے

میں کسی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہوں

جب گلی میں کوئی درویش صدا کرتا ہے　　　خوش رہو، میرے میاں! مائیں دُعا کرتا ہو

میں کسی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہوں

راہ میں جب کوئی دوشیزہ نظر آتی ہے　　　اور بُوِ زلف کی چلتے میں سُنگھا جاتی ہے

میں کسی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہوں

کوئی کہتا ہے جب افسانۂ حُسن و اُلفت　　　کھولتا ہے درِ میخانۂ حُسنِ والفت

میں کسی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہوں

یاد جب آتے ہیں عیش و غمِ اُلفت کے دن　　　ہائے وہ عشق کی پُر لطف اذیت کے دن

میں کسی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہوں

دل کے ارمان ہوا کرتے ہیں جب زیرِ غور　　　دل تو جذبات کی شدت سے دھڑکتا ہے اور

میں کسی دوسری دُنیا میں چلا جاتا ہوں

اختر انصاری

# اعترافِ شکست

مجھے اعترافِ شکست ہے
نہ خدا کے واسطے چھیڑ اب

نہ حریفِ لذتِ غم ہوا
نہ خموش رہ کے جفا سہی
نہ رہینِ درد و الم ہوا
نہ ستم سہے، نہ بلا سہی
نہ وفا کا پاس کیا ذرا
نہ ملامتِ رفقا سہی
یہی ننگِ عشق میں کم ہو کیا؟
یہ ادائے لطف و کرم ہو کیا؟
یہ جدید طرزِ ستم ہی کیا؟
نہ خدا کے واسطے چھیڑ اب
مجھے اعترافِ شکست ہے

تری ہر نگاہ بلا اثر
مرے دل پہ اب بھی ہے حکمراں
تری ہر ادائے جمیل کا
یہ دل ہے اب بھی ہوں قدرداں
ترا ہر تبسم دلربا
مرے واسطے اب بھی ہے جانستاں
مگر اے جمیلۂ دلنواز تر
نہ وہ میں ہوں اور نہ وہ آرزو
نہ وہ شوق ہے، نہ وہ جستجو
نہ خدا کے واسطے چھیڑ اب
مجھے اعترافِ شکست ہے

یحیٰی نقوی

# عورت سے خطاب

ایک مشتِ خاک کو جب مل گیا حُسن و شباب
ساغرِ گل میں نظر آئی، محبت کی شراب

نور کے سانچے میں ڈھل کر آئی تصویرِ بہار
اب نظر آنے لگی آغوشِ آدم کامگار

اے کمالِ صنفِ نازک، اے محبت کی پری
تیرے جلوے عیش پرور، تو ہے جنت کی پری

تو بہشتی حور تھی، اب باوفا عورت بنی
روح کی پاکیزگی سے پیکرِ عصمت بنی

آسمانِ آرزو کا تو کوئی سیارہ ہے
تو شہابِ حُسن ہے، یا دلربا مہ پارہ ہے

تیری آمد سے ہوا قائم محبت کا نظام
ورنہ رہ جاتی یونہی تکوینِ عالم نا تمام

تو دلوں کے واسطے لائی ہے صہبائے حیات
موجزن تیرے اشاروں پر ہے دریائے حیات

تیری آنکھوں سے عیاں ہے ایک طوفانِ شباب
شعلۂ سینا ہے تجھ میں، تو ہے جنت کا جواب

تیرے جلووں کی نمائش منظرِ جوشِ جمال
معجزہ قدرت کا، ترکیبِ عناصر کا کمال

تو وہ قوت ہے نہیں جس کی ہے کوئی انتہا
تو ہے ایسی انتہا، جس کی نہیں ہے ابتدا

کہربائی قوتوں سے کام جب لیتی ہے تو
سنگدل کو مسکرا کر موم کر دیتی ہے تو

شعر و موسیقی کے نغمے ہیں تری آواز میں
اک جہانِ دلکشی ہے تیرے ہر انداز میں

مرد کی مونس ہے تو، اور ہمدم و دمساز ہے
اور تکوینِ جہاں کا تو مقدس راز ہے

عیش کی تصویر تو ہے رو کلفت کے لئے
ہے محبت تیرے دم سے، تو محبت کے لئے

آسمانِ عشق کا تو خوشنما مہتاب ہے
تو سراپا ذوقِ انسانی کا دلکش خواب ہے

فطرت واسطی

# بمبئی کے ساحل پر

کارواں در کارواں رنگینیاں
میکدہ در میکدہ کیفِ شراب

حُسن کی رعنائیوں کا ازدہام
چاندنی کی نزہتیں زیرِ نقاب

جلوۂ فطرت کی لالہ کاریاں
شاہدِ معنی کا شیریں پیچ وتاب

ہلکی ہلکی وہ گلابی ساریاں!
ریشمی زرتار پلّو برقتاب

وہ شلوکے جامدانی، نیلگوں!
اُن سے وہ چھنتا ہوا رنگِ شباب!

وہ نگاہیں وہ تڑپتی بجلیاں!
اور وہ شاداب چہرہ وہ شباب!

ہلکا ہلکا سا تبسم زیرِ لب
حُسن کی گستاخیاں وہ بے حجاب!

قامتِ نازک میں ہلکی سی لچک
نرم رو موجوں میں جیسے پیچ وتاب

وہ تمناؤں کے پیکر دلنواز!
"زندگی ہے یا سکون آمیز خواب"

---

شام کی رنگینیاں ہیں بیشمار
چھپ رہا ہے رفتہ رفتہ آفتاب

حُسن واُلفت کا اعادہ ہوچکا
مانگ لے کچھ اے دلِ حسرت مآب

بمبئی کے ساحلوں کو اے شمیم
اک نظر ہی دیکھ لینا ہے ثواب

شمیم نعمانی نیازی

# انقلاب

چل چکا ہے خوابِ ہستی پر فسونِ انقلاب
"خود فراموشی" بدلکر "خود نما" ہو جائیگی

بڑھ رہا ہو شعلۂ مغرب بداماں صد خروش
آتشیں بادِ مخالف جانفزا ہو جائیگی

ڈالدی جائیگی پائے غم میں زنجیرِ شکست
مشکلِ حالات خود "مشکلکشا" ہو جائیگی

روند ڈالا جائیگا اقبالِ ظلمت پاؤں سے
"تیرگی" مٹ کر "جہاں دار ضیا" ہو جائیگی

سر کو ٹکرائیگا دیواروں سے "دورِ انحطاط"
چار سو شانِ ترقی رونما ہو جائیگی!

ٹوٹ جائیگا جہادِ قومیت کا سلسلہ
روحِ مذہب ۔ دیکھنا بے آسرا ہو جائیگی

ٹھوکریں کھائیگا پھر سرمایہ دارِ حیلہ گر
حکمرانی زہر ہے، دولت "سنکھیا" ہو جائیگی

زندگی کی کشمکش سے ہوگی تکمیلِ وجود
"شامِ غربت" صبحِ عیشِ جانفزا ہو جائیگی!

خود بخود فطرت پہ تب گویا شباب آجائیگا
کروٹیں لیتا ہوا پھر "انقلاب" آجائیگا

اختلاطِ مشرق و مغرب میں وقفہ تا بکے
دیکھنا اُڑ جائیگی مذہب پرستی ایکدن

حورِ جنت اور انساں کے تقدس کا خیال
لوگ سمجھیں گے اسے ظلمت پرستی ایکدن

عقل پست و فہم پست، انسانکا سوز و ساز پست
دولتِ اسلاف ہو جائیگی سستی ایکدن!

برق کی ہلکی سی رَو اسکو جلا دیگی کبھی
یا سراپا برق بن جائیگی ہستی ایکدن

ہے اُمیدم جستجوئے "تازہ ویرانی" مجھے
عرش کے تارے دکھا دے میری حیرانی مجھے

شمیم نعمانی نیازی

# جنوری ۳۵ء کیلئے

## حسب ذیل عنوانات پر مقالے درکار ہیں

(۱) دہلی اور لکھنؤ اسکول کی شاعری پر [illegible] کی خصوصیات

(۲) دونوں اسکولوں کے اکابر اور ان کا فرق مدارج

(۳) فن اور زبان کی حیثیت سے دونوں کا مرتبہ

(۴) لکھنؤ اسکول پر دہلی کا اثر

(۵) دہلی اسکول پر لکھنؤ کا اثر

(۶) دونوں اسکولوں کی غزلگوئی پر تفصیلی تبصرہ

(۷) لکھنؤ اسکول کے تین بہترین شاعروں کے ۲۰، ۲۰ شعر

(۸) دہلی اسکول کے تین بہترین شاعروں کے ۲۰، ۲۰ شعر

(۹) منظوم افسانے یا مثنوی لکھنؤ اسکول میں

(۱۰) منظوم افسانے یا مثنوی دہلی اسکول میں

(۱۱) دکن اور اُردو شاعری (اسوقت تک تمام ادوار پر تبصرہ)

(۱۲) پنجاب اور اُردو شاعری (اسوقت تک تمام ادوار پر تبصرہ)

(۱۳) تذکرہ نگاری کی حیثیت سے لکھنؤ اور دہلی کی خدمات

(۱۴) دونوں اسکولوں کے کارنامے رباعیات مرثیہ قصیدہ و نعت میں

(۱۵) دولت مغلیہ کے انحطاط کا اثر دہلی کی شاعری پر

(۱۶) شاہان اودھ اور لکھنوی شاعری

(۱۷) دہلی اور لکھنوی شاعری میں اخلاقی و مذہبی عنصر

(۱۸) شاعری کے لحاظ سے لکھنؤ کا دور زریں

(۱۹) شاعری کے لحاظ سے دہلی کا دور زریں

(۲۰) لکھنؤ اسکول کا سب سے پہلا شاعر جس نے دہلی کا تتبع کیا

(۲۱) دہلی اسکول کا سب سے پہلا شاعر جس نے لکھنؤ کا تتبع کیا

(۲۲) لکھنؤ اور دہلی کے وہ شعرا جنھوں نے ملک و قوم کو کوئی خاص پیغام دیا

(۲۳) کیا دہلی اسکول رو بہ انحطاط ہے؟ اور کیوں

(۲۴) کیا لکھنؤ اسکول رو بہ انحطاط ہے؟ اور کیوں

(۲۵) رامپور کا تعلق دہلی اور لکھنؤ اسکولوں سے

(۲۶) حیدرآباد اور لکھنؤ و دہلی اسکول کا اس سے تعلق

(۲۷) کیا لکھنؤ اسکول نے کلکتہ میں بھی شاعری کو متاثر کیا؟

(۲۸) کیا لکھنؤ اسکول میں اصلاح کی ضرورت ہے؟ اگر ہے تو کیا

(۲۹) کیا دہلی اسکول میں اصلاح کی ضرورت ہے؟ اگر ہے تو کیا

(۳۰) مستقبل میں آپ کو اُردو شاعری سے کیا توقعات ہیں؟

(۳۱) دونوں اسکولوں کے وہ شعرا جنھوں نے قدامت کو ترک کر کے کسی ابداع و اختراع سے کام لیا

(۳۲) لکھنؤ اور دہلی کے ریختی اور ہزل گو

(۳۳) لکھنؤ اور دہلی کی خواتین جنھوں نے شاعری میں نمایاں حصہ لیا۔

(۳۴) لکھنؤ اسکول کے مختلف ادوار اور ہر دور کے بہترین شاعر

(۳۵) دہلی اسکول کے مختلف ادوار اور ہر دور کے بہترین شاعر

(۳۶) آگرہ اور دہلی کا شاعرانہ تعلق

نوٹ:- لکھنؤ اور دہلی کی شاعری سے مراد وہ تمام شعراء ہیں جو یہاں کی شاعری سے متاثر ہو کر اسی رنگ میں شعر کہتے ہیں۔ اس کے لئے کسی خاص جگہ کا باشندہ ہونے کی شرط نہیں ہے۔

# فہرست مضامین مجموعۂ استفسار و جواب

(۱) غوازی مصر حشیشیون۔ اخوان الصفا (۲) گریۂ جنین (۳) قمری مہینے (۴) بوہرہ (۵) اصطلاحات
تصوف کا ترجمہ (۶) ابو العلاء المعری (۷) عبد اللہ پاشا فکری (۸) نور جہاں کا ایک شعر (۹) فن کاغذسازی (۱۰) عرب کا
بازار بردہ فروشی (۱۱) نظام شمسی کا آفتاب (۱۲) اقسام عالم جبر و اختیار (۱۳) ہلالی پرچم (۱۴) سورج کا وقت طلوع
و غروب بڑا نظر آنا اور کم گرم ہونا (۱۵) بالشویزم (۱۶) باب و بہار (۱۷) نباتات کا تنفس (۱۸) جراحی اور مسلمان (۱۹) خواب
کی حقیقت اور تعویذ وغیرہ (۲۰) لفظ دَر کا بالتشدید استعمال (۲۱) دستوریت (۲۲) بند دق۔ بارود۔ محکمۂ آبکاری (۲۳)
بحر مردہ (۲۴) نامہ بر کبوتر (۲۵) یورپ کی وسیع ترین زبان (۲۶) سعد بن وقاص کا مزار (۲۷) معاد و خلود و طبعیات
کے زاویۂ نگاہ سے (۲۸) اجراء اخبارات کی تاریخ (۲۹) عالم خیال اور رشک و رقابت (۳۰) خواتین ترکی اور تعلیم
(۳۱) نیستی سے ہستی کا امکان، درس نظامی کی تاریخ (۳۲) طبقۂ نسواں اور غزل گوئی (۳۳) برج بابل (۳۴) طبقۂ
فاسسٹ کی وجہ تسمیہ (۳۵) آفتاب کے داغ (۳۶) سامری کون تھا (۳۷) کیا بدوح خدا کا نام ہے (۳۸) نوٹ
کے اجراء کا فائدہ (۳۹) ممی کے پستہ قد محسوس ہونے کا سبب (۴۰) چند الفاظ کی تحقیق (۴۱) باغ ارم کی حقیقت (۴۲)
فلسفۂ محبت (۴۳) متنبی کی وجہ تسمیہ (۴۴) سیم تلغراف (۴۵) میقات حج (۴۶) بندقیہ کی حقیقت (۴۷) طبقۂ متاولہ (۴۸)
اصحاب کہف (۴۹) بھوت پریت (۵۰) فلسفۂ اجتماع (۵۱) جان بل (۵۲) کس کا شعر ہے (۵۳) سال کبیسہ حساب
گرگوری میں (۵۴) انڈیا آفس لائبریری (۵۵) سالویشن آرمی (۵۶) ہار کا سبب (۵۷) عین الزماں طرابلسی (۵۸)
تطابق سنہ ہجری و عیسوی (۵۹) کرامات غوث الاعظم (۶۰) حافظ شیرازی اور تیمور کی ملاقات (۶۱) چند الفاظ کے
معنی (۶۲) طاعت و جزا کی تمنا (۶۳) داغ و امیر (۶۴) الپ ارسلان (۶۵) معجزہ و کرامات سے انکار (۶۶)
صدور محال کا امکان (۶۷) پردہ اور تعلیم نسواں (۶۸) مریخ کی حقیقت (۶۹) ایران کا صفوی خاندان اور
قاجاری حکومت (۷۰) منصور حلاج (۷۱) آنکھ ور چال کی تشبیہ (۷۲) معجزہ و کرامات (۷۳) آنسہ می کا شعر منثور (۷۴)

گریۂ معصوم (۷۵) چند اصطلاحات کا ترجمہ (۷۶) ابو العتاہیہ کے متعلق چند سوالات (۷۷) فرقۂ معتزلہ کے مختلف
فرقے (۷۸) ایک برہم مستفسر کے چند استفسارات (۷۹) کھدر، جن، تعویذ، اُردو لغت (۸۰) بت غالیہ مو (۸۱) اسمائے نجوم
(۸۲) بروج اسمار کی حقیقت (۸۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۸۴) ہسپانیہ و اُندلس (۸۵) حکومت مصر (۸۶) اسماعیلیہ
مذہب (۸۷) اعداد متحابہ (۸۸) ادبیات (۸۹) ستاروں کی تعداد (۹۰) بوقلموں (۹۱) کلام مسجع (۹۲) علی محمد باب (۹۳)
مذہب و عقل (۹۴) طوفان نوح (۹۵) دیباچہ کی اصلیت (۹۶) رامائن و مہابھارت (۹۷) ابدالی اور درانی (۹۸)
قلعۂ گوالیار (۹۹) سید جلال (۱۰۰) خلفائے عباسیہ مصر (۱۰۱) ہنولا اور اجرام فلکی (۱۰۲) مرزا عبد القادر بیدل (۱۰۳)
یخ فروش نیشاپور (۱۰۴) تشبیہات چشم (۱۰۵) عرب میں گودنے کا رواج (۱۰۶) دیبل کی جائے وقوع (۱۰۷) طبقۂ نسوان
اور تعلیم (۱۰۸) چند اصطلاحات کا ترجمہ (۱۰۹) شاعری کی بعض اصطلاحیں (۱۱۰) عربی میں تقسیم علوم (۱۱۱) حقیقت و
مجاز (۱۱۲) عالم یقین و عالم جبروت (۱۱۳) چند اصطلاحات شاعری (۱۱۴) صلوات الوسطیٰ (۱۱۵) ظفر کا غیر مطبوعہ کلام
(۱۱۶) اوزون فردوسی (۱۱۷) تانا شاہ (۱۱۸) تھیا سوفکل سوسائٹی (۱۱۹) ٹی چری (۱۲۰) فیروزہ حصار (۱۲۱) برہمو سماج
(۱۲۲) مستنا پور (۱۲۳) اڑھائی دن کا جھونپڑا (۱۲۴) مثنوی مولانا روم کا ایک شعر (۱۲۵) پرانا قلعہ و داتا گنج لاہوری (۱۲۶)
تغزل اور اصطلاح صوفیہ (۱۲۷) منصور حلاج اور غرقابی فرعون (۱۲۸) بعض الفاظ کے معنے (۱۲۹) کس کا شعر ہے۔
(۱۳۰) لیکاڈس و کیخسرو (۱۳۱) طاؤد پیازہ کی قبر (۱۳۲) میر شیر علی افسوس (۱۳۳) کیا زیب النساء کے شعر ہیں (۱۳۴)
فری میسن کیا ہے (۱۳۵) الف لیلہ (۱۳۶) شیخ بدر عالم شیخ بایزید (۱۳۷) زبان اُردو کی ابتداء، سہرا (۱۳۸) عشق محبت
(۱۳۹) دوسرے کروں میں آثار حیات (۱۴۰) اسلام کے متفرق فرقے اور فرقۂ اعتزال (۱۴۱) انگل سام (۱۴۲) استعار
کی شاعری (۱۴۳) امیر دوست محمد خاں (۱۴۴) حافظ کے دو شعر (۱۴۵) ہم اسد اللّٰہم و ہم اسد اللّٰہیم (۱۴۶) فرقۂ اسماعیلیہ
(۱۴۷) ابن رشد و شیخ الرئیس (۱۴۸) ابو الفضل کی قبر اور غالب کا ایک شعر (۱۴۹) عرفی اور شاہزادہ سلیم (۱۵۰) زحل ارانوس
نپتون (۱۵۱) عمر انسانی (۱۵۲) سنبتی تھانیسری (۱۵۳) عہد اسلام کے سکے (۱۵۴) سرطان (۱۵۵) ملکۂ جین (۱۵۶)
سورۂ فاتحہ (۱۵۷) ہالہ اور مد و جزر (۱۵۸) مونٹ کارلو (۱۵۹) حالی کا ایک شعر (۱۶۰) نظریۂ تکہرب (۱۶۱) انسولین۔
(۱۶۲) ارتقائے انسانی کی دوسری منزل (۱۶۳) قصر الحمرا (۱۶۴) بعض اصطلاحات کا ترجمہ (۱۶۵) ارسطو کا مدفن
(۱۶۶) یاجوج ماجوج (۱۶۷) مثنوی کا ایک شعر (۱۶۸) ہندی اور عربی شاعری (۱۶۹) نیو پلوٹنزم (۱۷۰) بیدل کے
بعض اشعار (۱۷۱) مثنوی کا ایک شعر (۱۷۲) اپریل فول (۱۷۳) مشتری (۱۷۴) امریکہ کی دولت۔

# نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہوتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہیے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (تے)
بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۶ | فہرست مضامین نومبر ۱۹۳۴ء | شمارہ ۵

ملاحظات ———— ۲
ہماری عورتوں کا پردہ ———— محمد اعظم خاں ایم-اے ———— ۹
بدمعاش ———— سید محمد احسن بی-اے ———— ۲۰
مکتوبات نیاز ———— ۳۲
مصطفےٰ کمال کی زندگی کے چند دلچسپ اوراق ———— ۳۷
بیرگ کا بروگ ———— ۴۹
سلاطین سلف ———— ہوشؔ بلگرامی ———— ۵۶
فصاحت لکھنوی کی اصلاحیں ———— ۶۰
سید محمد میر سوزؔ ———— ۶۷
منظومات ———— اخترؔ، سروپ رانی نگارؔ، عدمؔ ———— ۶۹

# نگار

اڈیٹر:— نیاز فتحپوری

| جلد ۲۶ | نومبر ۱۹۳۴ء | شمارہ ۵ |
| --- | --- | --- |

# ملاحظات

## علم و یقین —— اعتقاد و مذہب

آپ روز سورج کو طلوع کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، جتنا وہ افق سے بلند ہوتا جاتا ہے اس کی حرارت کو زیادہ محسوس کرتے جاتے ہیں، پھر آہستہ آہستہ وہ آپ کے سر سے گزرتا ہوا دوسری سمت کی طرف ڈھل جاتا ہے اور رفتہ رفتہ نگاہوں سے غائب ہو جاتا ہے — یہ کیا ہے؟ — آپ اسے واقعہ کہتے ہیں۔ کیوں؟ — اس لئے کہ آپ کا مشاہدہ ہے، آپ اپنے حواس کے ذریعہ ایسا محسوس کرتے ہیں اور متواتر و پے در پے اتنی مرتبہ محسوس کر چکے ہیں کہ اگر کوئی شخص آپ سے آکر یہ کہے کہ آج آفتاب نے طلوع نہیں کیا، یا یہ کہ طلوع کرنے کے بعد غروب نہیں ہوا تو آپ اسے جھوٹا کہدیں گے اور آپ باہر نکل کر اسکی تصدیق بھی نہیں کریں گے — انسان میں جو یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کا نام یقین ہے۔ اور یقین بھی ایسا جس کے لئے کسی برہان و دلیل کی حاجت نہیں۔

انسان کی زندگی پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک سلسلہ ہے بے شمار "لمحاتِ احساس" کا یہاں تک کہ اگر آپ اس کو "احساسِ مسلسل" کہدیں تو بیجا نہ ہوگا، لیکن "احساسِ محض" بیکار ہے اگر دنیا میں "محسوسات" کا وجود نہ ہو، اس لئے انسان فطرتاً مجبور ہے کہ وہ اپنے "ذوقِ احساس" کو پورا کرنے کے لئے محسوسات کا مطالعہ کرے، انسان فطرتاً سکون کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے، اور سکون نام ہے صرف "یقین" کا - ریب و شک، ایک بے چینی ہے، ایک اضطراب ہے اور انسان اس الجھن کے دور کرنے پر قدرت کی طرف سے مجبور ہے - اس لئے اگر اس کے "احساسات" مطمئن نہیں ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ "سکونِ یقین" کی منزل سے ناآشنا ہے - اور "احساس" کا اطمینان اگر ہو سکتا ہے تو صرف محسوسات کی جستجو کے بعد کسی نتیجہ پر پہونچنے سے -

---

عام طور پر محسوسات کی دو قسمیں بتائی جاتی ہیں، ایک محسوساتِ خارجی، دوسرے محسوساتِ ذہنی یعنی ایک وہ جو خارج میں موجود ہیں جیسے درخت پتھر پانی وغیرہ اور دوسرے جن کا بظاہر وجود نہیں پایا جاتا لیکن ہم اسے محسوس کرتے ہیں، جیسے گرمی، سردی وغیرہ - مگر میرے نزدیک یہ تقسیم صحیح نہیں کیونکہ محسوسات جتنے بھی ہیں تمامتر خارجی ہیں، اور جن کو "ذہنی" کہا جاتا ہے وہ بھی کسی نہ کسی واسطہ سے محسوساتِ خارجی ہی سے پیدا ہوتے ہیں - یقیناً گرمی سردی کوئی مادی محسوس چیز نہیں لیکن جن اسباب کے ماتحت گرمی یا سردی محسوس کیجاتی ہے وہ "خارجی" محسوسات سے باہر نہیں - بیشک محبت و نفرت کا احساس بالکل ذہن سے متعلق ہے، لیکن کیا وہ چیزیں جن سے یہ جذبات متعلق ہیں خارج میں موجود نہیں ؟ - مادہ اور اعراض دو علحدہ علحدہ چیزیں بتائی جاتی ہیں، درانحالیکہ عرض کا وجود مادہ سے کہیں علحدہ نہیں - پھول ہے تو رنگ بھی ہے، بو بھی ہے، وہ نہیں تو یہ بھی نہیں،

---

یقین کے کئی مراتب و مدارج ہیں - ہم دور سے دھواں اٹھتا ہوا دیکھتے ہیں اور یقین کر لیتے ہیں کہ وہاں آگ کا وجود ہے، لیکن آگ کی نوعیت کیا ہے، اسکی خبر نہیں ہوتی، ہم چلکر وہاں جاتے ہیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ کسی نے خس و خاشاک جمع کر کے اس میں آگ لگادی ہے - ہم وہاں سے واپس آتے ہیں، لوگ پوچھتے ہیں کہ آگ کیسی ہے، ہم بتا دیتے ہیں، وہ سنکر مطمئن ہو جاتے ہیں، لیکن کیا ان کا یہ اطمینان اس درجۂ یقین کو پہونچ سکتا ہے جو ہمیں حاصل ہے - کیا یہ ممکن نہ تھا کہ ہم کہدیتے کسی نے لکڑی جلائی ہے اور وہ یقین کر لیتے -

ہمیں ایک گھڑا مٹی کا نظر آتا ہے، اس کی تازگی دیکھکر سمجھ لیتے ہیں کہ اس میں پانی ہے، قریب جاکر پانی کو دیکھتے ہیں تو یقین ہو جاتا ہے، لیکن جب گلاس میں پانی لیکر پی لیتے ہیں تو یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ سرد ہے یا گرم -

غور کیجئے کہ یقین کے ان تمام مدارج میں "مطالعۂ محسوسات" کو کتنا دخل ہے - اگر خود اپنی سعی و کوشش سے کام لیکر خود اپنی عقل و احساس کو ذریعہ بنا کر کوئی علم حاصل کیا ہے تو وہ ایک "یقین ذاتی" ہے جسے کوئی قوت

متزلزل نہیں کر سکتی، لیکن اگر ہم نے صرف دوسروں کی زبانی سُنکر کسی بات کو باور کر لیا ہے تو وہ محض "یقین روایتی" ہے جس میں ریب و تزلزل کا زیادہ امکان ہے اور تصدیق قلب کا بہت کم۔

تصدیق کی یہ منزل، سکون نفس کا یہ مرتبہ از خود حاصل ہونے والی چیز نہیں، بلکہ پیدا ہوتا ہے، محسوسات و موجودات کے مطالعہ سے۔ پھر یہ مطالعہ جتنا غایر ہوگا، اتنا ہی بلند یہ مرتبہ ہوگا اور یہی وہ چیز ہے جس نے دنیا میں علوم و فنون کی بنیاد ڈالی اور انسان کے اقتدار کو تمام روئے گیتی پر قائم کر کے اسے خلافتِ الٰہی کی منزل سے روشناس کیا ——

آئیے ذرا مدارج خلافت پر بھی غور کر لیں۔

میں ایک وزنی گیند ہوا میں اُچھالتا ہوں، وہ فوراً نیچے آجاتی ہے۔ بار بار پھینکتا ہوں وہ بار بار زمین پر آکر گرتی ہے۔ میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ بھاری چیز کبھی اوپر نہیں ٹھہر سکتی — دوسرا شخص اس پر زیادہ غور کرتا ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ وزن خود کوئی چیز نہیں ہے بلکہ نام ہے صرف کشش زمین کا۔ تیسرا ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے اور سوچتا ہے کہ زمین کی کشش کا مقابلہ کیونکر ہو سکتا ہے، یہاں تک کہ وہ غبارہ اور ہوائی جہاز بنا کر اس مقاومت میں کامیاب ہو جاتا ہے — آج دنیا کا تمام ہنگامۂ ترقی اسی مطالعہ پر قائم ہے اور اسی یقین کی سرزمین سے ارتقاء کے چشمے پھوٹے ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ انسان کو خود اپنے ملک کی بھی خبر نہ تھی آج وہ نہ صرف کرۂ ارض بلکہ فضا میں تیرنے والے کروڑوں اور اربوں میل دور کے کروں کا حال معلوم کر چکا ہے۔ یہ سب کرشمے ہیں یقین کے جو نتیجہ ہے علم کا۔

ایک شخص سوال کرتا ہے کہ اس تمام جد و جہد سے فایدہ؟ جبکہ انسان کو بہرحال فنا ہونا ہے۔ سوال ممکن ہے صحیح ہو، لیکن استدلال غلط ہے۔ انسان انفرادی حیثیت سے فانی ہے، لیکن اجتماعی حیثیت سے اس کو بقا و دوام حاصل ہے۔ انسان کی موجودہ صورت بدل سکتی ہے، اسکے عادات و اطوار میں تغیر ہو سکتا ہے، اس کے افراد یقیناً فنا ہوتے جائیں گے، لیکن انسان بہرحال باقی رہیگا۔ کرۂ ارض پر نہ سہی، کسی اور کرہ میں — انسان فطرت کی تخلیق کا مظہر آخریں ہے اور اگر آفرنیش کو فنا ہے تو انسان کو بھی ہے ورنہ نہیں۔ اس لئے انفرادی نقطۂ نظر سے جد و جہد پر گفتگو کرنا مقتضائے فطرت کے خلاف ہے، قدرت کی مرضی کے منافی ہے۔

آپ سمندر کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک نامتناہی سلسلہ ہے موجوں کا، درانحالیکہ ہر موج اپنی جگہ اُٹھکر فنا ہو جاتی ہے، پھر کیا سمندر کا وجود ان موجوں کے فنا ہونے سے ختم ہو جاتا ہے، جو موج اس لمحہ میں نمودار ہو کر فنا ہوئی ہے اسے پھر نہیں اُبھرنا، لیکن کیا اس سے سمندر کو کوئی نقصان پہونچ سکتا ہے۔ بالکل یہی حال عالم انسانی کا ہے کہ اس کے افراد مٹتے جاتے ہیں لیکن وہ علیٰ حالہٖ اپنی جگہ قایم ہے اور ہمیشہ قایم رہے گا۔

دُنیائے مذہب کے اصول مگر کچھ اور ہیں۔ وہاں علم ویقین کا نام اعتقاد ہے اور اسکی تعلیم "کل شیئٍ حادث" (ہر چیز فنا ہونے والی ہے) کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے - مذہب کے نزدیک انسان نہایت حقیر، صدر درجہ بے بس و بیکس اور مجبور ولاچار چیز ہے، اس کی کوئی حرکت اور اس کا کوئی خیال اس کے اختیار میں نہیں - جو چاہتا ہے خدا کرتا ہے اور جو چاہے گا کرے گا، انسان کا کام صرف سرِ عجز جھکا دینا ہے اور آنکھ بند کرکے، ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ کر دوسری دُنیا کے اس عمیق وتاریک غار کی طرف چلا جانا جس کا علم صرف اس قدر حاصل ہے کہ "کچھ معلوم نہیں"۔

مذہب کہتا ہے کہ انسان دُنیا میں صرف اس لئے آیا ہے کہ وہ عبادت کرے اور خدا کی پرستش میں رات دن مصروف رہے - لیکن اس سے پوچھئے کہ خدا کیا، اور اسکی پرستش کیوں ؟ تو وہ کہتا ہے کہ خدا کی حقیقت پوشیدہ ہے، کسی کی قدرت نہیں کہ اس کو سمجھ سکے اور عبادت اس لئے کہ اس نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے اُس نے جس کا حال معلوم نہیں - الغرض مذہب کے تمام عقاید کا عنصرِ عظیم "عدم علم" ہے اور اسی نہ سمجھ سکنے، نہ جان سکنے کا نام وہاں یقین رکھا جاتا ہے -

پھر اگر یہ "عدم علم" کوئی مستقل تعلیم ہوتی تو بھی ایک بات تھی، لیکن چونکہ انسان کی فطرت جستجو پسند ہے اور وہ اسوقت تک چین سے نہیں بیٹھتا جب تک اس کی یہ خلش دور نہ ہو، اس لئے مذہب اس پر بھی قایم نہ رہ سکا اور باوجود اس کے کہ وہ خود خدا کو نہیں سمجھ سکا تھا، لیکن لوگوں کو اس نے سمجھایا، باوصف اس کے کہ وہ دوسری دنیا سے بیخبر تھا لیکن دوسروں کو اس سے آگاہ کیا - اور اس شان سے اس اعتماد ویقین کے ساتھ کہ یہ سب کچھ گویا حقایق ثابتہ میں شامل ہے اور محسوسات ظاہری سے متعلق -

چنانچہ وہی جس کی کُنہ حقیقت کو وہ نہیں پا سکتا تھا دفعتہً خفا سے ظہور میں آجاتا ہے اور اس انداز سے کہ وہ کرسی پر بیٹھا ہوا ہے، چاروں طرف اس کے خدام (ملائکہ مقربین) حضوری میں حاضر ہیں، وہ اپنے خاص خاص بندوں سے ہمکلام ہوتا ہے، جس سے خوش ہوتا ہے اس کو باغوں میں بھیجدیتا ہے، جس سے برہم ہوتا ہے اسکو آگ میں جھونک دیتا ہے، وہ سُنتا ہے لیکن کان نہیں رکھتا، وہ دیکھتا ہے مگر آنکھوں سے نہیں وہ بولتا ہے مگر زبان سے نہیں - الغرض وہ دنیا ہی کے بادشاہوں کی طرح ایک جلیل القدر بادشاہ ہے اور اسپر کوئی حکمراں نہیں وہ بے نیاز مطلق ہے لیکن ہماری عبادتوں کی پرواہ ضرور کرتا ہے، وہ احتیاج سے بلند وارفع ہے، لیکن ہمارے عجز ونیاز کی اس کو ضرورت ہے - وہ کسی چیز سے متاثر نہیں ہوتا لیکن نافرمانی سے اسکو غصہ یقیناً آتا ہے وہ بے انتہا رحم وکرم والا ہے مگر گناہگار کو بغیر آگ میں جھونکے مانتا نہیں -

وہ موجود ہے لیکن زمان و مکان سے بے نیاز۔ وہ ہر لمحہ میں قدیم ہے، لیکن لمحہ فنا ہوجاتا ہے اور وہ نہیں۔ وہ عادل ہے لیکن عدل کا پابند نہیں جس کو چاہے بخش دے اور جسے چاہے سزا دے۔ علم کہتا ہے کہ یہ اجتماع اضداد کیسا، مذہب کہتا ہے کہ خدا کی مرضی، علم کہتا ہے کہ یہ تمام باتیں کیونکر معلوم ہوئیں، مذہب کہتا ہے، خدا کے برگزیدہ بندوں کے کہنے سے۔ علم کہتا ہے کہ اس برگزیدگی کا علم کیونکر ہوا، جواب ملتا ہے کہ انھیں کے قول سے۔ علم سوال کرتا ہے کہ کیا انسان بغیر تحقیق کئے ہوئے محض دوسروں کے کہنے پر اپنے نفس کو مطمئن کر سکتا ہے، جواب دیا جاتا ہے "کیوں نہیں"۔ علم پوچھتا ہے کہ کیا یقین، اسی کا نام ہے، مذہب کہتا ہے "بیشک"

مذہب کی تعلیم ہے کہ یہ دنیا جس میں انسان زندگی بسر کرتا ہے، یعنی محسوسات کی یہ ٹھوس دنیا، بالکل عارضی چیز ہے اور محض ایک پرتو ہے اس دوسری دنیا کا جو ہمیشہ قائم رہنے والی چیز ہے — مگر وہ دوسری دنیا کیسی ہے؟ — اس میں بہشت ہے، دوزخ ہے، دیدار خداوندی ہے یا اُس سے مہجوری — باغ و راغ ہیں، حور و قصور ہیں، فواکہ و اثمار ہیں دودھ اور شہد کی نہریں ہیں، کوئی فکر نہیں ہر وقت آزادی سے کھائیے پیو اور وہ سب کچھ کرو جس سے اس دُنیا میں باز رکھا جاتا ہے — یا پھر دہکتی ہوئی آگ کے غار ہیں، اژدہے ہیں، بچھو ہیں، خون و پیپ ہے، چیخ ہے، کراہ ہے — پوچھئے:-

کیا وہاں رقص و سرود بھی ہے — کیوں نہیں درختوں پر چڑیاں چہچہا رہی ہوں گی۔

کیا وہاں موٹر، ہوائی جہاز، ریل بھی ہے — بیشک ہے، انسان نے کسی جگہ پہونچنے کا خیال کیا اور فوراً پہونچ گیا یعنی

آنکھ کی بند ہوا کوچۂ جاناں پیدا

کیا وہاں "زہرۂ صبح و جام بلور" بھی میسر ہے — اس کا کیا ذکر کیونکہ وہاں تو ہر وقت صبح صادق ہی رہیگی اور جام بلور کیا معنی، وہاں تو دنیا کے قیمتی سے قیمتی جواہر سنگریزوں کی طرح بکھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ — بالکل درست لیکن پوچھئے کیا وہاں انسان کو کسی شے کے حصول کے لئے جد و جہد کرنا پڑے گی، کیا یہ دھڑکا لگا رہیگا کہ ممکن ہو فلاں چیز ہم کو نہ ملے یا ملنے کے بعد ہاتھ سے نکل جائے۔ اس کا جواب بالکل نفی میں ملیگا — پھر تماشہ یہ ہے کہ فطرت انسانی تو بدستور اُس دنیا میں بھی یہی رہیگی، لیکن لذت و الم کا مفہوم بالکل بدل جائے گا۔ گویا ان کا وجود احساس انسانی اور اس کی فطرت سے علٰحدہ قائم ہے!

---

اب ذرا اور گہرائی کی طرف جائیے اور غور کیجئے کہ مرنے کے بعد انسان کا ایک زمانۂ غیر معلوم تک عالم برزخ میں رہنا اور پھر بال سے زیادہ باریک تلوار سے زیادہ تیز "پل صراط" پر چلکر دوزخ یا جنت تک پہونچ جانا کیا غایت رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مصلحت خداوندی ہر جگہ اور ہر بات میں کارفرما ہے۔ لیکن موت کے بعد انسان کا تمام سخت

وہ مراحل سے گزر کر عذاب یا ثواب کی دائمی زندگی بسر کرنا کس نتیجہ کے لئے ہے۔ بہشت و دوزخ سے کسی کو لوٹ کر پھر دنیا میں جاتا نہیں کہ وہاں کے لوگوں کو ان کے حالات معلوم کرکے تخویف یا ترغیب ہو۔ پھر خدا کی اس میں کیا مصلحت ہو سکتی ہے کہ وہ انسان کو زندگی دوام عطا کرکے بقا میں اپنا شریک تو بنا لیتا ہے، لیکن دنیا والوں کے لئے مایۂ عبرت و بصیرت بنانے کے لئے طیار نہیں۔

---

صدیاں گزر گئیں کہ مذہب کی یہ تعلیمات بدستور اسی طرح اپنے لغوی معنی کے لحاظ سے دنیا میں کارفرما رہیں، یہاں تک کہ علم نے بڑھکر اسکو چیلنج دیا۔ ظاہر ہے کہ مشاہدات کا جواب قیاسات سے اور "یقینیات" کا مقابلہ "ممکنات" سے نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے ایک گروہ ایسا پیدا ہوا جس نے تلقینیات مذہب کے ظاہری معنی سے عدول کرکے انکا ایک باطنی مفہوم پیش کیا اور بتایا کہ یہ صرف تشبیہات و استعارات ہیں، لوگوں کو متاثر کرنے کیلئے خطیبانہ انداز بیان ہے، لیکن افسوس ہے کہ وہ مراسم و شعائر میں کوئی تبدیلی نہ پیدا کر سکا اور اس جواب کی حقیقت جان چھڑانے سے زیادہ اور کچھ نہ رہی علم کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ پیچھے مڑکر دیکھتا، سیلاب کی طرح اٹھا اور درمیان کے تمام چٹانوں کو کاٹتا ہوا چلا گیا۔ جن چیزوں کو ساتھ دینا تھا وہ ساتھ چلی گئیں، جن کو یہ منظور نہ تھا وہ اپنے منتشر اجزا لئے ہوئے پیچھے رہ گئے۔ چنانچہ مذاہب عالم کا یہی حشر ہوا۔

---

مگر دنیا کے تمام مذاہب میں ایک مذہب ایسا تھا جو اس طوفان کا ساتھ دے سکتا تھا، علم کے اس سیلاب کا شناور بن سکتا تھا، لیکن اسکو دنیا فراموش کر چکی ہے، خود اس کے ماننے والے اسکی حقیقت سے بیخبر ہیں اور اگر کوئی انھیں یہ بھولا ہوا سبق یاد دلاتا ہے تو اُسے باغی سمجھ کر نکال دیتے ہیں — اس مذہب نے کبھی اس بات کی تلقین نہیں کی کہ تم بغیر سمجھے ہوئے لغو اعتقادات کا اتباع کرو، بلکہ اس نے ہمیشہ اسی بات پر زور دیا کہ اپنی فکر و کوشش سے کام لو، غور و تدبر کرو، کائنات کا مطالعہ کرو، حقائق اشیاء کا علم حاصل کرو، دنیا میں ہمیشہ آگے قدم بڑھاؤ اور ترقی کی اس چوٹی تک پہنچ جاؤ جہاں نیابت خداوندی کا اعلان کیا جا سکتا ہو۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ نیابت خداوندی کیا ہے، وہ انسان کی انتہائی کامیاب تمناؤں کی بہشت ہے، استعداد و ترقی کی سکون بخش جنت ہے، کامرانیوں کی سلسبیل ہے، مسرتوں کی جوئبار ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھا دیا کہ اگر انسان نے یہ سب کچھ حاصل کرنے کی کوشش نہ کی، تو ذلت و نکبت کی آگ ہے، پستی و خسران کے دل جلا دینے والے شعلے ہیں، اور پامالی کی وہ تکلیفیں ہیں کہ سانپوں کی پھنکار اور بچھو کے نیش بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

مگر ہے کوئی آج؟ جو صرف اس تعلیم کو اساس مذہب بنائے اور رہزنی میں بہت جرأت کو علحدہ کرکے عزم پیش کرے — علم اپنا "یقین" کا پرچم لئے ہوئے آگے بڑھتا جا رہا ہے، کائنات کو فتح کرکے بہشتوں [illegible] جنتوں کو اپنے لئے

مخصوص کرتا جا رہا ہے، نعائم ولذائذ کو سمیٹ سمیٹ کر دامن مراد بھر رہا ہے — لیکن مذہب؟ — وہ بدستور اپنے ممکنات کے اوہام میں مبتلا ہے، قیاسات کی دلدل میں گرفتار ہے۔ اس نے منہ اِس پُشت کی طرف کر لیا ہے اور کہہ رہا ہے منزل اِدھر ہے وہ سکون کا طلبگار ہے — وہ سکون جس میں موت کی سی غفلت ہو، پتھروں کا سا جمود ہو، وہ کہتا ہے کہ اس دنیا کی پامالی ہی اُس دنیا کا عروج ہے، یہاں کی ذلت وہاں کی عزت ہے — حالانکہ بتانے والے نے صاف صاف بتا دیا تھا کہ "ہل یہلک الا القوم الفاسقون" سے اسی دنیا کی ہلاکت مراد ہے اور فاسق وہی ہے جس نے اسی آب و گل کی دنیا میں جد و جہد ترک کر دیا۔

---

آج اکتوبر کی ۲۶ ہے اور میں کہ زیادہ سے زیادہ ۱۵ اکتوبر تک لکھنؤ پہونچنے کا عزم کر چکا تھا ہنوز حیدرآباد میں ہوں — لکھنے کو تو یہ بھی لکھ دوں کہ نومبر کے شروع میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا، لیکن کسے خبر ہے کہ یہ ارادہ بھی پورا ہوتا ہے یا نہیں۔

جہاں تک ظاہری تعلقات کا واسطہ ہے، میری دنیا بہت محدود ہے، "اتنی محدود کہ" ہمیں جائے من و جائے تو باشد" سے زیادہ مجھے کوئی تمنا نہ کرنا چاہئیے، لیکن جس وقت اپنے باطنی اضطرابات کو دیکھتا ہوں تو یہ جی چاہتا ہے کہ اگر میں دنیا پر نہ چھا جاؤں تو دنیا کو ضرور میرے اندر سمٹ کر آ جانا چاہئیے۔

دنیا مجھے کافر کہتی ہے، مرتد بتاتی ہے، دشمن دین و ایمان ظاہر کرتی ہے — لیکن کیا کروں باوجود اس طرح بار بار ٹھکرائے جانے کے بھی یہ یقین دل سے کسی طرح محو نہیں ہوتا کہ نوع انسانی کی نجات کا ذریعہ اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہے — اور باور کیجئے کہ میرا کوئی اقدام، میرا کوئی سفر، میری زندگی کا کوئی لمحہ اس مقصود سے خالی نہیں ہوتا — میرے لئے دنیا میں اب کوئی سیر و تفریح نہیں مگر یہ کہ میں اپنا کوئی ہمنوا پیدا کر سکوں، میری حیات کا کوئی مدعا نہیں بجز اس کے کہ میں اسلام کے حقیقی مفہوم سے دنیا کو آشنا کر سکوں اور یہی وہ خلش ہے جو مجھے کبھی کبھی یہاں کھینچ لے آتی ہے اس لئے نہیں کہ یہاں اس پیام پر لبیک کہنے والے بہت ہیں، بلکہ صرف اس لئے کہ یہیں بہت کم ہیں —

بہرحال میں ان تمام احباب سے معافی چاہتا ہوں جن کے گرامی ناموں کا جواب اس دوران میں بروقت نہ دے سکا اور اُن حضرات سے بھی معذرت خواہ ہوں جن کے استفسارات کی طرف (دفتر سے دور ہونے کی وجہ سے) توجہ نہ کر سکا۔ چنانچہ یہ رسالہ باب المراسلہ و باب الاستفسار سے بالکل معرّا شائع ہو رہا ہے۔ ان ابواب کی جگہ میں نے دوسرے مضامین سے پُر کر دی ہے اور امید ہے کہ اس ماہ کی اشاعت میں غیر معمولی سامان دلچسپی نظر آئے گا — مجھے سخت افسوس ہے کہ افسانہ "بیراگ کا بروگ" کا سلسلہ درمیان میں منقطع ہو گیا تھا۔ لیکن اب نومبر سے پھر شروع کر دیا گیا ہے اور دسمبر میں ختم ہو جائے گا۔

جنوری ۴۳ء کا رسالہ اپنے موضوع کے لحاظ سے جس قدر اہم ہوگا کسی سے مخفی نہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ میں اپنی طویل غیر حاضری کی وجہ سے ابھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ کن کن حضرات کے مضامین موصول ہوئے ہیں اور میں اپنی توقعات کو کس حد تک کامیاب دیکھوں گا۔ بہرحال ابھی وقت ہے اور جو اہل قلم اس باب میں میری اعانت کرنا پسند فرمائیں وہ اب بھی کرم فرما سکتے ہیں۔

پہلے میرا ارادہ تھا کہ خود کوئی مضمون نہ لکھوں گا، بلکہ تمام مضامین موصولہ پر اپنی رائے کے اظہار پر اکتفا کروں گا۔ لیکن بعد کو میں نے یہ خیال ترک کر دیا — اب آپ میرے کم از کم دو طویل مضمون جنوری کے رسالہ میں پڑھیں گے۔ ایک تو اُردو شاعری پر تاریخی تبصرہ کے عنوان سے ہوگا اور دوسرا لکھنؤ کے ایک ایسے شاعر کے متعلق ہوگا جس سے دنیا ابتک بے خبر ہے، درانحالیکہ دہلی اسکول کے مقابلہ میں لکھنؤ ہی کی طرف سے ایک پیش کیا جا سکتا تھا —

# ہماری عورتوں کا پردہ

**تمہید** اس سے قبل اس موضوع پر ہندوستان کے مختلف رسائل میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور یہ بحث اس قدر پامال ہے کہ اُسے از سر نو تازہ کرنے کو جی نہیں چاہتا، علاوہ اس کے معاشرت اور رسم و رواج سے متعلق جتنی چیزیں ہیں ان کا بہترین فیصلہ خود زمانہ کے ہاتھوں ہوا کرتا ہے اور وہ ہماری خامہ فرسائی کی محتاج نہیں ہوتیں۔ مثلاً اسی پردہ کی رسم کو لے لیجئے۔ اس کے متعلق ہمارے بزرگوں کے جو خیالات تھے وہ ہمارے نہیں اور جو ہمارے خیالات ہیں وہ ہماری اولاد کے نہوں گے اس طرح زمانہ کی رفتار خود ہمارے رجحانات قائم کرنے میں بہترین اُستاد کا کام کرتی ہے اور ہمیں اس کے احکام پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ تاہم چونکہ اس موضوع پر ابتک جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ یا تو مذہبی بحثوں سے متعلق ہے یا ان غیر متعلق اعتراضات سے جو ہر فریق نے اپنے مخالفین پر کئے ہیں، اس لئے میرے لئے کہ میں ان دونوں سے اپنے مضمون کو حتی الوسع بچانا چاہتا ہوں ایک نئے نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر رائے زنی کی کافی گنجائش نکل آئے گی۔

اب رہی دوسری وجہ کہ زمانہ کا فتوےٰ میرے اور آپ کے دستخط کا محتاج نہیں، اور ایک روز وہ ہم سب سے اپنے احکام کی تعمیل کرا کے چھوڑے گا۔ بالکل صحیح ہے لیکن انفرادی کوششیں اگر زمانہ کی رفتار کو بالکل روک نہیں سکتیں تو گھٹا یا بڑھا ضرور سکتی ہیں مثلاً اگر سرسید پیدا نہوتے تو بھی آج ہندوستان کے مسلمان انگریزی تعلیم پانے اور ولایت جانے میں کوئی ہرج نہ سمجھتے اور کفر کے جو فتوے اُسوقت انگریزی خوانوں پر لگائے گئے تھے وہ اسی طرح ناپید ہو جاتے جس طرح اب ہو گئے ہیں لیکن فرق یہ ہوتا کہ اُس صورت میں مسلمان اس سے بھی زیادہ پست اور ذلیل ہوتے جتنے اب ہیں۔ یہی حال آج پردہ کا ہے۔ اگرچہ نسل حاضر اپنے بزرگوں کے بہ نسبت اس بارہ میں بہت آزاد خیال ہو گئی ہے پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہندوستان سے پردہ یا اُس کے حامی بالکل اُٹھ گئے۔

**حامیان پردہ کے تین گروہ** آپ غور کریں گے تو معلوم ہو گا کہ پردہ کی حمایت کرنے والوں کے تین گروہ ہیں۔ ایک وہ جو اُسے صرف مذہبی احکام کی بناء پر ضروری سمجھتا ہے۔ دوسرا

وہ جس کا خیال ہے کہ پردہ بجائے خود ضروری نہیں لیکن ہندوستان کی تعلیمی پستی اور سیاسی حالت نے اسے ناگزیر بنا دیا ہے۔ تیسرا گروہ وہ ہے جو پردہ کو کسی خاص مقام یا کسی خاص مدت کے لئے نہیں بلکہ ہر ملک اور ہر عہد کے لئے ضروری سمجھتا ہے اور اس کا سبب یہ بتاتا ہے کہ پردہ کے بغیر عورت کی عفت و عصمت اور سوسائٹی کی اخلاقی حالت کبھی اچھی نہیں رہ سکتی۔ آیئے! اب ہم ان تینوں گروہوں کے خیالات پر ایک ایک کرکے غور کریں۔

## پہلا گروہ - جو صرف مذہب کی بنا پر پردہ ضروری سمجھتا ہے

پہلے اس گروہ کو لیجئے جو پردہ کی نفع و مضرت سے بالکل قطع نظر کرکے صرف مذہبی احکام کی بنا پر اُس کی تائید کرتا ہے۔ قبل اس کے کہ میں پردہ کے بارہ میں کوئی مذہبی بحث چھیڑوں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اوامر و نواہی سے متعلق ایک عام اُصول آپ کے گوش گزار کر دوں۔ موجودہ زمانہ میں کسی رسم یا چیز کے متعلق یہ کہنا کہ فلاں مذہب اس کی اجازت دیتا ہے یا اس کی ممانعت کرتا ہے اُس رسم یا اُس چیز سے لوگوں کو باز رکھنے یا اس پر عمل کرانے کے لئے کافی نہیں جب تک آپ عقل کی رو سے یہ ثابت نہ کر دیں کہ وہ فعل بجائے خود مستحسن یا مذموم ہے۔ ایسے مذہبی احکام جو عقل کی کسوٹی پر نہیں کسے جا سکتے نہ صرف اُس خاص مذہب کے پیرؤں کے سوا اور سب کے لئے بیکار ہوتے ہیں بلکہ خود اسی مذہب کے پیرو جو ہر چیز کو عقل کی مدد سے جانچنا چاہتے ہیں وہ بھی ان کو قبول نہیں کرتے۔ فرض کیجئے کہ اس وقت کوئی اہلِ مذہب شراب خواری یا زنا کو رواج دینا چاہے تو صرف اس بنا پر کہ اس کے مذہب میں یہ چیزیں مباح ہیں۔ اسے اپنے مقصد میں بہت کم کامیابی ہوگی، اسی طرح اگر کوئی عیسائی لوگوں کو شادی بیاہ کی ممانعت کرتا پھرے یا کوئی جین مذہب کا پیرو کھانے پینے کی، تو غالباً ہم میں سے کوئی ذی ہوش آدمی عمر بھر مجرد رہنا یا دہی کھا کر جینا اس وجہ سے نہیں اختیار کرے گا کہ عیسوی مذہب اور جین مت کے احکام ایسے ہی ہیں بلکہ لوگ ایسے مذاہب سے دست بردار ہو جائیں گے جس کے احکام ناممکن العمل ہوں یا جنھیں فطرتِ انسانی قبول نہ کر سکتی ہو۔ جو لوگ اوامر و نواہی کے دائرہ کو ہمیشہ سخت تر کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں یہ سمجھ کر کہ وہ اس طرح نیکی کو دنیا میں عام کر رہے ہیں وہ دراصل اپنے مذہب کے فوائد و برکات کو عالمگیر ہونے سے روکتے ہیں۔

خوش قسمتی سے جہاں تک پردہ کا تعلق ہے ایسی کوئی پیچیدگی نہیں پیدا ہوتی۔ موجودہ مذاہب عالم میں صرف ایک اسلام ایسا مذہب ہے جس کی طرف پردہ منسوب کیا جاتا ہے اور مسلمان علما میں پردہ کے متعلق دو گروہ ہیں ایک کی رائے ہے کہ عورت نامحرم کے سامنے پہنچوں تک ہاتھ، ٹخنوں تک پاؤں اور چہرہ کھلا رکھ سکتی ہے، دوسرا اس کی اجازت نہیں دیتا لیکن اس پر دونوں کا اتفاق ہے کہ اگر عورت برقع اوڑھے یا چادر لپیٹ لے جس سے

اُس کے جسم کا کوئی حصہ کھلا نہ رہے تو پھر اُس کے باہر نکلنے میں کوئی عذر شرعی باقی نہیں رہتا۔

اب اگر پہلی تعبیر صحیح سمجھی جائے تو اُس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہماری عورتیں جس حالت میں اپنے گھروں میں رہتی ہیں اُسی حالت میں باہر نکل سکتی ہیں کیونکہ عام طور پر ہندی مسلمان عورتوں کا لباس ایسا ہوتا ہے کہ مذکورۂ بالا اعضا کے سوا اُن کے جسم کا کوئی حصہ کھلا نہیں رہتا۔ جب علما کی ایک جماعت مذہبی احکام کی یہ تعبیر کرتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ایک سخت تر تعبیر کو ترجیح دیکر اپنی عورتوں کو خواہ مخواہ ایک تماشا بنائیں اور ضروریات زندگی میں دشواری پیدا کریں لیکن اگر آپ کو اس دوسری تعبیر پر ہی اصرار ہے تو آپ کم سے کم اسی پر عمل کریں اور اپنی عورتوں کو برقع ہی پہنا کر باہر نکالیں۔ آپ شاید یہ فرمائیں کہ "برقع پہن کر تو ہماری عورتیں اب بھی باہر نکلتی ہیں" مگر نہیں ایسا نہیں ہے۔ آپ شہر کے اس سرے سے اُس سرے تک نکل جائیے آپ کو کہیں کوئی شریف مسلمان عورت بے پردہ یا برقع میں نہیں دکھائی دے گی بجز ریلوے اسٹیشنوں کے پلیٹ فارم کے وہاں بھی اس لئے نہیں کہ مذہب اسلام برقع میں نکلنے کی اجازت دیتا ہے بلکہ اس لئے کہ اسٹیشنوں پر ڈولیاں اور میانے نہیں ہوتے۔ اگر ریلوے کے ارباب مقتدر سامان کے ٹھیلوں کی طرح اسٹیشنوں پر ڈولیوں اور فنیسوں کا بھی انتظام کر دیں تو یقیناً اُس وقت آپ کو برقع کے متعلق مذہبی احکام کبھی یاد نہ آئیں اس سے معلوم ہوا کہ ہم اس مذہبی اجازت سے نہ فائدہ اُٹھاتے ہیں نہ اُٹھانا چاہتے ہیں الا اُن صورتوں کے جہاں بغیر اس کے کوئی چارہ نہیں۔ آخر اس کا کیا سبب؟ اسکا سبب یقیناً مذہب نہیں ہے کیونکہ مذہب تو ہر وقت باہر نکلنے کی اجازت دیتا ہے۔ بس آپ کو ماننا پڑے گا کہ پردہ کے اصلی اسباب مذہب اسلام کے احکام نہیں بلکہ کچھ اور ہیں اور اسلام اُن اصلی اسباب کو چھپانے کا صرف ایک بہانہ بنایا گیا ہے۔ یہ اصلی اسباب کیا ہیں؟ اس پر ہم آئندہ غور کریں گے۔

## دوسرا گروہ۔ جو صرف ہندوستان کیلئے پردہ ضروری سمجھتا ہے

فی الحال اُس دوسرے گروہ کو لیجئے جس کا خیال ہے کہ پردہ فی نفسہ کوئی ضروری چیز نہیں لیکن ہندوستان کی تعلیمی پستی اور سیاسی حالت نے اُسے یہاں کے لئے ناگزیر بنا دیا ہے۔ جہاں تک میں غور کر سکا ہوں مجھے تو تعلیم اور پردہ میں کوئی خاص تعلق نظر نہیں آتا ممکن ہے کہ آپ طبیعیات کیمیا، فلسفہ، منطق یا تاریخ جغرافیہ اور پردہ میں کوئی تعلق پیدا کر سکیں اور یہ بتا سکیں کہ کیوں ایک ایسے شخص کے سامنے جو علوم بالا سے واقف ہو ایک عورت بے پردہ ہو سکتی ہے اور ایسے شخص کے سامنے نہیں ہو سکتی جسے بدقسمتی سے ان علوم کے حاصل کرنے کا موقع نہ ملا ہو۔ ان حضرات کے فرمانے کا خدانخواستہ یہ مطلب تو

نہیں ہو سکتا کہ تعلیم سے انسان کے جنسی خواہشات فنا ہو جاتے ہیں یا اس میں حسن پسندی کی صلاحیت نہیں باقی رہتی۔ اس لئے اگر اس کا کچھ مطلب ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ ایک تعلیمیافتہ آدمی اپنے جذبات پر بہ نسبت ایک جاہل آدمی کے زیادہ قابو رکھ سکتا ہے لیکن جہاں تک پردہ کا تعلق ہے حقیقت حال اس کے برعکس ہے۔ ایک تعلیم یافتہ آدمی ہمیشہ ایک جاہل آدمی کے بہ نسبت زیادہ حساس واثر پذیر طبیعت رکھتا ہے جو خصوصیت کے ساتھ جنسی اثرات کے قبول کرنے کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہے یہی سبب ہے کہ آج وہ تعلیم یافتہ لوگ جو اپنی عورتوں کو جہلا سے پردہ کرانے پر زیادہ مُصر نہیں تعلیم یافتہ لوگوں سے بطور خاص چھپانے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ آپ نے اکثر گھروں میں دیکھا ہوگا کہ خواتین اپنے خدمتگاروں، درزیوں، دھوبیوں، بہشتیوں وغیرہ کے سامنے نکل آتی ہیں وہ تم سے آپ سے ضرور گہرا پردہ کرتی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ محض ایک بہانہ ہے جو تعلیم یافتہ طبقہ نے اپنے بچاؤ کے لئے تراشا ہے۔ اگر آج ہندوستان کی بیشتر آبادی تعلیمیافتہ ہوتی تو غالبًا یہ لوگ عوام کی جہالت کا عذر کرنے کے بجائے اُن کے تعلیم یافتہ اور ذکی الحس ہونے کا عذر کرتے۔

ہندوستان کی سیاسی حالت کا جو لوگ عذر کرتے ہیں اس سے ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں کوئی ایک قوم نہیں بستی بلکہ کئی قومیں آباد ہیں جو رسم و عادت اور نسل و مذہب کے اعتبار سے بالکل مختلف ہیں۔ اس لئے یہ حضرات سمجھتے ہیں کہ ایسے مختلف الحال لوگوں کو ایک دوسرے کی عزت کا کچھ پاس نہیں ہو سکتا اور ایسے ملک میں عورتوں کا بے پردہ ہونا خطرہ سے خالی نہیں۔ لیکن اگر ہندوستان میں کوئی آئینی حکومت نہ ہوتی بلکہ طوائف الملوکی کا دور ہوتا تو بیشک یہ عذر صحیح تھا لیکن موجودہ زمانہ میں جبکہ یہاں کی آئینی تنظیم دنیا کے کسی ملک سے پیچھے نہیں اس امر کا بعید ترین امکان بھی نہیں کہ کوئی جماعت غالب اپنے سے کم تعداد والی جماعت کی عورتوں کو بہ جبر لے بھاگے گی یا بے عصمت کر دے گی۔

آپ روزمرہ سیکڑوں فرنگی، پارسی، یہودی اور ہندو عورتوں کو کھلے بندوں پھرتے دیکھتے ہیں لیکن کبھی آپ نے دیکھا کہ کوئی پارسی کسی فرنگن پر یا کوئی ہندو کسی یہودن پر صرف اس لئے حملہ آور ہوا ہو کہ وہ اُس کی ہم مذہب نہیں ؟ وہ فرقہ وارانہ مناقشات جو کبھی کبھی ہمارے ملک میں رونما ہوتے رہتے ہیں اس پردہ کو جائز قرار دینے کے لئے بالکل ناکافی ہے کیونکہ جب مذہبی یا فرقہ داری جنون میں جہلا آپے سے باہر ہو جاتے ہیں تو عورتیں خواہ بازار میں پھر رہی ہوں یا گھروں میں بیٹھی ہوں یہ از خود رفتہ مجمع بہرصورت اُن پر حملہ کر سکتا ہے اس لئے صرف ایسے حملوں کے ڈر سے گھروں میں

چھپ رہنا ایسا ہی دانشمندانہ فعل ہے جیسے ٹھوکر لگنے کے خوف سے چلنا پھرنا موقوف کر دینا۔

### تیسرا گروہ جو پردہ کی عالمگیر ضرورت سمجھتا ہے

اب اُس تیسرے گروہ کی طرف آئیے جو یہ سمجھتا ہے کہ عورت کی عفت و عصمت اور سوسائٹی کی اخلاقی حالت برقرار رکھنے کے لئے پردہ بلالحاظ ملک و ملت ضروری ہے۔ اس جماعت کا خیال ہے کہ ہندوستان کی پردہ دار عورتیں ساری دنیا کی بے پردہ عورتوں سے زیادہ پاکدامن ہیں اور چونکہ ان کے نزدیک عورتوں کی عصمت کا جوہر صرف پردہ کی آڑ میں محفوظ رہ سکتا ہے اس لئے وہ نہیں چاہتے کہ پردہ اُٹھا کے اپنی عورتوں کو ایسے قیمتی جوہر سے عاری کر دیں۔ لیکن افسوس ہے کہ میں اس دعوے میں اجتماعِ ضدین ثابت پاتا ہوں۔

### باعصمت عورت کیلئے پردہ

کسی عورت کی عصمت برقرار رکھنے کے لئے پردہ کو ناگزیر قرار دینا گویا اس بات کا اقرار کرنا ہے کہ خود آپ کو اس عورت پر اعتماد نہیں اور آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ پردہ سے باہر آئی تو اپنے نفس پر قابو نہ رکھ سکیگی۔ بس یہ کہنا کہ باعصمت عورت کے لئے پردہ ضروری ہے بہ الفاظ دیگر یہ کہنا ہے کہ وہ عورت باعصمت بھی ہے اور بے عصمت بھی، جو بالکل مہمل ہے۔ آپ خود غور فرمائیے کہ آخر باعصمت سے آپ کی کیا مراد ہے۔ ایک عصمت کو چھوڑئے۔ دنیا کی کسی اور صفت کو لے لیجئے۔ مثلاً آپ ایک شخص کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہ "دیانت دار" ہے تو اس سے آپ کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ یہی نا کہ اس کو بددیانتی کے مواقع تو حاصل ہیں لیکن وہ بددیانتی نہیں کرتا۔ اسی طرح جب آپ اپنی عورتوں کے متعلق یہ فرماتے ہیں کہ وہ باعصمت ہیں، تو اس سے آپ کا یہی مطلب سمجھا جائے گا کہ اُنھیں بے عصمت ہونے کے مواقع تو حاصل ہیں مگر وہ بے عصمت نہیں ہوتیں لیکن اگر بے عصمتی کے ان موقعوں سے آپ کی یہی مراد ہے کہ گھر کی چار دیواری میں (جہاں غیر مرد کی پرچھائیں تک نہیں دکھائی دے سکتی)، نہایت سختی کے ساتھ مقید ہونے، اور اپنے ساس، سسرے، باپ، بھائی، دیور، جیٹھ حتیٰ کہ ماماؤں اور اناؤں تک کی انتہائی نگرانی میں رہنے کے باوجود وہ بے عصمت نہیں ہوتیں تو میں یہ دعوے بھی کر سکتا ہوں کہ قیدخانے تمام اُن نفوس قدسیہ سے معمور ہیں جو برقندازوں، فلک بوس دیواروں، مہلک برقی تاروں، آہنی سلاخوں اور موٹی موٹی زنجیروں کے باوجود برسوں کسی گناہ بلکہ معمولی قصور کا بھی ارتکاب نہیں کرتے اور ہم سب سے زیادہ پاک، نیک و سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ پھر اگر آپ ان پر نیک اور پارسا کا اطلاق کرنے کے لئے تیار ہیں تو میں بھی آپ کی عورتوں کو باعصمت سمجھنے کے لئے تیار ہوں لیکن اگر آپ انھیں پارسا سمجھنے میں صرف اس لئے تامل کرتے ہیں کہ انکی پارسائی نارسائی کا دوسرا نام ہے تو میں چاہتا ہوں کہ اسی اُصول کو آپ اپنی عورتوں سے بھی متعلق کیجئے۔ یعنی اگر

آپ کو اس پر اصرار ہے کہ جو نیکی قید و زنداں کی محتاج ہے وہ دراصل نیکی نہیں ہے تو آپ کو اس پر بھی اصرار ہونا چاہئے کہ جو عصمت آپ کے گھر کی چار دیواری کی محتاج ہے وہ دراصل عصمت کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔

اس کے جواب میں یہ نہ فرمائے گا کہ "یہ پردہ تو عورتوں نے مردوں کے جبر سے نہیں بلکہ اپنی خوشی سے اختیار کیا ہے" کیونکہ دنیا میں کوئی ذی روح جس میں زندگی کی ذرا سی بھی اُمنگ اور جذبات کی ترنگ باقی ہے اس ظالمانہ اور غیر فطری قید کو خوشی سے برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ ایک دائم الحبس قیدی کی طرح چار دیواری میں بیٹھے بیٹھے اس کی حس مردہ ہو گئی ہو اور اب اس قید کی اتنی تکلیف اُسے محسوس نہ ہوتی ہو جتنی ایک اوسط جذبات کے ذی روح کو ہونی چاہئے۔ اگر آپ کو میرے بیان میں شک ہے تو آپ زیادہ نہیں صرف ایک ہفتہ کے لئے اپنے مکان کے سوا چہ گز صحن میں مقید ہو جائیے پھر دیکھئے آپ کی کیا حالت ہوتی ہے۔ فرض کیجئے کہ آپ کی بیوی خود بے پردہ ہونا چاہیں تو کیا آپ انھیں اس کی اجازت دیں گے؟ ممکن ہے اب آپ ایک نئی ترکیب نکالیں جس سے آپ کا مقصد بھی حاصل ہو جائے اور آپ کی بیوی بھی ناراض نہ ہوں۔ یعنی آپ اُن سے یہ فرمائیں کہ "مجھے تم پر تو کامل اعتماد ہے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ اپنی سوسائٹی کے مردوں کی طرف سے بالکل اطمینان نہیں"۔

ممکن ہے کہ اس جواب سے آپ کی بھولی بھالی بیوی کی تشفی ہو جائے۔ لیکن اس سے کم از کم میری تشفی نہیں ہو سکتی۔ مردوں کی دست درازی دو صورتوں سے خالی نہیں۔ یا تو وہ عورت کی رضامندی سے ہوگی یا اس کی خلاف مرضی۔ پہلی صورت میں نہ تو وہ عورت آپ کے اعتماد کی مستحق ہے نہ باعصمت کہلائے جانے کی۔ اس لئے ایسی عورتوں سے یہاں ہمیں کوئی بحث ہی نہیں۔ اب رہی دوسری صورت سو اس کے متعلق قانون میں جو سخت سزا مقرر ہے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ اب فرض کیجئے کہ خدانخواستہ ایک ایسے بدمعاش کی نیت آپ کی بیوی کے متعلق بدل جائے جو یہ سزا بھگتنے کے لئے تیار ہو تو اُس کے لئے شاہراہ، پارک، اور گھر سب برابر ہیں بلکہ دن کے وقت بھری سڑک یا بارونق پبلک گارڈن میں حملہ کرنے سے بدرجہا زیادہ آسان تو اُس کے لئے رات کو اس کی خوابگاہ پر دھاوا کرنا ہوگا۔

اس کے جواب میں شاید آپ یہ فرمائیں کہ "جب میں اپنی بیوی کو پردہ کراؤں گا تو اس بدمعاش کو اسکا علم ہی کیسے ہوگا کہ میری ایک بیوی ہے جو جوان بھی ہے اور حسین بھی"؟ لیکن آپ کا یہ جواب صحیح نہیں۔ آپ ہی فرمائیے کہ آپ کے کتنے عزیز، دوست، ہمسایہ، ہم محلہ، ایسے ہیں جن کے متعلق آپ کو بخوبی معلوم ہے کہ ان کی بیوی یا بہن یا بیٹی یا سالی جوان بھی ہے اور حسین بھی۔ لیکن کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ نے انکے گھروں پر کتنی دفعہ کمند ڈالنے کی

کوشش کی؟

اس موقع پر آپ یہ کہیں گے کہ "بغیر صورت دیکھے ایسا اشتیاق نہیں ہو سکتا لیکن صورت دیکھنے کے بعد بیشک ایسا اشتیاق پیدا ہو سکتا ہے"

مگر تجربہ اسکی بالکل تائید نہیں کرتا - آپ ہی فرمایئے کہ روزانہ آپ کو کتنی حسین اور جوان فرنگی، پارسی، یہودی اور ہندو عورتوں کے دیکھنے کا موقع ملتا ہے؟ لیکن کیا انھیں دیکھ کر آپ کا اشتیاق کبھی اس درجہ پر پہونچا کر آپ نے ان کی موٹروں کے نمبر نوٹ کر کے ان کی خوابگاہوں پر شبخون مارا ہو؟ - اتنی بحث کے بعد غالباً اس حد تک تسلیم کرنے میں آپ کو تامل نہ ہوگا کہ جن عورتوں کی عصمت پر آپ کو کامل اعتماد ہے یعنی جن کے متعلق آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اُنھیں کسی قسم کی ترغیب و تحریص راہ راست سے نہیں ہٹا سکتی، وہ خواہ پردہ میں ہوں یا بے پردہ اس سے سوسائٹی کی اخلاقی حالت پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑ سکتا اور ان کی حد تک پردہ اگر مضر نہیں تو بیکار ضرور ہے۔

## بے عصمت عورت کیلئے پردہ

اب رہیں وہ عورتیں جن کی عصمت پر آپ کو اعتماد نہیں۔ انکے متعلق آپ فرمائیں گے کہ "چونکہ ان کی طرف سے سوسائٹی میں جسمانی اور اخلاقی خرابیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اس لئے اُن کا پردہ میں بٹھایا جانا ضروری ہے۔ اس پردہ سے خواہ مجبوری درجہ سہی لیکن سوسائٹی کی عافیت تو قائم رہیگی جس طرح زنداں کے قیدی کہ گو جرائم سے بدرجۂ مجبوری باز رہتے ہیں لیکن اُن کے قید ہونے سے ہماری زندگی تو آرام سے کٹ رہی ہے"!

اگر آپ نے دنیا کے موجودہ رجحانات کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے تو جانتے ہوں گے کہ پردہ کی طرح قیدخانوں کی سلاخیں بھی آج ارتکاب جرائم سے لوگوں کو باز رکھنے میں ناکام ثابت ہو رہی ہیں اور فی الواقع انھیں ہونا بھی یہی چاہئے تھا۔ اس لئے کہ جب تک مرض کے اسباب رفع نہ ہوں مرض کبھی زائل نہیں ہو سکتا۔ غلط تعلیم اور غلط تقسیم وہ اساسی سنگ و خشت ہیں جن پر دنیا کے تمام جرائم کی تعمیر ہوا کرتی ہے۔ اگر آج صحیح تعلیم اور دولت کی مساوی تقسیم شروع ہو جائے تو آپ دیکھیں گے کہ قیدخانوں کی کوٹھریاں خود بخود سونی ہونی شروع ہو جائینگی۔ یہی حال پردہ کا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قیدی اپنے کئے کی سزا بھگتتے ہیں اور ہماری عورتیں ناکردہ گناہوں کی۔

لیکن اگر آج آپ اُن اسباب کو پوری طرح رفع کر دیں جو عورتوں کی بے عصمتی کا باعث ہو سکتے ہیں تو آپکو پردہ کی کوئی ضرورت ہی نہ پڑے گی بلکہ آپ دیکھیں گے کہ ان اسباب میں ایک بڑا سبب خود پردہ ثابت ہوگا اب آپ ذرا اس پر غور فرمایئے کہ کسی عورت کی بے عصمتی کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں: - یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے

کہ اگر کسی شخص کی خواہشیں ایسے طریقوں سے پوری ہو سکتی ہیں جنھیں اُس کے ہمنشیں برا نہیں سمجھتے تو کبھی وہ انھیں چھوڑ کر ایسے طریقے نہیں اختیار کریگا جسے اس کے ہم چشم معیوب سمجھتے ہوں۔ اگر آپ کی ایک پر تکلف دعوت کسی دوست کے ہاں ہو تو آپ کھانے کا کمرہ چھوڑ کر اس کے باورچی خانے میں چوری کے لئے نہیں جائیں گے۔ لوگوں کے باورچی خانے تلاش کرنے کی ضرورت آپ کو اُسی وقت پیش آئے گی جب خود آپ کا باورچی خانہ خالی ہو۔ یہی حال انسان کی ہر خواہش کا ہے۔ اس میں عورت اور مرد کی کوئی تخصیص نہیں۔ بلکہ فطرتاً عورت مرد سے زیادہ شرمیلی ہوتی ہے خصوصاً جنسی معاملات میں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اگر اُس کی فطری خواہشات کی تکمیل اُن طریقوں سے ہوتی رہی جنھیں وہ جایز سمجھتی ہے تو وہ کبھی ایسے طریقے نہ اختیار کرے گی جو اس کے نزدیک ناجایز ہوں لیکن اگر آپ یہ چاہیں کہ تمام جایز راستے اس کے لئے بند کر دیں اور اس کے باوجود یہ توقع رکھیں کہ وہ کوئی ناجائز راستہ نہ نکالے گی تو یہ آپ کی غلطی ہے۔ وہ نکالے گی اور اسی طرح نکالے گی جس طرح ہم اور آپ ایسی صورتوں میں نکالتے ہیں خواہ آپ اُسے پردہ میں بٹھائیں یا بے پردہ پھرائیں۔ فرق صرف اتنا ہوگا کہ بے پردگی کی صورت میں وہ بہتر سے بہتر چیز جو تلاش و جستجو سے میسر آسکتی ہے بہم پہونچائے گی اور پردہ کی صورت میں جو کچھ برا بھلا مل جائے اسی پر قانع ہو جائے گی۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے ملک میں بدکاری اور عصمت فروشی کا بازار گرم ہونے دیں تو اس کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ آپ عورتوں کو چار دیواری میں بٹھا دیں یا کسی صندوق میں مقفل کر دیں۔ یہ طرز عمل انھیں جسمانی بدکاری سے اگر بچا بھی سکا تو ایسی سخت ذہنی بدکاری میں مبتلا کر دے گا جسمیں ہم میں سے ننانوے فیصدی آج کل مبتلا ہیں۔ شاید یہ ذہنی بدکاری آپ کی سمجھ میں نہ آئے لیکن یہ موقع اُس کی تشریح کا نہیں ہے آگے چل کر میں اس کا تفصیلی ذکر کروں گا فی الحال مجھے اصل بحث پر آلے اور وہ تدبیریں بتانے دیجیے جو عورتوں کی بے عصمتی کے اندیشوں کو دور کر سکتی ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی عورتیں باعصمت رہیں تو آپ اُنھیں اس کی کامل آزادی دیجئے کہ وہ جب چاہیں اور جس سے چاہیں شادی کریں، جب تک چاہیں اسکے ساتھ رہیں۔ جسوقت اُس سے تعلق منقطع کرنا چاہیں اسی آسانی سے کر سکیں جس آسانی سے ان کے شوہر اُن سے کر سکتے ہیں۔ بچپن کی نسبتیں، جوان ہونے کے بعد لڑکیوں کو اُن کی خلاف مرضی شادی سے روکنا، انتخاب شوہر میں اپنی مرضی کو ان کی مرضی پر مقدم رکھنا، اُنھیں اپنے ہونے والے شوہروں سے ملنے اور تبادلۂ خیال کرنے کا موقع نہ دینا عقد کو ایک عقدۂ لاینحل بنانا، طلاق اور خلع میں مشکلات پیدا کرنا بھاری بھاری مہر باندھنا جو کبھی ادا ہی نہ ہو سکیں، بیواؤں اور مطلقہ عورتوں کے عقد ثانی کو معیوب سمجھنا، عورتوں کو مالی مشکلات میں پھنسا دیکھنا لیکن

ان کو پردہ سے نکل کر خود کھانے کمانے کے قابل بننے کی اجازت نہ دینا، اُن کو جاہل بے وقوف اور معاملات دنیوی سے بے خبر رکھنا یہ اور اسی قسم کے اور سیکڑوں رسوم و مظالم ہیں جو در اصل بے عصمتی کے بیج نہیں درخت ہیں۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ جوان لڑکیوں کو جاہل اور جنسی معاملات سے بے خبر رکھیں اس کے ساتھ ہی دس ہزار کا جہیز تیار ہونے تک کنواری رہنے پر مجبور کریں، جب شادی کریں، تو انتخاب شوہر میں انکی رائے نہ لیں۔ اگر شوہر بدمزاج، بدزبان بدصورت بدمعاش، جاہل، امراض میں مبتلا یا جنسی اعتبار سے کمزور ہو تو بھی وہ اسی کو بناہتی چلی جائیں، اگر خوش قسمتی سے ایسا شوہر مرجائے یا طلاق دیدے تو عقد ثانی نہ کریں، وہ فاقوں مرجائیں مگر بے پردہ ہوکر خود کھانے کمانے کے قابل نہیں تو اس کا وہی انجام ہوگا جس کا آپ کو اندیشہ ہے۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک پردہ ان سب خرابیوں کی تلافی کر سکتا ہے تو مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ ع "ایں خیال است و محال است و جنوں"۔ میں یہ دعوے نہیں کر سکتا کہ ان سب اُمور کی اصلاح کردی گئی تو ہندوستان کے طول و عرض میں کسی بے عصمت عورت کا وجود نہ رہیگا۔ جب تک دُنیا قایم ہے اس میں ضرور ایسی عورتیں اور مرد ملیں گے جو بغیر کسی اور وجہ کے محض زنا کی خاطر زنا کرنا چاہتے ہیں لیکن کیا آپ اس کا دعوے کر سکتے ہیں کہ پردہ نے ایسی ہستیوں کو یا اُن کے مواقع کو بالکل مٹا دیا ہے؟ اگر نہیں تو پھر ایسے مستثنیات کی خاطر کسی ملک کی ایک کثیر آبادی کو معذور و مفلوج بنا دینا کونسی عقلمندی ہے؟ ممکن ہے ایک معترض یہ کہے کہ "ان اصلاحات کے لئے تو ابھی عرصہ چاہئے۔ اُس وقت تک ہم اپنی عورتوں کو بے پردہ کر کے خواہ مخواہ کیوں مصیبت مول لیں"۔ لیکن اُسے معلوم ہونا چاہئے کہ یہ 'مصیبت' اب اس کے اختیاری نہیں رہی۔ اور اگر وہ بروقت اس کا حل نہ سوچے گا تو یہ ایک خطرناک صورت اختیار کرلیگی۔ یہ معترض اس گزرگاہ عالم میں اگر ایک اندھے فقیر کی طرح نہیں بیٹھا ہے بلکہ ایک صاحب نظر دور اندیش کی طرح کھڑا حالات و واقعات کا بنظر غایر مطالعہ کر رہا ہے تو جانتا ہوگا کہ اب اُس کی عورتیں ان مظالم کو اُسی خاموشی سے برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں رہیں جس طرح صدیوں سے کرتی چلی آئی تھیں۔ زمانہ نے اپنا ورق اُلٹ دیا ہے اور مغربی آزادیوں کی لہریں بحیرۂ عرب کے اِس کنارہ پہونچ چکی ہیں۔ یہ بالکل جدا سوال ہے کہ یہ اچھا ہوا یا برا'؟ اس پر غور کرنے کا وقت گزر گیا اب تو یہ صورت آپڑی ہے کہ ع ورنہ ستانی بستم میرسد۔ میں آگے چل کر تفصیل سے وہ وجوہ بتاؤں گا جن کی بناء پر عورتیں ابتک مردوں کی محکوم رہتی چلی آئی تھیں۔ یہاں آپ میری خاطر یہ مان لیجئے کہ وہ وجوہ اب باقی نہیں رہے ہیں اس لئے یا تو آپ پردہ اُٹھائیے اور عورتوں کو اُن تمام مظالم سے نجات دلائیے جن میں سے چند کا اوپر ذکر ہوا یا اُن عواقب و نتائج کو برداشت کرنے کے لئے تیار رہئے جو آپ کی ہٹ دھرمی سے لازمی طور پر پیدا ہونگے۔

یہ بالکل غلط خیال ہے کہ یورپ کے مردوں نے اپنی خوشی سے عورتوں کو اس قدر آزادیاں دی تھیں - یہ آزادیاں عورتوں نے اپنی قوت بازو سے حاصل کی ہیں اور اب انھیں قائم رکھنے کے لئے وہ اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بہا دیں گی۔ یہی حال آپ کا ہونا ہے۔ اگر آپ نے اپنی خوشی سے عورتوں کے تمام جائز مطالبات پورے نہیں کئے ان کو اُن مظالم کے بار سے ہلکا نہیں کیا جن میں وہ صدیوں سے دبی چلی آتی ہیں اور ان کے وہ حقوق واپس نہیں کئے جو ابتک غصب کر رکھے ہیں تو آپ کا یہ پردہ کچھ کام نہ آئے گا اور بہت جلد آپ کو اُن آلام و مصائب کا شکار ہونا پڑے گا جو ہر انقلاب کے اجزائے لاینفک ہیں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آنے والے خطرات سے ڈر کر آپ اپنی عورتوں کو شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دیجئے۔ نہیں۔ اگر آپ اُن کی ایسی نگرانی اور رہنمائی کریں جیسے ایک دوست اپنے دوست کی کرتا ہے تو خود عورتیں مشکلاتِ زندگی میں آپ کا سہارا ڈھونڈیں گی۔ لیکن اگر اس کے برخلاف آپ نے قفل کنجی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو پھر آپ کی عافیت اور سوسائٹی کے شیرازہ کی خیر نہیں۔

یہ درست ہے کہ یورپ کے بعض شہروں میں ایک خلافِ نسوال تحریک شروع ہوگئی ہے اور میں اس تحریک سے واقف ہوں اور آگے چلکر میں آپ کو بھی اس کی حقیقت سے واقف کراؤں گا فی الحال مجھے ایک مثال کے ذریعہ اُس طرزِ عمل کو واضح کرنے دیجئے جو پردہ اُٹھانے کے بعد آپ کو اپنی عورتوں کے ساتھ اختیار کرنا پڑے گا۔

فرض کیجئے کہ ایک شخص نے اپنی جوان لڑکی کو بے پردہ کر دیا ہے۔ اب اگر اُس کی عفت و عصمت پر اسے کامل اعتماد ہے تو سبحان اللہ! اس سے بہتر کیا بات ہے۔ لیکن اس کے برخلاف اگر کچھ شک و شبہ ہے تو وہ سوال کریگا کہ "ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے؟" اس کا جواب بہت آسان ہے۔ اس کو لڑکی کے ساتھ بالکل وہی طرزِ عمل اختیار کرنا چاہئے جو ایسی صورتوں میں وہ اپنے لڑکے کے ساتھ اختیار کرتا۔ اب اگر اس کو اپنے پدری فرائض کا کماحقہ احساس ہے تو ایسی صورتوں میں وہ اپنے لڑکے کے ساتھ کیا کرتا؟ یہی نا کہ اُسے سمجھاتا بجھاتا، اچھی تعلیم دلاتا، اچھی صحبت میں بٹھاتا اور اگر مالی حالات اجازت دیتے تو شاید اس کی شادی بھی کر دیتا۔ لیکن یہ تو نہ کرتا کہ اُس کے کان اور ناک چھید کر ٹاٹ کے پردوں میں مقید کر دیتا۔

عقل، مذہب، اخلاق اور معاشرت کی رو سے ایک مرد کی بے عصمتی اُسی قدر مذموم، ناپسندیدہ، خطرناک اور مہلک ہے جتنی کہ ایک عورت کی، پھر کیا وجہ کہ آپ ایک کی پاکدامنی کو تو اتنی اہمیت دیں کہ فقط شبہ پر بطور حفظ ماتقدم اُس کو مقید کر دیں اور دوسرے کی عفت مآبی سے اسقدر غافل ہوں کہ وہ جتنا چاہے خراب ہوئے کوئی دار و گیر نہیں؟ آپ کا اپنی لڑکی کی عصمت کو اسقدر غیر معمولی اہمیت دینا اتنا ہی قابل اعتراض اور نازیبا فعل ہے

جتنا کہ اپنے لڑکے کی آوارگی سے اغماض کرنا - اسی پر آپ اور صورتوں کو بھی قیاس کر لیجئے - مثلاً آپ کو اپنی بیوی کی عصمت پر شبہ ہو تو کیا کرنا چاہئے؟ وہی جو آپ کی بیوی اُس صورت میں کرتی جب اسے آپ کی عصمت پر شبہ ہوتا وہ آپ کو سمجھاتی، مناتی، ڈراتی، دھمکاتی اور اگر اس پر بھی آپ اپنی حرکتوں سے باز نہ آتے تو وہ خلع لیکر کوئی اور شوہر تلاش کر لیتی لیکن یہ تو نہ کرتی کہ آپ کو پکڑ کر پردہ میں بٹھا دیتی یا آپ کے کان اور ناک کاٹ لیتی یا چھرا لیکر آپ کو ذبح کر دیتی جیسا کہ اکثر مردوں کے متعلق آئے دن سُنا جاتا ہے - ان مثالوں کی وجہ سے مجھے مجبوراً اس جگہ ایک اور ایسی بحث کا چھیڑنا ضروری معلوم ہوتا ہے جسے یوں چاہتا تھا کہ ابھی شروع نہ کروں۔

میں نے اپنے اکثر تعلیم یافتہ احباب کو یہ کہتے سُنا ہے کہ چونکہ مرد جسمانی اعتبار سے عورت کے بہ نسبت قوی ہوتا ہے اس لئے اُس میں اور عورتوں میں کسی طرح کی مساوات ہو ہی نہیں سکتی - وہ سمجھتے ہیں کہ اس جسمانی تفوق کی بنا پر مرد عورتوں کو نہ صرف پردہ میں رکھ سکتا ہے بلکہ عند الضرورت اُن کے ساتھ ایسے بہیمانہ افعال کا بھی مرتکب ہو سکتا ہے جن کا اوپر ذکر ہوا - ان کا خیال ہے کہ مرد کا عورت سے جسمانی قوت میں زیادہ ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ قدرت عورت کو مرد کا مطیع رکھنا چاہتی ہے - لیکن کیا اس منطق کا لازمی اقتضا یہ نہ ہوگا کہ آج سے بجائے اسکے کہ آپ اپنے گھوڑے پر سواری کریں آپکا گھوڑا آپ پر سواری کرنے لگے گا - اسلئے کہ وہ یقیناً جسمانی قوت میں آپسے زیادہ ہے غالباً صرف یہ ایک مثال اس احمقانہ مغالطہ سے نکالنے کے لئے کافی ہو جائے گی کیونکہ بدقسمتی سے اس کائنات کی بیشتر مخلوق جسمانی اعتبار سے آپ کے بہ نسبت قوی تر ہے اور مخلوق کو جانے دیجئے خود انسانوں ہی کی مختلف قوموں اور نسلوں میں جسمانی اعتبار سے اتنا فرق عظیم ہے کہ اگر یہ اُصول جائز قرار دے لیا جائے تو آج ہم سب اپنے گھروں میں آرام سے بیٹھنے کے بجائے افریقہ کے ریگستانوں میں بوجھ ڈھوتے پھریں گے۔

(باقی آیندہ)　　　محمد اعظم خاں - ام - اے

# ضرورت ہے شوہر کی

# بدمعاش

چالیس دن سے وہ برابر چل رہا تھا، ہر جگہ کام تلاش کر رہا تھا اور اُس نے اپنا وطن ولیادری کام نہ ملنے کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا۔ وہ ایک اچھا نجّار ستائیس سال کا قوی اور شریف انسان دو ماہ سے خاندان والوں کی روٹیاں توڑ رہا تھا۔ وہ جوکہ خاندان کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔ اُس کے لئے کرنے کو کچھ نہ تھا سوائے اس کے کہ عام بیروزگاری کے سلسلے میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہے۔ گھر میں روٹی کی قلت تھی، دونوں بہنیں کام کاج کرتیں لیکن مضبوط اور تنومند راڈل دوسروں کے ٹکڑے توڑتا اور خود کچھ نہ کرتا تھا۔ اُس کے کرنے کے لئے کچھ تھا ہی نہیں۔

اُس نے گاؤں کے اکثر و بیشتر آدمیوں سے سُنا تھا کہ وسطِ فرانس میں کام مل سکتا ہے۔

اس لئے وہ کاغذوں اور اسناد سے مسلح ہوکر اور سات روپیہ لیکر چل کھڑا ہوا کاندھے پر ایک نیلے رومال میں جو لکڑی کے سرے سے بندھا تھا ایک جوڑا جوتا، ایک قمیص اور دو پتلون لپٹے ہوئے تھے۔

وہ بغیر سستائے ہوئے دن رات دھوپ اور بارش میں چلا آرہا تھا اور اُس سرزمین کا جہاں کاریگروں کو کام ملتا ہے کہیں پتہ نہ تھا۔

پہلے پہل اُس کا مصمم ارادہ تھا کہ چونکہ وہ نجّار ہے اس لئے سوائے نجّاری کے اور کوئی کام نہ کرے گا۔ لیکن تمام کارخانوں میں جہاں جہاں اُس نے اپنے آپکو پیش کیا اسے کہا گیا کہ اُنھوں نے کام کی کمی کے باعث آدمیوں کو کم کر دیا ہے اس لئے اس نے بھی اپنے روپیوں کو قریب الختم دیکھکر ارادہ کر لیا کہ جو کام بھی اسے مل جائیگا کر لیگا۔

اس کے بعد وہ باری باری مزدوری، سائیس اور سنگ تراش کا کام کرتا رہا۔ وہ لکڑیاں چیرتا، کنوئیں کھودتا، کیچڑ بہاتا، ایندھن کے گٹھے باندھتا، پہاڑوں پر بھیڑوں کو چراتا، اور سب کچھ کرتا، صرف چند پیسوں کی خاطر۔ کیونکہ اُسکو صرف عارضی کام ملتا تھا اور وہ بھی اپنے آپ کو نہایت ہی کم اُجرت پر پیش کرکے کاشتکاروں اور کام لینے والوں کو لالچ دلانے کے بعد۔

اب ایک ہفتہ سے اُس کو کوئی کام نہ ملا تھا۔ اُس کے پاس ایک جنجی کوڑی نہ تھی۔ اُس کی زندگی کا انحصار اُن

چند روٹی کے ٹکڑوں پر تھا جن کو اُس نے راہ چلتے بھیک سے حاصل کیا تھا۔

جھٹ پٹا ہونے لگا تھا، اور تھکا ماندہ راڈل بھوکا، شکستہ دل، برہنہ پا، سڑک کے کنارے گھاس پر چلا جا رہا تھا کیونکہ جوتے کبھی کے پھٹ چکے تھے۔ خزاں کا آخری موسم تھا اور سنیچر کا دن۔ گہرے سیاہ بادلوں کا آسمان پر ہوا تعاقب کر رہی تھی اور درختوں کی پتیاں زور سے ہل رہی تھیں۔ ہوا سے بارش کی آمد کا احساس ہو رہا تھا۔ دیہاتی علاقہ اسوقت بالکل سنسان تھا۔ کھیتوں میں کہیں کہیں لانبی گھاس ضرور اُگی ہوئی تھی ورنہ ساری زمین کف دست کی طرح بالکل صاف تھی۔

راڈل بھوکا تھا ---- ایک گرسنہ درندے کی طرح بھوکا، اُسے ایسی وحشیانہ بھوک لگ رہی تھی جو بھیڑیوں کو انسانوں پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کر دیتی ہے۔ تھکن کی وجہ سے وہ جلد جلد چلنے لگا تاکہ راستہ جلد طے ہو جائے اور سُرخ آنکھوں اور خشک منھ کے ساتھ اُس نے اپنی لکڑی اس موہوم اُمید پر اُٹھالی کہ سب سے پہلے راہرو کو جو راستے میں اپنے مکان کو واپس جاتا ہوا ملیگا اس کو مار کر روٹی چھین لیگا۔

اُس نے سڑک کے کنارے ہل چلائی ہوئی زمین پر اس خیال سے نظر ڈالی کہ کچھ آلو ہی مل جائیں۔ اگر آلو ملجاتے تو وہ لکڑیاں جمع کرتا، کسی گڑھے میں آگ روشن کرتا اور اپنا پیٹ بھر لیتا۔

لیکن یہ ختم سال کا زمانہ تھا اور گزشتہ شام کی طرح اُس کو کچھ کچے ٹھنڈے کھانے کو ملے جن کو چلتے چلتے اُس نے کھیت سے اُکھاڑ لیا تھا۔

گزشتہ دو دن سے وہ بہ آواز بلند باتیں کر رہا تھا اور اُس کی رفتار کو اُس کے خیالات کے انہماک نے تیز تر کر دیا تھا اس سے قبل اُسے یہ خیال کبھی نہ آیا تھا کہ جس کام کو اُس نے جی لگا کر اپنی ساری کوششیں صرف کرکے سیکھا تھا۔ محض بیکار تھا اور اب تھکن، تلاش معاش کا دیوانہ وار تعاقب، اور اس کے متعلق کورے جواب، ذلتیں، راتوں کو سبزے پر سو جانا، فاقے، لوگوں کا اُس کے ساتھ نفرت انگیز سلوک، اُن کا متواتر سوال کرنا:- "تم اپنے گاؤں میں کیوں نہیں رہتے ہو" اپنی قوت بازو سے کام نہ لے سکنے کا رنج، بچھڑے ہوئے والدین کی یاد، کوڑی کوڑی کی محتاجی ---- یہ سب باتیں آہستہ آہستہ اُس کے دل کو نفرت و غصہ سے معمور کرتی جا رہی تھیں جو ہر روز بلکہ ہر گھنٹہ ہر منٹ بڑھ رہا تھا۔ اور بے اطمینانی کی ایک فریاد مختصر جملے کی صورت میں بلا ارادہ اُس کے مُنھ سے نکل جاتی تھی۔

روڑوں سے ٹھوکریں کھاتے ہوئے جو اُس کے برہنہ پاؤں کے نیچے لڑھک رہے تھے وہ چیخ اُٹھا۔ "مصیبت۔ مصیبت ---- حرامزادی مصیبت ---- دو آنے نہیں ملے ---- دو آنے تک نہیں ملے ---- اور اب بارش ہو رہی ہے۔

حرامزادی بارش۔"

وہ قدرت کی ناانصافی پر جل رہا تھا اور سارے انسانوں کو بُرا ٹھیرا رہا تھا۔ کیونکہ اندھی فطرت ناانصاف بے رحم اور ظالم ہے۔

"حرامزادی!" اُس نے ہلکے بھورے رنگ کے دھوئیں کو چھتوں میں سے نکلتے ہوئے دیکھ کر دانت پیستے ہوئے پھر دہرایا۔ اور سوچنے لگا کہ اُن میں سے کسی ایک مکان میں گھس کر اُس کے رہنے والوں کو مارے اور اُن کی بجائے خود دسترخوان پر جم جائے۔

"مجھے زندہ رہنے کا اب کوئی حق نہیں ——" وہ کہنے لگا۔ "جبکہ وہ مجھے بھوکوں مار ڈالنا چاہتے ہیں —— اور پھر میں چاہتا کیا ہوں؟ صرف مزدوری کرنا —— سور کے بچے! اور اُس کے اعضا کی تکلیف، بھوک کی تکلیف اور دلی اذیت نے ایک اُس قسم کی شوریدہ سری پیدا کر دی جس کا باعث شراب ہوا کرتی ہے۔ اور اُس کے دماغ میں یہ معمولی خیال پیدا ہو گیا کہ:۔ "مجھے زندہ رہنے کا حق ہے اس لئے کہ میں سانس لیتا ہوں، اس لئے کہ ہوا ہر ایک کے لئے ہے۔ کسی کو مجھے روٹی سے محروم رکھنے کا حق حاصل نہیں۔

مینھ برس رہا تھا، موسلا دھار اور منجمد کرنے والا۔ وہ ٹھیر گیا اور بڑبڑانے لگا:۔ "ہائے مصیبت —— گھر پہونچنے سے پہلے اور ایک مہینہ سڑکوں پر بسر کرنا پڑے گا ——" کیونکہ اب وہ اپنے گاؤں کو واپس جا رہا تھا اس خیال سے کہ وہاں کچھ نہ کچھ کام ملجانا آسان تھا —— بشرطیکہ وہ ہر اُس کام کو کرنے پر آمادہ ہو جو اُس کو مل جائے۔ بہ نسبت اس کے کہ وہ سڑکوں پر مارا مارا پھرے جہاں ہر شخص اُس کو مشتبہ نظر سے دیکھتا تھا۔

نجاری کا بازار چونکہ سرد تھا اس لئے وہ مزدوری بیلداری یا سنگتراشی کر لیا کرے گا اور اگر اس طرح روزانہ صرف دس آنے مل جایا کریں تو بس گزر کے لئے کافی تھا۔

اُس نے اپنے پھٹے رومال کو گردن پر لپیٹ لیا تاکہ ٹھنڈا اور سرد پانی پشت اور سینے پر نہ ٹپکے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اُس کو احساس ہو گیا کہ کپڑے اندر تک بالکل بھیگ گئے ہیں اور اُس نے حسرت سے اپنے چاروں طرف ایک نظر ڈالی —— ایک بے زبان جانور کی سی حسرتناک نظر جو یہ نہ جانتا ہو کہ اپنے جسم یا سر کو کہاں چھپائے اور دنیا میں کہاں پناہ لے۔

رات نے تاریکی میں کھیتوں کو پوشیدہ کر دیا۔ کچھ فاصلے پر ایک مرغزار میں اُسے ایک سیاہ ٹیلہ سا نظر پڑا —— گائے! وہ گڑھے پر سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بغیر کسی خیال کے وہ کر کیا رہا ہے، گائے کی طرف جانے لگا۔

جونہی وہ قریب پہونچا گائے نے اپنا سر اُٹھایا اور دل سوچنے لگا: "کاش ایک کٹورا ہی ہوتا تو کچھ دودھ پی لیتا" وہ گائے کو گھور کر دیکھنے لگا اور گائے اُس کو گھورنے لگی۔ اس کے بعد یکایک اُس نے زور سے ایک لات لگائی اور کہا "اُٹھو!" گائے آہستہ آہستہ اُٹھ گئی اور اُس کا وزنی تھن لٹکنے لگا۔ اِس کے بعد وہ اُس کی ٹانگوں کے درمیان چت لیٹ گیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اُس کے گرم اور متعفن تھنوں کو دباکر بہت دیر تک دودھ پیتا رہا۔

لیکن برفیلی بارش اور زور سے ہونے لگی اُسے سردی لگ رہی تھی اور وہ ٹکٹکی باندھے ہوئے اُسی مکان کو دیکھ رہا تھا جس کے دریچے کی روشنی درختوں میں سے چھن چھن کر آرہی تھی۔

گائے پھر دوبارہ بیٹھ چکی تھی۔ وہ بھی اُس کے نزدیک بیٹھ گیا اور اُس کی دی ہوئی غذا کے شکریہ میں اُس کا سر سہلانے لگا۔ شام کی سرد ہوا میں گائے کی کثیف اور بدبودار سانس اُس کے نتھنوں سے اس طرح نکل کر جیسے دو نلکیوں سے بھاپ نکلے، اس کے منھ پر لگ رہی تھی۔

"تجھے تو سردی نہیں لگ رہی ہے؟" اُس نے کہا۔

پھر وہ اپنے ہاتھ اُس کے سینے اور ٹانگوں پر پھیرنے لگا تاکہ گرم ہو جائیں۔ پھر اُسے اُس کے گرم پیٹ کے نزدیک گٹھری بن کر لیٹنے اور رات گزار دینے کا خیال پیدا ہوا۔ اُس نے جگہ نکال کر اپنا سر اُس کے تھن کے قریب جو ابھی خالی ہوا تھا رکھ دیا اور پھر تھک کر چوُر چوُر ہونے کے باعث اُس کی آنکھ لگ گئی۔

کئی مرتبہ وہ پشت یا سینہ اکڑ جانے کی وجہ سے جاگ اُٹھا اور پھر دوسرے حصۂ جسم کو جو ہوا کے رُخ پر تھا جانور کے جسم سے لگا کر فوراً ہی غافل سو گیا۔

مُرغِ سحر کی بانگ نے اُسے بیدار کر دیا۔ صبح ہو رہی تھی بارش رُک چکی تھی اور مطلع بالکل صاف تھا۔

گائے اپنی تھوتھنی زمین پر لٹکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس نے ہاتھوں کے بل جھک کر اس کی چوڑی ناک کا بوسہ لیا۔ "خدا حافظ۔ میری سندری" اُس نے کہا — "تو بڑی اچھی گائے ہے — خدا حافظ۔"

اس کے بعد اُس نے پھٹا کوٹ پہنا اور چل کھڑا ہوا۔

دو گھنٹے تک وہ سیدھا ایک ہی سڑک پر چلتا رہا۔ اس کے بعد کچھ ایسا تھک گیا کہ بے اختیار ہو کر گھاس پر بیٹھ گیا۔

اب دن نکل چکا تھا کلیسا کے گھنٹے بج رہے تھے اور عورتیں سفید ٹوپیاں اور مرد نیلا لباس پہنکر پیادہ پا گاڑیوں میں ہمسایہ گاؤں کی طرف اتوار کا دن اپنے دوستوں یا عزیزوں کے ساتھ گزارنے کے لئے جانے لگے۔

ایک موٹا کاشتکار تقریباً بیس بھیڑوں کو جن کی تنظیم اور باقاعدگی ایک تیز قدم کُتّے کے ذمہ تھی ہانکتا ہوا چلا جارہا تھا راؤل نے اُٹھکر سلام کیا اور کہا۔ "کیا آپ کے پاس کچھ کام مل سکتا ہے؟ —— ایک ایسے مزدور کے لئے جو بھوکوں مر رہا ہو" اس نے بُری نظروں سے دیکھکر کہا "میرے پاس اُن لوگوں کو جو سڑک پر ملا کرتے ہیں کوئی کام نہیں"۔

نجار پھر دوبارہ سڑک پر بیٹھ گیا۔

وہ بہت دیر تک گاؤں والوں کو دیکھتا رہا کہ کوئی اچھی، مہربان شکل والا نظر آئے تو پھر اُس سے درخواست کرے۔

اُس نے ایک بڑے آدمی کو جو فراک کوٹ پہنے ہوئے تھا اور ایک طلائی زنجیر اُس کے پیٹ پر پڑی ہوئی تھی منتخب کیا۔ اس نے کہا۔ "میں دو ماہ سے روزگار تلاش کر رہا ہوں۔ ابتک کوئی نوکری نہیں ملی اور اب میری جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں ہے"۔

مالدار آدمی نے جواب دیا۔ "کیا تم نے وہ اعلان جو اِس ضلع کے حدود پر چسپاں ہے نہیں پڑھا کہ یہاں بھیک کی ممانعت ہے، میں یہاں کا حاکم ہوں اور تم سے کہتا ہوں کہ اگر تم یہاں سے فوراً نہ چلے گئے تو میں تم کو گرفتار کروادونگا۔

راؤل کا ضبط رخصت ہوتا جارہا تھا اس نے جھلا کر کہا۔ "اگر آپ چاہتے ہیں تو مجھے گرفتار کرلیجئے، کم از کم میں بھوکا تو نہ مروں گا" اور وہ پھر دوبارہ سڑک پر بیٹھ گیا۔

پندرہ منٹ بعد دو پولیس کے سپاہی سڑک پر آتے ہوئے نظر پڑے۔ وہ خراماں خراماں، ساتھ ساتھ آرہے تھے۔ سورج کی کرنیں اُن کی چمکیلی چرمی ٹوپیوں، زرد چہروں اور برنجی کلغیوں پر پڑ رہی تھیں اور وہ ایسے رعب وداب سے چل رہے تھے گویا کہ وہ مجرموں کو ڈرانے اور اُن کو خوفزدہ کرکے بھگا دینے کے لئے آرہے ہیں۔

نجار سمجھ گیا کہ وہ اُس کے لئے آرہے ہیں لیکن وہ اُسی طرح خاموش بیٹھا رہا۔ اُس کو اُن کا مقابلہ کرنے کی خواہش پیدا ہوئی تاکہ وہ گرفتار کرلیں۔ اپنا بدلہ وہ بعد میں لیتا رہے گا۔

اپنے خاص فوجی انداز سے بے ڈھنگے قدم رکھتے ہوئے —— بطخ کی طرح —— وہ اس طرح چلے آرہے تھے گویا کہ اُنھوں نے اُس کو دیکھا ہی نہیں ہے۔ پھر یکایک اُس کے قریب سے گزرتے ہوئے اُنھوں نے اُس کو دیکھا، ٹھٹکے، اور اُس کو دہمکی دینے والی پُرخشونت آنکھوں سے گھورنے لگے۔ سارجنٹ پوچھتا ہوا آگے بڑھا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"سستا رہا ہوں" اُس نے خاموشی سے جواب دیا۔

"تم آ کہاں سے رہے ہو؟"

"اگر میں تم کو اُن سارے مقامات کے نام بتلاؤں جہاں جہاں سے میرا گزر ہوا ہے تو کامل ایک گھنٹہ لگ جائیگا۔"

"جاؤ گے کس جگہ؟"

"ولیاوری کو"

"وہ کہاں ہے؟"

"ماتشی میں"

"کیا وہ تمھارا وطن ہے؟"

"ہاں"۔

"تم نے اُس کو چھوڑا کیوں تھا؟"

"تلاش معاش کی خاطر"

سارجنٹ کانسٹبل کی طرف مڑا اور اُس شخص کے لہجے میں جو ایک ہی قسم کی جھوٹی بات متعدد مرتبہ سُنکر بھڑک اُٹھا ہو، چلّایا:-

"سب بدمعاش یہی کہتے ہیں۔ لیکن میں اُن کی چالوں کو سمجھتا ہوں۔"

اس کے بعد اُس نے پوچھا:-

"تمھارے پاس کچھ کاغذات ہیں؟"

"ہاں"

"مجھے دکھاؤ"

راڈل نے اپنی جیب سے کاغذات نکالے —— سارٹیفکٹ، میلے، بوسیدہ، پھٹے پُرانے کاغذات، اور اُن کو افسر کے حوالے کر دیا۔

دوسرے نے اٹک اٹک کر پس و پیش کرتے ہوئے، ہجے کر کے پڑھا اور ساتھ ہی اُنکو ٹھیک ظاہر کرتے ہوئے جھنجھلا کر اس طرح واپس کر دیا جیسے کسی شخص کو اُس سے زیادہ مکّار آدمی نے دھوکا دیا ہو۔

چند منٹ غور کرنے کے بعد اُس نے پھر اپنی تفتیش شروع کر دی:-

"تمھارے پاس کچھ رقم ہے؟"

"نہیں"

"کچھ بھی نہیں"۔

"ایک پیسہ نہیں؟"

"ایک پیسہ نہیں"

"پھر تمھاری گزر کیسے ہو رہی ہے؟"

"جو کچھ مل جاتا ہے اُس پر"۔

"تو تم بھیک مانگتے ہو؟"

"ہاں جب ضرورت پڑے"۔ راؤل نے بغیر کسی جھجک کے جواب دیا۔

لیکن سپاہی نے کہا۔ "میں تم کو آوارہ گردی اور شاہراہ عام پر بھیک مانگنے کی "علت" میں گرفتار کرتا ہوں۔ کیونکہ نہ تو تمھارا گھر ہے اور نہ کوئی وجہ معاش۔ اور تم کو اپنے ہمراہ چلنے کا حکم دیتا ہوں"۔

نجار اُٹھ کھڑا ہوا۔

"جہاں چاہو لے چلو"۔ اُس نے کہا اور اپنے آپ کو دونوں افسروں کے درمیان کر کے گو انھوں نے ابھی اِس کا حکم نہ دیا، اُس نے اپنی بات اس طرح پوری کر دی:۔

"چلو مجھے قید کر دو۔ جب بارش ہوگی تو سر چھپانے کا تو آسرا رہے گا"۔

وہ گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے جس کے مکانوں کی چھتیں پون میل کے فاصلے سے بے برگ اشجار میں سے نظر آ رہی تھیں۔

جب وہ گاؤں میں سے گزر رہے تھے تو نماز کا وقت تھا۔ چوک آدمیوں سے پُر تھا۔ فوراً ہی ان کی دو قطاریں مجرم کو جاتا دیکھنے کے لئے بن گئیں جس کے ساتھ شریر لڑکوں کی ایک پوری فوج تھی۔ مرد اور عورت سب قیدی کو نفرت کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ وہ اُسکو سنگسار کر دینا چاہتے تھے، اُس کی کھال کو ناخنوں سے نوچ نوچ کر اُس کو قدموں سے کچل ڈالنا چاہتے تھے۔ اُن کو حیرت تھی کہ آیا وہ چور ہے یا کوئی قاتل۔ قصاب جو ایک پُرانا تجربہ کار سپاہی تھا کہنے لگا:۔ "وہ زانی ہے"۔ تمباکو فروش کا خیال تھا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے اُسے ایک کھوٹی چونی دی تھی۔ اور لوہار کو یقین تھا کہ بیوہ مالٹ کا لاپتہ قاتل جس کی تلاش پولیس چھ ماہ سے کر رہی تھی یہی تھا۔

میونسپل کونسل روم میں جہاں کہ پولیس والے اُسے لائے تھے راؤل نے حاکم کو اجلاس پر اور اُس کے پہلو میں مدرس کو بیٹھے دیکھا۔

مجسٹریٹ نے کہا :۔ "آہا! آخر تم آگئے میں نے کہا تھا کہ تم کو قید کر دیا جائیگا۔ اچھا سارجنٹ واقعہ کیا ہے؟"

سارجنٹ بولا :۔ "ایک آوارہ گرد جس کا نہ کوئی ٹھکانہ ہے اور نہ ظاہری اسباب گزراوقات۔ اُس کو اپنے بیان کے مطابق آوارہ گردی اور بھیک مانگنے کی علت میں گرفتار کیا گیا ہے۔ اُس کے پاس سارٹیفکٹ اچھی حالت میں موجود ہیں۔"

مجسٹریٹ نے کہا :۔ "مجھے کاغذات دکھاؤ۔" اُن کو اُس نے لے لیا، پڑھا، پھر دوبارہ پڑھا۔ اور واپس کرتے ہوئے حکم دیا :۔ "اس کی تلاشی لو۔" راڈل کی تلاشی لی گئی۔ کچھ بھی برآمد نہ ہوا۔

"آج صبح کو تم سڑک پر کیا کر رہے تھے؟" اُس نے مزدور سے دریافت کیا۔

"میں کام کی تلاش میں تھا۔"

"کام کی تلاش ——— شاہراہ عام پر؟"

"تو پھر کیا جنگل میں چھپ کر تلاش کرنے سے مجھے کام مل جاتا؟"

دونوں ایک دوسرے کو دو مختلف النسل درندوں کی حریفانہ نفرت سے گھورنے لگے۔

مجسٹریٹ نے کہا :۔ "اب تو میں تمھیں چھوڑے دیتا ہوں لیکن پھر دوبارہ ایسی حرکت نہ کرنا۔"

"آپ قید ہی کر دیں تو بہتر ہے۔" نجار نے جواب دیا۔ "میں سڑکوں پر بہت کافی گھوم چکا۔"

"خاموش!" حاکم نے درشتی سے کہا۔

اس کے بعد اُس نے پولیس والوں کو حکم دیا :۔ "اس کو گاؤں سے دو میل کے فاصلہ پر لیجا کر چھوڑ دو۔"

"کم از کم مجھے کھانے کو تو کچھ دیجئے۔" مزدور نے کہا۔

وہ غضبناک ہو گیا :۔ "کھانا کھلایا جائے ابھی تو باقی رہ گیا ہے۔ آہا! ہا! ہا! خوب!"

لیکن راڈل بغیر کسی جھجک کے کہتا رہا :۔ "مجھے بھوکوں مرنے کے لئے چھوڑنا گویا جرم کا ارتکاب کرنے پر مجبور کرنا ہے اور یہ تم بڑے بڑے توندوالوں کے لئے اچھا نہ ثابت ہوگا۔"

مجسٹریٹ کھڑا ہو گیا تھا اُس نے اپنا حکم دہرایا :۔ "اس کو یہاں سے جلد لیجاؤ۔ ورنہ مجھے غصہ آجائے گا۔"

دونوں پولیس والوں نے نجار کے بازو پکڑے اور روانہ ہو گئے۔ اُس نے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی۔

گاؤں سے نکل کر پھر ایک مرتبہ اُس نے اپنے آپ کو اُسی سڑک پر پایا۔ پولیس والے اُس کو دو میل تک لے گئے اور وہاں پہونچکر سارجنٹ نے کہا :۔

"چل رفو چکر ہوجا ــــ اِس علاقے میں پھر قدم نہ رکھنا ورنہ میں پھر ٹھیک کردوں گا۔"

راڈل جواب دیئے بغیر اور اس سے بیخبر کہ وہ کہاں جارہا ہے چل کھڑا ہوا۔ وہ سید ہا پندرہ یا بیس منٹ تک کچھ ایسی بدحواسی کے عالم میں چلتا رہا کہ کچھ سوچ ہی نہ سکتا تھا۔

لیکن یکایک جب وہ ایک چھوٹے سے مکان کے قریب سے جس کا نصف دریچہ کھُلا ہوا تھا گزرا تو قورمہ کی مہک نے اُس کو کشاں کشاں دروازے کے سامنے لاکھڑا کیا۔

بھوک، حریصانہ، وحشیانہ اور دیوانہ کردینے والی بھوک نے اس کے حواس سلب کرلئے۔

"خدایا! کی دفعہ اُن کو کچھ نہ کچھ دینا" پڑیگا"؟ اُس نے زور سے فریاد کناں لہجے میں کہا اور دروازے کو اپنی چھڑی سے کھٹ کھٹایا۔

کسی نے جواب نہ دیا۔ اُس نے چیختے ہوئے زور سے کھٹ کھٹایا: "ارے کوئی ہے؟ دروازہ کھولو!"

اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ اُس نے دریچے کے پاس جاکر اُس کو اپنے ہاتھ سے ڈھکیلا اور باورچی خانے کی مقید ہوا، گرم گرم قورمے اور گوبھی کی مہک باہر آنے لگی۔

ایک چھلانگ میں نجار کمرے کے اندر تھا۔ میز پر دو نشستیں تھیں۔ مکان والے اپنے کھانوں کو چولہے پر رکھ کر نماز کے لئے گئے ہوئے تھے۔ شراب کی دو بوتلوں کے درمیان روٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔

راڈل نے پہلے روٹیوں پر حملہ کیا اور اس بے رحمی سے اُن کو توڑنے لگا گویا کسی آدمی کا ٹیٹوا دبا رہا ہے۔ اس کے بعد وہ حریصانہ بڑے بڑے لقمے بنا کر کھانے لگا۔ لیکن فوراً ہی اُسے گوشت کی خوشبو چولہے کی طرف لیگئی اور اُس نے دیگچی پر سے تھالی اُٹھا کر کانٹے کو جلدی سے اندر ڈالا اور گوشت کا ایک بڑا ٹکڑا نکالا۔ اس کے بعد اُس نے گوبھی، گاجر اور پیاز سے رکابی بھرلی اور اُس کو میز پر رکھ کر خود بیٹھ گیا۔ گوشت کے چار ٹکڑے کئے اور اس طرح کھانے لگا گویا اپنا ہی گھر ہے۔ جب اُس نے تقریباً سارا گوشت اور ترکاری کی کافی مقدار چٹ کردی تو اُس کو تشنگی محسوس ہوئی اور وہ اُٹھ کر چولہے کے قریب سے ایک بوتل اُٹھا لایا۔

جونہی اُس نے شراب کو اپنے جام میں دیکھا اُس نے تاڑ لیا کہ برانڈی ہے ــــ شراب گرم ــــ اُسکی رگ رگ میں آگ لگا دینے والی! اسقدر سردی سہنے کے بعد یہ چیز اچھی رہی ــــ اور وہ پینے لگا۔

چونکہ مدت سے اُس نے نہیں پی تھی اس لئے وہ اُس کو بہت اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ دوسرا جام اُس نے بھرا اور دو گھونٹ میں چڑھا گیا۔ یکایک اُس کے چہرے پر رونق آگئی۔

وہ کھاتا رہا لیکن نسبتاً کم تیزی سے، چبا چبا کر اور روٹی کو شوربے میں تر کر کے۔ اُس کا سارا جسم خاص کر پیشانی جہاں خون کی روانی بہت تیز ہوگئی تھی، نہایت گرم تھی۔ یکایک فاصلے پر گھنٹے بجنے لگے، نماز ختم ہو رہی تھی۔ نجار دفعتاً کھڑا ہوگیا اور بچی ہوئی روٹی کو ایک جیب میں اور برانڈی کی بوتل کو دوسری میں رکھ کر لمبے ڈگ بھرتا ہوا دریچے کے پاس گیا اور باہر سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔

سڑک پر اب بھی سناٹا تھا۔ وہ چھلانگ مار کر باہر نکل گیا اور اپنی راہ ہولیا۔ لیکن بجائے شاہراہ عام پر جانے کے وہ کھیتوں میں سے جنگل کی سمت بھاگنے لگا۔

وہ مستعد، قوی اور بشاش معلوم ہو رہا تھا۔ اب وہ ایسا پھرتیلا ہوگیا تھا کہ کھیتوں کی درمیانی باڑھ سے دونوں پاؤں ملا کر ایک چھلانگ میں کود گیا۔

جونہی وہ درختوں کے نیچے پہونچا اُس نے جیب سے بوتل نکالی اور چلتے چلتے پینے لگا۔ اس کے بعد اُس کے خیالات پریشان ہوگئے۔ آنکھوں کے سامنے دھندلکا سا آگیا اور اُس کی ٹانگیں ایسی لچکیلی ہوگئیں جیسے کمانی۔

اب وہ خنک اور تر کائی پر چل رہا تھا اور اس فرش مخملی کو دیکھ کر ایک بچے کی طرح بے اختیارانہ اُس کا دل کودنے کو چاہنے لگا۔ اُس نے ایک دوڑ لگائی، سر نیچے اور پاؤں اوپر کر دئے، اُچھل کر کھڑا ہوگیا اور پھر اُسی طرح قلہ بازیاں لگانے لگا۔

یکایک اُس نے اپنے آپ کو ایک تنگ گلی میں پایا اور ایک ماما کو دیکھا جو اپنے ہاتھوں میں دو برتن دودھ سے لبریز لئے ہوئے گاؤں کو واپس جا رہی تھی۔

وہ آگے کی طرف جھکا ہوا اُس کو گھورنے لگا اور اُس کی آنکھیں کُتے کی طرح جیسے اپنا شکار دیکھ لیا ہو چمکنے لگیں۔ ماما کی بھی اُس پر نظر پڑی، اُس نے سر اُٹھایا، کھل کھلا کر ہنس پڑی اور پکار کر کہنے لگی: "کیا تم گا رہے تھے؟"

اُس نے کچھ جواب نہ دیا اور نالے میں کود پڑا اگرچہ اُس کا کنارا چھ فٹ بلند تھا۔

"اللہ! تم نے تو مجھے ڈرا دیا!" یکایک اُس کو اپنے سامنے کھڑا ہوا دیکھ کر ماما نے کہا۔

لیکن اُس نے اُس کی بات مطلق نہ سُنی۔ وہ پئے ہوئے تھا۔ اُس کے حواس ایک جذبہ نے جو بھوک سے بدرجہا زیادہ تکلیف دہ تھا سلب کر لئے تھے۔ شراب اور ایک بے قابو کر دینے والی خواہش نے اُس شخص کی طرح جو دو مہینے سے لذاتِ دنیوی سے محروم کر دیا گیا ہو، جو مدہوش ہو، نوجوان ہو، پرجوش ہو، اور جس کے جسم میں فطرت کی پیدا کی ہوئی تمام خواہشات نے آگ لگا رکھی ہو، اُس کو پاگل بنا دیا۔

لڑکی اُس کی صورت، اُس کی آنکھوں، اُس کے نصف کھُلے ہوئے مُنھ اور اُس کے پھیلے بازوؤں سے خوفزدہ ہوکر پیچھے ہٹی۔

راڈل نے اُس کے بازو پکڑلئے اور ایک لفظ کہے بغیر اُس کو سڑک پر ڈال دیا۔ برتن اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑے۔ اس کے بعد وہ چیخنے لگی۔ پھر یہ دیکھ کر کہ اُس سنسان مقام پر جنہیں لا حاصل ہے اور اب اچھی طرح یہ سمجھ جانے کے بعد کہ وہ اُسکی زندگی کا درپے نہیں، اُس نے اپنی نارضامندی کا کچھ زیادہ اظہار نہیں کیا۔

جب وہ اُٹھی تو گرے ہوئے برتنوں کے خیال سے یکایک اُسے غصہ آگیا اور اپنے پاؤں سے کھڑاؤں اُتار کر اُس کی طرف جھپٹی کہ اگر وہ دودھ کے پیسے نہ دے تو مار مار کر اُس کا بھُرکس نکال دے۔

لیکن راڈل — جس کا نشہ اب ہرن ہوچکا تھا اور اپنے کئے پر بے انتہا خوفزدہ تھا، اُس کے حملے کی اصلی غایت کو نہ سمجھ کر، سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ اور وہ پتھر پھینکنے لگی جس میں سے چند اُسکی پُشت پر لگے۔

وہ بہت دیر تک بھاگتا رہا۔ اس کے بعد اُسے کچھ ایسی تھکن محسوس ہونے لگی جو اُسے زندگی بھر نہ ہوئی تھی اُس کی ٹانگیں کمزور ہوگئیں اور سر گھومنے لگا۔ جو کچھ گزر چکا تھا سب اُس کے دماغ سے محو ہوگیا اور کچھ سوچنے اور غور کرنے کے قابل نہ رہا۔

وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔

پانچ منٹ بعد وہ غافل سو رہا تھا۔

وہ چونک کر جاگ اُٹھا۔ اور آنکھیں ملتے ہوئے اُس نے دو چمکیلی چرمی ٹوپیوں والے آدمیوں کو اپنے اوپر جھکا ہوا اور پکڑ کر مشکیں باندھتے ہوئے دیکھا۔

"میں جانتا تھا کہ تم کو دوبارہ گرفتار کرنا پڑے گا" سارجنٹ نے طنز سے کہا۔

راڈل نے کوئی جواب نہ دیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ پولیس والوں نے اُس کو جھنجوڑا اور اگر وہ صدائے احتجاج بلند کرتا تو وہ سختی کا سلوک کرنے کو تیار تھے کیونکہ اب وہ اُن کا شکار تھا — اچھا شکار — اِن مجرموں کے شکاریوں کا کیا ہوا قید خانے کا شکار، جس کو وہ دوبارہ نہیں چھوڑنے والے تھے۔

"چلو!" سارجنٹ نے حکم دیا۔

سب روانہ ہوگئے۔ شام ہورہی تھی۔ موسم خزاں کی اُداس اور نامبارک شفق حدِ نظر تک پھیل چکی تھی۔

آدھے گھنٹہ میں وہ گاؤں پہونچ گئے۔

ہر گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا کیونکہ جو کچھ ہوا تھا اُس سے ہر شخص واقف تھا اور سب اُس بدبخت کو دیکھنے کے لئے بے چین تھے تاکہ اُس پر گالیوں کی بوچھار کی جاسکے۔

ہنگامہ شور و غل پہلے مکان سے شروع ہو کر ٹاؤن ہال کے پاس ختم ہوا جہاں حاکم بھی اس آوارہ گرد سے اپنا بدلہ لینے کے لئے منتظر بیٹھا تھا۔

جونہی اُس کی نظر راڈل پر پڑی وہ دور ہی سے چلّایا:۔

"آہا! تم آگئے؟"

اور فرطِ مسرت سے اپنے ہاتھ ملنے لگا۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا" اُس نے کہا۔ "صرف سڑک پر دیکھ کر میں سمجھ چکا تھا" اور اپنی بات پوری کرتے ہوئے اُس نے اور زیادہ مسرت سے کہا:۔

"تجھے حبسِ دوام کی سزا دی جائے گی۔ بدمعاش!"

(موپاساں)		سید محمد احسن بی۔اے

---

# مکتوبات نیاز

عزیز گرامی۔

یہ درست ہے کہ شیوۂ محبت کا واقف آپ سے زیادہ کون ہوسکتا ہے، لیکن خدارا، یہ تو بتائیے کہ آپ کے یہاں "جُرمِ محبت" بھی کوئی چیز ہے یا نہیں۔ ہاں، ہاں، کہدیجئے کہ آپ کی معصوم دنیا میں اس کا کیا گزر۔

مہینوں گزر جائیں آپ میری بات نہ پوچھیں۔ یہ عین اُلفت! میں آپ کی تمام بے اعتنائیوں کے باوجود رات دن آپ ہی کا دم بھرتا رہوں، یہ سراسر جُرمِ محبت!

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد  
جو چاہے آپ کا حُسن کرشمہ ساز کرے

بیس دن ہوئے آپ کو میں نے ایک نہایت ضروری خط لکھ کر چند باتیں دریافت کیں، اس کے بعد متواتر دو بار یاد دہانی کی، لیکن نہ آپ نے میرے اضطرار کی پرواہ کی اور نہ اس امر کی کہ آپ اگر ذرا توجہ کر کے اُن اُمور کے متعلق تفصیلی حالات لکھ دیتے تو میرا کتنا فائدہ تھا ــــ بہرحال اب کہ وقت گزر گیا ہے، یہ شکایت بالکل بیکار ہے کیونکہ اگر آپ اب جواب بھی دیں تو کوئی نتیجہ نہیں لیکن اس خیال سے کہ شاید آپکو میرا دل توڑ کر، میرا نقصان کر کے کچھ مسرت ہو، یہ اطلاع دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ بحمداللہ ان دونوں باتوں میں کامیاب ہوگئے اور جو کام آپنے کیا ہے وہ شاید ہی رستم و اسفندیار سے ہوسکتا۔

شاید آپ اس تحریر کا جواب دیں، لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ اب میرا دورِ سکوت و پندار شروع ہوگیا ہے۔ اس کے بعد بھی آپ جرأتِ خطاب کریں تو آپ جانئے۔

---

صاحب الطافِ عمیم ـ القاب و آداب کا یہ اہتمام صرف اس لئے ہے کہ آپ چاپلوسی کے فریب میں آجائیں اور میری خطا کو درگزر فرمادیں۔ باور کیجئے میں حد درجہ نادم ہوں کہ آپ نے ساری عمر میں ایک خدمت میرے سپرد

فرمائی اور وہ بھی مجھ سے بروقت انجام نہ پاسکی۔ مصروفیت وغیرہ کا عذر تو خیر بالکل لایعنی سی بات ہے، لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ باوجود کوشش کے بھی اس طرف طبیعت مائل نہ ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ مسودہ کو اسی کیفیت کے ساتھ دیکھوں جس کے ماتحت آپ نے لکھا ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ آخرکار مجبوراً آورد وتصنع سے کام لینا پڑا اور اب انتہائی شرمندگی کے ساتھ اُسے واپس کر رہا ہوں ـــــ غالباً آپ کو اطمینان نہ ہوگا لیکن مجھے اس حد تک ضرور اطمینان ہے کہ زبان ولغت کی غلطی تو اب کوئی ہے نہیں۔ رہ گیا سوال بیان ومعانی کا، سو اس کی پرواہ نہ کیجئے کہ لوگوں نے ملہمات ربانی کو بھی مجروح کئے بغیر نہیں چھوڑا، اور کسی تصنیف کا کیا ذکر ہے۔ جو کچھ میں لکھ رہا ہوں، خدا کرے آپ کو اس کا یقین ہو جائے اور اس کا یقین مجھے صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ آپ اس کے جواب میں پروانۂ معافی بھیج دیں۔ اس خط کو کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ڈاک میں ڈال رہا ہوں اور اس کے جواب کو اس سے بھی زیادہ لرزاں ہاتھوں سے کھولوں گا۔

---

واللہ، آپ بھی قیامت کرتے ہیں، کہ میرا "پائے لنگ" چھین کر "دلِ تنگ" مرحمت فرمانا چاہتے ہیں۔ آپ کی چارہ سازیوں کا شکریہ، لیکن میرا اُن سے فائدہ اُٹھانا معلوم! یقیناً آپ کو میری بیکسی وبیچارگی پر رحم آنا چاہئے، لیکن باور کیجئے کہ میں رحم کے قابل نہیں ہوں اور اتنا خانماں برباد نہیں جتنا آپ سمجھتے ہیں۔

عشق ہر جا می رود ما را بہ ساماں می برد

فرق اگر ہے تو صرف اتنا کہ آپ کے یہاں زندگی نام ہے مرغ وماہی کا، دیبا وحریر کا، خدم وحشم کا، ایوان وقصور کا، مے ونغمہ کا، یہاں "برگ وساز" عبارت ہے صرف اس فلسفہ سے کہ

رخت اگر کمتر بود کشتی بہ ساحل می برند

آپ کو اپنی اہمیت کا علم اس طرح ہوا کہ دوسرے ایسا کہتے ہیں، اور میری غیر اہمیت مجھ پر اس طرح القا ہوئی

مرا کردہ اند آشکارا بہ من

اللہ اللہ کیجئے، آپ بھی کس فکر میں مبتلا ہو گئے ـــــ آپ کیوں دیوانوں کا ساتھ دے کر اپنی زندگی کا لطف ضایع کرتے ہیں

با دلشدگاں ہر کہ در افتاد بر افتاد

---

محب دلنواز، آپ کا پیام، اختر کے ذریعہ سے پہونچا، مجھے تعمیل ارشاد میں کیا عذر ہو سکتا ہے، مگر سوچ لیجئے کہیں ایسا نہ ہو اس کا نتیجہ خلاف امید نکلے، میرا تو اس میں کوئی نقصان نہیں، جاتا ہے اور سچ سچ سارا واقعہ عرض کر دینا ہے، لیکن اگر انھوں نے صرف اس وجہ سے باور نہ کیا کہ روایت کرنے والا میں ہوں تو پھر کیا ہوگا۔ آپ کو معلوم نہیں، میں ہمیشہ سے ان کے نزدیک مجروح راوی کی حیثیت رکھتا ہوں، یہاں تک کہ اگر میں کہدوں خدا ایک ہے تو انھیں توحید میں بھی شک پڑ جائے گا، پھر کیوں نہ یہ خدمت آپ مولانا ذاکر کے سپرد فرمائیں جو اُن کے نزدیک مخبر صادق کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ آپ کہیں گے ان پر اعتبار مشکل ہے، سو اس کی ترکیب یہ ہے کہ محسن صاحب کو بھی ان کی معیت میں بھیجدیجئے۔

بہر حال مجھے امتثال امر میں عذر نہیں، لیکن کیا فائدہ اگر نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا۔ جواب کا منتظر ہوں۔

---

نگاہِ اولیں اور اس درجہ گرم و ستیزہ کار! معاذ اللہ! لیکن شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ان نیشتروں کی خلش مجھے کس حد تک گوارا ہے۔

آپ "بہ اندازہ ہوش" کی ہدایت فرماتے ہیں اور یہاں یہ عالم ہے کہ

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

آپ مجھے "کل" سے کیوں ڈراتے ہیں، جبکہ میں آج ہی سب کچھ آپ کے "پندار" پر قربان کر چکا ہوں۔
خدا وہ دن تو کرے کہ آپ اس ساز و سامان سے مجھے تباہ کرنے کے لئے تشریف لائیں۔

اے سنگ بر تو دعوئے طاقت مسلم ست
خود را ندیدۂ بہ کفِ شیشہ گر ہنوز

محمود صاحب سے کہدیجئے کہ انھوں نے لکھنؤ میں مجھے اسی چیز سے محروم رکھا جو میرا تنہا سرمایۂ حیات ہے، اور پھر اُس پر آپ کا یہ ظلم کہ مجھی سے اس کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ ہاں صاحب، چھایا کا خیال سنئے، ساون کی ملاریں سر دھنئے، ہولیاں کھیلئے، رنگ رلیاں منائیے، یہاں کیا ہے، وہی ایک داغِ نارسائی یا پھر

دستے کہ بجز جامہ دریدن نہ شناسد!

---

پیرومرشد، یہ کیا خیال ذہن مبارک میں آیا؟ میں اور آپ سے سرتابی! ذرہ و آفتاب کی دنیا میں یہ بات تو کبھی نہیں سنی گئی۔ کاہ و کاہربا کی حکایت میں یہ واقعہ تو آج تک کسی نے بیان نہیں کیا!

آپ کی محبت میرا ایمان اور آپ کا آستانہ میرا کعبۂ ایقان ہے، پھر

اے دامن تو قبلۂ مشتِ غبارِ من

یہ آپ نے کیونکر باور کرلیا کہ میں آپ سے منحرف ہوکر زندہ رہ سکتا ہوں۔ مجھے اس سے زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں، آپ خود روشن ضمیر ہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ

در کوئے یار، بندۂ فرمانبرم ہنوز

---

سوزاں چو شمع بودن، دانی کرمی توانم

داغ از دلم زدودن؛ دانی کرمی توانی؟

یعنی بجائے خود یہ حقیقت تو مسلم ہے کہ میں آپ سے کبھی بے تعلق نہیں ہوسکتا، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا آپ کو بھی اس کا علم ہے یا نہیں؟ کہدیجئے، کیوں نہیں؟ اور پھر اس کے بعد خاموشی اختیار کرلیجئے یہاں تک کہ آہ و فریاد کی تمام طاقت مجھ سے سلب ہوجائے۔ پے در پے چار عریضے روانہ کئے لیکن کوئی اعتنا نہیں، دو تار بھیجے، مطلق پرواہ نہیں، خاص طور پر آدمی بھیجا مگر جواب ندارد۔ اس بے توجہی سے تو خدا کی خدائی بھی نہیں چل سکتی، کارگاہِ "عشق و جمال" کا کیا ذکر ہے! آپ کہیں گے کہ یہ سب جھوٹ ہے، نہ اس سے پہلے کوئی خط آپ کو ملا نہ تار، نہ کوئی آدمی پہونچا نہ تقاضہ۔ یہ سب درست سہی، لیکن میں تو مستقبل کا ذکر کررہا ہوں اور جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ ہوکر رہیگا۔ اس لئے اس کی تکذیب کی صورت اگر ہوسکتی ہے تو صرف یہ کہ آپ فوراً جواب دیں اور نصیر کی روانگی کی تاریخ وہیں سے متعین کرکے اس بارے مجھے سبکدوش فرمائیں۔ اُن کے حقوق آپ پر بھی اتنے ہی ہیں جتنے مجھ پر، اور پھر آپ مجھ سے زیادہ دردمند دل رکھنے کے مدعی بھی ہیں، اس لئے معاملہ احسان و مراعات کا نہیں بلکہ ادائے فرض و رعایتِ فطرت کا ہے، جسے آپ مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔

---

کل ایک صاحب تشریف لائے اور تمھارے متعلق عجیب و غریب خبر سُنائی، وہ یہ کہ تم نے اپنی بیوی کو

طلاق دیدی ہے اور دوسری شادی کرنے والے ہو۔ پھر اگر معاملہ صرف طلاق کا ہوتا تو بھی غنیمت تھا۔ لیکن یہ عقد ثانی کی ترکیب بالکل سمجھ میں نہ آئی میں تمھاری طوفانی طبیعت سے واقف ہوں اور جانتا ہوں کہ جذبات سے مغلوب ہو کر تم اس سے بھی زیادہ نازیبا حرکت کے مرتکب ہو سکتے ہو، لیکن اس سے بھی آگاہ ہوں کہ جب جنون دور ہو جاتا ہے تو فرشتہ بھی تمھارے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اول تو خدا کرے تم اس خبر کی تردید کردو، لیکن اگر خدانخواستہ یہ واقعہ صحیح ہے تو اطلاع دو تاکہ دل کھول کر تمھیں گالیاں دے سکوں۔

ہرچند یہ تمھاری زندگی کا کوئی نیا تجربہ نہیں اور اسوقت تک تم کئی بار اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت اس طرح دے چکے ہو، لیکن غیر ہر بار کوئی نہ کوئی معقول سبب تمھاری خوش قسمتی سے پیدا ہو جاتا تھا، اس مرتبہ تو کوئی تاویل ہو ہی نہیں سکتی، سوائے اس کے کہ تم دفعتہً انسان سے جانور بن گئے ہو۔ بہرحال مجھے سخت خلجان ہے اور اگر تمھارا ہیجان دور ہو گیا ہو تو مفصل حالات سے آگاہ کرو، ورنہ میں خود آتا ہوں اور صرف اس لئے کہ اگر تم دوسری شادی کر چکے ہو تو اس کو بھی طلاق دلواؤں، کیونکہ ایک نہ ایک دن اس کے ساتھ بھی یہی سلوک ہونا ہے۔

---

صدیقی الاجل - میں کل شام کو یہاں پہونچا اور اِس وقت تک کہ کامل ۲۰ گھنٹے گزر گئے ہیں یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ اگر یہ لوگ واقعی انسان ہیں تو میں اپنے آپ کو کس قسم کا حیوان سمجھوں۔ اس میں کلام نہیں کہ "مساوات" عمدہ چیز ہے لیکن صرف "نظریہ" کی حد تک، کیونکہ اگر عملی صورت میں اس کا مظاہرہ اس طرح ہو سکتا ہے جو یہاں نظر آیا تو "ڈماکریسی" اور جمہوریت دونوں پر لعنت ہے۔

مجھے ایسے آقا کی ضرورت نہیں جو اپنی طرح مجھے بھی حیوان سمجھ کر زر و سیم کے انبار سے لاد دے، مجھے تو ایسا مالک چاہئے جو مجھے فاقوں میں مبتلا کرے لیکن سمجھے انسان ـــ باور کرو میں یہاں ایک منٹ کے لئے ـ ـ ـ نہیں رہ سکتا اور شام تک میرا یہاں سے بھاگ جانا بالکل برحق ہے۔

پھر اس خط کا جواب اس وقت دینا جب میں پھر تمھیں لکھوں۔ لاحول ولاقوۃ، تم نے بھی کس عذاب میں مبتلا کر دیا۔

---

# مصطفیٰ کمال کی زندگی کے چند دلچسپ اوراق

یوں تو اسوقت روئے زمین پر متعدد ہستیاں ایسی ہیں جو صرف اپنی ذاتی کوشش کی بدولت جھونپڑے سے محلوں تک پہونچی ہیں۔ مثلاً اطالیہ کا مسولینی، جرمنی کا ہر ہٹلر، ایران کا رضا شاہ لیکن یہ واقعہ ہے کہ زندگی کی جن تلخ و پیچیدہ راہوں سے مصطفیٰ کمال کو گزرنا پڑا ہے، اُن سے کوئی دوچار نہیں ہوا۔

دنیا کی کوئی سخت سی سخت مصیبت ایسی نہ تھی جو اس پر نازل نہ ہوئی ہو اور ہوش سنبھالنے کے بعد شاید ہی کوئی سال اس پر ایسا گزرا ہو کہ آگ اور خون کا کھیل کھیلنے پر وہ مجبور نہ ہوا ہو لیکن اس کے آہنی اعصاب ہر شدید ضرب کے بعد ہمیشہ اور زیادہ سخت ہوتے گئے اور کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی اسنے مایوسی و ناکامی سے اپنے آپ کو مغلوب ہونے نہیں دیا۔ دوستوں نے اس کے ساتھ دشمنی کی، اعزہ نے اس کی مخالفت کی، حکومت نے اس کو باغی سمجھا، ارباب وطن نے اس کی خدمات کو ٹھکرایا، لیکن ملک و قوم کی خدمت کا جو جذبہ اول دن اس میں پیدا ہو گیا تھا وہ بدستور قایم رہا اور آخر کار اس کو پورا کر کے دکھا دیا۔

چنانچہ آج کی صحبت میں ہم اس کی زندگی کا ایک ایسا ورق پیش کرتے ہیں جو غالباً اُردو داں پبلک کے سامنے کبھی نہ آیا ہوگا اور اگر اس کو دلچسپی کے ساتھ پڑھا گیا تو ہم اس بطل اعظم کی پوری زندگی اسی طرح نگار کے ذریعہ سے پیش کر دیں گے — اس کے ابتدائی حالات زندگی کو کسی دوسرے وقت پر ملتوی رکھتے ہوئے، فی الحال سلسلۂ سخن ہم اس زمانہ سے شروع کرتے ہیں جب جنگ عظیم کے بعد ترکی تقریباً فنا ہو چکی تھی اور تمام یوروپ اس کی موت کا فیصلہ سنا کر اپنی جگہ مطمئن ہو گیا تھا۔

---

(۱)

التوائے جنگ کو ایک ماہ کا زمانہ گزر چکا تھا کہ مصطفیٰ کمال قسطنطنیہ پہونچا۔ یہاں کا یہ عالم تھا کہ جہاں تا بنائے باسفورس میں

پڑے ہوئے تھے اور پایۂ تخت دردہ دانیال کے علاوہ ہر قابل ذکر مقام پر برطانوی فوجوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ استنبول اور غلطہ پر فرانسیسی عساکر قابض تھے اور پیرا میں اطالیہ فوجیں خیمہ زن تھیں۔ پولیس، جندرمہ اور بندرگاہ کا نظم و نسق بالکل اتحادی افسران فوج کے ہاتھوں میں تھا اور قلعے مسمار کئے جا رہے تھے۔

مصر، شام، فلسطین اور عرب ہاتھ سے نکل چکے تھے اور ترکی عساکر اتحادی کی آہنی گرفت میں سکرات کے لمحے بسر کر رہی تھی۔ انجمن اتحاد و ترقی ختم ہو چکی تھی، انور، طلعت اور جمال بھاگ کر دوسرے ممالک میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ صرف ایک توفیق پاشا رہ گیا تھا، سو اس کا کام دشمنوں کے احکام کی تعمیل کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

ترک قوم اس وقت تھک کر بالکل چور چور ہو چکی تھی اور جسمانی و اخلاقی دونوں حیثیتوں سے اس کی حالت اس درجہ سقیم ہو گئی تھی کہ وہ فاتح دشمن سے اپنا ضایع شدہ ملک نہیں مانگتے تھے، بلکہ صرف یہ چاہتے تھے کہ اُس کو کسی نہ کسی طرح زندہ رہنے دیا جائے۔

بظاہر یہ حالات ایسے نہ تھے کہ کسی قسم کی کوئی امید کسی شخص کو پیدا ہو سکتی، لیکن مصطفےٰ کمال جس کا نصب العین صرف کوشش کرنا تھا اب بھی مایوس نہ ہوا اور اس نے عزت پاشا سے مل کر کہا کہ "یقیناً اسوقت کھوئی ہوئی سلطنت کی واپسی کا سوال نہیں ہے، شام و عرب پر دوبارہ قابض ہونے کا سوال نہیں ہے لیکن قوم، عزت کا سوال تا آخر دم تک باقی رہتا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ توفیق پاشا کو جو اپنی غداری سے ترکوں کی رہی سہی عزت کو بھی تباہ کر رہا ہو برسرِ اقتدار رکھا جائے" اور کیوں نہ تم اس کی جگہ کام کرو۔"

عزت پاشا یہ سنکر دیر تک خاموش رہا اور پھر سوچکر بولا کہ "اگر تم کچھ کر سکتے ہو تو کرو، میں تمہاری مدد کیلئے طیار ہوں"۔

مصطفےٰ کمال، عزت پاشا کو ہموار کر کے دوسرے مقتدر لوگوں سے بھی ملا اور آخرکار انتہائی کوشش کے بعد وہ اس حد تک کامیاب ہو گیا کہ اس کی آواز سننا لوگوں کو گوارا ہونے لگا۔ چونکہ اس کی جرأت و بہادری کا سکہ پہلے ہی سے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا اور یہ سب کو یقین تھا کہ اسوقت یہی ایک شخص ایسا ہے جو فوجی قاید بننے کی صلاحیت رکھتا ہے، اس لئے وہ سمجھتے تھے کہ جو کچھ مصطفےٰ کمال کہتا ہے، اُسے کر دکھانے کی بھی اہلیت رکھتا ہے۔

وہ پارلیمنٹ ہاؤس میں بھی جاتا اور وہاں گھنٹوں گفتگو کرتا، الغرض رفتہ رفتہ وہ بعض سیاسی ہستیوں کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو گیا اور یہ طے کر لیا کہ آیندہ اجلاس میں توفیق پاشا پر عدم اعتماد کا ووٹ پاس کر کے عزت پاشا کو اس کی جگہ متعین کر دیا جائے، لیکن جب اجلاس ہوا تو اس میں کامیابی نہ ہوئی اور وہی لوگ جنھوں نے مصطفےٰ کمال سے توفیق پاشا کے خلاف ووٹ دینے کا وعدہ کیا تھا، اس کے موافق ہو گئے۔ اس کا بڑا سبب

یہ تھا کہ لوگ مصطفیٰ کمال سے خائف بھی بہت تھے اور سمجھتے تھے کہ اگر یہ برسر اقتدار ہو گیا تو خدا جانے کیا انقلاب برپا کرے گا۔

مصطفیٰ کمال کو اپنی اس ناکامی پر غصہ تو بہت آیا، لیکن وہ مایوس نہیں ہوا۔ فوراً ٹیلی فون پر جا کر سلطان سے ملنے کی درخواست پیش کی۔

جب سلطان سے ملاقات ہوئی تو اس نے کہا کہ "اس وقت نہایت مضبوط حکومت قایم کرنے کی ضرورت ہے اور اگر آپ قوم کی ہمت بڑھانے کے لئے آمادہ ہوں تو اب بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ اور میں ترکی کی عزت قایم کر دینے کا ذمہ دار ہوتا ہوں اگر محکمۂ فوج کی وزارت میرے سپرد کر دی جائے۔ موجودہ پارلیمنٹ باغیوں اور غداروں سے بھری ہوئی ہے اور اس لئے اس کو معطل کر دینا چاہئے"۔

سلطان ــــ "میں جانتا ہوں کہ فوج پر تمہارا بڑا اثر ہے لیکن کیا فوج میری وفادار رہیگی"۔

مصطفیٰ "میں ابھی آیا ہوں، اس لئے کوئی صحیح جواب نہیں دے سکتا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ فوج کی عدم وفاداری کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے"۔

اس گفتگو کے دوسرے دن سلطان وحید الدین نے پارلیمنٹ کو توڑ دیا اور داماد فرید کو وزیر اعظم بنا کر عنان سلطنت اپنے ہاتھ میں لیلی۔ اس واقعہ سے لوگوں میں سخت ہیجان پیدا ہوا اور ہر چند اس کا ذمہ دار بالکل مصطفیٰ کمال کو قرار دیا گیا، لیکن سلطان نے اس کو کوئی خدمت سپرد نہ کی۔

مصطفیٰ نے ناکام ہو کر قسطنطنیہ چھوڑ دیا اور قریب کے ایک گاؤں (شِشلی) میں چھوٹا سا مکان کرایہ پر لیکر قیام کر لیا۔ یہاں صرف اس کا ایک دوست کرنل عارف ایسا تھا جس سے وہ راز کی باتیں کہہ سکتا تھا۔

اس واقعہ کو کئی ہفتے گزر گئے اور ۱۹۱۹ء کی ابتدا میں اتحادیئن کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑنے لگی، کیونکہ اطالیہ فرانس اور انگلستان میں اندرونی اضطرابات کی وجہ سے فوجیں یہاں سے ہٹائی جا رہی تھیں اور یورپ کا اسوقت سب سے زیادہ اہم سوال جرمنی کے قلع قمع کا تھا، غریب ترکی کو کون پوچھتا جس کی موت کا یقین پہلے ہی سب کو ہو چکا تھا، چنانچہ لائڈ جارج کے مشیروں نے صاف صاف کہدیا تھا کہ "ترکی کو تو اسی حال پر چھوڑ دو کیونکہ اسکے اجزا تو خود منتشر ہو جائیں گے اور پھر ہم ٹکڑا ٹکڑا بانٹ لیں گے"۔

اس تغیر سے پھر بعض جماعتوں کو اُمید کی جھلک نظر آنے لگی لیکن قسطنطنیہ میں نہیں، کیونکہ یہاں تو سلطان بالکل انگریزوں کے ہاتھ میں تھا اور ان کی گرفت بہت مضبوط تھی، البتہ اناطولیہ اور اندرون ملک کے دیگر صوبوں

میں اس کے کچھ آثار پائے جاتے تھے، چنانچہ متعدد خفیہ انجمنیں قائم ہوگئیں اور دشمنوں کے ذخائر حرب کو چرا چرا کر اندرون ملک میں پہونچانے لگیں رفتہ رفتہ یہ تحریک قوی ہوتی گئی اور انگریزوں کو بھی معلوم ہو گیا کہ ترکوں میں پھر مقابلہ کا جذبہ پیدا ہو رہا ہے۔ مصطفیٰ کمال نہایت خاموشی سے اس انقلاب کو دیکھ رہا تھا، لیکن چونکہ وہ اس اسلوب کار کی کامیابی کی طرف سے مایوس تھا اس لئے اس نے کوئی عملی حصہ نہیں لیا۔

جب آہستہ آہستہ یہ انقلابی لہر زیادہ وسیع ہوئی اور انگریزوں نے محسوس کیا کہ اس فتنہ کا دبانا ضروری ہے تو انھوں نے سلطان سے کہا اور سلطان نے مصطفیٰ کمال کا نام اس خدمت کے لئے تجویز کیا۔ مصطفیٰ چونکہ انگریزوں کو گیلی پولی میں سخت شکست دے چکا تھا اور وہ اس کے انقلابی ارادوں سے واقف تھے اس لئے انھوں نے مخالفت کی، مگر داماد فرید کی سفارش و ذمہ داری پر اس کو مشرقی صوبوں کا گورنر جنرل بنا دیا گیا۔

اس واقعہ سے مصطفیٰ کمال کی افسردہ تمناؤں میں پھر شگفتگی پیدا ہونے لگی، لیکن اسکی روانگی کے چند گھنٹے بعد ہی یہ حکم منسوخ کر کے مصطفیٰ کی گرفتاری کا حکم جاری کیا گیا کیونکہ مصطفیٰ پر انگریزوں کو اعتماد نہ تھا اور ان کو یقین ہو گیا تھا کہ اناطولیہ پہونچکر بجائے بغاوت فرو کرنے کے اور زیادہ قوت اس میں پیدا کر دے گا۔ مصطفیٰ کو جب اس کا علم ہوا تو وہ چھپ کر کسی نہ کسی طرح پہلے سمسون پہونچا اور پھر وہاں سے اماسیا پہونچکر جو بہت زیادہ اندرون ملک واقع تھا آزادی کی سانس لی، کیونکہ یہاں انگریزوں کا کوئی اثر نہ تھا۔

اس جگہ قیام کر کے اس نے تمام اطراف کے حالات تار اور ٹیلی فون کے ذریعہ سے معلوم کئے اور اس نتیجہ پر پہونچا کہ بحالت موجودہ ترکی کسی مقابلہ کے لئے طیار نہیں ہو سکتا۔ تمام فوج بیکار و منتشر ہو چکی تھی اور البتہ ایک سپاہ کاظم قرہ باقر کے پاس دیار بکر میں موجود تھی۔ اور سمرنا کے پہاڑوں میں کچھ جماعتیں یونانیوں کا حملہ روکنے کے لئے پائی جاتی تھیں، جن کی تنظیم رؤف کر رہے تھے۔

مصطفیٰ نے سیواس سے رفعت کو، انگورہ سے علی فواد کو اور سمرنا سے رؤف کو بلا کر مشورہ کیا کہ جس طرح ممکن ہو یونانیوں کا حملہ روکنا ضروری ہے اور اس کے لئے ایک قومی عسکری تنظیم لازم ہے، اسی کے ساتھ چونکہ سلطان انگریزوں کے ساتھ میں ہے اس لئے اناطولیہ میں ایک عارضی حکومت قائم کر لینا چاہئے۔ جب یہ سب طے ہو گیا تو مصطفیٰ کمال نے ملک کے تمام نمایندوں کو سیواس میں طلب کیا۔ دیار بکر سے کاظم قرہ باقر اور ورنہ سے جعفر طیار آ کر جلسہ میں شریک ہوئے اور قونیا کے کمانڈنگ افسر نے ذریعہ تار اپنی شرکت و ہمنوائی کی اطلاع

دی۔ جنگ کے بعد گویا یہ پہلا کامیاب قدم تھا جو مصطفےٰ کمال نے اُٹھایا۔ اس کے بعد مصطفےٰ نے ملک کا دورہ شروع کرکے ایک ایک گاؤں میں پہونچکر پروپاگنڈا شروع کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں پھر احساس پیدا ہونے لگا اور ایک عسکری روح از سر نو رونما ہونے لگی۔ اسی طرح ارض روم کا دورہ کرکے وہاں بھی اس تحریک کو زندہ کیا اس کے بعد گاؤں گاؤں فوجی بھرتی شروع ہونے لگی، اور جو ذخائر حرب فرانسیسی اور انگریزی فوجوں کی نگرانی میں دئے گئے انکو بھی کہیں کہیں چھین لیا۔

ارض روم پہونچکر مصطفےٰ کمال نے سلطان کی طرف سے تمام کمانڈروں کو حکم بھیجا کہ ہتھیار انگریزوں کے حوالہ نکئے جائیں اور فوجوں کا اجتماع کیا جائے۔ اسی کے ساتھ اس نے سول حکام کے نام بھی احکام نافذ کئے اور ان کو ہدایت کی کہ کمیٹیاں بناکر والنٹیر بھرتی کئے جائیں اور سمرنا کے قبضہ کے خلاف احتجاجی جلسے کرکے خوشحال لوگوں اور تاجروں سے ٹیکس وصول کیا جائے تاکہ فوجی مصارف اس سے پورے ہوں۔

جسوقت یہ خبریں قسطنطنیہ پہونچیں تو انگریزوں کے غصہ کی انتہا نہ رہی اور سلطان بھی بہت برہم ہوا چنانچہ مصطفےٰ کمال کو ذریعہ تار اپنی فوجی خدمت سے معزول کرکے قسطنطنیہ طلب کیا گیا اس نے جواب دیا کہ "میں وہاں نہیں آسکتا اور جب تک ملک آزاد نہ ہوجائے گا میں اناطولیہ میں رہوں گا"

اس کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں اور فوجی کمانڈروں کو بلاکر کہا کہ "مرکزی حکومت تو ہم سے علحدہ ہو گئی ہے، اس لئے اب آپ لوگ فیصلہ کیجئے کہ کیا کرنا ہے اگر آپ مرکزی حکومت کا ساتھ دیکر ملک کو غلام بنا دینے پر راضی ہیں تو آپ کی مرضی، لیکن اگر عزت کی زندگی چاہتے ہیں تو میرا ساتھ دیجئے اور عہد کیجئے کہ جو عزم ہملوگ کرچکے ہیں اس سے مُنھ نہ موڑیں گے"

لوگوں نے کہا کہ "ہم تکو اپنا رہبر و سردار تسلیم کرتے ہیں، لیکن صرف اس شرط سے کہ سلطان کو کوئی نقصان نہ پہونچے"۔ مصطفےٰ کمال نے مصلحتاً اس کا وعدہ کرلیا اور اس طرح گویا پہلی بار اس کی عملی جنگ اتحادئین اور سلطان کے خلاف شروع ہوگئی۔

اس کے بعد مصطفےٰ نے سیواس میں انعقاد کانگرس کی اطلاع تمام ملک کو دی اور کاظم قرہ باقر کے مشورہ سے قرب وجوار کے تمام فوجی لیڈروں اور نمایندوں کو ارض روم میں بلایا تاکہ کانفرنس میں شریک ہوں اسی وقت مرکزی حکومت کی طرف سے کاظم قرہ باقر کے پاس حکم پہونچا کہ مصطفےٰ کمال کو گرفتار کرکے کانفرنس روک دی جائے اور نمایندوں کو واپس کردیا جائے۔ یہ وقت نہایت سخت تھا اور سلطان کے خلیفہ ہونے کی عظمت چونکہ بدستور لوگوں کے دلوں

میں قایم تھی، اس لئے کاظم باقر اپنی جگہ سے ڈگمگا گیا، مگر چونکہ قدرت کو کچھ اور منظور تھا اس لئے کئی دن کے غور و تامل کے بعد کاظم باقر نے اعلان کر دیا کہ "میں مرکزی حکومت کا ساتھ نہ دوں گا" اور اس طرح کشتی ڈوبتے ڈوبتے پھر بچ گئی۔

---

اُدھر سیواس کی کانگرس میں شرکت کے لئے تمام ملک سے نمایندے آرہے تھے اور پورے جوش کے ساتھ کام ہو رہا تھا۔ ادھر مرکزی حکومت نے کوشش کی کہ مصطفیٰ کمال کو سیواس پہونچنے سے پہلے پولیس کے ذریعہ سے گرفتار کر لیا جائے لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی اس کے بعد علی غالب گورنر ملیشیا کے نام سلطان کا حکم آیا کہ کُرد اقوام کو اُبھار کر کانگرس کے نمایندوں کو گرفتار کر لیا جائے۔ یہ سُنکر تمام نمایندے سخت برہم ہو گئے اور مصطفیٰ کمال نے کُردوں کو شکست دیکر راہ اور زیادہ صاف کر لی۔

اس کے بعد ایک مجلس عاملہ بنا کر مصطفیٰ کمال کو اس کا صدر کر دیا گیا اور چونکہ کُردی حملہ داماد فرید (وزیر اعظم) کے اشارہ سے کیا گیا تھا، اس لئے قوم نے مرکزی حکومت سے مطالبہ کیا کہ داماد فرید کو معزول کر کے جدید پارلیمنٹ قایم کی جائے۔ جب اس کا کوئی جواب نہ آیا تو مصطفیٰ کمال نے محکمۂ تار پر قبضہ کر کے قسطنطنیہ کا تعلق خبر رسانی تمام ملک سے قطع کر دیا اور مالی انتظام بھی اپنے ہاتھ میں لیکر موزوں عمال مقرر کرنا شروع کئے۔

آخرکار سلطان نے مجبور ہو کر داماد فرید کو معزول کر کے علی رضا کو مقرر کیا اور جدید پارلیمنٹ کے انتخاب کا فرمان نافذ کیا۔ اس سے لوگوں کا رُخ پھر مرکزی حکومت کی طرف پھر گیا اور مصطفیٰ کمال کی یہ تجویز کہ کانگرس کو ابھی قایم رکھا جائے اور پارلیمنٹ یہیں انگورہ میں منعقد کی جائے، کسی نے نہ مانی اور نتیجہ یہ ہوا کہ اب مصطفیٰ کو چھوڑ کر لوگوں نے رؤف کو اپنا لیڈر مقرر کیا اور قسطنطنیہ چلدئے۔ مصطفیٰ بدستور انگورہ میں رہا اور اس نے وہاں جانا بیکار سمجھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ انگریزوں کے اثر کی وجہ سے پھر پارلیمنٹ ناکام ہوگی اور لوگ پھر اسی کے پاس دوڑتے ہوئے انگورہ آئیں گے۔ اس اثناء میں مصطفیٰ آہستہ آہستہ فوجیں جمع کرتا رہا اور انگورہ میں بیٹھ کر اپنی مدافعانہ قوت کو خاموشی سے مضبوط بناتا رہا۔

اس طرف قسطنطنیہ میں جو تجربات قوم کے نمایندوں کو حاصل ہوئے وہ حد درجہ تلخ تھے، کیونکہ سلطان بالکل بے اختیار تھا اور انگریز یہ کیونکر گوارا کر سکتے تھے کہ ملک میں قومی روح پیدا ہو، ان کا مطالبہ یہ تھا کہ جو اصول ارض روم میں انھوں نے طے کر لئے تھے انھیں اُصول پر پارلیمنٹ کام کرے، یعنی ترکی کی آزادی علی حالہا برقرار رہے۔ مگر انگریزوں نے اس کو تسلیم نہیں کیا اور نمایندوں کو اپنے حقوق منوانے کی ہمت اس سے اور زیادہ بڑھ گئی کہ ملک

میں ہر جگہ انھیں کے موافق واقعات ظہور میں آرہے تھے۔ شمالی شام میں ترکوں نے فرانسیسیوں کو مار کر باہر نکال دیا تھا اور قلعہ جات عرفہ وعین تاب کا جو فرانس کے قبضہ میں تھے محاصرہ کر لیا تھا، اسی طرح انگریز بھی، قاف، کریمیا، اور اناطولیہ سے ہٹ رہے تھے کیونکہ فوجیں منتشر کی جا چکی تھیں، اور گیلی پول میں ایک فرانسیسی دستہ کو بھگا کر ان سے ہتھیار چھین لئے گئے۔ تھے۔

یہ حالات دیکھ کر انگریزوں نے سخت قدم اُٹھانے کا فیصلہ کیا لیکن چونکہ اندرون ملک سے ان کی فوجیں واپس جا چکی تھیں اور پایۂ تخت ہی میں ان کا زور چل سکتا تھا اس لئے ۱۶ مارچ ۱۹۲۰ء کو انھوں نے اپنے قبضۂ قسطنطنیہ کا اعلان کر کے رؤف اور فتحی وغیرہ چند قوم پرست افراد کو (حالانکہ وہ حقیقتاً ایسے نہ تھے) گرفتار کر کے مالٹا روانہ کر دیا اور پارلیمنٹ ہاؤس میں قفل ڈالدیا۔ عصمت، فوزی، عدنان اور خالدہ ادیب خانم بھاگ کر انگورہ چلے گئے اور بعض ترک سرداروں نے اناطولیہ کا رُخ کیا۔

اس واقعہ سے سلطان حد درجہ متاثر ہوا، کیونکہ وہ تو یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ اور اس کی نام نہاد خلافت قائم رہے۔ لیکن اس کی یہ برہمی انگریزوں کا تو کچھ بگاڑ نہ سکتی تھی، اس لئے اس نے ترکی قوم پر اپنا غصہ اُتارنا چاہا اور سلیمان شوکت پاشا وزیر حربیہ کو حکم دیا کہ ایک بیقاعدہ فوج خلیفہ کے نام پر طیار کی جائے چنانچہ تمام ملک کے مولویوں کو جمع کر کے پروپاگنڈا شروع کیا اور سیکڑوں ہزاروں جتھے جاہل ترکوں کے جو خلیفہ و خلافت پر جان دیتے تھے۔ سلطان کی حمایت میں نکل کھڑے ہوئے ــــ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں سخت خانہ جنگی شروع ہوئی، بھائی بھائی کا دشمن ہو گیا اور باپ بیٹے کے خلاف تلوار کھینچکر میدان میں آگیا۔ قونیہ میں تو سلطان کی فوج نے اتنی وحشت و بربریت ظاہر کی کہ مصطفیٰ کمال کی فوج کے افسروں کے ناخن نکلوا کر انھیں گھوڑے کی دُم سے باندھ کر گھسیٹتے گھسیٹتے مار ڈالا۔

سلطان نے اب داماد فرید کو پھر بلالیا اور چن چن کر ان تمام آدمیوں کو اپنے پاس سے علیحدہ کر دیا جو قوم پرست جماعت سے ہمدردی رکھتے تھے۔ اسی کے ساتھ یہ فرمان نافذ کیا کہ مصطفیٰ کمال اور اس کی جماعت باغی جماعت ہے اور جو کوئی انھیں ہلاک کرے گا وہ دنیا و آخرت میں دونوں جگہ انعام و جزا کا مستحق ہوگا۔

---

شام کا وقت ہے، مصطفیٰ کمال، انگورہ کے مدرسۂ زراعت کی عمارت میں کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا ہے، فواد خالدہ خانم، اور اس کا شوہر عدنان بھی قریب ہی موجود ہیں، عصمت دوسری کھڑکی میں جھکا ہوا باہر دیکھ رہا ہے۔

آفتاب غروب ہوچکا تھا، تاریکی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی اور ان میں سے ہر شخص ترکی قوم کی بدبختی پر دل ہی دل میں رو رہا تھا۔ یونانی قتل و خونریزی کرتے ہوئے سمرنا سے آگے بڑھ رہے تھے، فرانسیسی جنوب کی طرف کامیاب اقدامات کررہے تھے، سلطان کے ہواخواہوں نے مشرق میں کُردوں کو پھر اُبھار کر بدامنی پیدا کر رکھی تھی، اور یہ خانہ جنگی انگورہ کے قریب تک پہونچ چکی تھی،

سلطان کی فوجیں برابر کامیاب ہوتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں، اور اسمرود نجار پر قابض ہوکر بروصہ تک پہونچ گئی تھیں، قونیہ، اور باز آر اور درجنوں شہر سلطان کے طرفدار ہوگئے تھے، خود قومی افواج میں باہم پھوٹ پڑ چکی تھی اور بظاہر کوئی امید باقی نہ تھی کہ یہ فتنہ فرو ہوسکے گا۔

مصطفیٰ کمال ایک کرسی میں خاموش بیٹھا ہوا فکر میں مستغرق تھا، اس کا خاکی لبادہ چاروں طرف لپٹا ہوا تھا سیاہ استراخانی ٹوپی پیشانی پر ابرو تک کھنچ آئی تھی، ٹھوڑی سینے سے مل گئی تھی، اس کے چہرہ پر جھریاں ہی جھریاں نظر آرہی تھیں اور اس کو ساری دنیا تاریک نظر آرہی تھی ــــ وہ اسوقت ایک جنرل تھا بغیر فوج کے، صوبہ کا حاکم تھا بغیر رعیہ کے۔ اس کی تمام تدبیریں خاک میں مل رہی تھیں، اس کی جملہ امیدیں مٹی میں ملائی جارہی تھیں اور کچھ نہ کرسکتا تھا ــــ وہ دفعتہً اُٹھ کھڑا ہوا، اس کی آنکھیں سرخ تھیں، اس کے بال کھڑے ہوئے تھے، اس کے اعصاب تن کر فولادی تار بن گئے تھے اور وہ ایک زخمی شیر کی طرح بپھر کر فیصلہ کرچکا تھا کہ اگر آزادی ترکی کی قسمت میں نہیں ہے تو اس کے لئے جان دیدینے کا موقعہ اس سے بہتر کبھی نہیں آسکتا۔

مصطفیٰ کمال ہمیشہ کا بیمار تھا، درد گردہ کے دوروں اور بخار کے پے در پے حملوں نے اسے بہت ضعیف کردیا تھا، اسی کے ساتھ ذہنی و روحانی خستگی نے اسے کسی قابل نہ رکھا تھا، لیکن قومی محبت کی وہ آگ، ملی غیرت کا وہ شعلہ جو ایک بار بھڑک کر پھر کبھی افسردہ نہیں ہوتا، برابر بھڑک رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مصطفیٰ کمال کے اندر کوئی اور غیر معمولی قوت کام کررہی ہے ــــ وہ تمام رات لیمپ جلاکر میز پر کام کرتا رہا اور لمحہ لمحہ کی خبروں پر غور کرکے اپنے آیندہ اقدامات کے نقوش قایم کرتا رہا۔ وہ پیالی پر پیالی قہوہ کی خالی کرتا جاتا تھا، سگرٹ پر سگرٹ پیتا جاتا تھا۔ کبھی وہ سوجاتا تو عارف اس کی حفاظت کے لئے جاگتا رہتا، کبھی عارف سوجاتا تو وہ بیدار رہتا۔ اسکی پشت پر عصمت سیاہ لباس میں ادہر سے ادہر ٹہل رہا تھا، کبھی کھڑکی کے باہر جاکر جھانک لیتا، کبھی مصطفیٰ کمال کے پاس آکر کسی امر میں مشورہ کرلیتا، خالدہ ادیب ریوالور لئے ہوئے بیٹھی تھی اور سونان زہر کی پڑیا لئے ہوئے کہ اگر خدانخواستہ سلطان کی فوج آجائے تو گرفتار ہونے سے قبل جان دیدیں۔ دوسرے کمرہ میں فوزی بھی کام میں مصروف تھا

اور نیچے مسلح گھوڑے طیار تھے۔

آخر کار صبح ہوئی اور مصطفیٰ کمال جان دینے اور جان لینے کا آخری عزم کرکے اس طرح نکل کھڑا ہوا گویا اب اسے لوٹ کر واپس آنا ہی نہیں ہے۔ وہ اسوقت ایک بپھرا ہوا شیر تھا، خونخوار و ظالم شیر۔ نہ کسی سے رحم کا طالب تھا نہ کسی پر رحم کرتا تھا، وہ دیوانہ وار بڑھتا تھا اور شہاب ثاقب کی طرح سروں پر ٹوٹ ٹوٹ کر گرتا تھا، آگ، تلوار، خون اس کے رفیق تھے اور اس کے منہ سے سوائے اس کے کوئی لفظ نہ نکلتا تھا کہ "آزادی یا موت"۔۔۔ پھر اسکا نتیجہ کیا ہوا۔۔۔ اس کو سیاسئین یوروپ سے پوچھو، مستعرین مغرب سے دریافت کرو۔۔۔ ان پر ایک سکتہ سا طاری تھا کہ دفعتہً یہ بساط کیونکر الٹ گئی، نقشۂ جنگ کس طرح بدل گیا۔۔۔ یونانیوں کا قدم جہاں تک بڑھا تھا اسی جگہ روک دیا گیا، سلطان کی فوجوں کو تہ تیغ کرکے انگورہ کو خطرہ سے آزاد کر دیا گیا، مراش پر حملہ کرکے فرانسیسی و آرمنی فوجوں کو پسپا کر دیا گیا، کرد پامال ہوگئے، اطالیہ کے فوجی دستوں کو قونیہ سے ہٹا دیا گیا، اینٹی شہر میں انگریزی فوج کو نکال کر ساحل تک پہونچا دیا اور تمام اتحادی افسروں کو گرفتار کرکے قید کر لیا گیا۔۔۔

رفتہ رفتہ جب یہ خبر تمام ملک میں پھیل گئی کہ قسطنطنیہ پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا ہے اور سلطان ملک قوم کا دشمن ہے تو قومی خودداری کے جذبات پھر ابھرنے لگے، مرکزی حکومت اور سلطان کی طرف سے لوگ متنفر ہوگئے اور مرد و عورت جوق در جوق مصطفیٰ کمال کے جھنڈے کے نیچے آکر جمع ہونے لگے۔

مصطفیٰ کمال نے اعلان کیا کہ انگورہ میں نئی پارلیمنٹ کا افتتاح ہوگا اور ملک کے تمام وہ نمائندے جو جوش و خروش کے ساتھ قسطنطنیہ گئے تھے انگورہ پہونچ گئے اور جمعیتہ قومی کے قیام کا اعلان کرکے مصطفیٰ کمال کو اسکا صدر منتخب کیا۔

کل مصطفیٰ تنہا، بے یار و مددگار تھا لیکن آج وہ پوری قوم کا سردار بنا بیٹھا تھا۔ اور جمہوریت فرانس کے پریسیڈنٹ کے پیام کا جواب ان الفاظ میں دے رہا تھا:۔

> " جب تک پایۂ تخت غیروں کے ہاتھ میں ہے، ترکی کی قسمت کا فیصلہ انگورہ کی گرینڈ نیشنل اسمبلی کے ہاتھ میں ہوگا۔۔۔ اسمبلی نے ایک مجلس انتظامیہ مقرر کر دی ہے اور عنان سلطنت اسی کے ہاتھوں میں ہے۔۔۔ چونکہ قسطنطنیہ، سلطان اور وہاں کی حکومت دشمن کے قبضہ میں ہے اس لئے وہاں کے احکام کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ ترکی قوم آزاد حکومت کے تمام حقوق حاصل کرکے رہیگی اور اگر وہ کسی صلح کو قبول کر سکتی ہے تو وہ صرف عزت کی صلح ہے"۔

یہ تھے وہ الفاظ جو ترکی کے جدید حکمراں کے مُنہ سے نکلے تھے اور یقیناً دنیا کا یہ حیرتناک واقعہ ہے کہ وہ پورے ہو کر رہے۔ مصطفےٰ کمال ترک ہے اور اپنے ترک ہونے پر وہ ہمیشہ فخر کرتا ہے، وہ غیرت وخودداری کا مجسمہ ہے اور ترک قوم کی ذلت کو کبھی برداشت نہیں کرسکتا۔ جسوقت اس نے لارڈ کرزن کی وہ تقریر سُنی جس میں اس نے ترکوں سے اس طرح خطاب کیا تھا گویا کہ وہ ترک قوم کا بڑا مربی ہے تو وہ غصہ سے کانپ اُٹھا اور بولا کہ:-

"یہ انگریز کسی دن سمجھیں گے کہ ہم بھی وہی ہیں جو وہ ہیں۔ وہ مجبور ہوں گے کہ ہم سے برابر کا سلوک کریں۔ ہم اپنا سر کبھی ان کے سامنے نہ جھکائیں گے اور جب تک ہماری قوم کا ایک فرد بھی زندہ ہو ہم انکا مقابلہ کریں گے یہاں تک کہ ہم ان کی تہذیب کو انھیں کے سروں پر مار کر چور چور کردیں۔"

---

پیرس میں صلح کانفرنس کی کارروائیاں جاری ہیں، اور ۵۰۰ نمایندگان اخبار کے ہجوم میں، پریسڈنٹ ولسن، لائڈ جارج اور کلیمنشو دنیا کا نقشہ بنانے میں اس طرح مصروف ہیں گویا کہ اسوقت خدا کی خدائی ان کے ہاتھ میں ہو وفعتہً ترکی انقلاب کی خبریں ان کو پہونچتی ہیں اور وہ حیران رہجاتے ہیں کہ یہ کیا ہوا، ترکی جس کا سر کچل دیا گیا پھر کیونکر اُبھرا، اور مصطفےٰ کمال جو فوج کا ایک معمولی افسر تھا اس نے ملک پر کیا سحر کردیا ـــــ آخرکار انھوں نے عہدنامہ سیورے کے شرایط کا اعلان کردیا اور اس طرح گویا ترکی کی موت کا حکم سنادیا۔

(۱) ترکی حکومت صرف اناطولیہ میں محدود رہیگی، لیکن سمرنا اس سے چھین لیا جائے گا۔

(۲) ترکی کے مالی انتظام کی سخت نگرانی کی جائے گی۔

(۳) کمیشن مقرر کرکے ترکوں کی فوجوں کی جمعیت کو درہم برہم کیا جائے گا۔

(۴) پولیس وجندرمہ پر نگرانی قایم کی جاسے گی

(۵) ٹیکس اور کسٹمس بھی اُن کے ہاتھ میں نہ رہیگا۔

عہدنامۂ سیورے کا یہ اعلان ہونا تھا کہ تمام ترکی میں آگ لگ گئی۔ وہ قوم جو ۵۰۰ سال سے حکمراں رہی تھی کیونکر اس ذلت کو گوارا کرسکتی تھی، انھوں نے اپنے ذاتی مناقشات ترک کردئے، اور کمالی جماعت کے نام سے سب کے سب مصطفےٰ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوگئے۔

مصطفےٰ نے فوراً ایک فوجی کیبنٹ قایم کرکے بکر سمیع، عدنان، فوزی، اور عصمت کو مختلف خدمتیں سپرد کیں اور مقابلہ کی طیاریاں ہونے لگیں ـــــ اسوقت حالت یہ تھی کہ کاظم قرہ باقر نے مشرقی سرحد کو آرمینی فوجوں سے صاف

کردیا تھا، جنوب میں مقامی ترکوں نے بوزانتی سے فرانسیسیوں کو نکال کر التوائے جنگ کا معاہدہ حاصل کرلیا تھا۔ اور سوائے قسطنطنیہ کے جہاں اتحادی فوجیں پائی جاتی تھیں اور سمرنا کے جہاں یونانی دستے پڑے ہوئے تھے، اب ترکی میں کوئی فوج دشمنوں کی نہ تھی ۔۔۔ یوروپ کی طرف سے جعفر طیار بڑھا اور ایشیائی سمت سے علی فواد اور اسمد پر سلطان کی حامی فوجوں کو شکست دیکر انگریزی فوج سے تصادم ہوگیا۔

علی فواد نے یہ دیکھکر کہ انگریز صرف جنوبی ساحل پر قابض ہیں ایک دستہ سواروں کا باسفورس کی طرف روانہ کیا اور انگریزی فوج متعینہ قسطنطنیہ میں اضطراب پیدا کردیا ۔۔۔ اس وقت یوروپ کی سیاسی حالت عجیب تھی اور ہر ملک جنگ عظیم کے ردّ عمل کا شکار بنا ہوا تھا، اطالیہ بالشویکی انقلاب کے خوف سے سراسیمہ تھا، فرانس بالکل شام کی طرف متوجہ تھا اور جرمنی کا خوف اب بھی اس سے دور نہ ہوا تھا، برطانیہ کی جڑیں بھی ہل چکی تھیں، آئرلینڈ کی سول دار، عراق و ہندوستان کی بے چینی اور سرحدی خلفشار نے اس کو پریشان کر رکھا تھا۔ امریکہ اپنا دامن آلودہ کرنا ہی نہ چاہتا تھا ۔۔۔ الغرض ان حالات کے ماتحت اس وقت یوروپ کا کوئی ملک ایک سپاہی بھی ترکی کے مقابلہ میں بھیجنے کے لئے طیار نہ تھا ۔۔۔ قسطنطنیہ میں اتحادیئن کی فوجیں صرف چند ہزار تھیں اور ان کے لئے کوئی چارہ سوائے اس کے نہ تھا کہ تخلیہ کریں چنانچہ اتحادیئن کے کمانڈر نے کاغذات جلادئے، ذخائر کو تباہ کردیا اور شاخ زریں میں جہاز طیار ہوگئے۔

---

پریسیڈنٹ ولسن، لائڈ جارج، اور کلیمنشو نے جس وقت پیرس میں اتحادیئن کے اس ذلت کا حال سنا تو وہ غصہ سے بیتاب ہوگئے اور ان کی غیرت کسی طرح گوارہ نہ کرسکی کہ ترکی، ذلیل ترکی جو پشہ کی طرح ہر وقت مسل دیا جاسکتا ہے، ایک معمولی سپاہی مصطفیٰ کمال کی سیادت میں اتنی سرکشی اختیار کرے ۔ لیکن وہ کرتے کیا، حالات اتنے بدل گئے تھے کہ کسی فوج کا وہاں بھیجنا ممکن نہ تھا۔ وہ اسی فکر میں تھے کہ یونان کا وزیر اعظم وینزلو نے جو وہیں موجود تھا، اپنی خدمات پیش کیں ۔۔۔ وینزلو عرصہ سے یہ تمنا رکھتا تھا کہ یونان کسی طرح اناطولیہ کے بندرگاہ پر قابض ہوکر اپنی سلطنت وسیع کرسکے، چنانچہ موقعہ دیکھکر اس نے کہا کہ "اسوقت سمرنا میں بہترین یونانی فوج موجود ہے اور اگر اس بات کا وعدہ کیا جائے کہ ترکی کا ایک معقول حصہ یونان کو دیدیا جائے گا تو ترکوں کو پامال کردینے کا میں ذمہ دار ہوں"۔

خدایان صلح کانفرنس اس سے زیادہ اور کیا چاہ سکتے تھے، انھوں نے فوراً اس پر اظہار رضامندی کردیا

اور دنیا کی اس مشہور جنگ کا آغاز ہو گیا جو ترکی کو تباہ کرنے کے بجائے اسکی حیات ابدی کا ضامن ثابت ہوئی۔

---

جسوقت مصطفٰے کمال نے اپنی سپاہ کو جمع کر کے قسطنطنیہ پر حملہ کرنا چاہا، اسی وقت یونانیوں نے آگے بڑھنا شروع کیا۔ یہ جون ۱۹۲۰ء کی ۲۲ تاریخ تھی۔

چونکہ ترکی فوج اسوقت نہایت سقیم حالت میں تھی، نہ اُن کے پاس وردی تھی نہ کھانے پینے کا سہارا، نہ کوئی ترتیب تھی نہ کوئی تنظیم، اس لئے ظاہر ہے کہ یونانیوں کے اس اقدام کو کیونکر روکا جا سکتا تھا۔ انھوں نے جعفر طیار کو تھریس میں شکست دیکر اس کو گرفتار کر لیا، اور ادرنہ پر قابض ہو کر یورپین ترکی کے حصہ کو ترکی فوجوں سے بالکل صاف کر دیا۔ یونانیوں کی دوسری فوج سمرنا سے شمال کی طرف بڑھی اور اسمد سے ترکوں کو ہٹا کر قسطنطنیہ کی طرف ایشیائی حصہ کو بھی اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اس کے بعد ان کی قلبی فوج کا حصہ اندرون ملک کی طرف بڑھا تاکہ اناطولیہ کی ریلوے لائن پر قبضہ کر لیا جائے۔ لیکن نصف راستہ طے کیا ہوگا کہ اتحادیین نے انھیں وہیں ٹھہر جانے کا حکم دیا اور چھ مہینے تک اسی محاذ پر قایم رہے۔

اُدھر مسلسل شکستوں کی وجہ سے ترکی میں پھر بد دلی پیدا ہوئی اور اسمبلی مصطفٰے کمال کی جان کی دشمن ہو گئی۔ چنانچہ جب اس کا اجلاس ہوا تو مصطفٰے کمال اس میں اس طرح شریک ہوا گویا کہ اس نے کوئی قتل کیا ہے اور موت کا حکم اس کے خلاف سنایا جانے والا ہے، لیکن جب اس نے اپنی تقریر شروع کی اور شکست کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے بتایا کہ ساری ذمہ داریاں اسکی سلطان پر عاید ہوتی ہیں جس نے باقاعدہ فوجوں کو توڑ دیا ہے، ہتھیار دشمنوں کے حوالے کر دئے ہیں اور خانہ جنگی سے ملک کو تباہ کر رکھا ہے، تو لوگوں کا غصہ کچھ کم ہوا اور پھر اسکے بعد جب مصطفٰے کمال نے ترکی قوم کی غیرت و خودداری سے اپیل کرتے ہوئے کہا کہ "کیا یہ ممکن ہو کہ وہی یونانی جو کل تک ہمارے غلام تھے آج ہم پر حکومت کریں" تو پھر ایک لہر جوش و خروش کی لوگوں میں پیدا ہو گئی اور سب کے سب مصطفٰے کمال کا ساتھ دینے کے لئے آمادہ ہو گئے۔

مصطفٰے کمال نے بتایا کہ اسوقت یونانیوں کی مدد کیلئے کوئی مغربی سلطنت طیار نہیں ہو سکتی اور اگر اب بھی ہم یونانیوں کو شکست نہ دے سکے تو پھر اس کے بعد کبھی ممکن نہ ہوگا۔ اسنے پھر تمام ملک میں امید افزا پیام کو پہونچایا اور پھر کوشش شروع کی کہ یونانیوں کے مقابلہ کیلئے تازہ فوج فراہم کرے۔ بعض لوگ اب بھی مصر تھے کہ جن شرائط پر بھی صلح ہو سکے کر لینی چاہئے کیونکہ ممکن ہو آیندہ انکا موقعہ بھی نہ رہے، لیکن وہ یہ سنکر کہدیتا تھا کہ "تم بزدل ہو بے غیرت ہو، مجھ سے الگ رہو، کہیں مجھے بھی تمھاری ہوا نہ لگ جائے"۔ الغرض اسنے ترکوں کی ٹوٹی ہوئی ہمت کو پھر اُبھارا، اور پھر قسمت آزمائی کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ (باقی)

# بیراگ کا بروگ

(بہ سلسلۂ جولائی)

(۶)

گزشتہ واقعہ کو ایک ہفتہ گزر گیا ہے اور اسوقت تک راجہ رتن گڈھ کی طرف سے کوئی بات ایسی ظاہر نہیں ہوئی جو کملا کے روزانہ معمول یا اسکے خیالات کی موجودہ رفتار میں حارج ہوتی۔ وہ ڈر رہی تھی کہ مبادا اس کا باپ سوامی جی کے خلاف کوئی نامناسب حکم صادر کرے یا اُن کو یہاں سے نکل جانے کی ہدایت کرے، لیکن چونکہ راجہ رتن گڈھ بہت سنجیدہ شخص تھا اس لئے جب بعد کو اس مسئلہ پر غور کیا تو کوئی ایسا طریق عمل اختیار کرنا اس کو مناسب نہ معلوم ہوا، جو سارے قصبہ کو چونکا دیتا اور لوگوں کو سرگوشیوں اور قیاس آرائیوں کا موقعہ دیتا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر اس نے سوامی جی کو نکلوا دیا تو یقیناً لوگوں کو خیال پیدا ہوگا کہ اس میں کوئی معاملہ کملا رانی کا ضرور شامل ہے کیونکہ اب یہ تقریباً ہر شخص کو معلوم ہوگیا تھا کہ کملا اُن کی چیلی ہوگئی ہے اور ممکن ہے اس سے کوئی بدنامی پیدا ہوجائے اور جگدیش پور والوں تک بھی اس کی خبر پہونچ جائے۔ اس لئے وہ کملا کے سامنے یہ کہنے کو تو کہہ گیا کہ سوامی جی کو آج ہی نکلوائے دیتا ہوں، لیکن بعد کو جب تنہائی میں اس نے غور کیا تو فی الحال خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا، کیونکہ اگر ایک طرف اس کو بدنامی کا خیال تھا تو دوسری طرف اپنی بیٹی کی مشتعل طبیعت سے بھی واقف تھا اور وہ ڈرا کہ سختی کہیں اور زیادہ ضد نہ اس میں پیدا کر دے۔

اس نے سب سے زیادہ کار آمد تدبیر یہ سوچی کہ جسقدر جلد ممکن ہو کملا کی شادی کر دیجائے، چنانچہ اس نے جگدیش پور اطلاع دی کہ چونکہ وہ ہندوستان کے تمام مقدس مقامات کی جاترا کے لئے جانا چاہتا ہے، اس لئے اگر شادی مہینہ کے اندر ہی اندر ہوجائے تو مناسب ہے، اس نے اپنے یہاں کے پنڈتوں کے ذریعہ سے جگدیش پور کے پنڈتوں کو بھی دے دلا کر ملا لیا اور آخرکار یہ بات طے پاگئی کہ اگلی پورنماشی کو بارات آئے گی، اور ریاست میں نہایت تیزی سے تمام اہتمامات ہونے لگے۔

صبح کا وقت ہے بادل گھرے ہوئے ہیں، کبھی کبھی بجلی چمک اُٹھتی ہے اور کملا حسب معمول سوامی جی کے پاس بیٹھی ہوئی گفتگو میں مصروف ہے۔

سوامی جی ـــــ "میں نے سُنا ہے کہ اگلی پورنماشی کو تمھاری شادی ہونے والی ہے"

کملا ـــــ "ہاں، مہاراج، سُنا تو میں نے بھی ہے"

سوامی ـــــ "یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ دس ہزار تولہ سونا اور ۹ من چاندی گلائے جانے کا حکم دیا گیا ہے"

کملا ـــــ "ہاں، یہ بھی میں نے سنا ہے"

سوامی ـــــ "اتنی گراں قیمت کس چیز کی ادا کی جارہی ہے۔ محبت کی؟ نہیں۔ بلکہ تمھارے ہونے والے شوہر کی، اور صرف اس لئے کہ وہ تم کو تمھارے دیس اور تمھاری ماں باپ کی آغوش سے جدا کردے، کملا، تمھیں معلوم ہے کہ اتنا سونا کتنی بیگناہ مخلوق کا خون بہاکر فراہم کیا گیا ہے، کیا تم جانتی ہو کہ اتنی چاندی کتنی عرق آلود پیشانیوں کی تمناؤں کو پامال کرکے حاصل کی گئی ہے۔ کاش زیور سے لدی ہوئی دُلھنیں سمجھ سکتیں کہ دنیا کی کتنی بد دعاؤں کا بار اُن کے جسم پر ہے، اور اُن کے زرکار لباس کتنے مجروح جسموں کے ریشے سے طیار کئے گئے ہیں۔ اُف! دولت کے یہ خونچکاں کھیل قدرت دیکھ رہی ہے اور کچھ نہیں کہتی، دُنیا کی فضا میں ہر طرف فریاد و آہ کی صدا گونج رہی ہے اور کوئی اس کا سننے والا نہیں" ـــــ "ہاں، کملا، تمھارے لئے کیا کیا زیور طیار کئے جارہے ہیں، کتنا قیمتی ٹیکا تمھاری پیشانی کے لئے تجویز ہوا ہے۔ کتنی زرکار ساریاں تمھارے جسم کے لئے انتخاب کی گئی ہیں"

کملا یہ سنکر خاموش سر جھکائے بیٹھی رہی اور کچھ جواب نہ دیا۔ تھوڑے انتظار کے بعد سوامی جی بولے "کیوں، کیا تمکو میرا کہنا ناگوار ہوا۔ آہ، کملا، معلوم نہیں، میں کیوں تم سے تمام وہ باتیں کہہ دیتا ہوں جو صرف پرمیشور کے سامنے کہنے کی ہیں"

کملا نے اپنی گردن، لانبی صندلی رنگ کی سڈول گردن اُٹھائی اور حزیں و ملول نگاہوں سے سوامی جی کی طرف دیکھ کر بولی ـــــ "مہاراج، کیا اس وقت آپ کا یہ کہنا پرمیشور کے سامنے نہیں ہے، کیا اس نے یہ سب کچھ نہیں سُنا"

سوامی ـــــ نہیں کملا وہ ایسی باتیں اسی وقت سنتا ہے جب سولی پر چڑھ کر کہی جائیں ہتیلی پر سر رکھ کر

سُنائی جائیں ۔ میں بزدل ہوں، کم ہمت ہوں ۔ اُس سے تو کہہ سکتا نہیں تم سے کہتا ہوں ۔ حالانکہ مجھے سمجھنا چاہئے کہ تم راجہ کی بیٹی ہو اور راجہ کی بیٹی کا شوہر بھی راجہ ہی ہوا کرتا ہے"

ٹھیک اسی وقت نہایت تیز کوندا لپکا اور اتنی سخت گرج ہوئی کہ ساری پہاڑی گویا ہل کر رہ گئی ۔ کملا جو باوجود مضبوط دل رکھنے کے بھی آخر کار ایک عورت ہی تھی اور عورت بھی کمسن، محلوں میں پلی ہوئی، ڈر گئی اور سہم کر اسقدر سمٹی کہ سوامی جی کے جسم سے اس کا جسم مل گیا اس حال میں کہ دونوں جسموں کی عریانیوں کے درمیان صرف ہلکی ریشمی ساری کا پلو حائل تھا ۔ سوامی جی نے بے اختیارانہ اس کے نرم و نازک اور لچیلے جسم کو اپنے ہاتھوں سے سنبھال کر اپنے سے اور زیادہ قریب کر لیا لیکن فوراً ہی گویا کہ یہ اتصال خود بجلی کا احساس تھا ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے ۔ ایک طرف وہ شرمائی ہوئی علحدہ بیٹھی کانپ رہی تھی اور دوسری طرف سوامی جی کا دل جلدی جلدی دھڑک کر فوارے پر فوارے خون کے تمام جسم میں دوڑا رہا تھا ۔

(۷)

رتن گڈھ سے سوامی جی کو گئے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا ہے اور کسی کو خبر نہیں کہ وہ کیوں دفعتاً اس طرح چلے گئے اور کہاں ؟ کملا کا باپ بہت خوش ہے کہ وہ کملا کی بارات آنے سے پہلے ہی غائب ہو گئے ورنہ ممکن تھا کہ دولہا کے کانوں تک بھی کوئی بات پہونچتی اور کملا کی بدنامی کا باعث ہوتی ۔ خود کملا کی کیا کیفیت ہے، اس کا جاننے والا سارے رتن گڈھ میں سوائے اس کے دل کے اور کوئی نہیں ۔

آخری ملاقات کے بعد دو دن تک کملا خود شرم کی وجہ سے سوامی جی کے پاس نہیں گئی اور جب تیسرے دن وہاں پہونچی تو اس جگہ کو خالی پایا جہاں زندگی میں سب سے پہلی مرتبہ دو بجلیوں کے تصادم نے اس کو لرزہ براندام کر دیا تھا ۔ وہ حیران تھی کہ سوامی جی کہاں چلے گئے اور گئے تو اطلاع کیوں نہیں دی ۔ وہ ایسا محسوس کرتی تھی کہ کوئی چیز سینہ کے اندر سے اُٹھ کر منہ کو آ رہی ہے، اس کا بدن کانپ رہا تھا، اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی زندگی میں کوئی نہایت وسیع خلا پیدا ہو گیا ہے اور وہ اس کے اندر گرتی جا رہی ہے ۔ وہ تھر تھرا کر اسی جگہ بیٹھ گئی جہاں سوامی جی بیٹھا کرتے تھے، کبھی وہ فرش کی چٹانوں کو دیکھتی اور کبھی در و دیوار کے پتھروں کو گویا ہر ایک سے پوچھتی تھی کہ سوامی جی کہاں گئے ۔ لیکن اس سوال کا جواب دینے والا وہاں کوئی نہ تھا ۔

اس نے سوچا اور اپنے خیال میں بالکل صحیح سوچا کہ شاید اس دن کے واقعہ نے سوامی جی کو برہم کر دیا لیکن اس نے جو کچھ کیا وہ بالکل غیر اختیاری بات تھی ۔ اس خیال کے آتے ہی اُس وقت کا پورا منظر اس کی نگاہوں کے

سامنے آگیا ـــ وہ بجلی کی کڑک، وہ اس کا سہمکر سوامی جی سے لپٹ جانا اور اپنے جسم میں غیر معمولی گرمی محسوس کرکے فوراً علیحدہ ہوجانا۔ اس کے بعد اس کا شرماکر دیر تک خاموش بیٹھے رہنا ـــ اس کے بعد وہ جزئیات کی تنقید میں محو ہوگئی اور غور کرنے لگی کہ سوامی جی کے جسم سے اس کا جسم مس ہونے کے بعد جو کیفیت اس پر طاری ہوئی وہ کیا تھی۔ کیا اس نے کوئی خاص لذت محسوس کی، بیشک محسوس کی لیکن شاید اس کا تعلق دو جسموں کے ظاہری اتصال کے سوا قلب سے نہ تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز اس کو کھینچ رہی ہے اور اس کھنچ جانے میں اس کو لطف آرہا ہے ـــ اگر واقعی سنسنی کو لطف سے تعبیر کیا جاسکتا ہے ـــ سوامی جی کے جسم سے ملکر اس کا جی یہ کیوں چاہنے لگا کہ وہ فاختہ کی طرح پر سمیٹ لے اور وہیں سمٹ کر رہجائے، غالباً اس لئے کہ ہوا سرد تھی، بارش ہورہی تھی۔ تاہم اس میں برہمی کی کیا بات تھی کیا سوامی جی کو یہ ناگوار ہوا کہ اس کا گناہگار جسم اُن کے پاک جسم سے مس ہوگیا۔ لیکن خود انھوں نے کیوں اپنی آغوش میں اس کو بھینچ لیا تھا، اگر اس کا جسم اس قابل نہ تھا تو علیحدہ کرنے کے بجائے اس کو اپنے سے اور زیادہ قریب کیوں کرلیا۔ خیال و تصور کی جہان بین اسی حد تک پہونچی تھی کہ وہ پھر دفعتہً ٹک گئی ـــ اس کے چہرہ کی سفیدی میں سُرخ سُرخ لکیریں دوڑنے لگیں، کنپٹی کی رگیں تڑپنے لگیں، کان کی لو گرم ہوگئی، گردن کی شریان خون کی روانی سے اُبھر آئی، پیشانی کے نیلگوں عروق زیادہ نمایاں ہوگئے آنکھوں میں دھواں سا بھر کر چند موٹے موٹے قطرے آنسوؤں کے پلکوں تک آکر رُک گئے اور ایک ایسی کیفیت کے ساتھ جو ذرا اور بڑھ جائے تو ربودگی اور جنون کا فرق مٹادے، ایک چٹان کا کنارہ پکڑکر اُٹھ بیٹھی اور دیر تک کھڑی سوچتی رہی کہ اب کیا ہونا ہے۔

وہ آہستہ آہستہ اس حقیقت کی تلخی کو نہایت شدت سے محسوس کرتی جاتی تھی کہ سوامی جی کے ساتھ اسکا تعلق بہ نسبت روح کے شاید جسم سے زیادہ تھا اور یہ اس کے نفس کا فریب تھا کہ اسوقت تک اس حقیقت سے اسے بیخبر رکھا۔ لیکن کیا محبت کوئی اختیار کی چیز ہے، اور کسی کو دیکھتے رہنے کی آرزو کوئی گناہ ہے وہ بے اختیار کہہ اُٹھی :۔ "آہ سوامی، آپ کیا کرگئے، جب تک پاس تھے، دوری کا خیال بھی چنداں تکلیف دہ نہ تھا اور اب کہ آپ دور ـــ خدا جانے کتنی دور ـــ ہیں، نزدیکی کا تصور بھی سکون پہونچاتا نظر نہیں آتا ـــ کیا اسی کا نام محبت ہے۔ اُف کتنی تکلیف دہ چیز ہے، کیسی دہکا دینے والی آگ ہے ـــ وہ اگر مجھ سے خفا ہیں تو میں اُن سے پوچھوں گی کہ کیوں ـــ اور اگر انھوں نے کہا کہ " تم مجھے محبت میں مبتلا کرنا چاہتی تھیں" تو میں سوال کروں گی کہ کیا محبت بُری چیز ہے اور اگر انھوں نے کہا کہ ہاں، تو پھر ـــ مگر نہیں وہ ایسا نہیں کہہ سکتے

اُف، اس وسیع دُنیا میں انھیں کہاں ڈھونڈھوں، وہ اب کیوں ملنے لگے، ہاں، وہ تو مجھے تباہ کرنے آئے تھے سو تباہ کر چلے۔ بہتر ہے ـــــ" اس کی آواز بھرانے لگی، وہ خاموش ہوگئی، اس کی آنکھوں میں آنسو آئے لیکن پلک تک آکر رُک جانے کے لئے نہیں بلکہ ڈھلکنے کے لئے، اُس کی ساری کے آنچل میں جذب ہوکر اتنے حصہ کو اور زیادہ رنگین بنا دینے کے لئے ـــ

(۸)

رتن گڈھ کا قلعہ، نہایت قدیم راجپوت وضع کا قلعہ ہے، وہی چاروں طرف خندق، اور پُل وہی دروازے کے پھاٹک، وہی فصیلیں اور اسی طرح کے بیسیوں پیچ در پیچ راستے جو محل کے مختلف حصوں تک پہونچکر ساری عمارت کو بھول بھلیاں بنا دیتے ہیں۔

ریاست کے اکثر ذاتی کارخانے محل کے اندر ہی واقع تھے اور وہ سونار خانہ بھی جہاں آج کل رانی کملا کے جہیز کے لئے زیور طیار ہو رہا تھا، اسی عمارت کے ایک گوشہ میں واقع تھا۔ باہر دروازہ پر مسلح سپاہی پہرہ دے رہے ہیں اور ایک فوجی افسر آنے جانے والوں کی نقل و حرکت کو نہایت غور سے دیکھتا جاتا ہے۔

اندر داخل ہوتے ہی ایک بڑا ہال نظر آتا ہے جس کے اندر چار بڑی بڑی بھٹیاں دہک رہی ہیں اور چاندی سونا پگھلا پگھلا کر ان سوناروں کو تول تول کر تقسیم کر دیا جاتا ہے جو درجنوں کی تعداد میں ہال کے کنارے کنارے چاروں طرف، اپنے تمام آلات و اوزار لئے ہوئے مصروف کار ہیں۔ کوئی سونا کوٹ کوٹ کر اس کے بڑے بڑے پتّر طیار کر رہا ہے، کوئی جنتر سے تار نکال رہا ہے، کہیں صیقل ہو رہی ہے، کہیں ٹانکے دئے جا رہے ہیں۔ الغرض ہتوڑیوں، دھونکنیوں، خرادوں اور نہایئوں کی مختلف قسموں کی آوازوں سے مل کر ایک عجیب قسم کی دماغ خراش صدا گونج رہی ہے۔ ہال کے ایک گوشہ میں دروازہ ہے جو ایک مختصر سے کمرہ میں کھلتا ہے، جہاں ایک سردار کی نگرانی میں تمام زیور تُلنے کے بعد ذخیرہ کے کوٹھری میں رکھدیا جاتا ہے۔

سردار خوشحال سنگھ جو راجہ کے رشتہ میں ماموں ہوتے ہیں اس خدمت پر مامور ہیں اور دوسرے لوگوں سے جو وہاں بیٹھے ہوئے ہیں باتیں بھی کرتے جاتے ہیں۔ اسی وقت گول پگڑی باندھے ہوئے ایک چوبدار ہاتھ میں چاندی کا عصا، سُرخ باناتی کی وردی پہنے آتا ہے اور ایک چٹھی دیکر چلا جاتا ہے۔

سردار خوشحال سنگھ اس کو پڑھکر کچھ گھبرا سے جاتے ہیں اور فوراً کھڑے ہوکر سپاہی کو حکم دیتے ہیں کہ آج سے رات میں بھی کام ہوگا اور ذخیرہ کی کوٹھری میں جاکر ایک دوسرے سردار سے پوچھتے ہیں کہ ـــــ

اس وقت تک طیار شدہ اشیار کی فہرست کیا ہے؟"

—— "چاندی کے اسباب میں دس ہاتھیوں کی آرائش معہ زنجیر، عماری، ٹیکہ اور کرن پھول کے طیار ہوچکی ہے اور دس کے لئے اور طیار ہونا باقی ہے۔ اسوقت تک ڈھائی سومن چاندی صرف ہوچکی ہے اور باقی ڈھائی سومن خزانہ سے آچکی ہے۔"

خوشحال سنگھ — "اچھا ڈھائی سومن چاندی اور آئے گی کیونکہ دس ہاتھیوں کی آرائش اور طیار کرنا ہے سونے کی چیزیں کیا کیا طیار ہوچکی ہیں؟

—— "اسوقت تک دس ہزار تولہ گلایا جاچکا ہے اور ۳۰۰ سٹ گھانے کے بن چکے ہیں، البتہ صیقل ہونا باقی ہیں۔"

خوشحال سنگھ — "بہتر ہے، پانچ ہزار تولہ سونا کل تک اور آئے گا، مہاراجہ کا حکم ابھی ابھی مجھے ملا ہے کہ پندرہ دن میں سب کام مکمل ہوجانا چاہئے۔"

یہ کہکر خوشحال سنگھ باہر نکلا ہی تھا کہ پنڈت مہیش دت وید آگئے اور دونوں ایک گوشہ میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

وید —— "کہئے سردار جی، آج کل تو آپ بہت مصروف ہوں گے۔"

"ہاں آج سے تو راتوں میں بھی کام ہوگا، دن بہت کم رہ گئے ہیں اور ابھی آدھا کام بھی نہیں نبٹ سکا۔"

وید —— "مگر مجھے تو امید نہیں کہ ابھی یہ بیاہ ہوسکے"

سردار —— (چونک کر) کیوں، کیا بات ہے ویدجی"

وید —— "رانی کملا کی بیماری بڑھتی جاتی ہے اور مجھے امید نہیں کہ وہ اتنی جلد اچھی ہوجائے گی۔"

سردار —— "سچ بتائیے، کوئی خطرہ تو نہیں ہے"

وید —— "سردار جی، خطرہ کی نہ کہو، انسان ہر وقت خطرہ میں ہے، معمولی زکام بھی ہلاک کرنے کے لئے کافی ہے اگر بڑھ جائے اور قسمت میں بچنا ہو تو کنوئیں میں گرکر بھی زندہ نکل آتا ہے، مگر ہاں اس میں شک نہیں کہ اسوقت تک کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی اور راجکماری کو اختلاج بڑھتا ہی جارہا ہے"

سردار —— (نہایت آہستہ سے) کرن سنگھ جی تو بہت خوش ہوں گے۔ اور سچ پوچھو تو ان کے کنور سے زیادہ موزوں کوئی ہو بھی نہ سکتا تھا۔ ریاست کے سب سے بڑے جاگیر دار کا بیٹا، خوبصورت جوان پڑھا لکھا

قابل - ویدجی جسوقت سوچتا ہوں کہ نہ جانے کتنی پیڑھیوں کی جمع کی ہوئی دولت آج رتن گڑھ سے باہر چلی جارہی ہے تو میری حالت عجیب ہوجاتی ہے"

وید ــــــ "سردار جی! آپ کو معلوم نہیں کہ یہ شادی تو صرف دولت ہی کے لئے کی جارہی ہے، آپ کو معلوم نہیں کہ جگدیش پور والوں نے اس معاملہ میں کتنی کوشش کی ہے، اور بیچ میں سرکار انگریزی کو ڈال کر ہمارے مہاراج کو راضی کیا ہے، ورنہ وہ خود نہ مانتے تھے۔ پر اب کیا ہوسکتا ہے، وہ تو جو کچھ ہونا ہے ہوکر رہیگا"

سردار ــ "کرن سنگھ کے کنور بھی تو سنا ہے باہر چلے گئے ہیں اور وہ شادی میں شریک نہ ہوں گے"

وید ــــــ "ہاں، وہ آج کل نہیں ہیں، میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ وہ اسی کوشش میں گئے ہیں کہ یہ شادی کسی طرح نہ ہونے پائے (نہایت آہستہ سے کان کے پاس منھ لیجا کر) بلکہ مجھے تو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ راجہ کرن سنگھ نے ایک گمنام خط جگدیش پور اس مضمون کا بھجوایا ہے کہ راجکماری کا چال چلن اچھا نہیں اور سوامی جی سے انکا تعلق رہچکا ہے"

سردار ــــ (چونک کر)۔ ہاں، یہ آپ کو کیونکر معلوم ہوا، کیا مہاراج کو بھی اس کا علم ہوچکا ہے"

وید ــــــ مہاراج کو تو اس کا علم نہیں ہوا، اور نہ ہونا ہی اچھا ہے، ورنہ معلوم نہیں کیا نتیجہ ہو، سردار جی سچ کہوں مجھے تو اس شادی کا نتیجہ بہت بُرا نظر آتا ہے اور میرا ماتھا ٹھنکتا ہے کہ کچھ نہ کچھ ہوکر رہے گا۔ پرمیشر اچھا ہی اچھا کرے"

(باقی) نیاز فتحپوری

(نوٹ) یہ فسانہ ماہ آیندہ میں ختم ہوجائے گا۔

# سَلاطینِ سلف سب ہو گئے نذرِ اجل عثماںؔ

# مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہی نشاں باقی

اعلیٰحضرت خسروِ دکن مدظلہ العالی کا مندرجۂ عنوان پیام جب میں نے پہلے پہل سُنا تو مجھ پر تھوڑی دیر تک ایک عجیب کیفیت طاری رہی میری نگاہوں کے سامنے عہدِ ماضی کی تاریخ اپنے اوراق اُلٹنے کے لئے بے چین ہوگئی وہ تاریخ جس میں "سلاطینِ سلف" کی شاہانہ سطوت وجبروت کے نقوش ابتک اُبھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ تاریخ جس کے اوراق پر عظمت واقتدار کے ایسے ایسے مناظر ثبت ہیں جنھیں زمانہ کبھی فراموش نہ کریگا۔ غزنویوں کا دبدبۂ فتحمندی، غوریوں کا آئینِ ہوشمندی غلاموں کے ستاروں کی بلندی، خلجیوں کی فراست و دانشمندی۔ تغلقوں کی خسرو پرستی، اور تیموریوں کا تدبر و اسلامی رواداری تاریخ کے حافظہ میں ابھی اُسی طرح باقی ہے اور فضائے بسیط میں خاندانِ تیموری کے آخری تاجدار کا یہ اخلاقی درس بھی اب تک محفوظ ہے کہ:-

ظفرؔ آدمی اُس کو نہ جانئے گا گو ہو کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

غرض "بھارت ورش" کی اسلامی حکومتیں ان تاریخی اوراق میں میری ڈبڈبائی آنکھوں کے سامنے اس طرح آئیں کہ دلی کا چراغ ٹمٹما رہا ہے اور محمد شاہ رنگیلے کی عیش پرستی کا آفتاب لبِ بام آچکا ہے "اختر پیا" کی لکھنوی رنگ رلیاں سازشوں کا شکار ہونے لگی ہیں۔ بنگالے کے سورما شجاعت کے وہ جوہر کھو چکے ہیں، جن سے محرومی انسان کو صرف پہاڑوں میں روپوش ہونے کی تعلیم دے سکتی ہے، "تانا شاہ" کی مرہٹہ نوازی حضرت راجو کا نام لیتے لیتے قلعہ سے باہر ہو گئی ہے، نظام شاہیوں کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ عادل شاہیوں کا

عدل صرف زبانوں پر رہ گیا ہے، بہمنیوں کی عقیدت حضرت گیسو دراز کے قدموں پر نثار ہو چکی ہے، یہ تمام مناظر یکے بعد دیگرے میرے سامنے آئے اور میں " آہ یاد ایام " کہکے خاموش ہو گیا۔

یہ تو خیر قصۂ ماضی تھا مگر جب عہد حاضر کی اسلامی حکومتوں پر نظر پڑی تو دیکھتا ہوں کہ ترکی خلافت کی ذمہ داریوں کا بار اپنے دوش سے اُتار چکا ہے اور اس کو اب عالمگیر اخوت اسلامی سے کوئی سروکار نہیں رہا۔ ایرانی رضا شاہ کے فہم و تدبر کا امتحان لے رہے ہیں اور عالم اسلامی سے بے خبر ہو کر اپنی خیر منا رہے ہیں، حجاز کی مرکزیت کعبہ کے احترام اور پیغمبر اسلام کی خوابگاہ ہونے کی وجہ سے گو ہمیشہ قایم رہے گی۔ لیکن یہاں کے تپتے ہوئے ریگستان میں اب کاروان رفتہ کے نقش قدم مسکراتے نظر نہیں آتے۔ خاک عراق کے منافق ذرّے آج بھی اس تاریکی سے آزاد نہیں ہوئے جو حسین کی مظلومی نے ان پر ثبت کی تھیں، دریائے نیل کی موجیں مدت ہوئی اپنی " آزاد روانی " سے محروم ہو چکی ہیں، افغانستان کی طوائف الملوکی سے کس کو اُمید ہو سکتی ہے کہ وہاں آرام سے پاؤں پھیلانے کی کبھی اجازت مل سکے گی۔

ان مایوس کن حالات نے ماضی کی طرف پھر لوٹایا تو پایۂ تخت ہند کے وزیر اعظم حضرت آصفجاہ اول کی مآل اندیشی تاریخی اوراق میں سامنے آگئی، یہ وہ زمانہ ہے جب تیموری سلطنت کے سنبھلنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی تھی " رنگیلے عہد " میں ہر کس و ناکس کے دل پر مایوسی کے بادل چھا چکے تھے، ہر دماغ معطل ہو چکا تھا " رنگیلی قوتیں " جواب دے چکیں تھیں اور بہتری کے توقعات اُٹھ چکے تھے مگر ایک صرف حضرت آصف جاہ اول کا تنہا دماغ تھا جن کو دکن میں اپنا اور مسلمانوں کے بھٹکے ہوئے گلہ کا مستقبل مطمئن اور شاندار نظر آ رہا تھا، انھوں نے خاندان تیموری کی عظمت و عزت کو سنبھالنے کا ارادہ کر لیا۔ مالوہ سے بزرگان دین کی دعائیں لیتے " سیدوں " کی سرکشیوں کو دباتے " نادری غصہ " کی شعلہ افگن آگ کو بجھاتے اور دہلی کے تخت کو " خدا حافظ " کہتے ہوئے اپنے مفوضہ صوبہ (دکن) میں داخل ہو گئے اور ہر مذہب و ملت کو اپنی پناہ میں لیکر عبادت الٰہی میں سر بسجود ہو گئے۔ یہی تھے جنھوں نے ایسے وقت میں " دین حنیف " کو زندہ رکھا ورنہ کون تھا جو ہندی مسلمانوں کے زخموں کا اندمال کر سکتا۔ کیونکہ طوفان انقلاب نے جس قوم کی تباہی میں اندلسیوں کی طرح کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی اس کا آخری ٹھکانا سلطنت آصفیہ کے سایۂ عاطفت کے سوا اور کہاں ہو سکتا تھا خدا حضرت آصف جاہ اول کی روح کو آسودہ رکھے۔ جن کے شاہانہ عزایم کے صدقے میں مسلمانان ہند کو دکن میں امن و آسایش سے سانس لینے کا موقع مل گیا۔

حضرت اقدس و اعلیٰ اسی دودمان عالی کے ساتویں بادشاہ ہیں حضور نے بزرگان سلف کی سنت کو قائم رکھکر عالم اسلامی کو عموماً اور مسلمانان ہند کو خصوصاً یہ مژدہ جانفزا سنایا ہے کہ تمھاری ٹوٹی ہوئی امیدوں کا سہارا اور تمھارے بکھرے ہوئے اجزاء کا "نشان" سلطنت آصفیہ کے نام سے باقی ہے۔ (خدا ابدالآباد تک اس نشان کو باقی رکھے) اس سے وابستگی تمھارا اسلامی حق ہے اور اس کی وسیع آغوش تمھارے لئے ہر وقت کھلی ہوئی ہے، تمنے جس خواب ماضی کو تصور کی آنکھوں سے دیکھا ہے اُس کی تعبیر عہد حاضر میں اپنی مادی آنکھوں سے دیکھ لو!

حقیقت یہ ہے کہ اس شعر میں حضرت اقدس و اعلیٰ نے ایک ایسا جاں نواز پیام دیا ہے جو عالم اسلامی کیلئے یقیناً نوید حیات ہے، مصرعۂ اولیٰ میں سلاطین سلف "ایک ایسا ٹکڑا ہے جس کا معنوی اثر فریاد کی صورت میں مسلمانوں کی مضمحل روحوں پر چھا جاتا ہے۔ اس غم کا مداوا جو کر سکتا ہے اس درد کو دلوں کے پنہاں گوشوں سے جو نکال سکتا ہے اس اضطراب اور اس احساس بربادی کو مسلمانوں کی دم توڑتی ہوئی قوم کی روحوں سے جو مٹا سکتا ہے وہ عہد حاضر میں حضرت بندگان عالی ہی کی شاہانہ ذات ہے۔ جبھی تو مصرعۂ ثانی میں ارشاد ہوتا ہے کہ

مسلمانوں کا تری سلطنت سے ہے نشاں باقی

اس دلکش نغمہ کو سُن کر اطمینان و مسرت کو دعوت دیجئے، اس جمیل پیغام کو پڑھکر اپنی خوش نصیبی کو مبارکباد دیجئے، اور اس "روح پرور" "صلائے عام" پر لبیک کہکر زندہ ہو جائیے کیونکہ یہ پیام تمام ان برادران اسلام کے لئے ہے جن کی جبینوں سے اقصائے ہند کی بیشمار مسجدیں اب بھی آباد ہیں اور جن کی روحوں میں اب بھی حجازی نغمے پرورش پا رہے ہیں۔ یہ بشارت اس صبر آزما احساس شکستگی کے بعد ملی ہے جب مسلمانان ہند کے سروں سے عظمت و اقبال کا سایۂ ہمایوں اُٹھ چکا تھا۔ اسی سے متاثر ہو کر مولانا حالی نے اپنی شاعرانہ زبان میں اس طرح فریاد کی تھی کہ:۔

چاؤش تھے للکارتے جن رہگزروں میں ۔۔۔ دن رات بلند اُن میں فقیروں کی صدا ہے
جس دین کا تھا فقر بھی اکسیر غنا بھی ۔۔۔ اس دین میں اب فقر بھی باقی نہ غنا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے ۔۔۔ پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

مولانا حالی زندہ ہوتے تو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور اپنے کانوں سے سُنتے کہ ان کی فریاد صدا بصحرا ثابت نہیں ہوئی بلکہ سلطنت آصفیہ کے "قصر معلیٰ" تک پہونچکر رہی اور "فریاد رس" نے اس کا جواب شاعرانہ زبان میں دے کر تنہا حالی کی بے چین روح کو نہیں بلکہ جملہ مسلمانوں کو سکون پہونچا دیا جسکے اظہار تشکر

ہ مسلمانان ہند کی زبانوں سے ہمیشہ یہ دُعا نکلتی رہے گی۔

"خدا ہمارے بادشاہ دکن کو سلامت رکھے"

ہوشؔ بلگرامی

---

# شہوانیات یا ترغیبات جنسی

## حضرت نیاز کے قلم سے

جس میں فحاشی کی تمام فطری وغیر فطری قسموں کے حالات اور ان کی تاریخی ونفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اور آیندہ اخلاق انسانی کی بنیاد کن اصول پر قایم ہونا ہے۔ الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایکبار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز واقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی سُنے نہ ہوں گے اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول ۸ر کے مجلد کتاب صرف ۱؎۸ میں اور غیر مجلد ۱؎ میں ملے گی اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد ۲؎۸ میں اور غیر مجلد ۲؎ میں علاوہ محصول ۸ر کے ملیگی۔

اگر

ارشاد ہو تو کتاب بذریعہ وی۔ پی روانہ کی جائے حجم ۲۷۵ صفحات آرڈر میں مجلد وغیر مجلد کی صراحت ضروری ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

---

# فلسفۂ مذہب

مذہب اسلام اور اس کے مراسم شعائر پر تفصیلی بحث وتنقید۔ اگر آپ اسلام کی تقلید سمجھ کر کرنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ کیجئے بہت کم جلدیں رہ گئی ہیں۔ قیمت علاوہ محصول عہ

منیجر نگار۔ لکھنؤ

# فصاحت لکھنوی کی اصلاحیں

فصاحت لکھنوی، امانت لکھنوی کے بیٹے تھے، اور اُن کے انتقال کو زیادہ زمانہ نہیں گزرا۔ میں نے خود ۱۹۰۹ء میں سندیلہ کے مشاعرہ میں ان کو غزل پڑھتے سُنا اور اس کے بعد بھی وہ کئی سال تک زندہ رہے تغزل ان کا بالکل لکھنوی رنگ کا تھا اور سوائے رعایت لفظی یا محاورہ و زبان کے ان کی غزل میں اور کوئی چیز نہ ہوتی تھی۔ امانت کی واسوخت جن حضرات نے دیکھی ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اُن کے بیٹے کا رنگ شاعری کیا ہونا چاہئے تھا۔

بہرحال وہ لکھنؤ کے اساتذہ میں ضرور تھے اور جس حد تک زبان کی صفائی کا تعلق ہے اُن کے اُستاد تسلیم کرنے میں کسی کو تامل نہیں ہو سکتا۔ ان کے شاگردوں کی تعداد کا مجھے علم نہیں لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ نواب داراب علیخاں (تیموری شاہزادہ) کو بھی ان سے نسبت تلمذ حاصل تھی۔ نواب داراب علی خاں سطوت تخلص کرتے تھے اور فصاحت سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔

اتفاق سے حیدر آباد کی لائبریری میں سطوت کا قلمی دیوان نظر سے گزرا جو فصاحت کا درست کیا ہوا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ سطوت کی شاعری نہایت ہی ادنیٰ قسم کی شاعری ہے لیکن فصاحت نے جو اصلاحیں دی ہیں وہ نہایت دلچسپ ہیں اور ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فن میں ان کو کس قدر ملکہ حاصل تھا۔ چند نمونے ذیل میں درج کرتا ہوں:۔

---

سطوت کا شعر ہے:۔

باہیں گردن میں مری ڈال کہتا ہو وہ شوخ　　آج تو مجھ سے اے سطوت ترا دل شاد ہوا

شعر کی سخافت ظاہر ہے اور لفظ (اے) اتنی بُری طرح دبکر نکلتا ہے کہ پورا شعر نظری ہونے کے قابل تھا، مگر فصاحت نے اپنی اصلاح سے اس میں ایک رنگ پیدا کر دیا۔ ان کا اصلاح کیا ہوا شعر یہ ہے:۔

باہیں گردن میں مری ڈال کے سطوت وہ شوخ ہنسکے کہتا ہے کہ اب تو ترا دل شاد ہوا

---

طوت :- بیکار غم فراق کا کھایا غضب کیا کیوں اس صنم سے دل کو لگایا غضب کیا

اس شعر میں ایک نہایت نازک غلطی یہ تھی کہ لفظ (کیوں) دوسرے مصرعہ میں بیکار ہے۔ فصاحت نے
ں کو محسوس کر کے دوسرا مصرعہ یوں کر دیا :-

دل اپنا اس صنم سے لگایا غضب کیا

ب پورا شعر صاف ہو گیا اور زبان کی روانی پیدا ہو گئی۔

---

طوت :- افسوس دشمنوں کی نگاہوں پہ چڑھ گیا مجھ کو صنم نے پاس بٹھایا غضب کیا

بظاہر اس شعر میں کوئی نقص نہیں معلوم ہوتا لیکن ذوق محسوس کرتا ہے کہ دوسرے مصرعہ میں کسی بات
ں کمی ضرور پائی جاتی ہے۔ فصاحت نے اُس کمی کو اس طرح دور کیا :-

محفل میں اس نے پاس بٹھایا غضب کیا

---

طوت :- آئے وہ میری قبر پہ ہمراہ غیر کے دل خود دُکھا تھا اور دُکھایا غضب کیا

ایک نقص تو اس شعر میں یہ تھا کہ قبر کا ذکر کر کے شاعر نے مفہوم بالکل مہمل کر دیا تھا، کیونکہ مرنے کے بعد
ل دُکھنے اور دُکھانے کا معاملہ کوئی معنی نہیں رکھتا، اس کے علاوہ دوسرے مصرعہ میں (دُکھا تھا) کے بجائے
دُکھا ہوا تھا) ہونا چاہئے تھا — اُستاد فصاحت نے اصلاح دیکر یہ دونوں نقص دفع کر دئے اور روانی پیدا کر دی

آئے ہمارے گھر میں وہ ہمراہ غیر کے دُکھتا ہوا دل اور دُکھایا غضب کیا

---

بلایا غیر کو اس شمع رو نے اپنی محفل میں مرا دل مثل پروانہ جو جل جاتا تو کیا ہوتا

دوسرے مصرعہ میں لفظ (جو) بالکل زاید ہے۔ اصلاح نے اس نقص کو دور کر دیا :-

مرا دل صورتِ پروانہ جل جاتا تو کیا ہوتا

---

سطوت:۔ قتل کرنے جب بلایا اس بتِ سفاک نے ناتوانی سے قدم آگے بڑھا کر رہ گیا

خیر مفہوم و مضمون تو جیسا ہے ظاہر ہے، لیکن فنی نقطۂ نظر سے ایک نقص یہ ہے کہ ضمیر نہ ہونے کی وجہ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ کون قدم آگے بڑھا کر رہ گیا اور دوسرے یہ کہ قدم بڑھانا خود فرطِ ناتوانی کے منافی ہے۔

فصاحت نے اس شعر میں اصلاح دیکر اس کو بہت بلند کر دیا ملاحظہ ہو:۔

شرم آئی پیشِ منعم، جب گیا بہرِ سوال کچھ نہ بولا منھ سے ہاتھ اپنا بڑھا کر رہ گیا

---

سطوت:۔ خزاں کے ہاتھ سے کیا آج ہی پامال وہ گلشن ہزار افسوس کل جس باغ میں شورِ عنادل تھا

چونکہ دوسرے مصرعہ میں لفظ (باغ) موجود ہے، اس لئے پہلے مصرعہ میں لفظ (گلشن) بیکار ہے علاوہ اس کے سلاست و روانی بھی مفقود ہے۔ فصاحت نے اس میں بھی خوب اصلاح دی ہے:۔

گلستاں ہائے کیا آباد تھا فصلِ بہاری میں کہیں کوکو تھی قمری کی، کہیں شورِ عنادل تھا

---

سطوت:۔ عجب تقدیر ہے وہ نزع میں آئے تھے بالیں پر نہ کی کچھ بات اُن سے لب ہلانا ہم کو مشکل تھا

پہلے مصرعہ میں لکھنوی زبان کے لحاظ سے (نزع میں آنا) بالکل بے معنی سی بات تھی کیونکہ نزع اک کیفیت کا نام ہے اور جب تک اس کے ساتھ کوئی اور لفظ وقت کے معنے میں استعمال نہ کیا جائے مفہوم پیدا نہیں کرتا۔ دوسرے مصرع میں (نہ کی کچھ بات اُن سے) بھی بہت ڈھیلی بات تھی۔ اصلاح سے یہ دونوں نقص دور ہوگئے:۔

---

وہ بالیں پر ہمارے نزع کے ہنگام آئے تھے بھلا کیا بات کرتے لب ہلانا ہم کو مشکل تھا

---

سطوت:۔ نہایت آرزو ہے آکے پہلو میں وہ بُت بیٹھے خداوندا کسی دن تو بر آئے مدعا دل کا

پہلے مصرعہ میں (نہایت آرزو) بالکل غلط اور لفظ (بُت) بیکار تھا۔ اصلاح ملاحظہ ہو:۔

وہ دلبر آکے پہلو میں مرے بیٹھے یہ حسرت ہے

---

سطوت:۔ تڑپ کر تیری فرقت میں نکل جائیگا سینہ سے بہت مشکل ہے اب ایمان ہم کو تھامنا دل کا

اس شعر میں معشوق سے خطاب بہت غیر دلچسپ بات تھی اور (فرقت) کا اظہار بھی گراں گزرتا تھا۔
فصاحت نے اس شعر میں نہایت پاکیزہ اصلاح دی ہے:۔

ترٹپ کر دیکھنا اک دن نکل جائیگا سینہ سے　　　بہت مشکل ہے اُلفت میں عزیز رکھنا دل کا

زبان و بیان دونوں حیثیت سے شعر پاکیزہ ہوگیا۔

---

سطوت:۔ تنگ ہوں زیست سے فرصت جو مجھے دیتا ضعف　　　اپنے پاؤں سے میں اپدل سوے قاتل جاتا

پہلے مصرعہ میں لفظ (ضُعف) "ضوف" ہو کر ادا ہوتا ہے اور دوسرے مصرعہ میں (پاؤں) "پاؤون" ہوجاتا ہے۔ فصاحت کی بالغ نظری نے اپنی اصلاح سے یہ دونوں نقص دور کر دئے:۔

تنگ ہوں زیست سے مانع مجھے ہوتا جو نہ ضعف　　　اپنے ہی پاؤں سے میں جانب قاتل جاتا

---

سطوت:۔ بدمزہ ہوکے مجھے قتل ہی کرتا شاید　　　کان تک اس کے اگر شور سلاسل جاتا

معنی کے لحاظ سے شعر بہت رکیک ہے اس لئے فصاحت نے پہلا مصرعہ بدلدیا:۔

اپنے دیوانہ پر آتا اسے کچھ رحم ضرور

---

سطوت:۔ باغباں نالوں کی تاثیر نہیں کیوں ہوتی　　　گوش گل تک نہیں کیا شور عنادل جاتا

پہلا مصرعہ بالکل مبتدیانہ ہے اور دوسرے مصرعہ میں جو دعویٰ کیا گیا ہے اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا یعنی تاثیر نہ ہونے کی کوئی کیفیت ظاہر نہیں کی گئی۔ صلاح بہت پاکیزہ ہے:۔

باغباں ہنسنے پہ اس کے ہے تعجب مجھ کو

لفظ (ہنسنے) سے دوسرے مصرعہ کا ثبوت پیش کر دیا گیا۔

---

سطوت:۔ افسوس وہ حسیں نہ رہے، وہ نہ ہم رہے　　　وہ صحبتیں گئیں وہ زمانہ گزر گیا

دوسرا مصرعہ صاف تھا لیکن پہلا بالکل لچر تھا۔ فصاحت نے اس کو بدلکر اک لطف پیدا کر دیا:۔

اب وہ حسیں رہے نہ وہ افسوس ہم رہے

سطوت:۔ حسینوں پہ کیوں ہائے عاشق ہوا مجھے بیٹھے بیٹھے یہ کیا ہو گیا،

دوسرے مصرعہ میں (بیٹھے بیٹھے) کا استعمال بے محل تھا، اس لئے فصاحت نے اسے یوں کر دیا:۔

مجھے بیٹھے بٹھلائے کیا ہو گیا

---

سطوت:۔ عجب حال ہے مجھ سیہ بخت کا بہار آئی سودا سوا ہو گیا،

پہلے مصرعہ میں صرف سودا کی رعایت سے (سیہ بخت) لایا گیا تھا، فصاحت نے پہلا مصرعہ بدلکر شعر میں جان ڈالدی:۔ ترے وحشیوں کا عجب حال ہے۔

(ترے وحشیوں) کے فقرہ نے عجب لطف پیدا کر دیا

---

سطوت:۔ زلفوں نے آکے ڈھانک لیا رُوئے پر ضیا ٹوٹا جو بند رات کو اس کے نقاب کا

فصاحت نے اس میں صرف ایک لفظ کا تغیر کیا ہے یعنی (آکے) کی جگہ (بڑھکے) بنا دیا ہے، لیکن اسی ادنیٰ تغیر نے اک کیفیت پیدا کر دی۔

---

سطوت:۔ بعد مُردن یہ محبت کا اثر باقی ہے کف افسوس ملے جب میں انھیں یاد آیا

پہلے مصرعہ میں لفظ (بھی) ہونا ضروری تھا اس لئے اُستاد نے یہ اصلاح دی:۔

بعد مُردن بھی یہ اُلفت کا اثر باقی ہے

---

سطوت:۔ جب سے کہ عاشق مژۂ یار ہو گیا اک تیر تھا کہ دل سے مرے پار ہو گیا

پہلے مصرعہ میں (جب سے کہ) نہایت ہی ثقیل تھا اور دوسرے مصرعہ میں (اک تیر تھا) کہنا بالکل بے محل تھا کیونکہ (جب سے) کہنے کے بعد اس کا کوئی موقعہ ہی نہ تھا۔ اصلاح سے دونوں عیب مٹ گئے:۔

بے سمجھے عاشقِ مژۂ یار ہو گیا یہ تیر ہائے دل سے مرے پار ہو گیا

---

سطوت:۔ مُنھ رکھ کے چشم یار پر آزار ہو گیا نرگس کا پھول سونگھ کے بیمار ہو گیا

مطلع بنانے کی کوشش میں شاعر نے اس شعر کو بالکل مہمل کر دیا تھا۔ اصلاح سے مطلع تو باقی رہا نہیں لیکن شعر خاصہ ہو گیا۔

منھ رکھ کے چشم یار پہ غش آ گیا مجھے  نرگس کا پھول سونگھ کے بیمار ہو گیا

---

سطوت:۔ بہتر ہے ہجر یار سے سطوت جو آئے موت  صدمے اُٹھائے زیست سے بیزار ہو گیا

انداز بیان کی ژولیدگی ظاہر ہے۔ دوسرے مصرعہ کا مفہوم یوں ادا ہونا چاہئے تھا کہ "اتنے صدمے اُٹھائے کہ زیست سے بیزار ہو گیا"۔ اصلاح کی پاکیزگی قابل داد ہے:۔

آخر کو زہر کھا لیا سطوت نے ہجر میں  اس درجہ اپنی زیست سے بیزار ہو گیا

---

سطوت:۔ عجیب مجھ کو مزہ ملگیا فقیری میں  خدا سے مانگ کے میں ملک و مال کیا کرتا

پہلے مصرعہ میں محض وزن پورا کرنے کے لئے بجائے (ملا) کے (ملگیا) استعمال کیا گیا تھا اس لئے فصاحت نے اس کو یوں بنا دیا:۔  عجیب مجھ کو ملا ہے مزہ فقیری میں

---

سطوت:۔ ہجر میں تیرے صنم جان لبوں پر آئی  بخدا اسپہ تری یاد سے غافل نہ ہوا

پہلا مصرعہ بہت کمزور تھا اور دوسرے مصرعہ میں لفظ (بھی) ضروری تھا۔ اصلاح سے دونوں عیب مٹ گئے:۔

صدمۂ ہجر ہے، جان لبوں پر آئی  لیکن اسپر بھی تری یاد سے غافل نہ ہوا

---

سطوت:۔ ہم کریں نالے اگر جا کر میان کوئے دوست  ایک ہو دم میں زمین و آسمان کوئے دوست

دوسرے مصرعہ کی لغویت ظاہر ہے۔ اصلاح پاکیزہ دی گئی:۔

تنگ اپنی زیست سے ہوں ساکنان کوئے دوست

---

سطوت:۔ در و دیوار سے ٹکرا کے سر اپنا پھوڑا  تو جو آیا نہ مجھے گھر میں نظر آج کی رات

اس میں اُستاد نے دوسرے مصرعہ کے (تو) کو (وہ) کر دیا اور اس میں کلام نہیں کہ اس ذرا سے تغیر سے شعر

بہت پُرلطف ہوگیا۔

سطوت:۔ یا غیر کو یا مجھ کو صنم گھر میں بلاؤ  بس کہہ دو دہی تمکو جو ہے مدِنظر آج

پہلے مصرعہ کی بیہودگی اس قابل تھی کہ پورا شعر کاٹ دیا جاتا لیکن جناب فصاحت نے ایسا نہیں کیا اور اسی کو یوں بنا دیا:۔

یا غیر کو یا مجھ کو صنم گھر سے نکالو

---

سطوت:۔ دم میں خود ہونگے فنا اے یار کیا انکو ثبات  کھیل سے اگر حبابوں کو لبِ ساحل نہ توڑ

پہلے مصرعہ میں (دم میں خود ہوں گے فنا اے یار) کا ٹکڑا بہت بُرا تھا۔ اُستاد نے مصرعہ بدلکر یوں کر دیا:۔

خود فنا ہو جائیں گے اے شوخ انکو کیا ثبات

---

سطوت:۔ اے آسماں ملا مرے محبوب سے مجھے  دیکھوں گا اس کو میں تو مرا ہو گا غم غلط

اصلاح یہ دی گئی ہے:۔

کہتے ہیں ہجر میں مجھے سب دیکھکر عزیز  ذکرِ وصال چھیڑیے، ہو جائے غم غلط

---

سطوت کا دیوان کافی ضخیم ہے اور ہر جگہ فصاحت کی اصلاحوں سے مزین نظر آتا ہے۔ پھر مجھے حیرت اس پر نہیں کہ انھوں نے کیسی پاکیزہ اصلاحیں دی ہیں بلکہ تعجب اس پر ہے کہ انھوں نے ایسے لغو و مہمل کلام پر اتنا وقت کیوں ضایع کیا۔ لیکن اگر یہ صرف اُن کی وسعتِ اخلاق تھی، تو فصاحت کو شاعر سے بھی بڑھکر ولی کامل ماننا پڑے گا، کیونکہ اس سے نیچے درجہ کا انسان تو اتنا اور ایسا ایثار کبھی نہیں کر سکتا۔

# سید محمد میر سوز

## (دہلی کا ایک شاعر جس کو دنیا نے بہت کم یاد رکھا)

سوز کا ذکر تقریبًا ہر تذکرہ میں نظر آتا ہے اور بجز آزاد کے کہ انھوں نے تو بیشک میر کے حوالہ سے انھیں پون شاعر مانا ہے، باقی تمام تذکرہ نویسوں نے ان کا ذکر اس احترام سے کیا ہے جو میر، سودا یا درد کے باب میں ظاہر کیا گیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ آزاد نے میر کا تذکرہ نکات الشعراء دیکھا ہی نہیں اور اگر یہ خود ان کی ذاتی اُپج نہیں تھی تو شاید صرف کسی زبانی روایت پر اعتماد کر کے، سوز کے متعلق میر کا یہ محاکمہ لکھ گئے، ورنہ ممکن نہ تھا کہ وہ ایسی خلافِ حقیقت بات لکھنے کی جسارت کرتے۔

آزاد نے میر کے حالات میں اس واقعہ کو اس طرح ظاہر کیا ہے:۔

> "لکھنؤ میں کسی نے پوچھا کہ کیوں حضرت آج کل شاعر کون کون ہے، کہا ایک تو سودا، دوسرا یہ خاکسار ہے، اور کچھ تامل کر کے کہا: آدھے خواجہ میر درد۔ کوئی شخص بولا کہ حضرت، اور میر سوز صاحب؟ چیں بہ جبیں ہو کر کہا کہ میر سوز صاحب بھی شاعر ہیں؟ انھوں نے کہا کہ آخر اُستاد نواب آصف الدولہ کے ہیں، کہا کہ خیر یہ ہے تو پونے تین سہی"

لیکن جس وقت ہم میر کا نکاتِ الشعراء اُٹھا کر دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہ خواجہ میر درد کو آدھا شاعر سمجھتے تھے، نہ میر سوز کو پون بلکہ وہ ان دونوں کو پورا پورا شاعر جانتے تھے۔

درد کا ذکر تو انھوں نے اس احترام و ادب سے کیا ہے کہ شاید ہی کوئی خادم اس سے زیادہ ارادتمندی کا اظہار کر سکے اور جتنا اقتباس ان کے کلام کا پیش کیا ہے کسی اور شاعر کا لیا ہی نہیں۔

میر کے الفاظ عقیدت و ارادت ملاحظہ ہوں:۔

"جوشِ بہارگلستانِ سخن ــ عندلیب خوشخوانِ چمن این فن ــ درچمن شعرش لفظ رنگیں چمن چمن ــ گلچین خیالِ او دامن دامن ــ شاعرِ زور آور ریختہ ــ در کمال علاقگی دار ستہ ــ فقیر را بخدمت او بندگی خاص است ــ"

یہ ہیں خیالات میر کے اس شاعر کے متعلق جو بقول آزاد اُن کے نزدیک نصف شاعر تھا ــ اب پَون شاعر کے متعلق بھی اُن کی رائے سُن لیجئے کہ:۔

" میر تخلص جوانے است بسیار اہل ، خوش طبع "

معلوم ہوتا ہے کہ میر نے نکات الشعرا اس وقت مرتب کیا تھا جو سوز اپنا تخلص میر کرتے تھے۔ آزاد کے بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جب میر نے ان کا تخلص چھین لیا تو انھوں نے سوز تخلص اختیار کیا۔ درانحالیکہ نکات الشعرا کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تخلص خود سوز نے میر کے تتبع میں اختیار کیا تھا چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

" از خوش کردن تخلص من نصف دلم از دو خوش است "

بہر حال سوائے اس ایک روایت کے جو آزاد نے بحوالہ میر درج کی ہے، کسی تذکرہ میں سوز کی اُستادی سے انکار نہیں کیا گیا بلکہ خود آزاد نے سوز کے ذکر میں ان کی بہت تعریف کی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:۔

"میر سوز مرحوم کی زبان عجیب میٹھی زبان ہے اور حقیقت میں غزل کی جان ہے، چنانچہ غزلیں خود ہی کہے دیتی ہیں، ان کی انشا پردازی کا حُسن، تکلف اور صنایع مصنوعی سے بالکل پاک ہے اس خوشنمائی کی ایسی مثال ہے جیسے ایک گلاب کا پھول ہری بھری ٹہنی پر کٹورا سا دھرا ہے اور سبز سبز پتیوں میں اپنا اصلی جوبن دکھا رہا ہے۔

" مجالس رنگیں کی بعض مجلسوں سے اور ہمارے عہد سے پہلے کے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کلام صفائی محاورہ اور لطف زبان کے باب میں ہمیشہ سے ضرب المثل ہے، ان کے شعر ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کوئی چاہنے والا اپنے چاہیتے عزیز سے بیٹھا باتیں کر رہا ہے ــ میر تقی میر کہیں کہیں ان کے قریب آجاتے ہیں، پھر بھی بہت فرق ہے ــ"

میر حسن نے تذکرۂ شعرا، اُردو میں ان کی شاعری کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے ہیں یہ ہیں:۔

" شاعرِ شیریں بیان و سخن سنج زماندان، گلدستۂ شعرش چوں گلشنِ حسنِ دلبراں تازہ ، و گلہائے نقش در کثرت چوں سیلاب غم بے اندازہ "

گلشن ہند میں میرزا علی لطف نے لکھا ہے کہ:۔

"فن سخنوری میں اُستاد، طرز ادابندی کے بادشاہ - کلام ان کا سر سے پاؤں تک سوز و ساز ہے اور پاؤں سے سر تک ناز و نیاز"

بعد کے تذکرہ نویسوں نے بھی سوز کو اپنے عہد کا اُستاد کامل اور غزل گوئی میں ماہر بے بدل تسلیم کیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ نہ آج ان کا دیوان ہمارے سامنے ہے اور نہ عہد حاضر کے نقادان سخن نے ان کے کمال پر کوئی روشنی ڈالی -

آپ کا نام سید محمد میر تھا اور میر ضیاء الدین کے بیٹے تھے - ان کا سلسلۂ نسب قطب عالم گجراتی سے ملتا ہے اور تصوف و درویشی ان کا آبائی ذوق تھا، چنانچہ اسی بنا پر میر حسن نے انھیں "فقیہہ بیمثال اور درویش باکمال" بھی ظاہر کیا ہے۔ تذکرۂ بزم سخن میں دہلوی "مولد بخاری موطن مقیم لکھنؤ" لکھا ہے - ان کا خاندان بخارہ سے ہندوستان کس زمانہ میں آیا، اس کا پتہ چلانا دشوار ہے، اور نہ اس کی چنداں ضرورت کیونکہ بہر حال سوز دہلی ہی میں پیدا ہوئے، یہیں نشوونما پائی اور اسی جگہ ایک اُستاد کامل کی حیثیت سے وہ مشاعروں میں شریک ہوتے رہے -

ان کا زمانہ متعین کرنے کے لئے ان کے سنہ ولادت کی جب جستجو کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی تذکرہ نویس نے اس تحقیق کی زحمت گوارا نہیں کی، لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ ان کا انتقال ۱۲۱۳ھ میں ہوا جبکہ ان کی عمر ۷۰ سال کی تھی[۱] تو اس طرح ان کا سنہ ولادت ۱۱۴۳ھ ماننا پڑے گا اور اگر ۱۲۱۲ھ ان کا سنہ وفات تسلیم کیا جائے[۲] (جو غالباً درست نہیں ہے) تو سنہ ولادت ۱۱۴۲ھ متعین کیا جائے گا، بہر حال اس حساب سے میر سوز ۱۱۴۲ھ اور ۱۱۴۵ھ کے درمیان کسی سال میں پیدا ہوئے ہوں گے -

اب اسی کے ساتھ سودا، درد اور میر کے سنین ولادت و وفات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ سودا ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۹۵ھ میں انتقال کیا - درد ۱۱۳۳ھ کے قریب پیدا ہوئے[۳] اور ۱۱۹۹ھ میں وفات ہوئی[۴] — میر ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے[۵] اور ۱۲۲۵ھ میں انتقال کیا - اس طرح گویا ولادت کے حساب سے میر و سودا دونوں ایک ساتھ نظر آتے ہیں، اس کے بعد درد اور پھر میر سوز لیکن وفات کے لحاظ سے یہ ترتیب یوں ہوتی ہے :-

سودا — درد — سوز — میر — سب سے کم عمر درد نے پائی یعنی صرف ۶۱ سال جیے، اس کے بعد سودا و سوز کا

---

[۱] تذکرۂ گل رعنا۔ [۲] تذکرۂ گلشنِ ہند [۳] ان کا سنہ ولادت کسی تذکرہ میں نظر نہیں آیا لیکن چونکہ ان کا سنہ وفات آبحیات و گل رعنا میں ۱۱۹۹ھ لکھا ہے اور وقت وفات ۶۱ سال کی عمر بتائی جاتی ہے اس لئے ولادت ۱۱۳۳ھ میں ہوئی ہوگی [۴] گلشن ہند میں سنہ وفات ۱۲۰۰ھ لکھا ہے [۵] میر کا سنہ ولادت بھی اُن کے سنہ وفات سے متعین کیا گیا ہے کیونکہ ان کی عمر ۱۰۰ سال کی بتائی جاتی ہے اور وفات ۱۲۲۵ھ میں ہوئی ہے۔

نمبر ہے جو ستر ستر سال جئے اور پھر میر کا جو باوجود "غم عشق و غم روزگار" دونوں طرح کے صدمات اٹھانے کے پوری ایک صدی تک زندہ رہے۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ۲۰ سال کی عمر میں سوز کی مشق سخن کافی ہوگئی ہوگی تو اسوقت سودا اور میر کی عمر ۲۸، ۱۴ اور ۳۸ سال کی رہی ہوگی اور درد کی ۲۴ سال کی، گویا دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان چاروں نے چند سال کے فرق سے ایک ہی ساتھ شاعری کا آغاز کیا اور اس کا شباب بھی ساتھ ہی ساتھ رہا، یہی سبب ہے کہ جس وقت اس دور کے اساتذہ کا ذکر ہوتا ہے تو میر، سودا، اور درد کے ساتھ سوز کا نام بھی لیا جاتا ہے اور جس طرح اول الذکرتین اُستادوں کے متبعین پیدا ہوگئے تھے اسی طرح سوز کے رنگ کا تتبع کرنے والے بھی اسوقت پائے جاتے تھے، چنانچہ میر شمس الدین ہوش، میرزا حسین رضا عیش، میرزا رضا قلی خاں آشفتہ ان کے ممتاز شاگردوں میں تھے اور متبعین میں خلیل شاہ سائل، حیات اللہ اور انشا کا نام لیا جاتا ہے لیکن بقول صاحب شعرالہند یہ بالکل صحیح ہے کہ "زمانہ دوسرا میر، دوسرا سودا، دوسرا درد اور دوسرا سوز پیدا نہ کر سکا"

---

سوز، علاوہ شاعر ہونے کے خطاطی کے بھی ماہر تھے اور فنون سپہگری میں بھی کمال رکھتے تھے، خصوصاً تیراندازی اور شہسواری میں خاص ملکہ حاصل تھا اور جسمانی طاقت بھی غیر معمولی رکھتے تھے۔

آزاد نے لکھا ہے کہ "سنہ ۱۱۹۱ھ میں لباس فقر اختیار کیا اور لکھنؤ چلے گئے" لیکن دوسرے تذکروں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سوز دہلی چھوڑ کر پہلے فرخ آباد آئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب محمد شاہ رنگیلے کے بعد شاہ عالم کے دور میں دہلی پر تباہی آچکی تھی اور ایک ایک کرکے تمام اکابر فن اودھ کی طرف منتقل ہو رہے تھے۔ شاہزادگان میں سے مرزا محمد سلیمان شکوہ اور مرزا جہاندار شاہ بھی اسی طرف چلے آئے تھے، اور ان کے دربار شعراء کے مرجع بنے ہوئے تھے، چنانچہ مصحفی و انشا، اول اول سلیمان شکوہ ہی کے دربار سے وابستہ ہوئے اور بعد کو جرأت بھی یہیں آگئے۔ اسی طرح مرزا جہاندار شاہ کے دربار سے خواجہ میر درد کے شاگرد مرزا محمد اسماعیل تپش اور مرزا جعفر علی حسرت وابستہ تھے۔

فرخ آباد میں نواب احمد خاں بنگش کا دیوان، مہربان خاں رند شعرا کا بڑا قدردان تھا اور نواب محمد یار خاں امیر کا دربار تو اس قدر افزائی کے لئے بہت مشہور ہو چکا تھا، چنانچہ قائم چاند پوری اسی دربار کے مشاہرہ یاب تھے اور مصحفی، شاہ حاتم، اور مولوی قدرت اللہ بھی اسی امیر کے خوان کرم کے زلہ ربا تھے۔

مرشدآباد میں، مہاراجہ شتاب رائے، نواب غلام حسنین خاں، نواب اعظم خاں، نواب سعید احمد خاں صولت جنگ، نواب شوکت جنگ، نواب علاؤالدولہ سرفراز خاں کے درباروں نے اس۔ ۔ ۔ ۔ میں کافی شہرت پائی اور لکھنؤ میں خود آصف الدولہ، نواب سعادت علی خان اور نواب احمد خاں (نواب حافظ رحمت خاں روہیلہ کے چھوٹے بیٹے) شعر وسخن کے بڑے قدرشناس تھے۔

الغرض سوز بھی ترک وطن کے بعد سب سے پہلے فرخ آباد گئے اور مہربان خاں رند کے دربار میں پہونچے، ان سے چند سال قبل سودا خود یہیں پہونچے تھے اور اسی امیر کی شاعرنوازی سے مستفید ہوئے تھے۔

فرخ آباد میں کچھ زمانہ بسر کرنے کے بعد مرشدآباد پہونچے اور اس کے بعد لکھنؤ آئے۔ ان کے لکھنؤ آنے کا زمانہ سنہ ۱۲۱۱ھ بتایا جاتاہے جب نواب آصف الدولہ حکمراں تھا یعنی ۲۳ سال فرخ آباد اور مرشدآباد میں بسر کرنے کے بعد لکھنؤ پہونچے اور آصف الدولہ نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا لیکن اس کے ایک ہی سال بعد سنہ ۱۲۱۳ھ میں انتقال ہوگیا اور لکھنؤ میں دفن کئے گئے۔ صاحب تذکرۂ گلزار ابراہیمی نے لکھاہے کہ سنہ ۱۱۹۶ھ میں وہ لکھنؤ میں تھے۔ اس لئے غالبًا یہ بیان صحیح نہیں کہ وہ سنہ ۱۲۱۲ھ میں لکھنؤ آئے، یقینًا وہ اس سے بہت پہلے آچکے ہوں گے اور نواب آصف الدولہ نے کافی مدت تک ان سے اصلاح لی ہوگی[1]

اول اول جب دہلی میں تھے تو میر تخلص کرتے تھے لیکن دہلی چھوڑتے ہی اس کو بھی چھوڑ دیا اور سوز تخلص اختیار کیا: چنانچہ ان کا مشہور شعر ہے:-

کہتے تھے پہلے میر میر تب نہ ہوئے ہزار حیف　　　اب جو کہے ہیں سوز سوز یعنی سدا جلا کرو

ان کے شعر پڑھنے کا رنگ بالکل نرالا تھا، چنانچہ آزاد نے لکھاہے کہ "آواز دردناک تھی، شعر نہایت نرمی اور سوز وگداز سے پڑھتے تھے، شعر کو اس طرح ادا کرتے تھے کہ خود مضمون کی صورت بن جاتے تھے"۔ چنانچہ ایکبار جب انھوں نے اپنا یہ قطعہ پڑھا:-

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے　　　سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے
وہاں دیکھے کئی طفل پریرو　　　ارے رے رے، ارے رے رے رے، ارے رے

تو چوتھا مصرعہ پڑھتے پڑھتے وہیں زمین پر گر پڑے۔

[1] نواب آصف الدولہ کی شاعری پر میرا ایک بسیط مضمون جنوری کے نگار میں شایع ہوگا اور غالبًا دنیا کو یہ معلوم کرکے حیرت ہوگی کہ لکھنؤ میں یہی ایک شاعر ایسا ہوا ہے جو بجا طور پر دہلی کے شعراء باکمال کے پہلو بہ پہلو پیش کیا جاسکتا ہے۔ نیاز

آب حیات میں لکھا ہے کہ کسی غزل کا ایک قطعہ اس انداز سے سنایا کہ مشاعرہ کے سب لوگ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے، وہ قطعہ یہ تھا:-

اور مار سیاہ زلف سچ کہہ  تبلادے دل جہاں چھپا ہو
کنڈلی تلے دیکھیو نہ ہووے  کاٹا نہ ہنفی[1] ترا برا ہو

"پہلے مصرعہ پر ڈرتے ڈرتے بچکر جھکے، گویا کنڈلی تلے دیکھنے کو جھکے ہیں اور جس وقت کہا "کاٹا نہ ہنفی" بس دفعتہً ہاتھ کو چھاتی تلے مسوس کر ایسے بے اختیار لوٹ گئے کہ لوگ گھبرا کر سنبھالنے کو کھڑے ہوگئے" (آب حیات)

---

جس زمانہ میں سوز کی شاعری کا آغاز ہوا اسے عہدِ وسطیٰ کا دورِ اول کہنا چاہئے۔ جب زبان کی صحت وصفائی کی طرف شعرا کو خاص توجہ ہو چلی تھی اور ولی دکنی اور ان کے ہمعصر شعرا کے محاورات وطرزِ ادا میں نمایاں تبدیلیاں کی جارہی تھیں۔ چنانچہ اسی دور کا مشہور شاعر قائم کہتا ہے کہ:-

قائم، میں غزل طور کیا ریختہ، ورنہ
ایک چیز لچر سی بزبان دکنی تھی

یوں تو، غزل میں جذبات محبت کو بغیر کسی استعارہ و تشبیہہ کے ظاہر کر دینا شعرا متقدمین کی بھی خصوصیت تھی، کہیں ہندی وفارسی الفاظ کی آمیزش، ترکیب کی تعقید اور غیر مانوس قدیم محاورات نے اس میں وہ سلامت و روانی پیدا نہ ہونے دی جو "محبت کی زبان" کے لئے ضروری ہے۔ جس دور میں سوز پیدا ہوئے اسکی خصوصیت یہی تھی کہ اس نے زبان کی صحت وصفائی کی طرف خاص توجہ کی اور خصوصیت کے ساتھ سودا کو چھوڑ کر میر، درد، سوز اور قائم نے تو تغزل کی ایسی داغ بیل ڈالی کہ آج تک اس سے ہٹ کر کوئی دوسرا صحیح معیار قائم نہ ہو سکا۔ جس حد تک صرف غزلگوئی کا تعلق ہے اس میں کلام نہیں کہ میر تقی میر کا مرتبہ بہت بلند نظر آتا ہے، جس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ انھوں نے سب سے زیادہ طویل عمر پائی اور اپنے بعد کلام کا بڑا ذخیرہ چھوڑ گئے لیکن اگر اس سے قطع نظر کر کے درد اور سوز کا مطالعہ کیا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ زبان کی روانی، بیان کی سلاست طرزِ ادا کے بیساختہ پن میں ان دونوں کا پہلو بھی کسی طرح میر سے دبتا ہوا نظر نہیں آتا۔ بلکہ ایہام ولفظی رعایت

---

[1] نفی کو محاورہ میں ہنفی کہتے ہیں۔

کے ساتھ رکیک خیالات میرؔ کے یہاں تو کبھی آجاتے ہیں، لیکن دردؔ و سوزؔ کا کلام اس عیب سے بالکل پاک ہے۔ البتہ ان تینوں شاعروں کے سوز و گداز میں ضرور فرق ہے۔ دردؔ کی شاعری کا نصب العین یا سرچشمہ چونکہ صرف روحانی یا ذہنی محبت ہے اس لئے ان کے اشعار پڑھنے کے بعد ایک شخص اپنے اندر وہ عامیانہ جذبات پیدا ہوتے ہوئے محسوس نہیں کرتا جو گوشت و خون سے متعلق ہونے والی محبت سے وابستہ ہوتے ہیں، میرؔ کے یہاں جذبات عشق کا منبع یقیناً دردؔ کا سا عمیق و پاکیزہ نہیں ہے، لیکن چونکہ ان کی محبت ناکام تھی اس لئے اُن کے سوز و گداز میں وہ عامیانہ رنگ پیدا نہیں ہوا جو عشق کامیاب کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ سوزؔ کے واردات محبت ان دونوں کے مقابلہ میں زیادہ سطحی ہیں اور اس لئے جو کچھ وہ کہتے ہیں بالکل اسی دُنیا کی باتیں ہیں اور روز کی عاشقانہ زندگی میں جو کیفیات ہجر و وصال پیدا ہوتی ہیں، وہ انھیں سے بحث کرتے ہیں۔

وہ جذبات کا اظہار ہمیشہ صاف صاف الفاظ میں کرتے ہیں اور ان میں کسی قسم کا کوئی اغلاق نہیں ہوتا معلوم ہوتا ہے کوئی شخص کھڑا باتیں کر رہا ہے، لیکن کبھی کبھی ایسی لطیف و نازک تعبیرات کر جاتے ہیں کہ میرؔ و دردؔ کی دنیا سامنے آجاتی ہے۔ ان کا ایک شعر ہے:-

ایکباری دھک سے ہو کر دل کی پھر نکلی نہ سانس
کس شکار انداز کا یہ تیر سے آواز ہے

تیر بے آواز کے اثرات کو اس طرح ظاہر کرنا "پھر نکلی نہ سانس" اتنی پاکیزہ تعبیر ہے جو لفظاً و معناً دونوں حیثیت سے بہت بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ اس سے بہتر اور اتنا بہتر شعر کہ شاید ہی اسکی دوسری مثال کہیں اور مل سکے یہ ہے:-

مجھ کو دھوکا دیا کہا کہ شراب
اے ان آنکھوں کا ہوئے خانہ خراب

خالص میرؔ کے رنگ کے اشعار ملاحظہ ہوں:-

دو دن کی یہ زیست سوز صاحب		جس طرح بنے تم اب نبا ہو
رسوا ہوا خراب ہوا، مبتلا ہوا		وہ کونسی گھڑی تھی کہ تجھ سے جدا ہوا
میں کاش اسوقت آنکھیں موند لیتا		یہ میرا دیکھنا مجھ کو بلا تھا
ہے شوخ مزاج سوزؔ واللہ		چھیڑے گا اسے بُرا کرے گا
جس کا تو آشنا ہوا ہوگا		اس نے کیا کیا ستم سہا ہوگا

لوگ کہتے ہیں مجھے یہ شخص عاشق ہو کہیں     عاشقی معلوم لیکن دل تو بے آرام ہے

فارسی ترکیبیں وہ بالکل استعمال نہیں کرتے اور اُن کے سارے کلام میں صرف ایک غزل ایسی ہے جسمیں غالبًا قافیہ سے مجبور ہوکر انھوں نے فارسی الفاظ استعمال کئے ہیں، لیکن اصلی رنگ ہاتھ سے نہیں گیا، ملاحظہ ہو

برق تپیدہ یا شرر برجہیدہ ہوں     جس رنگ میں ہوں میں غرض از خود رمیدہ ہوں
اے آہ و نالہ مجھ سے نہ آگے بڑھو کہ میں     بچھڑا ہوں کارواں سے مسافر جریدہ ہوں
اے اہلِ دہر میں بھی مرقع میں دہر کے     تصویر ہوں ولے لبِ حسرت گزیدہ ہوں
منت کشِ خزاں ہوں نہ حسرت کشِ بہار     جوں سرو باغ دہر میں دامن کشیدہ ہوں

سوز کا اصلی رنگ جس میں وہ میر و درد سے بالکل علیحدہ نظر آتے ہیں حسب ذیل مسلسل اشعار کی غزل سے واضح ہوگا:۔

مرا جان جاتا ہے یارو بچالو     کلیجہ میں کانٹا گڑا ہے نکالو
نہ بھائی مجھے زندگانی نہ بھائی     مجھے مار ڈالو، مجھے مار ڈالو
خدا کے لئے اے مرے ہمنشینو     وہ بانکا جو جاتا ہے اس کو بلا لو
اگر وہ خفا ہوکے کچھ گالیاں دے     تو دم کھا رہو، کچھ نہ بولو نہ چالو
نہ آوے اگر وہ تمھارے کہے سے     تو منت کرو گھیرے گھارے منالو
کہو ایک بندہ تمھارا مرے ہے     اُسے جان کندن سے چل کر بچالو

جلوں کی بُری آہ ہوتی ہے پیارے
تم اس سوز کی اپنے حق میں دعا لو

الغرض سادگی اور انتہا سے زیادہ سادگی ان کی خصوصیت تھی اور اسی لئے ان کے بعض اشعار اب بھی عوام میں زبانزد ہیں مثلاً:۔

کی فرشتوں کی راہ ابر نے بند     جو گنہ کیجئے صواب ہے آج
ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا     پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

آبحیات میں لکھا ہے کہ:۔ "۱۲ سطر کے صفحہ سے ۳۰۰ صفحہ کا کل دیوان ہے اس میں ۲۸۸ صفحہ غزلیات ۱۲ صفحہ میں مثنوی، رباعی، مخمس ہیں"، لیکن افسوس ہے کہ اس وقت ان کا مکمل دیوان کہیں نہیں ملتا،

تذکروں میں ان کا کلام جتنا نظر آتا ہے وہ بہت کم ہے۔

اتفاق سے کتب خانۂ آصفیہ (حیدر آباد دکن) میں ان کا ایک قلمی دیوان نگاہ سے گزرا جو ہر چند بہت مختصر ہے لیکن نہ اتنا کہ اس کو نظر انداز کر دیا جاتا، چنانچہ اسی کو دیکھ کر اس مضمون کے لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی اور جی نہ چاہا کہ ناظرین نگار کو اس دیوان کے انتخاب سے محروم رکھوں۔

# انتخاب

سرِ دیوان پر اپنے جو بسم اللہ میں لکھتا — بجائے مدِّ بسم اللہ مدِ آہ میں لکھتا
اگر میں مرثیہ حسنین کا لکھتا تو کیا لکھتا — یہ سوزِ سینۂ زہرا فقط اک آہ میں لکھتا

اہلِ ایماں سوز کو کہتے ہیں کافر ہو گیا — آہ یا رب رازِ دل ان پر بھی ظاہر ہو گیا
کیا مسیحائی ہے تیرے لعلِ لب میں اے صنم — بات کے کہتے ہی دیکھو سوز شاعر ہو گیا

تڑپتی کیوں ہے اے بلبل کمال اتنا تو پیدا کر — کہ تیرا اشک جس جا گر پڑے گلزار ہو پیدا
مسیحائی ہے تیری تیغ میں کیا سوز کو غم ہے — جو سو سو بار ہو وے قتل، سو سو بار ہو پیدا

بلبل کہیں نہ جائیو زنہار دیکھنا — اپنے ہی من میں پھول کے گلزار دیکھنا

سرا و پر شام آئی اب تلک منزل نہیں پاتا — کہاں بستر بچھاؤں یاں کسی کا دل نہیں پاتا

رسوا ہوا خراب ہوا مبتلا ہوا — وہ کونسی گھڑی تھی کہ اس سے جدا ہوا
عاشق ہوا اسیر ہوا مبتلا ہوا — کیا جانئے کہ دیکھتے ہی دل کو کیا ہوا

میں کاش اس وقت آنکھیں موند لیتا — یہ میرا دیکھنا مجھ کو بلا تھا

تجھ پہ قربان مری جان و دل و دیں میرا — ایکباری تو سن افسانۂ رنگیں میرا

ایک دل تھا جان من اس کی بساط — تو نے لوٹا سوز لوٹے سے پڑا

تو منع گریہ نہ کر مجھ کو ناصحا بیدرد — نہیں ہے اب تو مرے اختیار میں رونا
تو روز وصل میں لے سوز اپنے آنسو پونچھ — ابھی بہت ہے تجھے ہجر یار میں رونا

بھلا میاں سوز ہم سے راست بولو عشق خوباں میں — بجز درد و الم پھر اور تم نے کیا مزا دیکھا

جب تک کہ میرے تن میں اے جان دم رہیگا
تیرا اسی طرح سے مجھ پر ستم رہیگا

رو دیگا عشق مجھ کو سر خاک ڈال اپنے
مرنے کا میرے تجھ کو کاہیکو غم رہیگا

ہے شوخ مزاج سوز واللہ
چھیڑیگا اسے بُرا کرے گا

بات کہتے ہی بگڑ کر تو چلا
دل تو میرا پھینک جا ، ظالم بھلا

عجب چیز تھا سوز کس سے کہیں ہم
وے اس کو ان غافلوں نے نہ پایا

سوز تھا جو پڑا سسکتا تھا
کیوں مرے نوجوان دیکھ لیا

کیوں سوز ہماری بات مانی
آپ ہی ملا تجھ سے آن دیکھا

جس کا تو آشنا ہوا ہوگا
اس نے کیا کیا ستم سہا ہوگا

تھرتھراتا ہے اب تلک خورشید
سامنے تیرے آگیا ہوگا

مجھ کو تنہا چھوڑ کر اے شوخ بے پروا نہ جا
جان میری ساتھ جائیگی ابھی سستا نہ جا

شوخ ہی آیگا خودداری بھی لازم ہے تجھے
سوز یہ کیا طور ہے اتنا بھی تو گھبرا نہ جا

جا جا ، مرے پاس سے تو جا جا
توبہ ، جو کہوں تجھے میں آجا

میں کہتا نہ تھا سوز تو مت ہو عاشق
یہ تیرا کیا تیرے آگے ہی آیا

خنجر سے منھ نہ موڑا ، تیغے سے دم نہ مارا
اس سوز نے بھی کی ہیں تجھ سے وفائیں کیا کیا

دیکھ دل کو چھیڑ مت ظالم کہیں دُکھ جائیگا
ہاں بغیر از قطرۂ خوں اور کیا تو پائے گا

قتل کی نیت تو کر آیا ہے تو کیا دیر ہے
پر مجھے تو مار کر ظالم بہت پچھتائے گا

دنیا میں یہی دوستی ہوتی ہے مری جاں
جب تک نہ لیا دل تجھے آرام نہ آیا

کعبہ ہی کا اب قصد یہ گمراہ کریگا
جو تم سے بتاں ہوگا سو اللہ کرے گا

اے سوز عزم کوچۂ قاتل نہ کر عبث
تو ایک بھی بتا دے کہ واں جا کے آسکا

ایک دن اک شخص نے اس سے کہا
تو نے تو یہ ذکر سُنا ہوئے گا

یعنی کہ عاشق ہے تراجی سے سوز
ہو تبسم یہ کہا ، ہوئے گا

ہوا دل کو میں کہتا کہتا دِوانا
پر اس بے خبر نے کہا کچھ نہ مانا

جن کو نت دیکھتے تھے اب ان کا
دیکھنا ہی خیال و خواب ہوا

سوز بیہوش ہوگیا، جب سے ۔۔۔ تیری صحبت میں باریاب ہوا

---

آج اس راہ دلربا گزرا ۔۔۔ جی پہ کیا جانئے کہ کیا گزرا
آہ ظالم نے کچھ نہ مانی بات ۔۔۔ میں تو اپنا سا جی چلا، گزرا
رات کو نیند ہے نہ دن کو چین ۔۔۔ ایسے جینے سے اے خدا گزرا

---

کہتا نہ تھا میں اے دل اس کام سے تو باز آ ۔۔۔ دیکھا مزا نہ تو نے نادان عاشقی کا

---

میں کس کے ہاتھ لکھ بھیجوں میاں نصاحب سلام اپنا ۔۔۔ مجھے تو بھول جاتا ہے ترے دھڑکے سے نام اپنا

---

مجھ سے مت جی کو لگا، ڈر نہیں رہنے کا ۔۔۔ میں مسافر ہوں، کوئی دن کو چلا جاؤنگا

---

مجھ کو دھوکا دیا کہہ کر شراب ۔۔۔ اے، ان آنکھوں کا ہوئے خانہ خراب

---

کوئی دن کو چلا جاؤں گا آپ ہی ۔۔۔ مسافر سوز کو رہنے دے بک چند

---

ہوگیا غم سے جان سوز گداز ۔۔۔ پر نہ آیا تو اپنی ضد سے باز

---

چین کب آوے جو دیکھیں دل کی بیتابیاں ۔۔۔ نیند بھی جاتی رہی سُن سُن تری بدخوابیاں

---

بھلا رے عشق تیری شوکت و شان ۔۔۔ بھائی میرے تو اُڑ گئے اوسان

---

تو جو کہتا ہے گلہ میرا کیا جس تس کنےین ۔۔۔ کب کیا، کس جا کیا، کس وقت کس دم کس کنیں

---

بُلبُل کدھر تو پھرتی ہے غافل خبر لے جلد ۔۔۔ گل نے لگائی آگ ترے آشیانہ میں

---

ایک ڈر تھا کہ جی بچے نہ بچے ۔۔۔ دوسرے غم نے کھائی میری جان

---

ظاہر میں گرچہ بیٹھا لوگوں کے درمیاں ہوں ۔۔۔ پر یہ خبر نہیں ہے میں کون ہوں کہاں ہوں

---

اس پاس پھر گیا دل گمراہ کیا کروں ۔۔۔ دم مارنے کی بات نہیں آہ کیا کروں
دل بیخبر پڑا ہے خدا جانے کیا ہوا ۔۔۔ اس حال سے میں سوز کو آگاہ کیا کروں

---

ایک دن ایک شخص نے پوچھا ۔۔۔ میر صاحب تمھارا یار کہاں
میں نے اس سے یہ سُن کہا بھائی ۔۔۔ اب مجھے اس تلک ہے بار کہاں
گاہ گاہے سلام ہوتا ہے ۔۔۔ پر وہ باتیں کہاں، وہ پیار کہاں
زندگی میں جفا غنیمت ہے ۔۔۔ سوز یہ ظلم بار بار کہاں

---

بُلبُل کہیں، پتنگ کہیں اور ہم کہیں ۔۔۔ اکٹھے یہ دل جلے نہ ہوئے ایک دم کہیں

کیا خفا کہہ دیا جوانی کو　　　کوسوں کس منھ سے ناتوانی کو
کیوں ہیں ہم بد نظر بھلا صاحب　　　آفریں تیری بدگمانی کو
سوز اب بھی رہا ہے کچھ باقی　　　چھوڑ دے اب سرائے فانی کو

دو دن کی یہ زیست سوز صاحب　　　جس طرح نبھے تم اب نبا ہو

جانے والو نہ چپکے قدم بڑھائے چلو　　　یہ اس کا کوچہ ہے ڈنک کرتے ہائے ہائے چلو

او چلے جانے والے بے پرواہ　　　کچھ فقیروں کے حال پر بھی نگاہ

غم ہے یا انتظار ہے کیا ہے　　　دل جو، اب بیقرار ہے کیا ہے

یہ ہو سکے کہ اپنے تئیں سوز بھول جائیے　　　پر میری جان کہہ تجھے کیونکر بھلا سکے

سرو قد لاکھوں پھرے ہیں مجھ کو کیا　　　آہ، میرا سرو بالا اور ہے

مرجانے کا قاتل نے نرالا ڈھب نکالا ہے　　　سبھوں سے پوچھتا ہے اسکو کس نے مار ڈالا ہے

آج جی اس طرح نکلتا ہے　　　جس نے دیکھا سو ہاتھ ملتا ہے

دریا دلی نے مجھ کو ڈبویا　　　ہے موج اپنی زنجیر اپنی

اشک خوں آنکھوں میں آکر جم گئے　　　دور کے بھی دیکھنے سے ہم گئے

مثل نے ہر استخواں میں درد کی آواز ہے　　　کچھ نہیں معلوم یارب سوز ہے یا ساز ہے
ایکباری دھک سے ہو کر دل کی پھر نکلی نہ سانس　　　کس شکار انداز کا یہ تیر بے آواز ہے

لوگ کہتے ہیں مجھے یہ شخص عاشق ہو گیا　　　عاشقی معلوم لیکن دل تو بے آرام ہے

رونا بھی تھم گیا ترے غصہ کے خوف سے　　　تھی چشم ڈبڈبائی پر آنسو نہ ڈھل سکے

سر زانو پہ ہو اس کے اور جان نکل جائے　　　مرنا تو مسلم ہے ارمان نکل جائے

## رامپور کی ایک خاتون سے جو نینی تال میں ہیں

رامپور سے چلتے وقت یا نینی تال پہونچکر جو خط آپ نے سب سے پہلے لکھا تھا اس کا جواب میں نے پیش کر دیا تھا لیکن اس کے بعد آپ کے متعدد خطوط کا جواب صرف اس لئے نہ دے سکا کہ آپ کا پتہ نینی تال کا مجھے یاد نہ رہا اور آپنے بھی پھر کسی خط میں اسکو تحریر نہ فرمایا ـــــ امید ہے اب یہ برہمی دور ہو گئی ہوگی ۔

نیاز

# شبِ بہار

جب رات کو ظلمت ہی ظلمت عالم پہ مسلط ہوتی ہے
جب چادرِ غفلت اوڑھے سب مخلوقِ الٰہی سوتی ہے
جب ابر اُمنڈ کر آتے ہیں اور بن کے سکوں چھا جاتے ہیں
پیمانۂ گُل کو صہبائے شبنم کے لئے ترساتے ہیں
پوشیدہ نظر سے جب تاروں کی مست ادائیں ہوتی ہیں
ہوتا ہے فضا میں سناٹا، مخمور ہوائیں ہوتی ہیں
اشجارِ چمن کی شاخوں کو جب نیند کے جھونکے آتے ہیں
اور نکہتِ گل کے خُم کے خُم گلشن میں لنڈھائے جاتے ہیں
پھر پی لی ہے میں نے پیت کی مے محسوس میں ایسا کرتا ہوں
پھر مجھکو کسی سے اُلفت ہے، محسوس میں ایسا کرتا ہوں

اختر انصاری دہلوی

# نقشِ نگار

عشق کی وحشت سرا میں پہلے خود کھویا مجھے
ڈھونڈتے پھرتے ہو اب لیکر یدِ بیضا مجھے
وسعتِ ذوقِ نظر اُف رے تری معراجِ شوق
اب خدا ہونیکا خود اپنے پہ ہے دھوکا مجھے
مجھ سے یہ بیگانگی اور غیر سے یہ التفات
میری نظروں میں کیا جاتا ہے کیوں رسوا مجھے
چشمِ عالم درسِ خودداری دئے جاتی مگر
تیری نظروں نے بنایا شورشِ بےجا مجھے
عرش والوں نے مجھے سمجھا تھا خاکسترنشیں
جستجوئے یار نے دیکھا فلک پیما مجھے
مجھ پہ یہ تشہیر کی تہمت غلط یکسر غلط
تو نے یوں بیساختہ کیوں بزم میں دیکھا مجھے

جس ادا سے طور کو سرمہ کیا تھا اے نگار
وہ ادائے دلنشیں اک بار پھر دکھلا مجھے

سروپ رانی نگار

# وقت کا راگ

جب سے میں نے آنکھ کھولی ہے فضائے دہر میں
ایک لافانی سفر درپیش ہے شام و سحر
جا رہا ہوں اپنے مقصودِ سفر سے بے خبر
اور بھی ہیں قافلے میری طرح گرمِ سفر
ہیں ستارے بھی رواں اپنے دیاروں کی طرف
گم شدہ ارضِ وطن کے خلد زاروں کی طرف

اور انساں بھی ہیں ذوقِ جستجو سے بیقرار
تھک کے گو رستے میں گہری نیند سو جاتے ہیں یہ
موت کے خاموش ویرانے میں کھو جاتے ہیں یہ

آہ انساں یہ سمجھتے ہیں کہ سب کچھ وقت ہے
اور مری تابِ سفر ہے اُن کے دم سے برقرار
(گو مرے دامن پہ آسودہ ہے صدیوں کا غبار)

ہے اُمیدوں کے اُفق پر دائمی طلعت کا نور
موت کے جھونکوں سے بجھ جاتے ہیں روحوں کے شرار
پھر مگر ہوتے ہیں شعلے زندگی کے آشکار

ہو اگر مجھ کو نہ انسانوں کی ہمراہی نصیب
دلشکن مایوسیوں سے مضمحل ہو جاؤں میں
بیدلی کے کیفِ مرگ آموز میں کھو جاؤں میں

اور مل جائے مری ہستی سراسر خاک میں
بزمِ ہستی میں حوادث کا گزر کوئی نہ ہو
زندگی کوئی نہ ہو شام و سحر کوئی نہ ہو

عدم

# نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ ر تاریخ تک شایع ہوتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ ر تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے۔ ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا۔
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سعہ)
بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۶ | فہرست مضامین دسمبر ۱۹۳۴ء | شمارہ ۶

ملاحظات ———— ۲
ہماری عورتوں کا پردہ ———— محمد اعظم ———— ۹
مکتوبات نیاز ———— ۲۸
مصطفیٰ کمال کی زندگی کے چند دلچسپ اوراق ———— ۳۷
بیرنگ کا برنگ ———— ۵۲
چار مصلح ———— فضل حق قریشی دہلوی ———— ۵۹
باب الاستفسار ———— ۶۱
مطبوعات موصولہ ———— ۶۵
منظومات ———— نظیر، مخدوم، نظرت، شمیم، اثر، مجاز، نفیس، اختر ———— ۷۳

# نگار

اڈیٹر:— نیاز فتحپوری

| جلد ۲۶ | دسمبر سنہ ۱۹۳۴ء | شمارہ ۶ |
| --- | --- | --- |


# ملاحظات

## آصف جاہ سابع کی غیر معمولی شخصیت

حیدرآباد سے میرا تعلق روحانی تو آب سے بیس سال پیشتر ہی قائم ہو چکا تھا جب وہاں کے بعض علم دوست امراء نے میری ناچیز تصانیف کو بہ نظر استحسان دیکھ کر شرف قبول عطا کیا تھا، لیکن تعلق ظاہری کو بھی تقریباً دس سال کا زمانہ گزر چکا ہے (کیونکہ اول اول سنہ ۲۵ء میں مجھے وہاں جانے کا اتفاق ہوا) اور اب کہ گزشتہ ۶، ۷ برس سے سال کے بارہ مہینوں میں کم از کم مہینہ ڈیڑھ مہینہ میرا وہاں قیام کرنا لازمۂ حیات میں داخل ہو گیا ہے میرے لئے سرزمین دکن گوناگوں دلچسپیوں کا باعث ہو گئی ہے، یہاں تک کہ جب میں وہاں کے لئے رخت سفر باندھتا ہوں تو اپنے اندر ایک خاص شوق و ولولہ محسوس کرتا ہوں اور جب جدا ہوتا ہوں تو وہاں کی یاد بہت دور تک میرا ساتھ دیتی ہے۔

ہندوستان کی مسلم آبادی کو جو تعلق دکن کے ساتھ پایا جاتا ہے، اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ دولت مغلیہ کی سطوت و جبروت بلکہ تمام مسلم شاہان سلف کی یادگار اب صرف یہی ایک سلطنت باقی رہ گئی ہے اور یہاں کے فرمانرواؤں میں مسلمانان ہند نے ہمیشہ اس

مرکزیت کو محسوس کیا جس کا فقدان حقیقتاً شیرازۂ اجتماعیت و قومیت کا فقدان ہے۔

پھر یہ حقیقت کس سے مخفی ہے کہ آج اکناف ہند میں علم و ادب کے کتنے ادارے، اور علم و مذہب کے کتنے خانوادے ایسے ہیں جو سلطنت دکن کی فیاضیوں کے گرانبار نہیں اور وہ کونسا صاحب فضل و کمال ہے جس کے دماغی افکار کا ارتقا رشاہ دکن کے بذل و کرم کا منت کش نہ ہو۔

موجودہ فرمانروائے دکن (آصف جاہ سابع) کی حکومت کو صرف ۲۴ سال کا زمانہ گزرا ہے اور ہرچند کسی ملک کی اصلاح و ترقی، یا کسی قوم کے ذہنی و دماغی انقلاب کے لئے تاریخ عالم میں یہ مدت بہت کم مدت تصور کیجاتی ہے لیکن اس مختصر زمانہ میں نہ صرف بہ لحاظ علم و ادب، صنعت و تجارت بلکہ بہ لحاظ نظم و سیاست بھی حیدرآباد دفعۃً اتنی بلند سطح پر پہونچ گیا ہے کہ ۲۵ سال قبل تصور انسانی میں بھی کبھی یہ بات نہ آسکتی تھی۔

---

کسی ملک و قوم کی ترقی یا انحطاط کا مسئلہ فنِ سیاست و تاریخ کا نہایت اہم بالشان مسئلہ تسلیم کیا گیا ہے اور ارباب فکر نے ہمیشہ اس کی جستجو کی ہے کہ قوموں کے ذہنی انقلابات اور ممالک کے معاشری و دماغی رجحانات پر سب سے زیادہ اثر کس چیز کا پڑا کرتا ہے۔ حکومت شخصی ہو یا جمہوری ہر جگہ ایک ہی دل و دماغ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے اور سوائے اس کے کہ ایک ہی چیز کے دو نام علحدہ علحدہ رکھ لئے گئے ہیں حقیقت کے لحاظ سے کوئی فرق پیش نہیں کیا جا سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ آج دنیا میں جمہوریت و اشتراکیت کا دور دورہ ہے اور استبداد شخصی مٹتا جا رہا ہے، لیکن کیا جمہوریت ترکی کی معنوی حیثیت کو مصطفےٰ کمال کی شخصیت سے علحدہ کیا جا سکتا ہے، کیا ایران کی موجودہ آزادی رضا شاہ پہلوی کے وجود سے بے نیاز ہو سکتی ہے، کیا جرمنی کا موجودہ سیلاب ترقی ہر ہٹلر کے علاوہ کسی اور چیز سے عبارت ہے، کیا اطالیہ کا استحکام سیاست مسولینی کی ذات کے علاوہ کوئی اور چیز ہے ۔۔۔ اور اگر تقدم شخصی کے ان محیر العقول کارناموں سے انکار ممکن نہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ سلطنت دکن کی موجودہ ترقیوں کو ہم آصف جاہ سابع کی اُس غیر معمولی شخصیت سے وابستہ نہ کریں جس کی حقیقی عظمت کا اندازہ صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس کا بہت قریب سے مطالعہ کیا جائے۔

عام انسانوں کی زندگی کے دو پہلو ہوا کرتے ہیں ایک پرائیویٹ دوسرا پبلک اور ایک کا اثر دوسرے پر نہیں پڑتا۔ لیکن چونکہ بادشاہوں کی زندگی، اور ان کی زندگی کا ہر ہر لمحہ اُمور سلطنت پر اثر انداز ہوتا ہے، اس لئے فرمانروائے وقت کی پرائیویٹ زندگی بھی ملک عام ہو کر رہجاتی ہے اور اس کی ہر خلوت کا اثر اس کی جلوت پر بھی پڑا کرتا ہے۔ اس لئے ایک ملک کا عروج ہمیشہ بادشاہ کی ترقی اخلاق کا انعکاس ہوا کرتا ہے اور اس بنا پر اگر سلطنت دکن کی ترقی کو دیکھ کر اس کے فرمانروا کے ذہنی علو کا اندازہ کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

یوں تو شاہِ دکن کی عظیم الشان ہستی کے مطالعہ کا موقعہ وہاں کے حالات اور پبلک رجحانات کی وساطت سے ہر سال مجھے مل جایا کرتا تھا، لیکن امسال یہ درمیانی واسطے بھی اُٹھ گئے اور مجھے وہ بڑی سی بڑی سعادت بھی حاصل ہو گئی جس کی اس دنیا میں آرزو کی جا سکتی ہے۔

سب سے پہلے اعلیٰحضرت نے مجھے شاہزادۂ مکرم جاہ بہادر کی تقریب سالگرہ میں یاد فرمایا اور اُس دربار سرور و نشاط میں شرکت کا موقعہ بخشا جہاں حال و مستقبل کے تین فرمانرواؤں کا اجتماع تھا۔ ایک تخت پر جلوہ افروز، دوسرا اس تخت کا دعاگو اور تیسرا گہوارہ میں ــ مراسم سالگرہ ادا ہو رہے تھے، جاہ و ثروت، دولت و امارت کے جتنے پُرشوکت مظاہرے ممکن ہیں نظر کے سامنے تھے، مبارکباد کے ترانوں سے ایوان شاہی گونج رہا تھا، اکین حکومت و اُمرائے سلطنت دست بستہ حاضر تھے اور اس تمام منظر پر صرف ایک ہستی چھائی ہوئی نظر آتی تھی جس کے نحیف و ناتوان جسم میں قدرت نے شیر کا سا دل ودیعت کر دیا ہے۔

اس کے بعد سالگرہ مبارک کے دربار میں مجھے یاد فرمایا گیا اور یہاں بھی ان آنکھوں نے دبدبۂ شاہانہ اور سطوت ملوکانہ کے وہ تمام مناظر دیکھے جو اس دور میں اب سوائے دکن کے اور کسی جگہ نظر نہیں آ سکتے۔ لیکن فخر و مباہات کی ایک منزل اور باقی تھی خوش بختی و کامرانی کی ایک ساعت اور مقسوم ہو چکی تھی، چنانچہ جشن سالگرہ کے چند دن بعد سیلاب کرم بڑھا، اور الطاف خسروانہ نے ایک گھنٹہ سے زیادہ شرف خطاب و حضوری مرحمت فرما کر زندگی میں سب سے پہلی بار مجھے یہ سمجھنے کا موقعہ دیا کہ انسان کا حقیقی مرتبہ بلحاظ انسانیت کتنی بلند چیز ہے اور جب اس صفت سے کوئی بادشاہ متصف ہو جائے تو پھر وہ کس حد تک مافوق الانسان ہو جایا کرتا ہے۔

اعلیٰحضرت کی ذات گرامی اپنی علم دوستی، سادگیِ اخلاق اور نظمِ حکومت کے لحاظ سے اس وقت نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند کی دنیا میں بھی غیر معمولی شہرت حاصل کر چکی ہے اور وہ حضرات جن کو کبھی حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا ہے انھیں تو وہاں کے ذرہ ذرہ سے یہ حقیقت آشکارا ہو گئی ہوگی کہ دورِ آصف جاہی کا عہد زریں "عہد عثمانی" ہی کے لئے مقسوم و مخصوص تھا۔ لیکن وہ لوگ جن کو مساعدتِ بخت سے ذات شاہانہ کی قدمبوسی اور تخاطب کا شرف حاصل ہو چکا ہے، اُن سے پوچھئے کہ "آصف جاہ سابع" کی ہستی کن کمالات و خصائص کا مرکز ہے۔

ٹھیک ۹ بجے صبح مجھے اذن باریابی ملا اور تقریباً ایک گھنٹہ تک شرف تخاطب حاصل رہا لیکن اس ایک ساعت کا ہر لمحہ اس احساس سے لبریز تھا کہ اگر ذات شاہانہ کے مطالعہ کے لئے ساری عمر بسر کر دی جائے تو بھی اس کے فضائل و کمالات کا استقصاء ممکن نہیں۔

سب سے پہلا اثر جو ذات ہمایونی کا انسان پر پڑتا ہے، وہ اخلاق کی سادگی اور اُس کا خلوص ہے۔ اعلیٰحضرت

کی نگاہ اولیں ایک ایسا غیر معمولی جذبۂ محبت و شیفتگی دل میں پیدا کر دیتی ہے کہ انسان بے اختیارانہ طور پر ایک فدایانہ کیفیت اپنے اندر محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہ قرونِ اولیٰ کے اکابر کی سی سادگی، وہ اعاظم اسلاف کی سی صداقت وہ قائدینِ ملت کی سی بزرگانہ شفقت و رافت۔ انسان ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی اور فضا میں پہونچ گیا ہے اور دنیا کی معمولی سطح سے اُٹھا کر کسی ایسی بلند سطح پر اس کو پہونچا دیا گیا ہے جس کا ذکر افسانوں میں تو سُنا جاتا تھا لیکن آنکھوں سے اس نے نہ دیکھا تھا۔

دوسرا اثر جو اس سے بھی زیادہ انسان کو مسحور کر دیتا ہے وہ اعلیٰحضرت کی وسعتِ معلومات ہے۔ کوئی موضوع ہو، کوئی بحث ہو، ایسی مدبرانہ و حکیمانہ تقریر فرماتے ہیں کہ مخاطب کو دم بخود رہجانا پڑتا ہے۔ جو لفظ زبان سے نکلتا ہے فاضلانہ، اور جو فقرہ ادا ہوتا ہے مجتہدانہ و عالمانہ۔ حافظہ کا یہ عالم ہے کہ جو چیز ایک بار نگاہ سے گزر گئی ہمیشہ کے لئے دماغ میں منقوش ہو گئی اور ندرتِ بیان کی یہ کیفیت کہ جس مسئلہ کو جس پہلو سے اُٹھایا اسے دلنشین کر کے چھوڑا۔

قرآن و حدیث، تاریخ و فقہ، کلام و الہیات کا اتنا زبردست مطالعہ اعلیٰحضرت نے کیا ہے کہ شاید ہی یہ تبحّر کسی اور کو حاصل ہو اور پھر جس انشا، و ادبیت کے ساتھ ان تمام نوادر کو آپ پیش فرماتے ہیں وہ تو حقیقتاً سحرِ حلال کی کیفیت رکھتا ہے۔

چنانچہ اس زمانہ میں اُردو، فارسی اور بھاشہ کے ذریعہ سے جو جذبات بلند اور تاثرات عالیہ اعلیٰحضرت نے پیش فرمائے ہیں ان کو دیکھ کر اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ دورِ حاضر میں علم و فضل کا یہ رتبۂ بلند صرف ذات " عثمانی " کے لئے مخصوص ہو چکا تھا اور اس میں کوئی دوسرا سہیم و شریک ذات ہمایونی ہو ہی نہیں سکتا۔

فارسی میں تو خیر اعلیٰحضرت کو صاحبِ زبان کا سا ملکۂ راسخ حاصل ہونا ہی چاہئے کیونکہ آصف جاہی خاندان سرزمین ہند میں قدم رکھنے کے بعد کبھی اس خصوصیت سے معرّا نظر نہیں آیا اور آصف جاہ اول (میر قمر الدین خاں شاکر) سے لیکر آصف جاہ سادس (میر محبوب علی خاں خلد مکان) تک ہر فرمانروا نے اس زبان میں نہایت پاکیزہ نمونے شاعری کے چھوڑے ہیں لیکن جن مطالب عالیہ اور جن رموز اخلاقی کو اعلیٰحضرت نے بیان فرمایا ہے، واقعہ یہ ہے کہ کسی اہلِ زبان کے بھی بس کی بات نہ تھی اور یہ طرۂ امتیاز صرف " ذات عثمانی " کے لئے ودیعت ہو چکا تھا۔

اعلیٰحضرت کا اُردو کلام اور پاکیزہ رنگ تغزل کا ذکر فضول ہے کہ ہندوستان کا ہر ہر گوشہ اس سے واقف ہے، لیکن حیرت تو یہ ہے کہ اس دوران میں پورب کی ہندی بھاشہ میں بھی آپ نے ایسی ایسی البیلی ٹھمریاں سپردِ قلم فرمائی ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ دکن میں بیٹھ کر اجودھیا کی البیلی اور رسیلی زبان میں کیونکر ایسا ماہرانہ عبور حاصل ہو سکا۔ پھر اسی کے ساتھ جس عجیب و غریب جدّت سے کام لیا گیا وہ یہ تھی کہ عاشقانہ مضامین کے ساتھ مناقب کے نازک و عمیق جذبات کو بھی حد درجہ حُسن دلآویزی کے ساتھ ظاہر کر کے ہندی لٹریچر میں ایسا بیش بہا اضافہ فرمایا کہ اس کی نظیر متقدمین کے کلام میں بھی کہیں نظر نہیں آتی۔

متاخرین کا کیا ذکر ہے۔

اعلیٰحضرت کی تیسری خصوصیت جس کا ہر زمانہ اور ہر طبقہ کی مذہبی دنیا میں فقدان رہا ہے، آزاد مشربی و روشن خیالی ہے جس حد تک راعی و رعایا اور حکومت و سیاست کا تعلق ہے، اعلیٰحضرت کا کوئی مذہب نہیں ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ وہ ہر مذہب کے ماننے والے ہیں، چنانچہ اپنی عیسائی، ہندو، سکھ اور پارسی رعایا کے اکابر مذہب کے متعلق اعلیٰحضرت نے اپنے مختلف قطعات میں وقتاً فوقتاً جن جذبات کا اظہار فرمایا ہے اُن سے حیدرآباد کا ہر ہر فرد واقف ہے۔ لیکن ذاتی حیثیت سے یقیناً وہ مخصوص عقاید کے ماننے والے ہیں اور اپنے ہر مذہبی نظریہ پر خود اپنی جستجو و کاوش سے درجۂ ایقان تک پہونچنے کی مجتہدانہ خصوصیت رکھتے ہیں۔ اعلیٰحضرت کو کورانہ تقلید اور تقلیدی مذہب سے کلی نفرت ہے اور ان کا ہر عقیدہ خود انھیں کی تحقیق کی بُنیاد مرصوص پر قائم ہے۔

اعلیٰحضرت کے مذہبی عقاید پر اس دوران میں ملک کے اندر کافی ہلچل پیدا ہو گئی تھی اور ہندوستان کی صحافت نے جس کو آج تک کبھی تحقیق حق کی توفیق نہیں ہوئی اس مسئلہ کو بہت ہنگامہ خیز چیز بنا رکھا تھا، درانحالیکہ ان شور و غوغا کرنے والوں میں سے کسی ایک کو بھی اس کا صحیح علم نہ تھا کہ اعلیٰحضرت کیا فرماتے ہیں اور جو کچھ فرماتے ہیں وہ کس تحقیق انیق اور کس جذبۂ خلوص و صداقت کا نتیجہ ہے۔ کیا کوئی مسلمان ایسا ہے جو اہلبیت کی محبت سے اپنے دل کو خالی پائے، اور کیا جناب امیر کا علوئے مرتبت تاریخ و مذہب کا کوئی ایسا پیچیدہ مسئلہ ہے جس میں اختلاف آرا، ہو سکے۔ پھر اگر اعلیٰحضرت نے صداقت کا اعلان صداقت ہی کی زبان میں کیا اور اس کی محبت وولا کا بے اختیارانہ اظہار آپ کی زبان و قلم سے بار بار ہوا تو کیا یہ کسی اصول دین کی ترمیم و تنسیخ تھی یا صرف اُس بھولے ہوئے درس کو یاد دلانا تھا، جس کا ذکر کبھی کبھی زبانوں پر تو آجاتا ہے لیکن دل سے تراوش نہیں کرتا۔

حقیقت یہ ہے کہ سُنّی و شیعہ دونوں جماعتوں کے افراد فرطِ عصبیت سے صحیح راستہ کو چھوڑ چکے ہیں اور اگر حضرات شیعہ کے نزدیک جناب امیر کی فضیلت صرف اسی طرح ثابت ہو سکتی ہے کہ دیگر صحابہ کو بُرا کہا جائے تو سنیوں کے یہاں بھی حضرت علی کے مرتبۂ بلند کا ذکر کرنا گویا خلفاء ثلٰثہ کی توہین کرنا ہے ـــــ یوں تو اہل سنت والجماعت بظاہر اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ صاحب ذوالفقار بڑی پُر عظمت ہستی کے مالک تھے کیونکہ اس سے انکار حقیقت کا انکار، قرآن و حدیث کا انکار ہے، لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس خیال کے آتے ہی وہ کس کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور وہ جوش و ولولہ جو خلفاء ثلٰثہ کے فضایل بیان کرنے میں ظاہر ہوتا ہے، جناب امیر کا نام آتے ہی کتنا سرد پڑ جاتا ہے، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر حضرت علی کے فضل و کمال کا پلہ ذرا بھی جھک گیا تو اُن کے مذہب کا شیرازہ درہم برہم ہو جائے گا، درانحالیکہ اگر مذہب واقعی رسول کی بتائی ہوئی کوئی چیز ہے تو جناب فاطمہ کے شوہر سے زیادہ اس کا سمجھنے والا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ جس کا اعتراف خود خلفاء ثلٰثہ نے بھی کیا اور حضرت عمر نے تو یہاں تک کہدیا کہ "لَوْلَا عَلِیٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ" (یعنی اگر جناب امیر کی ذات نہ ہوتی تو عمر ہلاک ہو جاتا) پھر ملتمہ

تو یہ ہے کہ سُنّی اپنے آپ کو امام ابوحنیفہ کا مقلد تو ظاہر کرتے ہیں، لیکن اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ابوحنیفہ خود علویین کے طرفدار تھے اور محض اسی طرفداری کی بدولت وہ قید و بند کی صعوبتوں میں گرفتار ہوئے —— اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ سُنیوں کی حیرت کا سبب یہ نہ تھا کہ افضلیت و ولایت جناب امیر کا مسئلہ کوئی اختراعی مسئلہ ہے، بلکہ حیرت اس بات کی تھی کہ ایک بادشاہ کے قلم سے کیونکر ان حقایق کا اظہار ہوسکا، حالانکہ وہ اگر اعلیحضرت کے مرتبہ سے پوری طرح آگاہ ہوتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ آصف جاہ سابع پہلے ایک مرد درویش ہے اور اس کے بعد بادشاہ، یعنی اگر وہ سرزمین دکن کے چند لاکھ نفوس پر دُنیاوی حکمرانی کر رہا ہے، تو اس کو یہ اہلیت تامہ بھی حاصل ہے کہ دکن اور دکن سے باہر کروروں مسلمانوں کے قلب پر فرمانروائی کرے، اپنے ارشادات روحانی سے، اپنے حکیمانہ اجتہادات سے، اپنے فیوض و کمال سے

وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ

---

شیعہ سُنّی جماعتوں کی نزاع آج نہیں صدیوں سے جبینِ انسانیت کے لئے ایک شرمناک داغ بنی ہوئی ہے اور اس افتراق و انتشار کی خلیج کو جتنا کم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اتنی ہی زیادہ وہ وسیع ہوتی جاتی ہے —— کیوں؟ —— صرف اس لئے کہ ان دونوں کو ایک مرکز پر لانے کے لئے اس وقت تک کوئی ہستی رونما نہ ہوئی تھی اور وہ بیچ کی کڑی جو ان دونوں زنجیروں کو آپس میں ملا کر "حبل المتین" بنانے والی ہے، مفقود تھی۔ لیکن اب کہ اعلیحضرت ایک طرف خلفائے ثلثہ کا بھی احترام کرتے ہیں اور دوسری طرف جناب امیر کے حقیقی فضل و کمال سے بھی دنیا کو روشناس کرنا چاہتے ہیں، ہمکو بہت کچھ اُمیدیں وابستہ ہیں اور ہوسکتا ہے کہ ان دونوں جماعتوں کو ایک دوسرے سے بغل گیر کرنے کی سعادت و برکت آصف جاہ سابع کے لئے مقسوم ہو چکی ہو اور دنیائے اسلام کی یہ وہ عظیم الشان خدمت ہے جس کی نظیر اسوقت تک کی تاریخ اسلامی میں کوئی دوسری نظر نہیں آسکتی۔

نیاز فتحپوری

# جنوری ۳۵ء کے نگار کی خصوصیات

۱۔ اُردو شاعری پر شروع سے اسوقت تک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ تذکروں، تاریخی کتابوں، ادبی تنقیدوں اور مختلف مضامین کی صورت میں اتنا منتشر، اسقدر کثیر ہے کہ کوئی ایک شخص نہ بیک وقت ان سب کو دیکھ سکتا ہے، نہ یاد رکھ سکتا ہے، لیکن جنوری ۳۵ء کا نگار اس موضوع پر اتنی جامع تالیف ہے کہ اس کے پاس رکھنے کے بعد آپ کو نہ کسی تاریخ و تذکرہ کی ورق گردانی کی ضرورت ہو سکتی ہے، نہ کسی اور تنقید و تبصرہ کے مطالعہ کرنے کی۔

۲۔ جنوری ۳۵ء کا نگار یوں سمجھئے کہ اُردو شاعری کے متعلق ایک ایسی انسائکلوپیڈیا ہے، جس میں اس موضوع پر آپ کے ہر سوال کا جواب بہ آسانی ملسکتا ہے۔

۳۔ قطب شاہی عہد سے لیکر اسوقت تک جتنے شاعر گزر چکے ہیں ان سب کا بہترین کلام اور اُن کی شاعری پر بہترین تاریخی و تنقیدی تبصرہ آپ کو جنوری ۳۵ء کے نگار میں نظر آئے گا۔

۴۔ اس میں بعض ایسے شاعروں کا کلام آپ کو ملے گا جن سے دنیا بالکل ناواقف تھی درانحالیکہ وہ اپنے عہد کے بے مثل کہنے والے تھے۔

۵۔ اس رسالہ میں خود جناب نیاز فتحپوری کے لکھے ہوئے تین چار تاریخی و تنقیدی مضامین شامل ہیں اور غالباً تنہا یہ خصوصیت اس اشاعت کو اہمیت بخشنے کے لئے کافی ہے۔

۶۔ وہ حضرات جو اُردو شاعری کے مطالعہ کا شوق رکھتے ہیں، یا وقتاً فوقتاً اس موضوع پر تنقیدی و تاریخی مقالے لکھنا چاہتے ہیں، نیز وہ طلبہ جو انعامی مقابلوں یا طیاری امتحان کے سلسلہ میں اُردو شاعری کے متعلق بہترین تاریخی و تنقیدی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں، اُن کے لئے صرف اس رسالہ کا دیکھ لینا کافی ہے —— تاہم —— باوجود ان تمام خصوصیات کے نگار کے سالانہ خریداروں سے کوئی زاید قیمت نہیں لیجاتی۔ پس اس کے حصول کی بہترین تدبیر یہی ہے کہ جنوری ۳۵ء سے نگار کے سالانہ خریدار بن جائیے۔ ورنہ صرف جنوری ۳۵ء کا نگار حاصل کرنے کے لئے علاوہ محصول کے آپ کو دو روپیہ ادا کرنے پڑینگے۔

منیجر نگار لکھنؤ

# ہماری عورتوں کا پردہ

(بہ سلسلۂ ماسبق)

## پردہ کے نقصانات

اس تمام بحث سے جو اب تک ہوئی اگر کچھ ثابت ہوا تو صرف یہ کہ پردہ غیر ضروری ہے ۔ لیکن آپ کہیں گے کہ "ہماری معاشرت میں بہت سے غیر ضروری اجزا شامل ہیں۔ اس لئے اگر پردہ سے کوئی خاص نقصان نہ ہو تو اس کے برقرار رہنے میں کیا مضائقہ ہے ؟"۔ اگر فی الواقع پردہ صرف غیر ضروری ہوتا تو یہ کہنا صحیح تھا اور اس کے اُٹھا دئے جانے پر ہمیں اصرار کی کوئی وجہ نہ تھی۔ لیکن بد قسمتی سے ایسا نہیں ہے۔ پردہ ہماری سوسائٹی کے تمام افراد کے حق میں (خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں) جسمانی و ذہنی، اخلاقی و عمرانی ہر حیثیت سے سخت مہلک ہے۔ حامیانِ پردہ کا خیال ہے کہ پردہ کی بدولت ہماری سوسائٹی کو سب سے زیادہ اخلاقی اور جسمانی فائدے پہونچ رہے ہیں۔ یہ میں جانتا ہوں کہ "اخلاق" سے ان حضرات کی مراد صرف جنسی اخلاق ہے اور اس کے سوا انسانی سیرت کے جتنے محاسن ہو سکتے ہیں ان میں سے کوئی بھی لفظ "اخلاق" میں شامل نہیں۔ مثلاً جب آپ یہ کہتے ہیں کہ "یورپ کی اخلاقی حالت بالکل تباہ ہو گئی" تو اس سے آپ کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ یورپ میں لوگوں نے سچ بولنا بالکل چھوڑ دیا ہے یا ان میں ہمدردی باقی نہیں رہی یا وہ اپنے قول کے پابند نہیں رہے یا اُن سے حب وطن کا مادہ مفقود ہو گیا۔ بلکہ آپ کی مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ وہاں عصمت فروشی بڑھ گئی ہے۔ گویا آپ اخلاق کو صرف جنسی اخلاق کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں حالانکہ اخلاق کا لفظ بہت وسیع ہے اور اس میں انسانی سیرت کے وہ تمام محاسن شامل ہیں جن سے پردہ کا نہ تو فی الواقع کوئی تعلق ہے نہ خود پردہ کے حامی کوئی تعلق سمجھتے ہیں۔ اس لئے ابتدا ہی میں ہم اسے واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اس بحث میں ہم بھی جہاں کہیں 'اخلاق' یا 'اخلاقی حالت' کا لفظ استعمال کریں گے اُس سے صرف جنسی اخلاق مراد ہوں گے جو در اصل دیگر اوصاف انسانی کی طرح شجر اخلاق کی صرف ایک شاخ ہے۔

## پردہ کے نقصانات اخلاقی اور جسمانی اعتبار سے

حامیانِ پردہ کا یہ خیال ہے کہ پردہ نے سب سے زیادہ فائدہ ہمارے ملک کی

اخلاقی اور جسمانی حالت کو پہونچایا۔ میں کہتا ہوں کہ پردہ نے سب سے زیادہ نقصان جس چیز کو پہونچایا وہ ہماری اخلاقی اور جسمانی حالت ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض درخت بالکل ٹیڑھے ہوتے ہیں۔ کبھی آپ نے غور کیا کہ اس کا کیا سبب ہے؟ جب کسی پودے کی قدرتی نشوونما میں کوئی خارجی چیز حائل ہوجاتی ہے تو وہ صحیح راہ کے بجائے کسی اور طرف سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ بالکل یہی حال انسانی جذبات کا ہے۔ جب آپ کسی جذبہ کے قدرتی ذریعۂ تسکین کو بند کردیتے ہیں تو یہ نہیں ہوتا کہ وہ جذبہ غائب ہوجائے بلکہ وہ قوی تر اور تند تر ہوجاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی تسکین کے لئے زیادہ نامناسب ذرائع نکالنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اب ذرا آپ قدرت کے ایک عالمگیر قانون پر نظر کیجئے۔ دو جنسوں کا باہمی اختلاط، فطرت کا وہ آئینِ مسلّم ہے جو اُس نے بقائے نسل کے لئے وضع کیا تھا۔ نباتات، حیوانات، چرند، پرند، غرض آپ کائنات کی کسی مخلوق کو لے لیجئے آپ کہیں یہ نہ دیکھیں گے کہ اس میں نر اور مادہ جدا کردئے گئے ہوں — بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتی ہو اور بکرا دوسرے پر، گائیں ایک چراگاہ میں چرا کرتی ہوں اور بیل دوسری میں، اونٹ کو آتا دیکھکر سانڈنی کسی ٹیلے کی آڑ میں دبک جائے یا کسی ریچھ کو دیکھکر اس کی مادہ درخت کے پتوں سے منھ ڈھانک لے۔ یہی حال پرندوں کا ہے یہی مچھلیوں کا، یہی نباتات کا لیکن ان سب سے اشرف و ممتاز ایک مخلوق اور ہے جو اس قانونِ قدرت کے خلاف اپنا ایک قانون علٰحدہ رکھتی ہے جو پردہ کہلاتا ہے اور جس کا مقصد یہ ہے کہ نوعِ انسان کی دو جنسوں میں ایک حدِ فاصل قائم کردیجائے اس دوراندیش جماعت کے نزدیک دنیا میں نیکی کو عام کرنے کے لئے اس قانونِ قدرت کے خلاف ایک ایسا قانونِ اخلاق بنانا ضروری تھا جس کی رو سے ہر وہ شخص مجرم قرار دیا جائے جو جنسِ مخالف کے چہرہ پر ایک نظر بھی ڈال لے۔ مگر بدقسمتی سے اس ملائک صفت جماعت نے اپنا یہ قانونِ اخلاق مدون کرتے وقت اس امر پر بالکل غور نہیں فرمایا کہ قدرت کے قوانین بڑے سخت ہوتے ہیں اور جو شخص ان کی خلاف ورزی کرتا ہے اسے قدرت بڑی بیرحمی سے مسل ڈالتی ہے۔ واضعانِ پردہ کا بظاہر یہ منشا نہ تھا کہ اس میں اتنی شدت کی جائے لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور لوگوں نے دیکھا کہ اس سے بداخلاقی کم ہونے کے بجائے اور بڑھ رہی ہے، تو انھوں نے پردہ میں اور سختی کی، اس سختی سے بداخلاقی اور بڑھی یعنی پردہ بھی اور بڑھا یہاں تک کہ اب حالت یہ ہے کہ اگر اتفاق سے کوئی میری بیوی کی آواز بھی سُن لے یا ایک جھلک دیکھ لے تو میں غصہ سے بیتاب ہوجاؤں گا۔ اسی طرح ہمارے اخلاق کی حالت یہ ہوگئی ہے کہ جس طرح ایک فاقہ زدہ کو

کھانے کے سوا کسی اور بات کا خیال ہی نہیں آتا اسی طرح ہمارا دماغ ہر وقت عورتوں ہی کے خیال میں منہمک رہتا ہے۔ ہماری ساری دماغی فضا جنسی خیالات سے معمور ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر زیادہ نہیں تو کم سے کم ننانوے فیصدی اشخاص کو جنسی مالیخولیا ہو گیا ہے۔ خود جنسی تعلقات کے بارہ میں ہمارے خیالات نہایت لغو ہیں اور اس پردہ نے جنسی نفسیات کو بالکل ستیاناس اور سراسر زہر آلود کر دیا ہے۔ جنسی خواہش، دیگر خواہشات انسانی کی طرح بقائے حیات اور بقائے نسل کا ایک ذریعہ ہے لیکن ہم اُسے ایک اہم، مفید فطری اور قابل احترام خواہش سمجھنے کے بجائے نہایت شرمناک، بیہودہ، فوق العادت اور مضحکہ خیز جذبہ سمجھنے لگے ہیں۔ اُس کا ذکر مہذب مجالس میں معیوب، اور اُس کی تعلیم سرکاری مدارس میں ممنوع قرار دی گئی ہے عوام اور جہلا در کنار اچھے تعلیم یافتہ حضرات بھی جنسی تعلقات پر ایک اہم اور غور طلب مسئلہ کی حیثیت سے نظر نہیں ڈالتے۔

ہمارے ان اہل الرائے حضرات کے نزدیک گھوڑوں، کتوں اور گایوں کی افزائش نسل کا مسئلہ تو بڑا اہم ہے جس پر خاص توجہ کی جاتی ہے اور جس کی خاص تعلیم دی جاتی ہے لیکن نسلِ آدم کی افزائش کے مسئلہ کو اہم سمجھنا اور اس کے متعلق سائنٹفک معلومات حاصل کرنا ایسی مضحکہ خیز حرکت ہے جو بھانڈوں کے سوا کسی اور کے شایان شان نہیں۔ یہی حال پردہ نے عورت کا بھی بنا دیا ہے۔ عورت ہمارے لئے ایک ایسا رازِ سربستہ ہے جو صرف سربستہ ہی نہیں بلکہ نہایت شرمناک اور ناگفتہ بہ بھی ہے۔ کسی مہذب محفل میں تو اس کا ذکر کیا ہی نہیں جاتا اور نامہذب محفلوں میں یا تو تمسخر و استہزا کے موقعوں پر کیا جاتا ہے یا ذلیل اور گندے خیالات کے ساتھ۔

آپ یقین مانئے کہ جب میں اپنے حلقۂ احباب پر نظر ڈالتا ہوں تو ان میں سے ننانوے فیصدی کو انہی گندے خیالات میں گرفتار پاتا ہوں۔ پردہ نے اُن کی جسمانی زناکاری کے مواقع کم کر کے انھیں ایسی سخت ذہنی زناکاری میں مبتلا کر دیا ہے جس سے شاید ہی کبھی نجات مل سکے۔ پھر اس میں بیاہے اور کنوارے جوان اور بوڑھے، جاہل اور تعلیم یافتہ اعلےٰ اور ادنےٰ کی کوئی قید نہیں۔ جسے دیکھئے اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔

ممکن ہے آپ اس بیان کو پڑھکر میرے حلقۂ احباب سے بدظن ہو جائیں اور یہ سمجھیں کہ میں نے اپنے شہر کے تمام اوباشوں کو اپنا دوست بنا لیا ہے ــــ لیکن میں اپنے یا اپنے احباب کے حق میں کچھ نہیں کہنا چاہتا اور خود آپ کی راست گوئی پر اعتماد کر کے پوچھتا ہوں کہ آپ کا اور آپ کے احباب کا کیا حال ہے؟

اس کے جواب میں آپ حقیقت کو چھپانا چاہیں بھی تو نہیں چھپا سکتے۔ یہ حقیقت اب میرے یا آپکے اعتراف کی محتاج نہیں رہی اور ایک زمانہ اس سے واقف ہوگیا ہے۔ اگر بدقسمتی سے آپ کو کبھی کسی پارسی، ہندو یا اینگلو انڈین کے خیالات مسلمانوں کے جنسی اخلاق کے متعلق معلوم کرنے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ کہہ سکیں گے کہ وہ لوگ اس بارہ میں مسلمانوں کے کس قدر مداح وثنا خواں ہیں۔ آپ جتنا چاہیں اپنے منھ آپ میاں مٹھو بنیں لیکن اس افسوسناک حقیقت کو نہیں چھپا سکتے کہ غیر قومیں اپنی عورتوں کو آپ کے سایہ سے اتنی ہی دور رکھنا چاہتی ہیں جتنی ایک پردہ دار عورت اپنے بچہ کو آسیب کے سایہ سے۔ یہ تو آپ کا سلوک اُن عورتوں کے ساتھ ہے جو آپ کی دسترس سے باہر ہیں اب اُن عورتوں کا حال سنئے جن کو سوسائٹی نے آپ کے قبضۂ قدرت میں دے رکھا ہے۔

بیویوں کا احترام اخلاق کے اُن ابتدائی مسلمات سے ہے جن پر عمل کرنا مشرق و مغرب میں یکساں ضروری سمجھا جاتا ہے اور اُن تمام ملکوں میں جہاں پردہ رائج نہیں اس کا سختی سے لحاظ رکھا جاتا ہے اسلام نے بیویوں کے حقوق کی جتنی حفاظت کی ہے اُس کی نظیر کسی اور مذہب میں کم ملے گی لیکن پردہ کی بدولت عورتوں کے یہ حقوق صرف کتابوں کے اوراق میں محفوظ رہ گئے اور عملی دنیا میں شاید ہی کوئی عورت ایسی مظلوم و بیکس ہو جیسی ایک ہندوستانی مسلمان بیوی ہے۔ مردوں نے یہ سمجھ کر کہ عورتیں نہ کہیں جا سکتی ہیں، نہ کسی سے دردِ دل کہہ سکتی ہیں نہ معاملات دنیوی کو سمجھ سکتی ہیں اور نہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتی ہیں۔ ان کے حقوق غصب کرنا اور ان کی ان کمزوریوں سے ناجائز فائدہ اُٹھانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ ہمارے پچاس فیصدی سے زیادہ گھروں میں بیویاں زرخرید لونڈیوں سے بدتر ہیں۔ بدمزاجی، بدزبانی، سب وشتم، مارپیٹ، بیویوں کا مال ان کی خلاف مرضی بیچ دینا ان کی جائداد میں گرو کر دینا، ان کی رقمیں بینکوں سے نکال لینا اور اسی قسم کی سیکڑوں حرکتیں اس قدر عام ہوگئی ہیں کہ اگر اُن کا تفصیل سے ذکر کیا جائے تو یہ بجائے خود ایک مستقل عنوان ہو سکتا ہے۔ لیکن میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اس بحث کے آغاز ہی میں ہم نے اخلاق کو صرف جنسی اخلاق تک محدود رکھنے کا تصفیہ کیا تھا اس لحاظ سے یہ واقعات ہمارے دامنِ اخلاق پر خواہ کیسے ہی بدنما داغ سہی لیکن ہماری اصل بحث سے خارج ہیں یہاں میں صرف جنسی اخلاق کی حد تک چند مثالیں دیکر اس اخلاقی جزو کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے شوہر و زوجہ کی عصمت میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا۔ زنا خواہ شوہر سے

سرزد ہو یا زوجہ سے یکساں مذموم ہے۔ یہی نقطۂ نظر مغربی ممالک کا ہے۔ وہاں زوجہ کو شوہر کی آوارگی پر نوٹس لینے کا ایسا ہی اختیار حاصل ہے جیسا شوہر کو زوجہ کی آوارگی پر، اور یہ اختیار آپ کی عورتوں کی طرح صرف زبانی نہیں بلکہ عملی بھی ہے۔ وہاں عورت جب چاہے مرد کی بےعصمتی ثابت کرکے اُس سے تعلق منقطع کرسکتی ہے اور کرتی رہتی ہے۔ اس کے برخلاف آپ کے جنسی اخلاق یہ ہیں کہ آپ تو معمولی سے شبہ پر اپنی بیوی کا گلا کاٹ سکتے ہیں۔ مگر آپ کی بیویاں اپنی آنکھوں سے آپ کی سیہ کاریاں دیکھ لیں تب بھی خون کے گھونٹ پینے کے سوا کچھ نہیں کرسکتیں۔ ہمیں تو اس کا پیدائشی حق حاصل ہے کہ جتنی عورتیں چاہیں لائیں اور اپنی بیوی کی چھاتی پر مونگ دلیں لیکن اگر ہماری بیوی کسی مرد کو جھانک کر دیکھ لے تو وہ سوختنی اور گردن زدنی ہے۔ یہ تو اقدام کی صورت تھی اب مدافعت کی صورتیں لیجئے۔

ہماری سوسائٹی میں تعلق جنسی کے لئے شوہر کی خواہش کافی ہے اور اس کی قطعاً ضرورت نہیں کہ زوجہ کی صحت، حالت، رغبت اور رضامندی کا کچھ بھی لحاظ کرے، ہماری بیویاں خواہ کسی جسمانی عارضہ میں مبتلا ہوں یا کسی واقعہ سے متاثر ہوں لیکن یہ موانع کوئی چیز نہیں ہیں۔ اگر آپ اسے مبالغہ سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ہماری معاشرت کی عملی دنیا میں ایسی صورتیں بکثرت پیش نہیں آتیں تو آپ اُس بدنام امریکن خاتون مس میو کی کتاب 'مادر ہند' کے اُس حصہ کا مطالعہ فرمایئے جس میں اُس نے ہندوستان کے زنانہ دواخانوں کے چشم دید حالات قلمبند کئے ہیں۔

بعض دفعہ تو آپ کو اس کا نہ صرف اختیار دیا جاتا ہے کہ آپ اپنی بیوی کے جذبات کا لحاظ نہ کیجئے بلکہ آپ ایسا کرنے پر مجبور کئے جاتے ہیں۔ ذرا اُس حجلۂ عروسی کا تصور کیجئے جہاں ایک ایسی بھولی بھالی لڑکی محوِ خواب ہو جسے جنسی معاملات سے بےخبر رکھنے کی انتہائی کوشش کی گئی تھی اور جو بیچاری صدق دل سے یہ سمجھتی ہے کہ اگر وہ اپنے قریب ترین عزیز کو بھی کسی طرح اپنا ستر دیکھنے کا موقع دے تو گویا ایک گناہِ عظیم کا ارتکاب کرے گی۔ اِدھر تو اس غریب کی حالت اُدھر آپ اپنے جنسی اخلاق کے احکام سے مجبور ہو کر صبر کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکتے کیونکہ اگر کہیں شامتِ اعمال سے آپ نے ایسا قصد فرمایا تو میکے اور سسرال اور برادری اور محلہ میں آپ کی رسوائی ظاہر ہے۔ اس بہیمانہ طرزِ عمل کے جو اثرات اس غریب لڑکی کے ذہنی کیفیات پر مترتب ہوتے ہیں اُنکا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے۔ اور اس کے جو مسموم اثرات آپ کی بیوی اور اس کے توسط سے آپ کی اولاد پر پڑتے ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ اگر آپ انھیں حرکتوں پر اکتفا کرتے تو بھی خیر تھی مگر افسوس کہ قدرت کا انتقام اسی پر ختم نہیں ہوتا۔ اس بحث کے آغاز میں میں نے ایک جملہ لکھا تھا جسے آپ اجازت دیں تو یہاں دہرا دوں

میں نے کہا تھا کہ "جب آپ کسی جذبہ کے قدرتی ذریعہ تسکین کو بند کر دیتے ہیں تو یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ جذبہ غائب ہوجائے بلکہ وہ قوی تر اور تند تر ہوتا چلا جائے گا..... اور اگر اس پر بھی آپ اُسے کوئی راہ نہ دیں گے تو وہ اپنے نفاذ کے لئے نامناسب راستے نکالیگا" اس بیان کے پہلے حصہ کا آپ کو ثبوت مل گیا یعنی آپ نے یہ دیکھ لیا کہ مردوں کو عورتوں کی صورت دیکھنے کی ممانعت کرنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ اب میں آپ کو اس بیان کے دوسرے حصہ کا ثبوت دیتا ہوں۔ پردہ کی قید و بند کے بعد جن لوگوں کا عورتوں تک دسترس ہوتا ہے ان کا حال وہ تھا جو آپ نے سُنا، جن کا دسترس عورتوں تک نہیں ہوتا ان کا حال یہ ہے جو آپ اب سُنیں گے۔ ہماری سوسائٹی میں خلاف وضع فطری حرکتیں جسقدر عام ہیں وہ غالباً آپ سے مخفی نہوں گی۔ ان حرکتوں کی شہرت و مقبولیت کی زندۂ جاوید یادگار اُردو اور فارسی شاعری کا وہ ناپاک دفتر ہے جو علانیہ امرد پرستی پر فخر و ناز کر رہا ہے۔ آپ شاید یہ سمجھیں کہ میکشی اور شاہد بازی کی طرح یہ امرد پرستی بھی صرف شعراء کے دواوین میں رہتی ہے اور خارج میں اس کا کہیں وجود نہیں پایا جاتا تو یہ غلط ہے۔ ایران اور ہندوستان میں جب پردہ رائج ہوا تو اُس کے سایۂ عاطفت میں امرد پرستی اپنے اصلی اور عملی معنوں میں پھیلنی شروع ہوگئی۔ پردہ کے حامی نوع انسان کی دو جنسوں میں سے ایک کو تو مقید کر ہی چکے تھے اب اگر دوسرے کو بھی کر دیتے تو سارے ملک میں گھروں سے باہر سناٹا ہو جاتا جو عملی دنیا میں کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اس لئے کرتے تو کیا کرتے؟ مجبوراً جہاں تک بنا کمسن لڑکوں کی نگرانی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ مگر میں آپ سے اوپر عرض کر چکا ہوں کہ قوانین قدرت کا سیلاب کبھی ہمارے ان طفلانہ اور احمقانہ کوششوں سے نہیں رُک سکتا۔ اب ہمارے جذبات نے اپنے لئے ایک نیا مخرج تلاش کیا جو سب سے زیادہ آسان اور سب سے زیادہ آسان اور سب سے زیادہ مہلک ہے اور جسے اصطلاح عام میں استلذاذ بالنفس کہتے ہیں۔

اگر آپ کو پردہ کے انتظامات سے کچھ فرصت ملے اور آپ کبھی اپنے گرد و پیش پر ایک نظر ڈالنے کی زحمت گوارا فرمائیں تو غالباً ہمارے نوجوان طلباء کے کمھلائے ہوئے چہرے، دھنسی ہوئی آنکھیں، پچکے ہوئے گال، جھکی ہوئی کمر، لڑکھڑاتی ہوئی زبان اور ڈگمگاتے ہوئے قدم آپ کی نگاہوں سے نہ چھپ سکیں گے آپ جانتے ہیں یہ سب کس شجر مقدس کے ثمرات پاکیزہ ہیں؟ غالباً مجھے پھر اُس کا نام لینے کی ضرورت نہیں لیکن اتنا ضرور عرض کر دینا ہے کہ یہ وہ شجر مقدس ہے جس کے مسموم ثمرات دنیا کی بڑی سے بڑی قوم کو نیست و نابود کر دینے کے لئے کافی ہیں۔

سب سے آخر میں میں اُس ڈراؤنی چیز کی طرف آتا ہوں جس کے خوف سے آپ نے یہ ساری مصیبت مول لی تھی اور بتاتا ہوں کہ آپ کی تمام تدابیر حفظ ماتقدم کے باوجود وہ چیز ویسی ہی ڈراؤنی اور بھیانک ہے جیسے پہلے تھی۔ آپ سمجھتے ہیں کہ پردہ نے آپ کی سوسائٹی میں فحش کا بازار بالکل سرد کر دیا اور اب آپ اُن تمام خطرات سے محفوظ ہو گئے جو آپ کے نزدیک صرف بے پردہ قوموں کا حصہ ہیں۔ آیئے! میں ذرا آپ کو اس کی بھی سیر کرا دوں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ابتک ہندوستان کے کسی گوشہ میں مردوں پر پردہ عائد نہیں کیا گیا، اور سوسائٹی نے انھیں نہ صرف اس کی آزادی دے رکھی ہے کہ جہاں چاہیں جائیں اور جن سے چاہیں ملیں بلکہ اُن کی نفسانی خواہشیں پوری کرنے کے لئے ایک خاص طبقہ بھی فراہم کر دیا ہے جس سے وہ عند الضرورت کام لے سکتے ہیں اور لیتے رہتے ہیں۔ یہ طبقہ خود اپنی اور دوسروں کی نظروں میں اسقدر ذلیل ہے کہ اس سے کسی جنسی اخلاق کی توقع نہ کی جاتی ہے نہ کی جا سکتی ہے اس لئے وہ طبقہ خود بھی کسی اخلاق کا ادعا نہیں کرتا اور بجز پیسہ کے ہر چیز کو اپنے دائرۂ اخلاق سے باہر سمجھتا ہے۔

اس صورت حال کا جو نتیجہ ہونا چاہئے تھا وہ ظاہر ہوا۔ اگر آپ کبھی تمام خانگی ویدوں، حکیموں، ڈاکٹروں اور اشتہاری دواسازوں سے قطع نظر صرف کسی ایک دواخانہ کے شعبۂ امراض خبیثہ تک قدم رنجہ فرمائیں تو شاید اُس دن سے آپ اپنی اخلاقی حالت پر فخر کرنے کی زحمت گوارا نہ فرمائیں گے۔ پھر لطف یہ کہ جن مریضوں سے ملاقات کی شفاعت آپ کو وہاں حاصل ہو گی اُن میں سے آدھوں کی شادی ہو چکی ہو گی اور آدھوں کی ہونے والی ہو گی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ تمام امراض شریفہ اُن سب خواتین محترم کے خون میں منتقل ہو چکے ہیں یا ہونے والے ہیں جن کے پردہ پر آپ کو اس قدر اصرار اور جن کی عصمت پر آپ کو اسقدر ناز ہے۔ آپ کے جنسی اخلاق کی یہ ستم ظریفیاں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اُن پر ہنسئے یا رو دیئے۔ آپ زنا کے تو سخت دشمن ہیں لیکن اُن عواقب و نتائج کے بالکل دشمن نہیں جن کی وجہ سے زنا حرام قرار دیا گیا ہے۔ گویا آپ گُڑ تو ڈھیروں کھائے جاتے ہیں مگر گلگلوں کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ اُن مہلک امراض کو (جن کی وجہ سے عورت کی عصمت اسقدر اہمیت رکھتی ہے) روکنے کی آپ کے پاس صرف یہی ایک تدبیر ہے کہ عورت کو پردہ میں مقید کر دیا جائے اور آپ اپنی ساری کوششیں اسی میں صرف کر دیتے ہیں۔ جب آپ کو عورت کے پردہ کی طرف سے اطمینان ہو گیا آپ سمجھے کہ حق ادا ہو گیا اور اب آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں باقی رہی گویا آپ کے نزدیک قاضی صاحب کا ایجاب و قبول کرا دینا اُن تمام معاصی کا کفارہ ہے جو نکاح کے بعد کی

غلط کاریوں سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ آپ کے مرد چاہے مبروص و ـــ مجذوم ہوں یا دق ـــ مجنون ہوں یا دنیا بھر کے امراض خبیثہ میں مبتلا ـــ لیکن چونکہ ایک مستند قاضی نے دو گواہوں کی موجودگی میں انکا عقد کر دیا ہے اس لئے اب انھیں اس کی کامل آزادی حاصل ہوگئی ہے کہ اُس تندرست اور بے گناہ عورت کو جس نے پردہ کی قید میں گھٹ گھٹ کر اپنی عصمت برقرار رکھی ہے اس کی بلا رضامندی بلکہ خلاف مرضی پکڑ کر یہ تمام امراض اُس میں منتقل کر دیں۔ یہاں تک تو صرف اُن امراض کا ذکر تھا جو عورتوں کو بالواسطہ منتقل ہوتے ہیں اس پر اُن امراض کا اور اضافہ کیجئے جو براہ راست پردہ کی پیداوار ہیں اور جن سے ہر سال ہزارہا عورتیں لقمۂ اجل ہو جاتی ہیں۔ دق۔ سل۔ ضعف معدہ۔ خرابی جگر اور دوسیکڑوں رحمی اور نسوانی شکایتیں جن سے شاید ہی مسلمانوں کا کوئی گھر خالی ہو، در اصل نتیجہ ہیں تنگ و تاریک مکانات میں رہنے، کھلی ہوا میں نہ نکلنے، ورزش نہ کرنے، سیر و تفریح سے محروم رہنے اور اُس طائر پرشکستہ کی طرح گھٹ گھٹ کر جینے کا جسے کبھی کنج قفس سے باہر نکلنا نہیں نصیب ہوتا۔

## مغربی ممالک اور ہندوستان کی اخلاقی اور جسمانی حالت کا مقابلہ

یہاں تک آپ کے مکارم اخلاق کا ذکر خیر تھا اب اگر آپ اجازت دیں تو ایک سرسری نظر اُن بے پردہ ممالک کی اخلاقی اور جسمانی حالت پر بھی ڈال لیجائے جو آپ کے نزدیک شیاطین کی بستیاں اور بدکاری کے گہوارے ہیں تاکہ آپ خود دونوں کا مقابلہ کر سکیں۔ آپ یہ تو جانتے ہوں گے کہ مغربی ممالک میں غیر فطری حرکتیں بہت کم ہیں اور ایسا ہونا چاہئے کیونکہ جب تک انسان کی فطری خواہشیں فطری ذرایع سے پوری ہو سکتی ہیں، وہ کبھی غیر فطری ذرایع اختیار نہ کرے گا۔ اس کے ساتھ ہی آپ کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ زنا خواہ کیسا ہی مذموم فعل سہی لیکن اتنا مذموم نہیں جتنا کہ یہ خلافِ فطرت طریقے ہیں۔ کیونکہ زنا صرف اُن قوانینِ اخلاق کی خلاف ورزی کا نام ہے جو معاشی اور عمرانی ضرورتوں کے لئے وضع کئے گئے ہیں اور خلاف فطرت حرکتیں (جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے) قوانین اخلاق و فطرت دونوں کے خلاف ہیں۔ اب رہا زنا اور اُس کے قبیح نتائج۔ چونکہ اس بارہ میں آپ میری رائے ہرگز تسلیم نہ کریں گے اس لئے میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ آپ کے نزدیک مغربی ممالک میں کتنی فیصدی عورتیں پاکدامن ہوں گی؟ ایک فیصدی؟ مشکل سے۔ اچھا تسلیم۔ اور مرد کتنے فیصدی؟ صفر؟ اچھا یہ بھی تسلیم ہے اب یہ بتائیے کہ ہماری پردہ دار عورتیں آپ کے نزدیک

کتنی فیصدی پاکدامن ہوں گی؟ ننا نوے فیصدی کم سے کم؟ یہی میں نے مانا مگر یہ تو ارشاد ہو کہ ہمارے بے پردہ مرد کتنے فیصدی حقیقی معنوں میں پاکدامن ہوں گے؟ مشکل سے ایک فیصدی، وہ بھی محض آپ کی خاطر میں آنے کے لئے تیار ہوں۔ اس اعداد و شمار کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مغربی ممالک میں صد فیصدی مرد اپنی نفسانی خواہشیں ۹۹ فیصدی عورتوں سے پوری کرتے ہیں اور آپ کے یہاں ۹۹ فیصدی مرد ایک عورت سے (یا پھر غیر فطری ذرایع سے) یہ ایک فیصدی وہ عورت ہے جو ہماری سوسائٹی کے سب سے زیادہ پست و ذلیل طبقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اب اگر آپ نے کبھی امراض خبیثہ کے اسباب پر غور کرنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے تو معلوم ہوگا اسکا سب سے بڑا سبب ایک عورت کا کئی مردوں سے تعلق رکھنا ہے۔ اس لحاظ سے ہندوستان کی موجودہ صورت حال کا لازمی اقتضا یہ ہونا چاہئے کہ یہاں یہ امراض مغربی ممالک سے کئی گنا زیادہ ہوں اور یہی ہو رہا ہے یہ ننانوے فیصدی مرد اُس ایک فیصدی عورت کے تمام جسمانی اور اخلاقی عوارض باقی ۹۹ فیصدی پاکدامن عورتوں میں منتقل کر دیتے ہیں میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ کسی ملک کی دو جنسوں میں سے ایک کا جسمانی یا اخلاقی امراض میں مبتلا ہونا دوسری جنس کو بھی ان امراض میں مبتلا کر دینے کے لئے بالکل کافی ہے خواہ وہ دوسری جنس بذات خود کتنی ہی پاکدامن اور باعصمت ہو چنانچہ یورپ نے اسی خطرہ کو محسوس کر کے اس کے انسداد کی ایک نئی تدبیر نکالی ہے۔ آپ جرمنی کی خلاف نسواں تحریک سے تو بخوبی واقف ہیں اور نہایت شد و مد سے اُسکی حمایت کر رہے ہیں لیکن آپ کو اس کا بھی علم ہے کہ وہاں آج کل ایک اور تحریک اس تحریک سے زیادہ شدت سے پھیلی ہوئی ہے؟ اور وہ یہ ہے کہ جتنے مرد خطرناک متعدی امراض میں مبتلا ہوں وہ سب آختہ کر دئے جائیں، آپ کو شاید معلوم نہیں کہ یہ تحریک جرمنی میں قانون کی صورت اختیار کر چکی ہے اور اس کا قوی امکان ہے کہ عنقریب دیگر ممالک مغرب میں بھی ایسا ہی قانون بنجائے لیکن یہ فرمائیے کہ کیا آپ اس تحریک کی بھی اُسی جوش و سرگرمی کے ساتھ حمایت کرنے کے لئے تیار ہیں؟ حالانکہ یہ خلاف نسواں تحریک کے بہ نسبت نوع انسان خصوصاً آپ کے ملک کے لئے بہت مفید ثابت ہوگی کیونکہ پردہ کی بدولت یہاں کنواری لڑکیاں ایسے امراض کے اندیشہ سے بڑی حد تک محفوظ ہیں۔ اس طرح پردہ کا اصلی فائدہ تو اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے۔ کہ ہندوستان میں یہ تحریک قانون کی صورت اختیار کرے اور اس پر نہایت سختی سے عمل کیا جائے۔ لیکن چونکہ یہ قانون مردوں کے حق میں سخت ہے اس لئے غالباً آپ اس کی تائید کرنے کے بجائے خدا کا شکر ادا کریں گے کہ ابتک ہندوستان کی گورنمنٹ کو ایسا بیہودہ خیال نہیں پیدا ہوا اور خدا جانے آج سرکاری جراح کا نشتر ہم میں سے کن کن کی خبر

سے اچکا ہوتا۔ البتہ اگر کسی طرح اس قانون کا شکار عورتیں بن سکتیں تو آپ اسی مستعدی کے ساتھ اُسکی حمایت کے لئے تیار ہو جاتے جس طرح کہ آج تحریک مخالف نسواں کی تائید کے لئے تیار ہیں۔ غرض آپ کو معلوم ہو گیا کہ آپ کی جسمانی اور اخلاقی حالت جس پر آپ کو بڑا ناز تھا یورپ سے اتنی پست ہے کہ دونوں میں کوئی تناسب قائم ہی نہیں ہو سکتا۔

## پردہ کے نقصانات ذہنی اعتبار سے

ذہنی اعتبار سے جو نقصانات پردہ کی وجہ سے مسلمانوں کو پہونچے ہیں اُن سے پردہ کا بڑے سے بڑا حامی بھی انکار نہیں کر سکتا اس لئے اس بحث کو زیادہ طول دینا ضروری نہیں معلوم ہوتا۔ نہ صرف تعلیمی حالت بلکہ تجربہ، عام معلومات، ذہانت اور امور دنیوی کی واقفیت میں ہماری عورتیں (یورپ کی عورتوں کا تو خیر ذکر ہی کیا) خود ہندوستان کی بے پردہ عورتوں کے پاسنگ بھی نہیں اور یہ ظاہر ہے کہ ایسی ماؤں کے آغوش شفقت میں جو اولاد پرورش پائیگی وہ کیسی قابل و لائق نکلے گی اسکے جواب میں پردہ کے حامی یہی کہے چلے جاتے ہیں کہ "عورتوں کو پردہ میں بیٹھکر تعلیم حاصل کرنے سے کس نے منع کیا ہے؟" لیکن اس پر غور نہیں فرماتے کہ عملی دُنیا میں یہ کسی طرح ممکن بھی ہے یا نہیں۔ فرض کیجئے کہ میں اپنی ایک پردہ نشین لڑکی کو ڈاکٹری کی تعلیم دلانا چاہتا ہوں تاکہ وہ پردہ ہی میں رہکر خود کھانے کمانے کے قابل بھی بنے اور اپنی اولاد کی نگہداشت بھی بہترین طریقہ پر کر سکے۔ بتائیے اس کے لئے کیا صورت اختیار کیجائے؟ زنانہ میڈیکل کالج ہر جگہ نہیں ہے اب اگر فرض کیجئے دلی بھیجیں تو آخر وہاں پانچ سال تک اسکی نگرانی اور عفت و عصمت کی حفاظت کون کرے گا۔

ہمارے اس طرز عمل سے صاف ظاہر ہے کہ خود ہمیں اپنی عورتوں کی ذہنی حالت پر اس سے زیادہ اعتماد نہیں جتنا کہ ایک ناسمجھ بچے یا ایک مجنون پر ہوتا ہے آخر اس کا کیا سبب؟ قدرت نے ہماری عورتوں کو بھی وہی دماغی اور ذہنی قوا؛ عطا کئے ہیں جو مغربی عورتوں کو۔ پھر آخر ان میں باہم اتنا فرق عظیم کیوں ہے۔ ہماری عورتوں کی وہ حالت اور مغربی عورتوں کی یہ کیفیت کہ وہ کبھی آسمان کی فضاؤں میں اُڑتی ہیں تو کبھی سمندر کی تہوں میں پہونچتی ہیں۔ کبھی افریقہ کے مہیب جانوروں کا شکار کرتی ہیں تو کبھی امریکہ کے وسیع دواخانوں میں تیمارداری۔ جنگ کے زمانہ میں دشمنوں کا مقابلہ کرتی ہیں تو صلح کے زمانہ میں اپنے ملک کا سارا انتظام، وہ اپنے دوستوں کے حق میں فرشتۂ رحمت ہیں تو دشمنوں کے لئے قہر الٰہی قوم کی ہر مشکل اُن کے ناخن تدبیر کی محتاج ہے اور ملک کا ہر سر رشتہ ان کے مساعی جمیلہ کا ممنون۔ ایک طرف وہ سائنس کے میدان میں نئی نئی تحقیقاتیں کرتی ہیں تو دوسری طرف فنون کی دنیا میں بیش بہا ذخیرہ بہم پہونچاتی ہیں۔

## پردہ کے نقصانات معاشی اعتبار سے

معاشی اعتبار سے جو نقصان مسلمانوں کو پردہ کی وجہ سے برداشت کرنا پڑ رہا ہے وہ بالکل ظاہر ہے، آج شاذ و نادر کوئی مسلمان عورت اپنی ذاتی آمدنی رکھتی ہے ورنہ ۹۹ فیصدی سے زیادہ عورتیں صرف مردوں کی کمائی پر اپنی زندگی بسر کر رہی ہیں۔

جتنے پیشے اس وقت ہندوستان میں عورتوں کے لئے کھلے ہیں اُن سب میں غیر مسلم عورتیں بھری ہیں بجز ایک گداگروں اور طوائفوں کے کہ اُس میں تو بیشک مسلمان عورتوں کا نمبر از روئے تناسب سب سے بڑھا ہوگا۔ شریف عورتوں میں اول تو کوئی علم و ہنر ہی نہیں اور ہزاروں میں ایک آدھ کے ہاں اگر ہے بھی تو ہم لوگ اس سے کسی طرح کا مالی فائدہ اُٹھانا سخت معیوب سمجھتے ہیں خصوصاً اگر اُس کے لئے گھر سے باہر نکلنا پڑے۔ اس طرح قوم کی نصف آمدنی تو بالکل مفقود ہو گئی اب جو نصف بچی اُس میں قطع نظر اُن تمام فضول خرچیوں کے جن میں مسلمان عورتیں بطور خاص مشہور ہیں اور جو پردہ کے بالواسطہ نتائج ہیں بعض اخراجات براہ راست پردہ کی بدولت لاحق ہو رہے ہیں مثلاً ڈاکٹروں کی فیسیں اور دواؤں کی قیمتیں جو ہر مہینہ اُن امراض کے لئے ادا کرنی پڑتی ہیں جن کا گزشتہ اوراق میں ذکر ہوا اور جو خاص پردہ کی پیداوار ہیں یا مثلاً اُن سواریوں کا خرچ اور کرایہ جو ہماری عورتوں کے لئے ناگزیر ہیں۔ اگر آپ کی بیوی کو کہیں جانا ہو تو بغیر سواری کے ان کا گھر سے نکلنا ممکن نہیں خواہ فاصلہ کتنا ہی کم اور آپ کی مالی حالت کیسی ہی سقیم ہو۔ اسی طرح کے اور بہت سے خرچ ہیں جن کی وجہ سے مسلمانوں کی مالی حالت روز بروز بدتر ہوتی چلی جاتی ہے لیکن قطع نظر اس مالی نقصان کے جو مسلمانوں کو اور قوموں کے مقابلہ میں برداشت کرنا پڑ رہا ہے ایک سخت خرابی اُن کی معاشرت میں عورتوں کی معاشی غلامی کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے جو تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ ہندوستان کے مردوں کو اپنی عورتوں پر اتنے وسیع اختیارات صرف معاشی تفوق کی بنا پر حاصل ہوئے ہیں۔ آج ہماری عورتیں ہمارے مظالم جو اس خوشی کے ساتھ برداشت کر رہی ہیں ان کا سبب معاشی غلامی کے سوا کچھ نہیں۔ عورتوں کی اس بیکسی اور بیچارگی کو جنت الحمقا ——— کے رہنے والے اُن کے غیر معمولی صبر و شکر اور ایثار و محبت پر محمول کر کے خوش ہوتے ہیں اور دوسری قوموں کی عورتوں پر اپنی عورتوں کی فوقیت جتاتے ہیں یہ نہیں سمجھتے کہ یہ سب معاشیات کے کرشمے ہیں۔ ورنہ ہماری عورتیں بھی دوسری عورتوں کی طرح انسان ہیں اور اُنھیں جذبات و خواہشات کی تابع ہونگی

جو سارے عالم میں یکساں کارفرما ہیں۔ ہندوستان کے مرد اس لئے عورتوں کے ساتھ مساوات نہیں برتتے کہ کوئی آقا اپنے ملازم کے ساتھ مساوات نہیں برتتا اور ہندوستان کی عورتیں محض اس لئے در اصل کی تابع ہیں کہ ہر خدمت گار اپنے آقا کا تابع ہوتا ہے۔ آج ہندوستانی عورتیں اس معاشی غلامی سے آزاد ہو جائیں پھر دیکھئے وہ کیسے مساوات کا دعوے نہیں کرتیں اور آپ کیسے ان دعووں کو تسلیم نہیں کرتے۔ پس معلوم ہوا کہ معاشی غلامی جسے در اصل ہندوستانی عورتوں کے تمام مصائب کی جڑ کہنا چاہئے صرف پردہ کا نتیجہ ہے۔

## پردہ کے نقصانات عمرانی (Social) حیثیت سے

عام طور پر ہندوستانی گھروں میں بیوی کی عجیب حالت ہے وہ نہ تو صاحب خانہ کے برابر سمجھی جاتی ہے نہ ملازمین کے۔ مذہب، عقل اور معاشرت کا اقتضا یہ ہے کہ اس سے مساویانہ برتاؤ کیا جائے لیکن ذہنی، معاشی اور تعلیمی اعتبار سے وہ اس قدر پست ہوتی ہے کہ آپ چاہیں بھی تو اپنی بیوی کو برابری کا درجہ نہیں دے سکتے۔ کیونکہ خرچ کرنے والے کے حقوق کبھی کمانے والے کے برابر نہیں ہو سکتے اور نا سمجھ کو اختیارات سمجھ دار کے برابر نہیں دئے جا سکتے۔ اس کی وجہ سے ہماری گھریلو زندگی میں سخت کشمکش رہتی ہے اور انجام کار گو عورت ہی کو سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اس سے اُس کی ذہنیت اور آپس کے تعلقات پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ صرف یہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے اثرات میاں بیوی سے گزر کر اولاد پر پڑتے اور وہ غریب سب سے زیادہ اس کشمکش کا شکار ہوتی ہے آپ روزمرہ اپنے گھروں میں دیکھتے ہوں گے کہ ماں بچوں کو ایک بات کی تاکید کرتی ہے اور باپ اس کے بالکل برعکس اُنھیں ایک دوسری ہدایت دیتا ہے۔ باپ کی رائے کو ماں صحیح نہیں سمجھتی اور ماں کے خیالات کو باپ غلط ٹھہراتا ہے۔ ماں کے لئے اس میں بڑی سہولت ہے کہ بچہ "بیجا"، "ہوّا" اور بھوت پریت سے ڈرے۔ باپ اسے بچہ کے حق میں زہر سمجھتا ہے۔ ماں بیمار بچہ کو دم کرانے کے لئے مسجد بھیجنا چاہتی ہے باپ اسے بیکار سمجھ کر ڈاکٹر کے ہاں لیجاتا ہے۔ ماں کی آرزو ہوتی ہے کہ بچہ کا چلہ، چھٹی، عقیقہ، سالگرہ، دودھ بڑھائی، کھیر چٹائی اور بسم اللہ بڑے دھوم سے کرے، باپ اسے فضول خرچی اور بیہودگی سمجھتا ہے باپ چاہتا ہے کہ بچہ کو کسی اچھے مدرسہ کے دارالاقامہ میں شریک کرائے ماں اُسے اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی۔ ماں چاہتی ہے کہ اپنے جیتے جی ننھے سے دولہا کو سہرا باندھے دیکھ لے اور چھوٹی سی بہو

بیاہ کرلائے باپ اُسے لڑکے کے حق میں سم قاتل سمجھتا ہے۔غرض "دوملامیں مرغی حرام"۔اس کشمکش کی وجہ سے بیچارے بچہ کی جان عجب عذاب میں ہوتی ہے۔وہ باپ کے کہے پرچلتا ہے توماں خفا ہوتی ہیں اور ماں کی بات سنتا ہے توباپ ہڈیاں نرم کرتے ہیں۔اس کا اثر اُس کی ذہنیت پر اسقدر تباہ کن ہوتا ہے کہ وہ عمر بھر ان متضاد اثرات کو زائل نہیں کرسکتا۔ہماری سوسائٹی میں آج کل آپ کو بکثرت لوگ سخت متلون مزاج ملیں گے جو گھڑی میں شیطان ہوتے ہیں توگھڑی میں فرشتہ۔اُن پر نیک کا اطلاق ہوسکتا ہے نہ بد کا۔وہ غریب در اصل اسی دو عملی کے ثمرہ اور اسی کشمکش کے شکار ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ مغربی تعلیم اور مغربی قوموں کے میل جول سے ہمارے خیالات ہمارا طرز بود و باش، ہمارا لباس ہماری غذائیں ہمارے مکان غرض ہمارا پورا تمدن اس قدر بدلتا جارہا ہے کہ اس سیلاب کا رُکنا اب کسی طرح ممکن نہیں رہا۔لیکن ہماری عورتیں اُسی پرانی تہذیب پر قائم ہیں جیسکی پابند اپنی بڑی بوڑھیوں کو دیکھتی چلی آئی تھیں۔اس کا نتیجہ یہ ہورہا ہے کہ ہماری سوسائٹی کی دونوں جنسوں میں روز بروز ایک خلیج اختلاف حائل ہوتی چلی جاتی ہے۔یہ صحیح ہے کہ موجودہ تعلیم یافتہ لڑکیاں اس پرانی ڈگر سے بتدریج ہٹتی جارہی ہیں لیکن اُن کی تعداد اور رفتار اتنی کم ہے کہ ہر نئے قدم پر وہ مردوں سے قریب تر ہونے کے بجائے بعید تر ہوتی جارہی ہیں اور یہ خلیج پردہ کی بدولت روز بروز وسیع ہوتی جاتی ہے۔تعلیم یافتہ مردوں نے جب دیکھا کہ اس کی اصلاح میں طرح طرح کی دشواریاں پیش آرہی ہیں اور خود اُنہی کے ہمقوم ان کے راستے میں روڑے اٹکا رہے ہیں تو اُنھیں اس خلیج کے عبور کرنے سے بحیرۂ عرب اور بحیرۂ روم کا عبور کرنا زیادہ آسان معلوم ہوا اور وہ اپنی شبستانوں کو نازنینان ہند سے زینت دینے کے بجائے مہوشان فرنگ کے رخ روشن سے منور کرنے لگے۔اس صورت حال کا ہماری قومی اور عمرانی زندگی پر جو اثر پڑرہا ہے اُسے آپ لوگ میرے بہ نسبت غالباً کچھ زیادہ ہی ناپسند کرتے ہوں گے لیکن ہم میں سے اکثر حضرات اس کے اسباب رفع کرنے میں جتنی کوشش کرسکتے ہیں اس سے زیادہ کوشش یقین ہے کہ وہ میرے اس مضمون کا جواب لکھنے میں صرف فرمادیں گے۔

پردہ کی بدولت سب سے بڑا نقصان مسلمانوں کو عمرانی حیثیت سے یہ پہونچا کہ شادی کے لئے فریقین کے باہمی انتخاب کا موقع جاتا رہا۔اس خرابی کے نتائج اتنے دوررس اور ہہلک ہیں کہ ان پر جتنا ماتم کیا جائے بجا ہے آپ بارہ آنہ کی ایک نکٹائی خریدتے ہیں تو کسی اور کے مذاق پر اعتماد نہیں کرتے اور خود اپنی پسند سے خریدنا چاہتے ہیں حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ وہ نکٹائی دوچار مہینے سے زیادہ نہیں چلے گی اور اگر پسند نہ آئے تو اس سے قبل بھی آپ بغیر کسی دشواری کے اُسے پھینک سکتے ہیں۔اس کے برخلاف جو عورت ایک دفعہ آپ کی پابند ہوگئی

وہ آپ کے رسم و رواج کی رو سے عمر بھر کے لئے گلے کا ہار ہو گئی جسے آپ بغیر انتہائی دشواریوں اور بدنامیوں کے الگ نہیں کر سکتے۔ لیکن اس کے باوجود آپ بغیر اس عورت کے دیکھے بھالے کسی دوسرے کی پسند یا محض قسمت کے بھروسہ پر ہمیشہ کے لئے اپنا شریک زندگی بنا لیتے ہیں۔ بعض لوگ اس مصیبت سے بچنے کے لئے غیروں میں شادی نہیں کرتے اور محض اسی کی خاطر غیر خاندانوں کے بعض اچھے موقعوں کو چھوڑ کر اپنے خاندان کی معمولی لڑکیوں ہی پر اکتفا کر لیتے ہیں لیکن خدا اس پردہ کا بھلا کرے جہاں اُس لڑکی کے والدین کو کسی لڑکے کا ایسا رجحان معلوم ہوا کہ انھوں نے فوراً اپنی لڑکی کو اس سے چھپا دیا اور اگر نسبت پکی ہو گئی تو ایسا سخت پردہ ہو گیا کہ ایک غیر شخص اُسے دیکھ لیگا لیکن منگیتر نہیں دیکھ سکتا۔ اس طرح آپس کی شادی یا منگنی کا جو اصل مقصد تھا وہ بالکل فوت ہو گیا۔ اس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوتا کہ لڑکا اور لڑکی ایکدوسرے کے عادات و اطوار، مذاق و طبیعت، صورت و شکل سے محض ناواقف ہوتے ہیں بلکہ بسا اوقات ایک تیسرے شخص کو بیچ میں کود پڑنے کا موقع ملتا ہے۔ آپ نے اکثر ایسے واقعات سُنے ہوں گے کہ جب نسبت پکی ہونے کے بعد لڑکی اپنے منگیتر سے چھپنے لگی تو اس کے کسی اور رشتہ دار نے اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر اُس کا دل موہ لیا اور جب والدین نے فقط اپنی بات نباہنے کیلئے اُس پہلے شخص سے شادی کر دی تو اس شادی کا نہایت عبرتناک انجام ہوا۔

ایسی ہی صورتیں اکثر لڑکوں کے ساتھ بھی پیش آتی ہیں۔ چونکہ ان کے لئے ان کی منگیتر ایک اسم فرضی سے زیادہ نہیں ہوتی اس لئے کسی اور کی زلف گرہگیر میں دل پھنسا بیٹھتے ہیں اور وہ غریب جوان کے نام پر دھونی رمائے بیٹھی ہوتی ہے منہ تکتی رہجاتی ہے۔ اس صدمہ سے وہ بعض دفعہ خودکشی کر لیتی ہے اور بعض دفعہ ہندوؤں کی کنواری بیواؤں کی طرح ساری عمر عالم دوشیزگی میں بسر کر دیتی ہے۔ خوش قسمتی سے جہاں ایسی صورتیں پیش نہیں آتیں اور ہنسی خوشی شادی ہو جاتی ہے وہاں بھی اختلاف مزاج اور اختلاف حالات کے باعث اکثر بدمزگیاں رہتی ہیں اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ تعجب تو اس پر ہوتا ہے کہ بغیر دیکھے کی شادیاں بعض دفعہ کامیاب کیسے ثابت ہو جاتی ہیں؟

براہ کرم اس کے جواب میں آپ نہایت فخر کے ساتھ یہ نہ فرمایئے کہ "ہمارے ہاں تو اتنی شادیاں کامیاب ہو جاتی ہیں اور جو کامیاب نہیں ہوتیں وہاں بھی شاذ ہی طلاق کی نوبت آتی ہے مغربی ممالک میں تو دیکھ بھال کے شادی کرنے پر روزانہ اتنے طلاق کے مقدمات رجوع ہوتے ہیں کہ ان کے لئے خاص طلاق کی عدالتیں قائم کی گئی ہیں۔ پھر جب ایسا ہے تو بغیر دیکھے ہی شادی کیوں نہ کی جائے اور خواہ مخواہ پردہ کیوں اُٹھایا جائے۔"

میرے باخبر دوست! آپ نے مشرق و مغرب کے طلاقوں کی تعداد تو نہایت احتیاط سے نوٹ کر لی ہے لیکن ان کے اسباب پر احتیاط سے غور نہیں فرمایا۔ مغرب میں طلاقوں کی تعداد اس لئے زیادہ نہیں ہے کہ وہ آپ کی طرح بغیر دیکھے بھالے شادی نہیں کرتے اور نہ آپ کے ہاں طلاقوں کی تعداد اس لئے کم ہے کہ آپ یورپ کے اندھوں کی طرح شادی کیا کرتے ہیں۔

مغربی قوموں میں دیکھ بھال کر شادی کرنے کے باوجود طلاقوں کی کثرت کے اسباب یہ ہیں کہ:-

(۱) وہ اپنی ازدواجی زندگی میں ذراسی بھی بدمزگی کو پسند نہیں کرتے۔ اگر شادی کے بعد میاں بیوی کے وہ توقعات جو انھوں نے ایکدوسرے سے پہلے وابستہ کئے تھے پورے نہ ہوئے تو وہ فوراً تعلق منقطع کر لیتے ہیں اور اپنی زندگی کو آپ کی طرح خود اختیاری آلام و مصائب کا ایک لاتناہی سلسلہ نہیں بناتے۔

(۲) چونکہ وہاں ہر فریق معاشی حیثیت سے آزاد ہوتا ہے اس لئے اسے اس علحدگی سے مالی مشکلات کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔

(۳) چونکہ وہاں طلاق معیوب نہیں سمجھا جاتا اس لئے کسی کو سوسائٹی کی نفرت و حقارت کا خطرہ نہیں ہوتا۔

(۴) چونکہ وہاں کی عورتیں جاہل، بے وقوف اور آلۂ ہیجان نہیں ہوتیں اس لئے ذراسی حق تلفی یا بے توجہی کو بھی برداشت نہیں کرسکتیں --- اس کے برخلاف آپ کے ملک میں بغیر دیکھے بھالے شادی کرنے کے طلاقوں کی کثرت اس لئے نہیں ہے کہ:-

(۱) یہاں عورتیں معاشی حیثیت سے مردوں کی تابع ہیں۔ وہ اچھی طرح سمجھتی ہیں کہ اگر مرد انھیں طلاق دیدیں گے تو وہ فاقوں مرجائیں گی اور سڑکوں پر ننگی پھریں گی۔

(۲) ان کی یہ حالت دیکھ کر راہ رو ہمدردی یا مدد کرنے کے بجائے یا تو ان کا مضحکہ اڑائیں گے یا انھیں کڑے تیوروں سے دیکھیں گے کیونکہ وہ ایسی عورتوں کو اخلاقی مجرم سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے ہم چشموں میں ایسی ذلیل و خوار ہوجائیں گی کہ لوگ ان کے سایہ سے بھاگیں گے۔

(۳) چونکہ ہماری عورتیں ذہنی اور تعلیمی اعتبار سے نہایت پست ہیں اس لئے انھیں ہماری بہت سی بدتمیزیاں اور بیہودگیاں محسوس تک نہیں ہوتیں اور وہ اپنی اسی جنت الحمقاء ( Fools' paradise ) میں خوش رہتی ہیں پس اگر آپ ان کو اسی جنت میں رکھنا اور خود بھی اسی جنت میں رہنا چاہتے ہیں تو تمام کالج اور مدرسے خواہ وہ زنانہ ہوں یا مردانہ بند کرا دیجئے۔ پردہ کی سختیاں اور بڑھا دیجئے۔ موجودہ نظام

آمد و رفت اور رسل و رسائل کا قطعًا بائیکاٹ کر دیجئے مختصر یہ کہ اس بیسویں صدی سے نکل کر تیرھویں صدی میں رجعت قہقری کیجئے ورنہ یاد رکھئے کہ جس دن مندرجہ بالا وجوہ باقی نہیں رہے اسی دن سے ان کورانہ شادیوں کی بدولت یہاں طلاقوں کی وہ کثرت ہوگی کہ مجبوراً حکومت ہند کو سارے ملک کے مکانات کرایہ پر لے کر انھیں طلاق کی عدالتوں میں مبدل کر دینا پڑے گا۔ آپ فرمائیں گے کہ طلاق کے یہ سب وجوہ صرف عورتوں سے متعلق ہیں۔ اگر فی الواقع ہمارے ملک کی اکثر شادیاں کامیاب نہیں ہوتیں تو مردوں کو عورتوں کی درخواست کے بغیر طلاق دینے میں کیا امر مانع ہے؟ وہ خود ایسی عورتوں سے پیچھا کیوں نہیں چھڑا لیتے جن سے ان کی طبیعت نہیں ملتی"؟ آپ کا یہ اعتراض صحیح ہے۔ فی الحقیقت ہمارے ملک میں مردوں کو طلاق دینا اتنا مشکل نہیں جتنا عورتوں کو لینا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مردوں کے از خود طلاق نہ دینے کے چند وجوہ ہیں۔

(۱) پہلے تو یہ کہ ہندوستانی گھروں میں آپس کی ناموافقت کا سارا خمیازہ عورتوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ مرد کا اُس میں کچھ نقصان نہیں ہوتا۔ وہ عورت کی خلاف مرضی جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ لیکن اگر عورت اُس کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرے تو وہ چشم و ابرو، زبان، ہاتھ بلکہ ڈنڈے اور جوتے سے بھی کام لے سکتا ہے۔ اس لئے مرد ایسی بیکس عورت کو خواہ مخواہ اپنے قبضہ سے نکالنا پسند نہیں کرتا اور یہی سمجھ کر رہنے دیتا ہے کہ چلو ایک ماما کی تنخواہ ہی بچی۔

(۲) جن مردوں کا درجۂ حرارت اس سے زیادہ ہوتا ہے اُنھیں ایک ایسی عمدہ ترکیب آگئی ہے کہ جس سے سانپ بھی مر جاتا ہے اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹتی۔ یعنی وہ عورتوں کو عالم برزخ میں چھوڑ دیتے ہیں جو عرف عام میں صرف "چھوڑ دینا" کہلاتا ہے۔ اس چھوڑ دینے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ مرد نے اُس عورت کو نہ تو طلاق دی ہے نہ اس سے کوئی واسطہ رکھا ہے۔ ایسی عورت کا اگر کوئی پرسان حال ہوا تو وہ اس کے سر جا پڑتی ہے ورنہ جو طریقے اس سے بن پڑتے ہیں ان کی مدد سے کچھ کما کھا لیتی ہے۔ عورت اس کو غنیمت سمجھتی ہے کہ طلاق کی رسوائی سے بچی مرد اسکو غنیمت سمجھتا ہے کہ مہر کے بار سے ہلکے ہوئے۔ اس طرح ایک انبوہ کثیر اسی عالم برزخ میں زندگی بسر کر رہا ہے اور ایسی صورتیں ہمارے طلاق کی فہرست میں شامل نہیں کی جاتیں۔

(۳) تیسرا سبب مردوں کے طلاق نہ دینے کا یہ ہے کہ ایک عورت کو طلاق دینے کے بعد لوگ ایسے شخص کو اپنی بیٹی دیتے گھبراتے ہیں کہ مبادا اس کا بھی وہی حشر ہو۔ اس طرح طلاق کا جو عملی فائدہ ہونا چاہیئے وہ آسانی سے نہیں حاصل ہوتا۔ اب رہے ناجائز تعلقات سو ان کے لئے بیوی کی موجودگی کسی طرح مانع نہیں

ہوسکتی پھر کیا ضرور ہے کہ طلاق دیگر ملکوں میں اتنی خفیف ہوں اور مہر کی فکر الگ کرنی پڑے۔ غرض یہ سب وجوہ ملک ہندوستان کے طلاق کی تعداد بڑھنے نہیں دیتے۔ اس سے آپ اس مغالطہ میں مبتلا ہیں کہ ہماری ازدواجی زندگی جیسی خوشگوار ہے ویسی دنیا کی کسی اور قوم کو نصیب نہیں حالانکہ جس ملک میں دولہا دلہن کے باہمی انتخاب سے شادی ہونے کے بجائے اور لوگوں کے انتخاب سے شادی ہوتی ہو وہاں حقیقی مسرت کبھی حاصل نہیں ہوسکتی۔

## یورپ کی خلاف نسواں تحریک

آخر میں ایک سرسری نظر اُن اسباب پر ڈالتا ہوں جنکی مدد سے مردوں نے عورتوں کو اپنا مغلوب کیا تھا اور اب تک اُن پر حکومت کرتے چلے آئے ہیں۔ اس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ مرد جسمانی اعتبار سے عورت کے بہ نسبت قوی ہوتا ہے اور یہ تفوق نہ صرف انسانوں میں پایا جاتا ہے بلکہ تمام ذی روح مخلوق میں لیکن اس سے انسان کے سوا کوئی مخلوق ناجائز فائدہ نہیں اُٹھاتی مثلاً آپ نے کبھی کسی درندے یا چرند یا پرند کو اپنی مادہ سے لڑتے یا اُسے مارتے یا اس کا حصہ کھاتے نہ دیکھا ہوگا بلکہ وہ ہمیشہ اپنی ذات سے زیادہ اپنی مادہ کا خیال رکھتا ہے اور اپنے اس جسمانی تفوق سے اُسے نقصان پہونچانے کے بجائے اس کی مدد کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کی سیکڑوں مثالیں آپ روزمرہ مختلف جانوروں میں دیکھتے ہوں گے۔ حیوانات کی دو جنسوں میں جسمانی قوت کے اختلاف کے باوجود آپ کامل مساوات پاتے ہیں اور کبھی ایک کو دوسرے کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے نہیں دیکھتے۔ لیکن حضرت انسان نے جو اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھتے ہیں تمام مخلوق کے برخلاف اس جسمانی قوت کے اختلاف کی یہ تعبیر کی کہ گویا خود قدرت عورت کو مرد کا تابع رکھنا چاہتی ہے چنانچہ مردوں نے اپنی جسمانی قوت سے کام لیکر سب سے پہلے عورتوں کے معاشی حقوق غصب کئے اور اُنکے تمام ذرائع آمدنی پر قبضہ کرکے اُنھیں اپنا مطیع بنالیا۔ یہ صورت حال اُسوقت تک دنیا میں باقی رہی جب تک جسمانی قوت کا دور دورہ رہا۔ جوں جوں مشینوں کی ایجاد ہونے لگی دنیا کا رنگ بدلنا شروع ہوا اور عورت نے اپنی کھوئی ہوئی قوت از سر نو حاصل کرنی شروع کی یہاں تک کہ بعض میدانوں میں مردوں سے بھی سبقت لے گئی۔ مرد ہرچند اُس کی ان کوششوں میں مزاحم ہوتا رہا لیکن آزادی نسواں کا یہ سیلاب ایک دفعہ اپنی معاشی جکڑبند توڑنے کے بعد برابر بڑھتا گیا یہاں تک کہ بیسویں صدی میں جنگ عظیم کی بدولت یورپ کے مردوں کا رہا سہا تفوق اور عورتوں کی رہی سہی قیدیں بھی ٹوٹ گئیں اور انھوں نے کامل مساوات کا

دعویٰ کر دیا۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ کوئی شخص اپنی چڑھی ہوئی کمان کو اترا دیکھنا پسند نہیں کرتا اور ہر معزول حاکم چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنی حکومت پھر حاصل کرے۔ اس کے لئے وہ اپنی ساری قوت صرف کر دیتا ہے اور ہر جائز و ناجائز طریقہ اختیار کرتا ہے۔

آج دنیا کا سرمایہ دار مزدوروں کے روز افزوں مطالبات سے کسقدر عاجز و پریشان ہوگیا ہے اور انھیں ان کے جائز حقوق سے محروم رکھنے کے لئے کیا کچھ نہیں کر رہا ہے لیکن صرف سرمایہ دار کی یہ حیرانی و مجبوری دیکھکر کیا آپ مزدور کے ان مطالبات کو ناجائز قرار دیدیں گے؟ یہی حال تحریک مخالف نسواں کا ہے۔ مرد اپنا کھویا ہوا اقتدار پھر حاصل کرنا چاہتے ہیں عورتیں اپنا حاصل کیا ہوا اقتدار پھر کھونا نہیں چاہتیں۔ اسی کشمکش کا نام تحریکِ مخالف نسواں ہے پہلے تو یہ تحریک یورپ میں نہایت کمزور و محدود ہے لیکن بالفرض بڑھکر قوی اور وسیع بھی ہوجائے تو اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ یہ تحریک فی الواقع بجا اور اس کے حامی درحقیقت حق بجانب ہیں۔ دنیا میں چور اور ڈاکو اپنے بڑے بڑے جتھے بناکر کمزوروں کا مال و متاع لوٹ لیتے ہیں اور ان کی آزادی اور زندگی خطرہ میں ڈالدیتے ہیں لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قتل و غارت نہایت مستحسن افعال اور ان کے مرتکب نہایت مقدس لوگ ہیں۔ میں نے لوگوں کو اکثر یہ کہتے سنا ہے کہ "آج یورپ اسی آزادیِ نسواں کی بدولت سر پر ہاتھ رکھکر رو رہا ہے" مگر میں نہیں سمجھ سکا کہ اس سے وہ آخر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ یورپ کسی ایک شخص کا نام تو نہیں کہ جو کسی مجسمہ کی طرح کسی میدان میں کھڑا ایک ہاتھ سے سر کو پکڑے اور دوسرے سے اپنے آنسو پوچھتا جاتا ہو۔ یورپ ایک براعظم ہے جہاں دنیا کے اور مقامات کی طرح مرد بھی بستے ہیں اور عورتیں بھی۔ یہ ظاہر ہے کہ خود عورتیں اپنی اس آزادی پر جس کے لئے یہ ساری کشمکش ہے سر کو ہاتھ لگا کر نہیں رو رہی ہوں گی۔ اب رہ گئے مرد ان میں اگر بعض آزادیِ نسواں کے خلاف ہیں تو بہت سے اس کے حامی بھی ہیں جو حامی ہیں وہ تو سر کو ہاتھ لگا کر نہیں رو رہے ہوں گے اب رہ گئے وہ جو اس کے خلاف ہیں وہ عورتوں کی آزادی سلب کرنا چاہتے ہیں مگر نہیں کرسکتے تو ایسے لوگوں کا سر کو ہاتھ لگا کر رونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ آج قیصر جرمنی۔ سلطان روم۔ شاہ افغان۔ مہاراجہ اندور سب اپنے سروں کو ہاتھ لگا کر رو رہے ہیں لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کے ممالک یا نوع انسان کو بھی ان کے ساتھ رونا چاہئے۔ ہر حاکم جو اپنے محکوموں کو ناخوش رکھتا ہے اس کا یہی انجام ہوتا ہے اور یہی انجام آپ کا ہوگا اگر آپ اپنی عورتوں کو اسی طرح دبانے کی کوشش کریں گے۔ جو اسباب یورپ میں تحریکِ مخالف نسواں کے ہیں وہی ہندوستان میں تحریک

پردہ کے ہیں۔ جس طرح یورپ کے بعض نااہل اور خود غرض مرد عورتوں کو اپنے دوش بدوش کام کرتا نہیں دیکھ سکتے اسی طرح ہندوستان کے جاہل اور ناعاقبت اندیش مرد پردہ اُٹھا کر اپنے ناجائز اختیارات سلب کرانا نہیں چاہتے۔ لیکن نہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے نہ یہ، اس لئے کہ خود قانون قدرت جبر و تعدی کا دشمن ہے — یہ جبر و تعدی خواہ کسی صورت میں اور کسی جنس پر ہو لیکن قدرت ظالموں سے انتقام لئے بغیر نہیں رہتی۔ اگر آپ نے انقلاب فرانس اور انقلاب روس کے عبرتناک واقعات سنے ہیں تو اس کے بعد غالباً آپ کو کسی تاریخی شہادت کی ضرورت نہ ہوگی۔

محمد اعظم

---

# شہوانیات یا ترغیبات جنسی

## حضرت نیاز کے قلم سے

جس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات اور ان کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر بحث روشنی ڈالی گئی ہے اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اور آیندہ اخلاق انسانی کی بنیاد کن اصول پر قایم ہوتا ہے۔ الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایکبار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز واقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی سُنے نہ ہوں گے، اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول ۸ کے مجلد کتاب صرف ۳ میں اور غیر مجلد ۲ میں ملے گی اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد ۴ میں اور غیر مجلد ۳ میں علاوہ محصول ۸ کے ملے گی۔

اگر

ارشاد ہو تو کتاب بذریعہ وی پی روانہ کی جائے حجم ۲۷۵ صفحات آرڈر میں مجلد و غیر مجلد کی صراحت ضروری ہے۔

نیجر نگار لکھنؤ

# مکتوبات نیاز

میرزا صاحب — کہئے آجکل آپ کی "ستارہ پیشانی" کہاں ہیں — کیوں؟ کیا "زہرہ جبین" کا یہ ترجمہ بُرا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "عشق" نام ہے صرف حماقت کا، خواہ قبل مسیح ہو یا بعد مسیح۔ فرق اتنا ہے کہ اگلے وقتوں کا عاشق اکثر و بیشتر مفلس و نادار ہوتا تھا اس لئے سوائے اس کے کہ محمل کے پیچھے پیچھے دوڑتا پھرے یا پہاڑ کے پتھر پھوڑ کر مرے اور کیا کر سکتا تھا، یہ زمانہ ذرا زرداری کا ہے، اس لئے اب معشوق کی جستجو میں پاؤں کے آبلے نہیں پھوٹتے، پٹرول بہایا جاتا ہے اور بجائے جوئے شیر لانے کے وہسکی اور شامپین کی طلب ہوتی ہے — رہا سوال کامیابی کا، سو پہلے محبوب ملتا تھا خدا جانے کتنا سر کھپانے کے بعد، اور اب یہ مصیبت ہے کہ وہ سب کو آسانی کے ساتھ مل جاتا ہے، الغرض محبت کی دشواریاں بدستور قائم ہیں — اس لئے میری ہمدردیاں تو آپ کے ساتھ وہی ہیں جو کسی وقت قیس و فرہاد کے چارہ سازوں کو اُن کے ساتھ رہی ہونگی، البتہ سوال یہ ہے کہ جب باوجود "انہمہ دعوائے مرزائیت و طنطنۂ سوفسطائیت" آپ کسی کے سامنے "منہ پھاڑ سر جھاڑ" بھیں بھیں رو رہے ہوں گے، تو اس وقت مجھ غریب "چارہ گر" کی کیا حالت ہو گی۔ آپ ہی کہئے، سوائے دُم دبا کر فرار ہو جانے کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ پھر آپ کے صبر و استقلال کی حالت بہت سقیم ہے اور شاید دو ہی چار دن میں اسکا جنازہ نکلنے والا ہے۔ اگر یہ خبر صحیح ہے (اور یقیناً صحیح ہوگی) تو کم از کم میرا "استعفاء رفاقت" تو آپ قبول ہی کر لیجئے، مجھے "غم روزگار" سے اتنی فرصت کہاں کہ آپ کے "غم عشق" کی سربراہی کرتا پھروں۔ آپ کو اُن کی محبت و وفاداری پر یقین ہے، مناسب — لیکن مجھے باور نہ کرائیے، کیونکہ اس کے بعد بھی میں عاشق ہونے سے رہا اور آپ معشوق بننے سے۔

حیرت ہے کہ ایسے گوشت ہوش والے انسان بھی اس کوچہ میں آکر اتنے احمق ہو جاتے ہیں۔

سنئیے، ایک بات ضروری عرض کرنا ہے۔کل دلدار خانصاحب کا خط آیا۔ وہ کہتے ہیں اگر اسوقت غفلت سے کام لیا گیا تو پھر ایسا موقعہ ہاتھ نہ آئے گا۔ چونکہ موقعہ محل کی باتیں آپ زیادہ سمجھتے ہیں اس لئے میں نے جواب دینے سے قبل یہ مناسب سمجھا کہ آپ کی رائے اس معاملہ میں لیلوں۔

یہ بالکل درست ہے کہ میں اس کام کی تکمیل کے لئے بیتاب ہوں اور یہ بھی غلط نہیں کہ خانصاحب میرے ہوا خواہ ہیں اور ایک حد تک صائب الرائے بھی، لیکن مجھے صرف یہ اندیشہ ہے کہ اگر اس کے بعد بھی کاربرآری نہ ہوئی تو پھر سوائے سر پھوڑ کر مرجانے کے اور کوئی صورت باقی نہ رہیگی۔

باربار آپ کا احسان اُٹھانے میں تو چنداں حرج نہیں، لیکن یہ مسلسل مایوسیاں کس سے برداشت ہونگی۔ بہرحال، آپ کے جواب کا منتظر ہوں، اور جواب بھی وہ جس میں میری "خاطرداری" کا لحاظ مطلق نہ کیا جائے بلکہ صرف مصلحت وعاقبت بینی کا۔

---

ارے یار، چپ بھی رہو۔ اب کیوں کہتے ہو۔ اُف، اُف،

عرفی مگو بہ تیرہ شب ہجر حرف مے
حرفے ست ایں کہ در شب مہتاب گفتنی ست

یہ تم نے کیا کہا، یہ میں نے کیا سنا۔ معاذ اللہ!

باور کرو جس وقت وہ صحبت یاد آجاتی ہے تو دل تڑپ کر رہجاتا ہے۔ تمھارے کہنے کی ضرورت تھی، میں تو وہاں اُڑ کر پہونچتا، لیکن باور کرو، بہت درماندہ ہوں "اتنا درماندہ کہ اب کیا کہوں"۔

قصۂ غم سنا کر تمھاری مسرتوں کو خراب کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ تمھاری کامرانیوں کی خبر سنکر اسوقت میں اپنی ناتمراریاں بھی بھلائے بیٹھا ہوں۔

کتنے دن قیام کا ارادہ ہے — کل چائے کے وقت میں نے شکردان کھولکر دیکھا تو شکر کے اندر ایک چیونٹا ملا خشک مرا ہوا۔ میں نے سوچا کہ دیکھئے، جان بھی وہیں دی اور دفن بھی وہیں ہوا۔ — سو بھائی تمھاری خواہش تو قریب قریب یہی ہوگی لیکن میں جانتا ہوں کہ اتنی فرصت زمانہ کب دیتا ہے، بہرحال وہاں سے آنا پڑے گا اور اسی لئے پوچھا کہ کب تک اس کی توقع۔ (غالباً اندیشہ، زیادہ صحیح لفظ ہوگا) کی جائے۔

میرا سلام عرض کردو اور کہو کہ کیوں صاحب اِدھر سے گزر جانا اور بات تک نہ پوچھنا۔ بہتر ہے میں نے بھی

اگر اس غصہ میں شیشہ کا شیشہ خالی نہ کر دیا تو میرا نام مفتی صدرالدین آزردہ نہیں۔

میں اور شغلِ بادہ کشی ، دے گئیں مجھے
یکم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں (آزردہ)

---

ہنسو، ہنسو، ہاں ، خوب ہنس لو ۔۔ کاہے کو کبھی ایسا موقعہ ہاتھ آئے گا ۔ میں بیوقوف تھا کہ وہاں جاکر یہ رسوائی اٹھائی ، اور تم ۔ ہاں بھئی ، تمھاری فراست ، و دانشمندی کا کیا کہنا ، کہ یہاں کہتے کہتے زبان گھس گئی لیکن تم ٹس سے مس نہ ہوئے ۔ تم لاکھ عذر کرو ، لیکن بخدا یہ سارا مظلمہ تمھاری گردن پر ہے ۔ نہ تم خاموش رہتے ، نہ مجھ سے یہ حرکت ہوتی کہ :۔

اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

شامت جب آتی ہے تو اکثر احباب ہی کے وساطت سے آتی ہے ۔ پھر اب فرمائیے کیا ارادہ ہے ۔ تم سے تو خیر انتقام لینا چنداں دشوار نہیں ۔ گیا اور تمھاری تسبیح توڑ کر رکھدی ، دلایل الخیرات چھپا کر گم کر دی ، جانماز گھسیٹ لی اور یہ کچھ نہ سہی تو تیمم کا تودہ ہی اٹھا کر پھینک دیا ۔ تمھارے رُلانے کے لئے تو اتنا ہی کافی ہے ، لیکن یہ بتاؤ کہ اُس "شقی" سے کیونکر عہدہ برآ ہوں ، نہ خدا کا قایل نہ رسول کا ، نہ کسی پیر کا معتقد نہ ولی کا ۔ نہ دل میں مروت نہ آنکھوں میں لحاظ ۔ ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی ۔ یہ بتاؤ تو جانوں ۔

میں نے ایک تدبیر سوچی ہے ۔ تمھاری کیا رائے ہے ۔ یہ بالکل یقینی ہے کہ وہ چند دن میں یہاں آئیں گے ، اس لئے کیوں نہ وہ دروازہ ان کے لئے مسدود کر دیا جائے جہاں کی آستاں بوسی اُن کا دین و ایمان ہے ۔

پوچھو اس کا کیا ذریعہ ہے ؟

تم نے اُن میر صاحب کو دیکھا ہوگا جو تنبورہ لئے ہوئے "قاچار" کے مکان کی طرف اکثر جاتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔۔ وہ ہیں اُن کے اُستاد ۔ اور مجھ سے وہ عقیدت رکھتے ہیں اس لئے کہ مجھ سے زیادہ ان کا کوئی علاج نہیں ۔ نہ یہ میرا کہا ٹال سکتے ہیں نہ وہ ان کا ۔۔ اس لئے سوچتا ہوں کہ اس ذریعہ سے ایک جنگ کرادوں ۔ باور کرو میں اسکا دوست ہوں ، لیکن یہ تباہی منظور ہے اور وہ خانماں بربادی منظور نہیں ۔۔۔ وہ تو ہو گئے ہیں پاگل ، اس لئے اگر ان کے طرزِ عمل سے خفا ہو کر بیٹھ جاؤں تو پھر کون اس کشتی کو بھنور سے نکالنے والا ہے ؟

کیا تم ؟ ۔ کیوں نہ ہو ، ماشاء اللہ !

---

یاد فرمائی کا شکریہ ۔ آپ نے ..... صاحب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، خدا کرے صحیح ہو، لیکن میری رائے اُن کے نسبت یہی ہے کہ

کم چنیں دیوانۂ ہشیار پیدا می شود

آپ اپنی فطرت کے لحاظ سے فرشتہ ہیں، اس لئے ساری دنیا کو بے گناہ جانتے ہیں، میں ایسا نہیں ہوں اس لئے سمجھتا ہوں کہ معصوم صورتوں میں کیسی کیسی قبیح سیرتیں چھپی رہتی ہیں۔ بہرحال آپ اپنے معاملات کو مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں، آپ کی مرضی ہے جو جی میں آئے کیجئے۔ لیکن مجھ سے رائے نہ طلب کیجئے۔ میں تعمیل ارشاد پنڈت جی سے ملا، اُن کے انداز گفتگو سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ اس باب میں براہ راست آپ ہی سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں اور میری وساطت پسند نہیں۔ اور یہ بھی ٹھیک۔ آپ لینے والے وہ دینے والے، میں کہاں؟ نہ تین میں نہ تیرہ میں۔

---

تمہارا خط ابھی ابھی ملا۔ یعنی ۱۰ر ستمبر ٹھیک دس بجے دن کو۔ اور اسی وقت جواب لکھنے بیٹھ گیا۔ باتیں مزہ کی تھیں، جی لگ گیا۔ خیر، بُزرگی وُزرگی تو میں جانتا نہیں، لیکن اتنا ضرور سمجھتا ہوں کہ میرزا مظہر اپنے ذوق کے لحاظ سے واقعی "جانِ جاناں" تھے۔

اگر تم نے ان کے کلام کا غایر مطالعہ کیا ہے تو اس کے ماننے میں تامل نہ ہونا چاہئے کہ وہ نہایت رنگین و لطیف طبیعت رکھتے تھے اور ذوقِ شعر کے لحاظ سے تو فارسی اُردو دونوں میں ان کا جواب نہ تھا۔

رہ گیا سوال تاباںؔ کا، سو تذکرہ نویس کچھ کہیں لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اُن سے شدید محبت کرتے تھے۔ تاباںؔ کے غیر معمولی جمیل ہونے پر سب کو اتفاق ہے، رہ گئے میرزا صاحب، سو ان کا یہ ذوق خود اُن کے کلام سے ظاہر ہے۔ ہرچند امرد پرستی کا اظہار فارسی شاعری میں ایسی معمولی بات ہے کہ اس کو سامنے رکھ کر کسی شاعر کے امرد پرست ہونے پر حکم نہیں لگایا جا سکتا، لیکن میرزا صاحب کے یہاں یہ رنگ کچھ عجیب و غریب کیفیت لئے ہوئے ہے۔

اس قسم کے اشعار کم و بیش تمام شاعروں میں پائے جاتے ہیں، لیکن میرزا صاحب جس تکرار و لذت کے ساتھ اس جذبہ کا اظہار کرتے ہیں وہ دوسروں کے یہاں بہت کم پایا جاتا ہے۔ چند شعر سُناتا ہوں۔

وگرنہ گوید تواں کرد یادِ حق مظہر الٰہ باطل من عشق نوجوانے ہست

تم کہوگے کہ "نوجوان" مرد بھی ہو سکتا ہے اور عورت بھی، بہتر ہے ایک شعر اور سنو:۔

کنوں در جائے سر پیچ مرصع سنگہا دارد ۔ بطفلاں مظہر با بسکہ اُلفت بیشتر دارد

ممکن ہے تم یہ کہو کہ طفل چھوٹے بچے کو کہتے ہیں اور اس سے امرد پرستی کو کوئی تعلق نہیں، لیکن خود میرزا صاحب نے طفل کے کیا معنے لئے ہیں، یہ بھی سُن لو:۔

عشقبازان مرید طفلان اند ۔ پیر ایں قوم نوجوان باشد

طفل سے مراد اُن کی نوجوان ہے یا نہیں؟ اب کیوں نہیں بولتے۔ اچھا اور لو:۔

عاقبت از بہرِ تحصیلِ کمالِ جذبِ عشق ۔ شد مُرید نوجوانے گرچہ مظہر پیر بود

میبرس باعثِ ضعفِ قوائے مظہرِ ما ۔ کہ گشتہ پیر ز بیداد نوجوانے چند

مظہر تو دشمنِ خودی اے خاناں خراب ۔ دل می دہی بدست سپاہی پسر کسے؟

خویش را مظہر بدست دلبرے بفروختم ۔ بہ ہویت پیری جُستم جوانے یافتم

بعض اشعار میں تو انھوں نے اشارہ تک کر دیا ہے مثلاً:۔

من از رنگیں ادا ئیہائے اشعارش گماں دارم ۔ کہ مظہر میل با رعناں جوانے میرزا دارد

اور ایک جگہ تو اس سے بھی زیادہ کُھل گئے ہیں:۔

کفر دیں امروز مظہر نازہا دارد بہ من ۔ سرو رعنا ساخت عشقِ میرزا را جا مرا

اس کی تحقیق شاید تم نے کی ہوگی کہ وہ حیدر آباد گئے یا نہیں لیکن دکن کے سانولے سلونے لڑکوں سے انھوں نے جس دلچسپی کا اظہار کیا ہے، اس شعر سے عیاں ہے:۔

گشتہ ام محو سوادِ خط سبزانِ دکن ۔ دلنشیں اُفتاد نقشِ حیدر آبادی مرا

یہ تو وہ اشعار ہیں جن میں کسی تاویل کی ضرورت ہی نہیں، ورنہ یوں تو جھلک نہ معلوم کتنے اشعار سے نمایاں ہے۔ ایک شعر سلو کس قیامت کا لکھ گئے ہیں:۔

سر از یں تیغ بُردن آساں نیست ۔ آہ، مظہر خم سلام کسے

میں تو مظہر کے ذوقِ شاعری کا پرستار ہوں اور اس سے بحث نہیں کہ وہ امرد پرست تھے یا کیا۔ کیونکہ اگر ایسا ہو بھی تو کیا گناہ ہے۔ شاید تم اس راز سے آگاہ نہیں کہ "حسنِ مجرد" کے پرستاروں کا میلان اس طرف زیادہ ہوتا ہے، گو خود میرا مشرب یہ نہیں ہے اور ہو سکتا ہے کیونکہ محبت کے باب میں روحانیت و حقانیت میری

سمجھ میں آتی نہیں اور کسی صوفی کی خدمت میں بیٹھ کر یہ فن سیکھنے کی کوشش کبھی کی نہیں - میں محبت کرتا ہوں اور گناہ سمجھ کر کرتا ہوں تاکہ اس کی لذت باقی رہے - عورت کے ساتھ جائز ناجائز کا شرعی تعلق میرے بس کی بات نہیں

---

پیر و مرشد،

آپ اس محبت سے فرمائیں اور میں تعمیل نہ کروں - یہ آپ نے کیا کہا، میری فطرت سے آپ اچھی طرح واقف ہیں کہ:-

ہر آنکہ بندہ بخواند مرا خدائے من ست

چہ جائیکہ آپ، جن کے الطاف میرے لئے سرمایۂ حیات ہیں - آپ مطمئن رہئے، امکان سے بھی زیادہ اگر کوئی صورت کوشش کی ہو سکتی ہے تو وہ بھی صرف کر دی جائے گی اور توقع ہے کہ ناکام نہ رہوں گا -

کل صبح اول وقت نماز پڑھکر (نماز، اس لئے کہ آپ کو میرے خشوع و خضوع کا یقین ہو جائے) راجہ صاحب سے ملوں گا اور کہوں گا کہ سرکار یہ معاملہ میری موت و زیست کا ہے، اس لئے اگر مجھے ہلاک کر کے دنیا کی رونق آپ واقعی تباہ و برباد کرنا چاہتے ہیں، تو خیر، بات دوسری ہے، ورنہ جس طرح ممکن ہو بشیر کو صدر دفتر میں تبدیل کر دیجئے وہ پوچھیں گے اس سے تمھاری موت و حیات کا کیا تعلق؟ میں عرض کروں گا کہ پیر و مرشد کی تمنا یہی ہے اور ان کی کسی آرزو کا پورا نہ ہونا میرے لئے موت سے بدتر ہے" - امید تو ہے کہ مان جائیں، لیکن اگر یہ تدبیر نہ چلی تو پھر ایک صورت اور میرے ذہن میں آئی ہے - آپ سے اس لئے نہیں کہنا چاہتا کہ کہیں شرعی جواز و عدم جواز کی بحث نہ چھڑ جائے اور آپ مجھے اس سے باز رکھیں -

---

عزیز، کیا پوچھتے ہو کیا عالم ہے - موسم کو دیکھتا ہوں اور یہ شعر پڑھتا ہوں

بہار ہند بود برشگال ہاں، غالب

دریں خزانکدہ ہم موسم شرابے ہست

اُف یہ کالی کالی گھٹائیں، یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں، اور اِدھر

سفالینہ جام من از مے تہی

کل، یوسف کا خط آیا ہے، لکھتے ہیں آ رہا ہوں - میں تمھیں خط بھیجتا ہوں، خدا کرے تم بھی جواب میں لکھو کہ

آرہا ہوں۔ ہائے، ہائے۔ ابھی نہ یوسف پاس نہ عزیز قریب، لیکن تصور ہی سے بے قابو ہوا جاتا ہوں —
کیا تمھیں میری اس بے بسی و بیکسی پر بھی رحم نہ آئے گا۔

تم کہو گے کہ یہاں آکر کیا کروں۔ میں جانتا ہوں کہ ایک جگہ نہ بیٹھ سکنے کا عذاب جو خدا نے تم پر مسلط کیا ہے وہ یہاں بھی ساتھ آئے گا، سو، سُن لو کہ تمھارے آنے کے بعد میں خود یہاں نہیں ٹھیروں گا۔ اور دو چار دن کیلئے یا جب تک تم کہو گے بالکل خارج البلد رہوں گا۔

سر پھوڑنے کے لئے نہ یہاں پہاڑوں کی کمی ہے اور نہ دشت نوردی کے لئے جنگلوں کا نقدان — چلو تمھارا انتظام تو ہو گیا رہا میں اور یوسف، سو ہم دونوں گاؤں کے کسی جھونپڑے میں رات کو جس وقت بادل گرج رہے ہونگے مینہہ برس رہا ہوگا کہیں دور سے آنے والی بانسری کی آواز کو سنتے رہیں گے اور تڑپتے رہیں گے۔ مگر ظالم تو کب میرا کہا مانتا ہے۔

کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مری کہانی
مجھے اس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی

---

کل ہی اجین سے واپس آیا ہوں۔ تم بہت یاد آئے۔ چندراوتی کا گانا تھا۔ لطف آگیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ مع اپنی آواز کے دل میں سمائی جارہی ہے۔ عمر ۳۰ سال سے متجاوز، لیکن چمپئی رنگت اور نقشہ کی دلآویزی ہنوز باقی ہے۔ اچھو میاں بھی تھے اور ڈاکٹر شریف الحسن بھی — ان کی ترکیب سنئے، ایک صاحب نے "تو بھیرویں بہار" کی راگنی میں ان کی شاگردی اختیار کی۔ اور دوسرے نے ایمن میں ان کی صاحبزادی کی۔ یہاں انتہائی مایوسی میں بے اختیار جی چاہا کہ طبلہ اپنے سر پر دے ماروں یا سر طبلہ پر پٹک دوں، لیکن میر منور علی صاحب مجھ سے زیادہ تیز نکلے اور طبلہ کے ساتھ سارنگی کو بھی منگوا کر بیٹھ گئے۔ کیا کہوں یہ چار دن کس خود فراموشی کے عالم میں بسر ہوئے ہیں — یاران مخلص کا ایک جگہ بیٹھ جانا بھی واللہ، کتنی بڑی نعمت ہے۔

فی الحال میرا ارادہ لکھنؤ آنے کا نہیں ہے، لیکن اگر زمانہ نے فرصت دی اور مکروہات نے پیچھا چھوڑا تو نومبر کے پہلے ہفتہ میں چار دن کے لئے ضرور آؤں گا۔ تم سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے اور جب سے یہ سنا ہے کہ تم نے وہاں اپنا گھر بسا لیا ہے تو بیتابی اور بڑھ گئی ہے۔

---

ممتازہ ۔ یہ تم نے کیونکر جانا کہ مجھے گھر کی محبت نہیں اور گھر گیا جاڑ ہیں، کیا تمہاری محبت بھی نہ ہوگی، لیکن پیارے یہ بتاؤ کہ وہاں قیام کی صورت کیا ہے۔

سعدیا حبِ وطن گرچہ حدیثے ست صحیح
نتواں مُرد بہ سختی کہ من آنجا زادم

خدا کرے تم زندہ رہو کہ اس پیار سے کبھی کبھی پوچھ لیتے ہو، ورنہ اب اور کون پوچھنے والا باقی رہگیا ہے بہرحال آؤنگا اور وطن کی ویرانیوں پر آنسو بہانے جلد آؤں گا۔ خدا حافظ

---

میرے عزیز دوست۔

میرا معاملہ ان کے ساتھ کیا ہے، اب یہ نہ پوچھئے۔

نے رخصتِ اشکے نہ فرصتِ آہے
دارم برخِ یار غریبانہ نگاہے

میں یونہی بزدل تھا آپ نے ہمدردی فرماکر اور غضب ڈھا دیا۔ آپ کو کیا خبر کہ کتنی بار درد کو سینہ لگا کرنے کی کوشش کر چکا ہوں، لیکن دل ہے کہ اُمنڈا چلا آرہا ہے، آپ اپنے منھ سے کیوں کہیں، مجھے خود اسکا اعتراف ہے کہ تنگ ظرف ہوں، تنگ حوصلہ ہوں، درد کی تاب نہیں، ضبط کا یارا نہیں، اور کس کس سے اس حقیقت کو دُہراتا پھروں کہ

مرا صبر سُکست و درد لبیاست می نالم

آپ کی ہمدردیوں کا شکر گزار ہوں اور آپ کی چارہ سازیوں کا ممنون، لیکن کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ ایک زمانہ تھا کہ مجھے خودداری کا احساس تھا اور سعی و طلب میں بیقرار رہتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ نہ وہ خودداری باقی رہی نہ وہ سعی و طلب کی وہ بیقراری، یہاں تک کہ اب زندگی کا مفہوم بجز

تنہا ملول بودن و تنہا گریستن

کے اور کچھ نہیں ہے۔

---

محترمہ ۔ اشعار ملے اور تمام اُن درد سامانیوں کے ساتھ جو بقول آپ کے آپ کی زندگی کا سہارا ہیں لیکن میرا

نزدیک موت کا کفارہ ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں "موج کوثر و تسنیم" کے لئے دنیا نے کتنی بار مجھ سے مطالبہ کیا اور میں نے ہمیشہ یہ کہکر ٹالدیا کہ دیکھا جائے گا۔ میں کسی سے یہ بھی تو نہیں کہہ سکتا کہ آپ کون ہیں اور کیوں اپنے کلام کی اشاعت گوارا نہیں فرماتیں۔

آپ کا یہ شعر:—

بانسری بج رہی تھی دور کہیں
رات کس درجہ یاد آئے ہو تم

ابتک فضائے شاعری میں گونج رہا ہے۔ اب آپ نے دوسری صدائے دردناک سے تڑپا دیا۔ معاذ اللہ!

کس نے مجھ کو پکارا صحرا میں
ہائیں آئی کدھر سے یہ آواز

جنگل کے سناٹے میں کسی عاشق آوارہ کا یہ محسوس کرنا کہ کوئی اُسے پکار رہا ہے، ایسی مکمل تصویر انتہائے وحشت و اُلفت کی ہے کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں۔

دشت کو چھوڑ کے میں اسکی گلی میں پہونچا
کیا کہوں تجھ سے تو واں اور بھی ٹھیرا نہ گیا

میری ہلاکت کے لئے یہی شعر کیا کم تھا کہ آپ نے مقطع لکھ کر اور قیامت کردی:—

ہم بھی جا پہونچے تھے یہ دیکھنے کیسی ہے نسیم
حال اُس غمزدہ کا ہم سے تو دیکھا نہ گیا

باور کیجئے کہ آپ سے ملنے اور آپ کی داستانِ غم سننے کے بعد بھی مجھ پر اتنا اثر نہیں ہوا، جتنا آپ کے کلام سے ہوتا ہے۔ شاید اس لئے کہ جو نگاہ آئینہ سے اچٹ کر آتی ہے وہ زیادہ قاتل ہوتی ہے۔

آپ کب تک لکھنؤ آئیں گی۔ غالباً محرم میں۔ "ہاں، نہیں" دونوں صورتوں میں آپ کا سکوت ہی مناسب ہے۔ میرا لطفِ انتظار آپ کیوں غارت کریں۔

# مصطفیٰ کمال کی زندگی کے چند دلچسپ اوراق

(بہ سلسلۂ ماہ گزشتہ)

مصطفیٰ کمال یونانیوں کے مقابلہ کی طیاریاں کر ہی رہا تھا کہ ایک اور اندرونی خطرہ سے اسے دوچار ہونا پڑا۔ اس وقت تک سمرنا کے سامنے یونانیوں کا مقابلہ زیادہ تر غیر منظم جماعت سے کیا گیا تھا جو حملہ کرکے پہاڑوں میں چھپ جایا کرتی تھی۔ اس جماعت کا سردار ایک شخص ادہم سرکیشیا کا رہنے والا تھا۔ اس نے ایک اچھی خاصی تعداد سپاہیوں کی فراہم کرلی تھی جن کا نام اس نے "سبز فوج" رکھا تھا۔ اس نے اپنا مرکز ایک مقام کیتھیا میں قائم کیا تھا اور ایک اخبار بھی شایع کیا کرتا تھا جس میں زیادہ تر بالشیو کی خیالات ہوتے تھے۔

چونکہ اس سبز فوج نے یونانیوں کے خلاف مدافعت کرکے انگورا کو تباہ ہونے سے بچالیا تھا اس لئے ادہم کے حوصلے بہت بڑھ گئے اور حکومت انگورا سے منحرف ہوکر اس نے فرمانروایانہ احکام عمال کے نام جاری کرنے شروع کردئے بلکہ اس سے بھی زیادہ اس نے یہ کیا کہ لوگوں کو سزائیں دینے لگا، جس نے نافرمانی کی اسکو سولی پر چڑھادیا اور جس وقت حکومت انگورا نے اس سے بازپرس کی تو نہایت سرکشی کا جواب دیا۔

مصطفیٰ کمال نے یہ حالت دیکھ کر فیصلہ کرلیا کہ سب سے پہلے اس بیقاعدہ فوج کی بلا کو دور کرنا ضروری ہے اس نے ادہم کو انگورا آنے کی دعوت دی اور جب وہ آیا تو اسے سمجھایا کہ ملک کے مفاد کے لئے ضروری ہے کہ بیقاعدہ فوج کو باقاعدہ فوج کے افسران کے ماتحت کردیا جائے' لیکن اس نے صاف انکار کردیا اور آخرکار مصطفیٰ کمال نے عصمت پاشا کو حکم دیا کہ اس فتنہ کو بالکل کچل دیا جائے۔

ادھر یونانیوں نے یہ دیکھ کر کہ ترک آپس ہی میں لڑ رہے ہیں، حملہ کردیا اور آفیون پر قبضہ کرلیا لیکن عصمت نے ادہم کو شکست دیکر اس کی جماعت کو کچل دیا اور یونانیوں کو بھی پسپا کرکے پھر اسی حد تک پہونچادیا جہاں سے انھوں نے اقدام کیا تھا۔

دوسری طرف کاظم قرہ باقر نے آرمینیا پر حملہ کرکے کارس پر قبضہ کرلیا اور بالشویکی فوجوں کے ساتھ اپنی فوج

ملادی۔ روس اسوقت روپیہ اور آلات حرب دونوں سے ترکی کی مدد کر رہا تھا، کیونکہ انگلستان ان دونوں کا یکساں دشمن تھا۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں یونان اندرونی سیاسی نزاعات کا شکار ہوگیا اور وینزولا مع اپنے ساتھیوں کے وہاں سے نکالا گیا۔ ادہر انگلستان، فرانس اور اطالیہ اس جنگ کا جاری رہنا مناسب نہ سمجھتے تھے اور چونکہ یونان لڑنے پر اصرار کر رہا تھا اس لئے انھوں نے اپنی غیر جانبداری کا اعلان کرکے اس جنگ کو خالص ترکی و یونانی جنگ بنا دیا تھا۔ حکومت انگورہ کے پاس فرانس خفیہ پیغامات بھیج رہا تھا کہ وہ مدد کے لئے طیار ہے، اطالیہ آلات حرب سے مدد کر رہا تھا، افغانستان و ایران کے وفد قیام اتحاد کے لئے آچکے تھے، مصر و ہندوستان کے مسلمانوں نے چندہ جمع کرکرکے روپیہ بھیجنا شروع کر دیا تھا اور خود ترکی کے اندر بھی خانہ جنگی ختم ہوکر تمام جماعتوں میں اتحاد ہوگیا تھا اور جتنی محارب فوج تھی وہ سب مصطفیٰ کمال کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوگئی تھی۔ اس لئے مصطفیٰ کمال نے سوچا کہ اب انتظار کی ضرورت نہیں اور اس کو فوراً یونانیوں کے خلاف اقدام شروع کر دینا چاہئے۔ اسوقت اس کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ خواب و خور سب ترک ہوگیا تھا اور ایک لمحہ بھی کسی اور کام میں صرف نہ کرتا تھا۔ افواج کی حالت یہ تھی کہ نہ تو ان کے پاس وردی تھی، نہ کافی سامان حرب، گاؤں کی گاڑیاں پکڑ پکڑ کر ان سے ٹرانسپورٹ کا کام لیا جاتا تھا اور کھانے پینے کا ذخیرہ بھی بالکل ناکافی تھا، اور اسمبلی بدستور اس کی مخالفت پر آمادہ تھی، یوں تو وہ سب کے سامنے اپنے جذبات کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتا تھا لیکن بعض اوقات تنہائی میں اپنی بوٹیاں نوچنے لگتا تھا۔

بہرحال حالات جو کچھ بھی ہوتے وہ ہمت ہارنا نہیں جانتا تھا اور فوزی کے ساتھ برابر انتظام میں لگا ہوا تھا۔ ٹھیک اسی وقت جبکہ وہ انگورہ میں اسدرجہ منہمک تھا عصمت پاشا اسکی شہر کے سامنے اپنا محاذ درست کر رہا تھا یونانیوں کی فوجوں کا اجتماع بڑھتا جا رہا تھا، توپیں اور ہوائی جہاز چلے آرہے تھے، آخرکار جولائی کے پہلے ہفتہ میں انھوں نے حملہ شروع کیا اور کیٹہیا و آفیون پر قبضہ کرکے اسکی شہر تک بڑھ گئے جو ریلوے جنکشن تھا اور تمام مغربی اناطولیہ کی کلید سمجھا جاتا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر عصمت پاشا گھبرا گیا اور اس نے مصطفیٰ کمال کو تار دیا کہ فوراً پہونچ جا۔ مصطفیٰ کمال تار ملتے ہی اسکی شہر کی طرف روانہ ہوگیا اور یہاں پہونچکر اس نے فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لیلی اور نقشہ دیکھ کر کہا کہ "یہاں جنگ کرنے سے تمام ترکی فوج ختم ہوجائے گی" اس لئے اس نے فوجوں کو ۳۰۰ کیلو میٹر پیچھے ہٹا کر دریائے سکاریا کے سامنے اپنا محاذ قایم کیا۔ یہ انتظام کرکے وہ پھر انگورہ گیا کیونکہ یہاں کی رعایا خوف کے وجہ سے بھاگی جارہی تھی اور اسمبلی والے چیخ رہے تھے کہ یہ ساری مصیبت مصطفیٰ کمال کی

لائی ہوئی ہے۔ اس نے پہونچ کر سب کو سمجھایا کہ ڈرنے کی ضرورت نہیں وہ یقیناً کامیاب ہوگا، لیکن ضرورت ہے کہ اس کو سپہ سالار بنا کر اختیارات کامل عطا کر دئے جائیں۔ اول اول تو اسمبلی نے پس وپیش کیا لیکن پھر مجبوراً اس کا کہنا ماننا پڑا کیونکہ کوئی اور صورت مفر کی تھی بھی نہیں۔

اتفاق سے اسی دوران میں وہ گھوڑے سے گر گیا اور اس کی پسلی میں سخت چوٹ آئی، لیکن وہ برابر اپنے کام میں لگا رہا اور انگورہ کا انتظام کر کے پھر دریائے سکاریا پر پہونچ گیا۔

---

۲۴ ہر اگست ۱۹۲۱ء کو یونانیوں نے گولہ باری سے حملہ شروع کر دیا اور اس کے بعد دونوں فوجوں میں دست بدست لڑائی شروع ہوگئی۔ یہ جنگ مسلسل چودہ دن تک جاری رہی اور اتنی شدت کے ساتھ کہ نہ ترک ہٹنے کا نام لیتے تھے اور نہ یونانی۔

رات کے ۲ بجے کا وقت تھا اور مصطفےٰ کمال اپنے کیمپ میں بیتابانہ ٹہل رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور ایک افسر نے اندر آکر کہا کہ "فوزی پاشا آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں" مصطفےٰ کمال ٹیلی فون پر گیا تو فوزی نے یہ خبر سنائی کہ "آج کا دن ہمارے ہاتھ رہا، یونانیوں کی قوت بالکل ختم ہو چکی ہے اور وہ پسپائی کی طیاریاں کر رہے ہیں" یہ سنتے ہی مصطفےٰ کمال نے حکم دیا کہ "تمام رزرو فوج کو شمال کی طرف منتقل کر کے دشمن کو آسانی سے پسپائی کا موقعہ نہ دو" چنانچہ اس کے بعد بھی سات دن تک یونانیوں نے مقابلہ کیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی ہمت ٹوٹ چکی تھی اور ترکوں کے دل بڑھ گئے تھے، آخر کار یونانی بھاگے اور انھیں خندقوں میں جا کر پھر پناہ لی جہاں سے وہ بڑھے تھے۔ مصطفےٰ کمال نے حکم دیا کہ ترکی فوج بھی خندقیں کھود کر ان کے سامنے اپنا محاذ قایم کرے اور یہ انتظام کر کے انگورہ چلا گیا۔

---

انگورہ کی اس وقت یہ حالت تھی کہ ہر شخص فرطِ مسرت سے دیوانہ بنا ہوا تھا اور جدھر دیکھئے سوائے غازی مصطفےٰ کمال کے اور کوئی ذکر ہی سننے میں نہ آتا تھا۔ لیکن مصطفےٰ کمال سے پوچھئے کہ وہ کس حال میں تھا۔ لوگ خوش تھے لیکن وہ بدستور افکار میں گھرا ہوا تھا، دنیا سمجھ رہی تھی کہ ترکوں کو فتح حاصل ہوئی، درانحالیکہ یہ صرف مدافعانہ حملہ تھا جو کامیاب ہوا، ورنہ اصل جنگ تو ابھی باقی تھی اور مصطفےٰ کمال سمجھتا تھا کہ جب تک یونانیوں کو ملک سے نکال کر سمندر پار نہ کر دیا جائے اس کامیابی کا کوئی اعتبار نہیں۔

چنانچہ اس نے انگورہ آتے ہی سب سے پہلے فرانس سے خفیہ معاہدہ کر کے اپنی ۸۰ ہزار فوج جو حدود شام میں بیکار پڑی ہوئی تھی اس کو بلا لیا اور ماسکو سے روپیہ قرض لیکر اطالیہ و امریکہ سے آلات و ذخائر حرب خریدنا شروع کئے اسی کے ساتھ اس نے بھرتی بھی شروع کر دی اور ہر وہ ترک جو تلوار اُٹھا سکتا تھا جبراً فوج میں داخل کیا گیا۔ لیکن یہ ایک دن کا کام نہ تھا اس میں مہینوں لگ گئے اور لوگوں نے پھر بھلا دیا کہ یونانی ہنوز ملک کے اندر موجود ہیں۔ اسمبلی جس نے مصطفیٰ کمال کو اختیارات کامل دیدئے تھے اب وہ پھر اس کے اقتدار کا سلب کرنا چاہتی تھی، انور پاشا جو بخارا کا امیر ہو گیا تھا وہ بھی ترکی واپس آنا چاہتا تھا، جمال پاشا جو افغانستان میں مشیر فوجی تھا وہ بھی اتحاد کے لئے ہاتھ بڑھا رہا تھا لیکن مصطفیٰ کمال نے کسی ایک کی نہ سُنی رؤف اور فتحی بھی مالٹا سے رہا ہو کر پہونچ گئے تھے لیکن انھوں نے یہاں پہونچکر اور مخالفت شروع کر دی۔ الغرض غریب مصطفیٰ کمال ان مصائب میں گھرے ہونے کے باوجود عزم کر چکا تھا کہ یونانیوں کو نکال کر رہیگا اور اسوقت سوائے اس فکر کے کوئی اور مسئلہ اس کے سامنے نہ تھا۔

آخر کار انھیں حالات میں ۱۹۲۱ء کا موسم سرما ختم ہو کر ۱۹۲۲ء کا موسم بہار آگیا اور گرمی شروع ہو گئی۔ وہ اپنے دل میں طے کر چکا تھا کہ ۲۶ اگست کو جارحانہ حملہ شروع کر دیگا، لیکن کسی کو اس کی اطلاع نہیں کی اور اگست کے پہلے ہفتہ میں محاذ پر پہونچکر فوزی اور عصمت سے ملنے کے بعد جب ہر ہر چیز کا معائنہ کر لیا تو اسنے فٹ بال کے میچ میں تمام افسران کو شریک کر کے کھیل ہی کھیل میں تمام ہدایات سمجھا دیں۔

حملہ سے ایک ہفتہ قبل مصطفیٰ کمال نے تمام تاروں کو قطع کر کے ترکی اور بیرونی دنیا کا سلسلۂ خبر رسانی بالکل مسدود کر دیا اور ۲۴ کی رات کو اس نے بڑے پیمانہ پر جلسۂ رقص منعقد کیا اور اس نے سنتریوں کو حکم دیدیا کہ کوئی شخص اس کے مکان میں نہ آنے پائے کیونکہ وہ بہت مصروف ہے۔

اس وقت تک کچھ ترکی دستے آفیون کے سامنے جمع ہو گئے تھے اور کچھ دستوں کو اس طرح نقل و حرکت دگئی کہ یونانیوں کو شمال کی طرف متوجہ ہو جانا پڑا۔ جلسۂ رقص جاری تھا، لہو لعب میں لوگ مصروف تھے کہ رات کو ٹھیک جسوقت سوئی بارہ پر پہونچی ہے، مصطفیٰ کمال نے دفعتہً حملہ کر دیا اور ۲۶ اگست ۴ بجے صبح تک ترک ڈوملوپنار تک پہونچ گئے جو یونانی مدافعت کا خاص مقام تھا اور شام تک یونانیوں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ ہر چند ترکی سپاہ اس قابل نہ تھی کہ وہ یونانیوں کا تعاقب کرتی، لیکن مصطفیٰ کمال نے اس رسم کو بھی پورا کیا اور برابر دس دن تک لگاتار ان کا پیچھا کر کے اس وقت تک دم نہیں لیا جب تک سرزمین اناطولیہ یونانیوں سے صاف نہیں ہو گئی۔

ہرچند مصطفیٰ کمال یونانیوں کو ترکی ایشیا کے حدود سے باہر کر چکا تھا، لیکن چونکہ یونانی اب سمندر سے قسطنطنیہ پر حملہ کی طیاریاں کر رہے تھے، اس لئے مصطفیٰ کمال کی مصروفیت و پریشانی بدستور باقی تھی۔ فوج کی دوبارہ تنظیم کرکے قسطنطنیہ کی طرف روانہ کرنا، یونانی جس حصۂ ملک کو تباہ و برباد کرکے چلے گئے تھے اس کی دیکھ بھال، دول خارجہ کی سیاسی چالوں سے نبٹنا، الغرض یہ اور اسی طرح کی بیسیوں گتھیاں اس کے سامنے تھیں جن کا سلجھانا ضروری تھا اس کی یہ حالت تھی کہ شب و روز میں شاید دو گھنٹے آرام کرتا ہو، ورنہ ہر وقت کام میں لگا رہتا اور اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہ تھا۔

اس انہماک و مصروفیت میں اس کے دو دن بسر ہو چکے تھے کہ تیسرے روز صبح کو اردلی نے اطلاع دی کہ کوئی خاتون ملنا چاہتی ہیں۔ مصطفیٰ کمال ہنوز کوئی جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ وہ خود اندر آگئی اور یہ کہکر کہ میرا نام لطیفہ خانم ہے، خاموش کھڑی ہوگئی۔ وہ جوان تھی، بے نقاب تھی اور مغربی ملبوس سے آراستہ۔ مصطفیٰ کمال ایک منٹ تک اُسے دیکھتا رہا اور پھر بیٹھنے کی اجازت دیکر انتظار کرنے لگا کہ وہ کیا کہتی ہے۔ اس نے کہا کہ "میں سمرنا کے ایک مشہور تاجر کی لڑکی ہوں اور ابھی ابھی اپنے والدین کو پیرس چھوڑ کر یہاں آئی ہوں۔ سمرنا کے پشت کی پہاڑی پر وسیع مکان ہے اور میں چاہتی ہوں کہ آپ معہ اپنے اسٹاف کے چند دن میری مہمانی قبول کریں"۔

مصطفیٰ کمال کا ذوق عورتوں کے باب میں ہرچند نہایت ادنیٰ درجہ کا ہے اور ضرورت کے وقت وہ معمولی ہوٹلوں اور بازاروں کی عورتوں سے عارضی دلچسپی پیدا کر لیا کرتا تھا، لیکن اس دوران میں وہ اپنے اس ذوق سے بھی کچھ تھک سا گیا تھا اور اسی لئے جب ایک بلند درجہ کی شایستہ و مہذب خاتون اس کے سامنے آئی تو وہ عورت کے باب میں اپنی فطری کمزوری کی وجہ سے فوراً اس کی طرف مایل ہوگیا اور اس کی دعوت کو قبول کر لیا۔

اس نئے مکان میں پہونچکر اسے بہت آرام ملا۔ جگہ وسیع و کشادہ، ملازم شایستہ و مہذب، فرنیچر نفیس و قیمتی اور پھر ایک حسین و جوان خاتون کی ہر وقت کی معیت! اس کے تمام وہ جذبات جو گزشتہ جنگ کی صعوبتوں میں گم ہو چکے تھے، پھر عود کر آئے اور اس کو یہ دیکھکر غیر معمولی مسرت حاصل ہوئی کہ لطیفہ خانم بھی ان جذبات کی پذیرائی کے لئے آمادہ ہے۔ الغرض یہ ملاقات آہستہ آہستہ بے تکلفی کی صورت اختیار کرنے لگی اور مصطفیٰ کمال نے آخر ایک دن اظہار تمنا کر ہی دیا۔

مصطفیٰ کمال کے گزشتہ تجربات اور نیز اس کی فطری وحشت نے کبھی عورت کو اس سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی کہ وہ ایک عارضی لطف و لذت کی چیز ہے، چنانچہ لطیفہ کے متعلق بھی اس نے یہی خیال قایم کیا اور چاہا

کہ دوسری معمولی عورتوں کی طرح اس کی عصمت کا بھی سودا کرے، لیکن یہ ارادہ دیکھ کر وہ فوراً اس کی آغوش سے علٰحدہ ہوگئی اور بولی کہ "بیشک مجھے بھی محبت ہے لیکن جب تک عقد نہ ہوجائے میں آپ کے لئے بالکل غیر ہوں۔"
مصطفیٰ کمال کی زندگی میں یہ بالکل پہلا موقعہ تھا کہ اس نے ایک عورت کی طرف سے یہ جواب سنا ہو۔ وہ چیں بجبیں ہوکر بولا۔ "عقد؟ عقد کیا چیز ہے، کیا ایک کثیف داڑھی والے ملا کا چند بے معنی الفاظ دہرا دینا اتنی اہم چیز ہے۔ علاوہ اس کے میں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک میں ترکی کو آزاد نہ دیکھ لوں، شادی نہ کروں گا۔"
لطیفہ نے بھی انھیں سخت تیوروں سے جواب دیا کہ "میں نے بھی قسم کھائی ہے، جب تک شادی نہ ہوجائیگی میں اپنے آپ کو کسی کے حوالہ کروں گی، اس لئے اگر آپ کو اپنی قسم کا احترام ہے، تو مجھے بھی اپنے عہد کی پاسداری کا اتنا ہی حق حاصل ہے۔"
صبح کو مصطفیٰ کمال کا کمرہ خالی تھا اور وہ پھر اپنی افواج کے ساتھ جا کر مل گیا تھا۔

---

ہفتوں گزر گئے لیکن اس نے کوئی اطلاع نہیں بھیجی۔ لطیفہ منتظر تھی اور بے چین بھی کیونکہ وہ حقیقتاً اسی سے محبت کرتی تھی کبھی وہ سوچنے لگتی کہ کیا واقعی اس نے غلطی کی۔ لیکن بعد کو وہ پھر مطمئن ہوجاتی، یہاں تک کہ جب زمانہ کافی گزر گیا تو مایوس ہو کر وہ پھر اپنے مطالعہ کی دلچسپیوں میں مصروف ہوگئی اور اُن خانماں برباد ترکوں کی اعانت وہمدردی میں اپنا وقت صرف کرنے لگی جو ہزاروں کی تعداد میں سمرنا سے چلے آرہے تھے۔
ادھر مصطفیٰ کمال بھی اپنے کاموں میں مصروف تھا۔ کبھی بروصہ جاتا کبھی انگورا اور ایک نہایت ہی اہم مسئلہ اس کے سامنے تھا۔ وہ مضطرب تھا کہ یونانیوں کو کسی کسی طرح ترکی کے حدود سے باہر نکال کر ایتھنس تک پہونچا دے قبل اس کے کہ وہ اپنی فوج کی دوبارہ تنظیم کرسکیں، لیکن دشواری یہ تھی کہ اس کے پاس کوئی جہاز نہ تھا اور لامحالہ خشکی کے راستہ سے اس کو درۂ دانیال عبور کرنا تھا، جہاں چناق پر انگریزی فوج پڑی ہوئی تھی جو اسے یوروپ کے حدود میں جانے سے روکتی تھی۔ کچھ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ انگورا واپس آکر اس نے ان تمام مسائل پر غور کرنا شروع کیا اور تمام امکانات کو سامنے رکھ کر سوچنے لگا کہ اس گتھی کو کیونکر سلجھائے۔ اگر سوال صرف یونانیوں کا ہوتا تو اسے چنداں پرواہ نہ ہوتی، لیکن وہاں تو درمیان میں مصیبت انگریزی فوج حائل تھی جس سے مقابلہ کرنا آسان نہ تھا۔
اس کی فوج تھکی ہوئی شکستہ حال تھی اور سامان حرب بھی کافی نہ تھا، علاوہ اس کے نہ اس کے پاس

توپیں تھیں نہ جدید آلات حرب۔ برخلاف اس کے انگریزی فوج کی یہ حالت تھی کہ وہ ہر طرح آراستہ تھی، آسودہ تھی، ذخیرۂ حرب بھی اس کے پاس کافی تھا، بڑی بڑی توپیں، بڑے بڑے ہوائی جہاز اس کی مدد کو موجود تھے اور پھر اگر ضرورت ہو تو بیڑہ کا بیڑہ مدد کے لئے طلب ہو اور بات بڑھ جائے تو اس سے بھی زیادہ پوری سلطنت کی قوت موجود۔ اس لئے وہ سوچتا تھا کہ اگر واقعی انگریز لڑائی پر آمادہ ہوگئے تو پھر کوئی امکان کامیابی کا نہیں ہے، لیکن غور طلب مسئلہ یہی تھا کہ آیا واقعی یہ جنگ کے لئے آمادہ ہیں یا محض دھمکی دینا مقصود ہے۔

فرانس و اطالیہ والے کہہ رہے تھے کہ یہ صرف برطانیہ کی چال ہے اور لڑنا مقصود نہیں، یہی رائے روسیوں کی تھی لیکن ان کی رائے پر مصطفیٰ کمال عمل کرنا مناسب نہ سمجھتا تھا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کا دوست ان میں سے کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ خود غور کر رہا تھا کہ صورتِ حال کیا ہے۔ اخبارات سے اس کو اتنا تو ضرور معلوم تھا کہ انگریز قوم جنگ کے خلاف ہے اور لائڈ جارج کی محاربانہ پالیسی کو پسند نہیں کرتی لیکن اسکے سامنے سب سے اہم یہ سوال تھا کہ وہ سر چارلس ہرنگٹن کے تیوروں کو معلوم کرے جو اسوقت قسطنطنیہ میں اتحادی افواج کا کمانڈر تھا۔ مصطفیٰ کمال یہ تو جانتا تھا کہ اگر جنگ شروع ہوگئی تو فرانسیسی اور اطالوی افواج علحدہ ہو جائینگی، لیکن خود انگریزی فوجیں کیا کم تھیں کہ ان کا مقابلہ آسان ہوگا۔ اس دوران میں اس نے اُس خفیہ مراسلت کی بھی خبر رکھی جو تار کے ذریعہ سے مابین قسطنطنیہ اور لندن ہو رہی تھی، اسی کے ساتھ اس نے دیگر ذرائع سے یہ بھی معلوم کیا کہ ہرنگٹن کس پالیسی کا آدمی ہے اور آخر کار وہ حد درجہ کشمکش کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا کہ یہ وقت بازی لگانے کا ہے، یا تو ترکی ہمیشہ کے لئے آزاد ہوتا ہے یا پھر صفحۂ ہستی سے اس کا نام مٹتا ہے ۔ مصطفیٰ کمال نے اپنی آستین اُلٹ لی اور حکم دیا کہ دو ہزار ترک سواروں کی جمعیت انگریزی افواج کی طرف پیشقدمی کرے۔

چنانچہ آہستہ آہستہ کمالی فوج بڑھی اور جب وہ انگریزی حدود میں پہونچی تو مضبوطی سے روک دی گئی — مصطفیٰ کمال نے دیکھا کہ اب پانسہ ڈالنے کا وقت آگیا ہے، اس نے حکم دیا کہ پیدل فوج کا ایک دستہ آگے بڑھے لیکن بندوقوں کا منھ نیچے کی طرف کر کے تاکہ انھیں معلوم ہو جائے کہ ترک افواج کا مقصد جنگ کرنا نہیں بلکہ دوستانہ طور پر آگے بڑھنے کا ہے۔ یہ وقت حد درجہ خطرہ کا تھا۔ دونوں طرف کی فوجوں کے تیور بگڑے ہوئے تھے اور اگر غلطی سے کوئی ایک بندوق بھی کسی طرف سے چل جاتی یا کوئی پر جوش سارجنٹ ذرا سی بھی چوک حکم دینے میں کر دیتا تو پھر آگ ہی لگ جاتی اور برطانیہ و ترکی کی جنگ کا چھڑ جانا یقینی تھا۔ ترکوں کا پیدل دستہ آگے بڑھتا جا رہا تھا اور انگریزی سپاہ جو خندقوں میں پڑی ہوئی تھی حیران تھی کہ کیا کرے کیونکہ اس کو حکم صرف

یہ تھا کہ وہ ترکوں کو آگے بڑھنے سے روکے، فیر کرنے یا کوئی دوسری قوت استعمال کرنے کا حکم نہ تھا۔ آخر کار جب بندوقوں کے خار دار تاروں تک ترکی دستہ پہونچا تو فوراً حکم آیا کہ وہ آگے بڑھنے سے رُک جائے کیونکہ التوائے جنگ کی گفتگو شروع ہو گئی ہے۔

یورپ میں اس وقت سب سے زیادہ اضطراب فرانس کو تھا، وہ سمجھتا تھا کہ اگر لڑائی دوبارہ چھڑ گئی تو پہلے سے زیادہ خطرناک ہوگی اور اب بالشیوک حکومت ترکی کا ساتھ دیگی، چنانچہ فرانسیسی نمایندہ فرینکلن بوئلاں مصطفیٰ کمال کے پاس آیا اور کہا کہ فوجی اقدام روک دیا جائے اور وہ تمام اتحادیوں کی طرف سے وعدہ کرتا ہے کہ یونانی فوجیں تھریس سے باہر کر دیجائیں گی اور یوروپین ٹرکی، ترکوں کو واپس مل جائے گی اور اگر مصطفیٰ کمال کوئی اور شرط کرنا چاہے تو وہ بھی پوری کر دی جائے گی لیکن جنگ کے شعلہ کو دوبارہ بھڑکانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

مصطفیٰ کمال یہ سُنکر دل میں بہت خوش ہوا لیکن بظاہر پس و پیش کرتے ہوئے اس نے اپنی رضامندی کا اظہار کر کے فوج کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور عصمت پاشا کو حکم دیا کہ وہ ہمرنگٹن سے موضع مدانیا میں جا کر ملے اور جزئیات طے کرے۔ چنانچہ عصمت پاشا وہاں گیا اور گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ اتحادی افواج نہ صرف یہ کہ یونانیوں کو تھریس سے باہر کر دینگی بلکہ خود بھی قسطنطنیہ کو جلد سے جلد خالی کر دیں گی۔

یہ تھی سب سے پہلی حقیقی فتح مصطفیٰ کمال کی سیاسی ہوشمندی کی، جس نے دفعتہً ہوا کا رُخ بدلدیا اور وہی ترک جو صلح کے اس طرح آرزومند تھے گویا بھیک طلب کر رہے ہیں، اب شرائط صلح خود لکھوا رہے تھے اور دول یورپ اُن کے ماننے پر مجبور تھے۔

---

ٹھیک یہی وقت تھا کہ مصطفیٰ کمال کو لطیفہ کا خیال آیا اور دفعتہً اتنا قوی ہو گیا کہ فوراً موٹر منگا کر دیوانہ وار سمرنا پہونچا اور لطیفہ سے کہا کہ "میں شادی کے لئے طیار ہوں، ابھی، اسی وقت، بغیر کسی رسم کے" اور دوسرے دن صبح کو عقد کے بعد اسے اپنے ساتھ لے گیا۔

---

اس وقت مصطفیٰ کمال عظمت و جلال، کامیابی و فتحمندی کی اس بلند چوٹی پر کھڑا ہوا تھا جہاں پہونچکر انسان کا دماغ خراب ہو جاتا ہے، لیکن اس پر کوئی اثر نہ تھا ــــ اب حالت یہ تھی کہ چونکہ بازی ترکوں کے ہاتھ رہی تھی اسلئے دول یوروپ صلح کے لئے بیتاب تھے خواہ کوئی قیمت اسکی ادا کرنا پڑے لیکن مصطفیٰ کمال چپ نہ تھا کہ وہ اسی پر

پھیل جاتا اس نے حد سے ایک قدم آگے نہ بڑھایا اور کہدیا کہ ترکی کی کوئی شرط سوائے اس کے نہیں ہے کہ وہ اپنے ملک کی بالکل آزاد حکومت تسلیم کی جائے اور غیر حکومتوں کو مطلق دخل دینے کا اختیار حاصل نہ ہو۔ اگر کوئی دوسرا شخص اس کی جگہ ہوتا تو معلوم نہیں کیا کیا شرائط پیش کرتا کیونکہ اس وقت تمام دنیا میں اس کی شجاعت کا غلغلہ بلند تھا ایران، افغانستان، مصر، ہندوستان و چین کے مسلمانوں کی طرف سے مبارکباد کے تار پر تار چلے آرہے تھے، ایران و افغانستان اتحاد کے لئے ہاتھ بڑھا رہے تھے اور تمام اسلامی دنیا اس "بطل اعظم" پر اپنی ہمدردیاں نثار کرنے کے لئے طیار تھی، لیکن مصطفےٰ کمال سمجھتا تھا کہ یہ تمام باتیں بیکار ہیں اور اسے معلوم تھا کہ ترکی کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ سلطنت عثمانیہ اب تباہ ہوچکی ہے اور کوئی قوت اسے دوبارہ زندہ نہیں کرسکتی، اس لئے اب سوال غیر ملکی مقبوضات وفتوحات کا نہیں تھا، بلکہ صرف ترکی قوم کے بقا وحیات کا تھا اور اس نے اسی پر قناعت کرنا مناسب جانا۔ اس نے دنیائے اسلامی کے تمام پیغامات کا جواب ان الفاظ میں دیا کہ "میں اپنے تمام مسلمان بھائیوں کو آزاد دیکھنے کی تمنا رکھتا ہوں، لیکن سوائے اس خواہش کے میں اور کوئی مدد ان کی نہیں کرسکتا"

اس نے اسمبلی میں صاف صاف کہدیا کہ "میں عالم اسلامی کے تمام قواعد کے اتحاد کا قائل نہیں ہوں۔ ہر قوم کے سامنے اس کی اپنی ضروریات ہیں اور انھیں کو سامنے رکھ کر اسے اپنا لائحۂ عمل مرتب کرنا چاہئے، یہ وقت مذہبی اخوت و ہمدردی کا نہیں ہے بلکہ صرف قومی تحفظ کا ہے اور اب ترکی دوبارہ وہ حماقت نہیں کرسکتا جس میں صدیوں تک مبتلا رہکر اس نے عظیم نقصانات برداشت کئے"

---

ان تمام کامیابیوں کے باوجود مصطفےٰ کمال کو اطمینان نہ تھا کیونکہ خود اندرون ملک اس کے بہت سے دشمن موجود تھے اور اب ان کی مخالفت کا مقابلہ کرنا تھا۔ اسمبلی نے دوبارہ اس کو انگورہ طلب کیا تاکہ صلح کانفرنس کے متعلق گفتگو کی جائے، لیکن وہ نہیں گیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس سے مقصود کچھ اور تھا۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں تھا کہ ممبران اسمبلی نے صرف جنگ کا خطرہ دیکھ کر اس کو عارضی اختیارات فوج پر دیدئے تھے لیکن اب کہ خطرہ نکل گیا ہے وہ کبھی اس کو برسر اقتدار نہ رہنے دیں گے۔ چنانچہ ایک دن دوران گفتگو میں خالدہ ادیب خانم نے اس سے کہا کہ "پاشا، اب صلح کے بعد تم کو تھوڑا سا آرام لینا چاہئے"۔ مصطفےٰ کمال نے کہا۔ "آرام؟ آرام کیسا! اب صلح کے بعد ہم کو آپس میں بھی تو ایک دوسرے سے لڑنا ہے۔ کیا میں اُن کو چھوڑ دوں گا جنھوں نے میری مخالفت کی ہے، اور کیا وہ یوں آسانی سے میری قیادت کو تسلیم کرلیں گے"۔

دیسے نے انگورہ کہلا بھیجا کہ " میں ابھی نہیں آسکتا، میرے فوجی فرائض فی الحال سمرنا میں قیام کرنے پر مجبور کر رہے ہیں "۔ رؤف پاشا (وزیراعظم) اور بہت سے دوسرے سیاسی حضرات اس کے پاس آئے اور پوچھا کہ " آیندہ نظام حکومت کی کیا صورت ہوگی۔ انگورہ میں تو خیر صوبجاتی خودمختار حکومت موجود ہے، لیکن قسطنطنیہ میں خلیفہ وسلطان مع اپنے وزراء کے حکمراں ہے اس لئے اب بہتر صورت یہی ہے کہ دونوں حکومتوں کو ملا کر سلطان کو ایک آئینی حکومت کا بادشاہ تسلیم کیا جائے اور تم وزارت کا بار اپنے سر لو "۔

مصطفےٰ کمال یہ سنکر خاموش رہگیا، کیونکہ اس کے خیالات تو کچھ اور ہی تھے وہ منتظر تھا کہ قسطنطنیہ سے اتحادی فوجیں ہٹیں اور وہ خلافت وسلطانی دونوں کا خاتمہ کرکے جمہوریت کا اعلان کرے، لیکن اس کا اظہار کسی طرح مناسب نہ تھا کیونکہ ترک قوم بہت مذہبی اور قدامت پرست تھی۔ فوج ہر چند اس کے قابو میں تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ سلطان یا خلیفہ کے مقابلہ میں اسکی تلوار اُٹھنا بہت دشوار ہے۔ رؤف پاشا چونکہ اس کی طرف سے مشتبہ تھا اس لئے وہ بار بار اصرار کرتا تھا لیکن مصطفےٰ کمال نے اس سے کہدیا کہ تم انگورہ چلو میں وہیں پہونچکر مفصل گفتگو کروں گا۔

---

انگورہ میں اس وقت رفعت بھی موجود تھا اور علی فواد بھی ماسکو سے واپس آگیا تھا، اب رؤف بھی پہونچ گیا اور مصطفےٰ کمال بھی۔

رؤف اور رفعت، مصطفےٰ کے انقلابی خیالات سے آگاہ تھے لیکن یہ اس وقت کی بات تھی جب اُسے کوئی عروج حاصل نہ ہوا تھا، کوئی قوت اس کے پاس نہ تھی لیکن اب حالات مختلف تھے اور وہ ڈر رہے تھے کہ دیکھئے کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ رفعت نے اس سے دریافت کیا کہ " بعض لوگ کہتے ہیں کہ تمھارا ارادہ خلافت وسلطنت ختم کر دینے کا ہے، کیا یہ صحیح ہے "۔ مصطفےٰ کمال نے جواب دیا کہ " تمھاری رائے اس باب میں کیا ہے، کیا یہ مناسب ہوگا؟ " رؤف نے کہا " میرے باپ دادا نے سلاطین عثمانیہ کا نمک کھایا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ میری رائے کیا ہوسکتی ہے، لیکن یہ ضرور ہے کہ وحید الدین کو تخت سے اُتار دینا چاہئے کیونکہ اس نے بڑی غداری کی ہے اور اسکی جگہ کسی اور کو سلطان بنا دینا چاہئے، یہ رائے نہ صرف میری بلکہ ساری قوم کی ہے "۔ رفعت نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور مصطفےٰ کمال نے یہ دیکھکر کہ ابھی وقت نہیں آیا یہ کہکر ٹال دیا کہ " میں اسمبلی میں اپنے خیالات کا اظہار کرونگا "۔

اس کے ایک ہفتہ بعد حکومت برطانیہ نے خلیفہ وحید الدین کو لکھا کہ لوزان کانفرنس میں صلح کی گفتگو کے لئے ترکی نمایندے روانہ کئے جائیں اور انگورہ کی قومی اسمبلی کو بھی اطلاع دیجائے کہ وہ اپنے نمایندے بھیجے۔

اس کا اثر تمام ملک میں بجلی کی طرح دوڑ گیا کیونکہ سوائے چند آدمیوں کے سب لوگ وحید الدین کے مخالف تھے اور جانتے تھے کہ لائڈ جارج اور وحید الدین دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ خود قسطنطنیہ میں سلطان کے خلاف اتنی بڑی پھیل گئی کہ وزراء کا باہر نکلنا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ ادھر انگورہ میں تو خیر مخالفت ہونا ہی تھی۔ مصطفیٰ کمال نے دیکھا کہ یہ موقع ہے کم از کم شخصی سلطنت کا تو خاتمہ کر ہی دیا جائے اگر خلافت کا استیصال ممکن نہیں۔ چنانچہ جس وقت انگورہ اسمبلی میں یہ مسئلہ چھڑا ہوا تھا اور ہر طرف سے پُرجوش مباحثہ ہو رہا تھا کہ مصطفیٰ کمال کھڑا ہوا اور کہا کہ میرے نزدیک خلافت کو سلطنت سے علحدہ کرکے وحید الدین کے ساتھ ہی ملوکیت کو بھی مٹا دینا چاہئے۔"

یہ سنتے ہی لوگوں کے کان کھڑے ہوئے اور انھوں نے چہ میگوئیاں شروع کیں۔ لیکن مصطفیٰ کمال اس موقعہ کو ہاتھ سے دینا نہ چاہتا تھا، اس نے اپنے ۸۰ ساتھیوں کی مدد سے فوراً اسی جگہ ووٹ لینے کی تجویز پیش کردی لیکن اسمبلی نے معاملہ کو خاص شرعی کمیٹی کے سپرد کر دیا۔ دوسرے دن یہ شرعی کمیٹی بیٹھی جو علماء و فقہاء پر مشتمل تھی اور جس کا صدر ایک بہت ہی پرانا، دقیانوسی قسم کا مولوی قرار دیا گیا تھا۔ ان علماء میں سے ایک ایک کھڑا ہوتا اور قرآن و احادیث کے استناد اور علماء قدیم کے اقوال سے استشہاد کرتا، کوئی لفظی بحث میں پڑ کر اصل مسئلہ کو چھوڑ دیتا، کوئی منطقی و نحوی جھگڑے سامنے لا کر تنقید کرتا، الغرض یہی ترتون سا میں ہو رہی تھی کہ مصطفیٰ کمال ایک بار پھر کھڑا ہو گیا اور کہا کہ "میں یہ قال اقول کی فضول بحث سننے کے لئے طیار نہیں، سلطنت عثمانیہ ملک و قوم کے اختیارات چھین کر قائم کی گئی تھی اور اب قوم سلطان کے اختیار چھین کر اسے معزول کر دینا چاہتی ہے، اس لئے تم لوگ مانو یا نہ مانو، یہ تو ہو کر رہنا ہے، البتہ یہ ضرور ہوگا کہ تم میں سے دو چار کے سر مجھے کاٹنا پڑیں گے۔"

ظاہر ہے کہ مولوی اس کی تاب کیا لا سکتے تھے۔ بدحواس ہو کر اپنی عبائیں سنبھالتے ہوئے وہاں سے بھاگے اور بھاگتے ہوئے یہ تجویز پاس کر گئے کہ خلافت سلطنت سے علحدہ کر دی جائے اور وحید الدین کو معزول۔

اس کے بعد اسمبلی کے اجلاس میں یہ مسئلہ پھر پیش ہوا، اور مصطفیٰ کمال نے یہ دیکھ کر اس کے مخالف زیادہ ہیں ہنگامہ کے ساتھ ووٹ لینا مناسب سمجھا، اس نے اپنے گرد اپنے آدمیوں کو جمع کرکے حکم دیا کہ علحدہ علحدہ ووٹ شماری کی ضرورت نہیں یونہی مجمع سے رائے دریافت کر لی جائے، بعض نے اسکی مخالفت کی، لیکن یہ دیکھ کر کہ مصطفیٰ کمال کے تیور بگڑے ہوئے ہیں اور اس کے مسلح آدمی خدا جانے کیا کریں، اس پر راضی ہو گئے اور آخر کار اسمبلی کو اعلان کرنا پڑا کہ "ترکی سے ملوکیت و سلطانی منسوخ کی جاتی ہے۔"

اس کے پانچ دن بعد ہی رفعت قسطنطنیہ پہونچا اور قسطنطنیہ پر قبضہ کرکے سلطان کی معزولی اور دورِ سلطانی کے اختتام کا

اعلان کردیا اور وحید الدین کو انگریزی جہاز میں پناہ لیکر وہاں سے بھاگنا پڑا۔ اس کے بعد اس کا بھتیجہ عبدالمجید خلیفہ بنایا گیا لیکن اختیارات حکومت اس کو بالکل حاصل نہ تھے۔

---

اس میں شک نہیں کہ مصطفیٰ کمال اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا لیکن وہ خوب جانتا تھا کہ اسمبلی اس کے خلاف ہے اور اصل مقصد کی تکمیل آسان نہیں۔ چونکہ شخصی حکومت منسوخ ہو چکی تھی اس لئے جدید حکومت کی تعیین ضروری تھی اور اسے معلوم تھا کہ لوگ اس کو عاملانہ خودمختاری دینے کے لئے آمادہ نہ ہوں گے۔ ہرچند فوج اس کی طرفدار تھی اور چند احباب بھی ایسے تھے جو ہر موقع پر اس کی اعانت کے لئے طیار ہو سکتے تھے، مگر وہ جانتا تھا کہ اس طرح دھمکا دھمکا کر کب تک کام نکالا جائے گا ضرورت ہے کہ کسی سیاسی چال سے مخالفوں کو زیر کیا جائے۔

۱۹۱۹ء میں اس نے رؤف و رفعت کی مدد سے ملک کے اندر دفاعی کیٹیاں قائم کی تھیں اور رفتہ رفتہ ان کا زور بہت بڑھ گیا تھا اور چونکہ ان کمیٹیوں کی تنظیم بالکل فوجی قسم کی تھی اس لئے ان سب کی باگ مصطفیٰ کمال ہی کے ہاتھ میں تھی اس نے سوچا کہ ان مقامی کمیٹیوں کو "جمعیت ملی" کے نام سے موسوم کرکے تمام داخلی انتظامات کا اختیار ان کو دیدینا چاہئے اور چونکہ یہ کمیٹیاں اسی کے تحت ہیں اس لئے ملک کی تمام انتظامی مشین پر اس کا اقتدار قایم رہے گا۔

اس نے فوراً ملک کا دورہ شروع کیا یہ جہاں کہیں پہونچتا تھا لوگ دیوانہ وار اس کی پذیرائی کرتے تھے، غازی مصطفیٰ کمال کے نعروں سے فضا گونج جاتی تھی اور یہ بھی ان کا دل ہاتھ میں لیکر سمجھاتا تھا کہ "دیکھو دشمن ملک سے چلا گیا ہے لیکن جنگ ابھی تک ختم نہیں ہوئی۔ ملک غداروں سے بھرا ہوا ہے اور ضرورت ہے کہ پوری مستعدی سے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے میرا ساتھ دیا جائے۔ ترکی کو تم نے اپنا خون بہاکر حاصل کیا ہے، اس لئے اس پر حکومت کرنے کا حق تمھیں کو حاصل ہے۔ اپنی کمیٹیوں کو مضبوط بناؤ، وسیع کرو اور وہ کرو جو میں کہتا ہوں"۔ الغرض اسی طرح اس نے ہر جگہ اپنے موافق اچھی خاصی جماعت پیدا کرلی اور اس کے بعد وہ اسمبلی کی قوت گھٹانے کی طرف متوجہ ہوا۔

---

مصطفیٰ کمال نے دورہ سے فارغ ہونے کے بعد سب سے پہلے یہ کام کیا کہ اس نے قانون اسمبلی کے سامنے پیش کیا کہ ممبران اسمبلی کا گرفتاری سے مستثنیٰ ہونے کا قاعدہ منسوخ کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی اس نے اخبارات کا سخت احتساب شروع کیا اور پولیس کو حکم دیا کہ پبلک میں کوئی شخص تقریر نہ کرنے پائے۔ اسمبلی نے اس قانون کو پاس نہ ہونے دیا لیکن احتساب اخبارات اور پولیس کا کیا علاج تھا۔ وہ لوگ سمجھتے تھے کہ مصطفیٰ کمال کا دورہ کیا معنی

رکھتا ہے اور وہ کس فکر میں سرگرداں ہے لیکن کھلم کھلا اس کی مخالفت بھی نہ کر سکتے تھے۔ تاہم ایک موقع ان کے ہاتھ آہی گیا۔

صلح کانفرنس کے متعلق تمام کارروائیاں مصطفیٰ کمال نے راز میں رکھی تھیں اور جو کچھ کر رہا تھا اپنے ہی اختیار سے کر رہا تھا۔ کانفرنس نومبر سے جاری تھی اور ترکی کی طرف سے عصمت پاشا گفتگو کرنے کے لئے شریک ہوا تھا۔ لیکن وہاں حالات کچھ ایسے پیدا ہوئے کہ کانفرنس کامیاب نہ ہوئی اور عصمت فروری میں وہاں سے بگڑ کر انگورہ کی طرف چل پڑا مصطفیٰ کمال یہ سنکر بہت مشوش ہوا کیونکہ اسکی تمام کامیابیوں کا انحصار صرف اس پر تھا کہ کانفرنس میں بھی اسی کی جیت رہے، چنانچہ یہ فوراً اسکی شہر جاکر عصمت سے ملا اور پھر اس کو ساتھ لیکر انگورہ آیا۔ لیکن اسٹیشن پر نہ رؤف پاشا (وزیر اعظم) استقبال کیلئے آیا اور نہ کوئی اسمبلی کا ممبر۔ مصطفیٰ کمال نے برہم ہوکر رؤف کو بلایا اور جواب طلب کیا۔ اس نے کہا کہ "وزیر اعظم میں ہوں عصمت پاشا نہیں ہے، اس لئے میں اس کے لینے کے لئے اسٹیشن نہیں جا سکتا تھا، رہا آپ کا مسئلہ سو آپ کیوں بغیر مشورۂ وزراء عصمت سے ملنے اسکی شہر چلے گئے" اور یہ کہکر اس نے وزارت سے استعفا دیدیا۔ اور اسوقت سے وہ عصمت کا دشمن اور مصطفیٰ کمال کا مقابل بن بیٹھا۔

اسمبلی کو یہ موقعہ مصطفیٰ کمال کی مخالفت کا ہاتھ آگیا اور کامل نو دن تک صلح کانفرنس کا مسئلہ زیر بحث رہا مصطفیٰ کمال پر اسمبلی نے دو الزام قایم کئے ایک تو یہ کہ اس نے انگریزوں سے دھوکا کھا کر التوائے جنگ کو کیوں منظور کر لیا اور کیوں قسطنطنیہ پہونچکر سنگین کی نوک سے اپنے شرائط اسی وقت تسلیم کرا لئے، دوسرا الزام یہ تھا کہ بغیر منظوری اسمبلی عصمت ایسے بہرے شخص کو صلح کانفرنس میں شرکت کے لئے کیوں مامور کیا۔ اس لئے عصمت کے خلاف ملامت و بے اعتمادی کا ووٹ پاس کیا جائے۔

ہرچند مصطفیٰ کمال جانتا تھا کہ عصمت بیوقوف ہے لیکن چونکہ اس کا خاص آدمی تھا اور اندھوں کی طرح اس کا حکم ماننے والا تھا اس لئے وہ کسی طرح گوارا نہ کر سکتا تھا کہ عصمت کے خلاف کوئی کارروائی اسمبلی میں ہو، اس لئے اسنے بعض کو تو سمجھایا کہ یہ ساری ترکیب رؤف کی ہے جو خود صلح کانفرنس میں شریک ہونا چاہتا ہے، بعض کو وعدوں کا سبز باغ دکھا کر رام کیا اور بعض کو دھمکایا، الغرض عصمت کے خلاف ووٹ پاس نہ ہو سکا اور اس نے پھر اسی کو کانفرنس بھیج کر حکم دیا کہ کچھ بھی ہو وہاں کامیابی حاصل کرنا ضروری ہے۔

اس دوران میں مصطفیٰ کمال رات دن اس فکر میں لگا ہوا تھا کہ "جمعیت ملی" جو اس نے قائم کی پورا پورا اقتدار ملک میں حاصل کرے اور اُدھر اسمبلی اس خطرہ کو دور کرنے کی تدبیریں سوچ رہی تھی آخر کار اس نے ایک وفد مصطفیٰ کمال کے پاس بھیجکر مطالبہ کیا کہ بہ حیثیت صدر حکومت ہونے کے اس کو تمام پارٹیوں سے علحدہ اور بالکل نیوٹرل

رہنا چاہئے۔ مصطفیٰ کمال نے کہا کہ ملک میں صرف ایک ہی سیاسی جماعت کام کر رہی ہے جس کا نام "جمعیت ملی" ہے اور جس میں ہم آپ سب شریک ہیں، پھر یہ فرق و امتیاز کیسا؟"

یہ جواب گویا اسمبلی کے نام کھلا ہوا چیلنج تھا۔ اور وہ لوگ بھی جنھوں نے گزشتہ چار سال میں مصطفیٰ کمال کا ساتھ دیا تھا رؤف کی سرکردگی میں علٰحدہ ہو گئے یعنی رحمی، عدنان، کاظم قرہ باقر، رفعت، علی فواد، اور نورالدین سب اس سے منحرف ہو گئے۔ البتہ عصمت وفتحی نے ساتھ نہیں چھوڑا، اور فوج بھی اس کی طرفدار تھی۔

اسمبلی کے ممبروں اور نمائندوں کی اب تمامتر کوشش یہی تھی کہ کسی طرح مصطفیٰ کمال کے اقتدار کو گھٹایا جائے اور اس باب میں اس کے مخالفوں کی تعداد برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ مصطفیٰ کمال نے یہ دیکھ کر کہ اسمبلی میں اس کے ہمنوا کم ہوتے جا رہے ہیں، اس کو تحلیل ہو جانے کا حکم دیا اور دوبارہ انتخاب ممبران کی کارروائی عمل میں آئی لیکن اس مرتبہ پہلے سے بھی زیادہ مخالف لوگ اسمبلی میں جمع ہو گئے۔ اب اس نے سوچا جو کچھ کرنا ہے کر ڈالنا چاہئے ورنہ ممکن ہے یہ موقعہ بھی ہاتھ سے نکل جائے۔

اس وقت حالت یہ تھی کہ "جمعیت ملی" کی قوت بہت بڑھ گئی تھی، تمام فوج مصطفیٰ کمال کے ساتھ تھی، اور اس کے بڑے بڑے مخالف رؤف، کاظم، علی فواد اور نورالدین انگورا سے باہر تھے۔ عصمت پاشا صلح کانفرنس میں ترکی کے تمام مطالبات تسلیم کرا چکا تھا اور قسطنطنیہ دشمنوں کی فوج سے بالکل خالی ہو چکا تھا۔ اس لئے مصطفیٰ کمال نے سوچا کہ اعلان جمہوریت کے لئے اس سے بہتر وقت کوئی نہیں آسکتا، لیکن وہ جانتا تھا کہ اسمبلی میں اگر اس مسئلہ کو اٹھایا گیا تو وہاں کامیابی نہ ہوگی، اس لئے وہ نہایت ہی دانشمندانہ سیاسی چال چلا۔ اس نے کیبنٹ کے وزراء کو کھانے پر مدعو کیا اور ان سے کہا کہ موجودہ صورت گورنمنٹ کی کسی طرح کامیاب نہیں ہو سکتی اور جب تک بات بات میں اسمبلی کی دخل در معقولات بند نہ ہو، انتظام دشوار ہے۔ اگر آپ لوگوں کو وزیر بنایا گیا ہے تو اس کے معنے یہ تو نہیں ہو سکتے کہ اسمبلی کے نمائندے ہر وقت آپ کے سر پر چڑھے رہیں۔ اگر کام کرنے کا پورا اختیار حاصل نہیں تو ایسی وزارت سے کیا فائدہ، اس لئے میری رائے میں آپ لوگ استعفا دیجئے اور دیکھئے کہ اسمبلی کیا کرتی ہے، ظاہر ہے کہ وہ آپ لوگوں کے خدمات حاصل کرنے پر مجبور ہے پھر آپ ہی کا انتخاب کرے گی، اس وقت آپ حسب منشاء شرائط عاید کرکے اپنا پوزیشن محفوظ کر سکتے ہیں۔"

چنانچہ کیبنٹ نے دوسرے دن استعفا دیدیا اور اسمبلی نے دوسری نئی گورنمنٹ کی تنظیم شروع کی، لیکن اسمبلی کے ممبروں میں باہم گرمی ورد و کد جھگڑا ہوا یہاں تک کہ آپس میں مار پیٹ کی نوبت آگئی۔

مصطفیٰ کمال یہ دیکھ کر بہت خوش ہو رہا تھا۔ اس نے فتحی سے کہا کہ "کل جتنی انجمن اسمبلی کے مباحثہ میں بیٹھا

کر سکتے ہو، پیدا کرو" اور کمال الدین سے کہا کہ "تم اس وقت یہ تجویز پیش کرنا کہ مصطفیٰ کمال کو بلا کر اس جھگڑے کو طے کیا جائے" مصطفیٰ کمال نے رات ہی کو عصمت کے مشورہ سے جمہوریت کے بل کا مسودہ طیار کر لیا اور کل کا انتظار کرنے لگا۔

دوسرے دن وہی ہوا جو وہ سمجھتا تھا یعنی اسمبلی کے ممبروں کی باہمی مخالفت بہت زیادہ بڑھ گئی اور آخر کار یہ رضامندی ظاہر کی گئی کہ مصطفیٰ کمال کو بلا کر کہا جائے کہ وہ نئی کیبنٹ مرتب کرے۔ اول اول تو مصطفیٰ کمال نے آنے سے انکار کیا لیکن جب بعد کو اس نے یہ کہلوا لیا کہ اس کے فیصلہ کو قطعی فیصلہ سمجھا جائے گا تو وہ آیا اور اس نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا کہ:- جن مشکلات میں آپ لوگ مبتلا ہیں وہ سب آپ ہی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ آپ لوگ بیشک قوم کے نمایندے ہیں، لیکن جب تک آپ وزرا کو اپنے فرائض انجام دینے کے لئے آزاد نہ چھوڑیں گے کبھی کام نہیں چل سکتا۔ آپ قانون بنایئے، نظم و نسق پر اصولی بحث کیجئے، لیکن ایک بار کیبنٹ بنا دینے کے بعد اس کے فرائض میں دخل نہ دیجئے اگر وہ اسمبلی کے بنائے ہوئے قانون پر عمل کر رہے ہیں۔ اس لئے میرے نزدیک اب صورت صرف یہی ہے کہ حکومت کے موجودہ نظام کو بدل دیا جائے اور میں بحیثیت حکم کے فیصلہ کرتا ہوں کہ آیندہ سے ترکی کی حکومت جمہوری حکومت ہوگی"۔

یہ سنتے ہی اسمبلی حیران رہ گئی، لیکن اب ہو بھی کیا سکتا تھا، مصطفیٰ کمال کو فیصلہ کا اختیار دے کر سب اپنے ہاتھ پاؤں کٹا چکے تھے۔ آخر کار جمہوریت کا بل پاس کیا گیا اور مصطفیٰ کمال کو اس کا صدر بنایا گیا۔

(باقی)

---

# بیراگ کا روگ

(گزشتہ سے پیوستہ)

## (۹)

محل کی سب سے بلند منزل پر، جہاں رتن گڑھ راج کا پھریرا دور سے اڑتا ہوا نظر آتا ہے، ایک ایسے کمرہ میں جس کے چاروں طرف تازہ ہوا کے لئے کوئی روک نہیں ہے، راجکماری کملا مسہری پر لیٹی ہوئی ایک کتاب پڑھ رہی ہے جو سوامی جی نے کسی وقت اس کو تحفتاً دی تھی۔

بائیں کی طرف سوشیلا خاموش بیٹھی ہوئی راجکماری کے چہرہ اور اس کے رنگ کے اتار چڑھاؤ کو غور سے دیکھ رہی ہے، سامنے میز پر متعدد دواؤں کی شیشیاں اور گلاس رکھے ہوئے ہیں۔

راجکماری آتشِ زیب کی ہلکی ساری ہلکے زرد رنگ میں رنگی ہوئی پہنے ہوئے ہے اور تکیہ کے اوپر سر کے نیچے اپنا ہاتھ رکھے ہوئے کتاب دیکھ رہی ہے سر کے بال ہوا سے منتشر ہو کر کبھی کبھی پیشانی پر آجاتے ہیں جن کو وہ کبھی دوسرے ہاتھ سے سر کے اوپر کر لیتی ہے اور کبھی نہیں —— اس کا چہرہ زرد ہے لیکن کتاب پڑھتے پڑھتے اس زردی میں ہلکی سرخی زعفران کی سی جھلک پیدا ہو جاتی ہے، اس کا خوبصورت کتابی چہرہ جو محبت کرنے والی عورت کی خاص پہچان ہے، اس وقت اور زیادہ اُترا ہوا نظر آتا ہے، اور شال کا زریں کنارہ سینہ سے ہوتا ہوا پشتِ گردن تک پہونچ گیا ہے اس کے دل کی دھڑکن کا غماز بنا ہوا ہے۔

اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کتاب کو بند کیا اور کسی خیال میں محو ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ سوشیلا اس وقت غور سے اس کے مضمحل لیکن تابناک چہرہ کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ واقعی محبت بھی کوئی ایسا روگ ہے جس کا علاج اس دنیا میں ممکن نہیں —— راجکماری کی بند آنکھوں کے کنارے سے دفعتہً دو آنسو ڈھلکے اور وہ انھیں اپنی انگلیوں سے پونچھتی ہوئی اُٹھ بیٹھی —— سوشیلا کھڑی ہو گئی اور آگے بڑھنا چاہا، لیکن راجکماری نے اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا تو وہ وہیں ٹھٹھک کر رہ گئی۔ وہ پھر لیٹ گئی اور تھوڑی دیر سوچ کر بولی:-

"سوشیلا، کیا واقعی میں بیمار ہوں؟"

—— "نہیں راجکماری، آپ کے دشمن بیمار ہوں، موسم بدل رہا ہے، اسی لئے طبیعت مضمحل رہتی ہے خود میرا بھی حال ہے"

کملا (تھوڑی دیر سوچکر، آپ ہی آپ) —موسم بدل رہا ہے —— اسی لئے طبیعت مضمحل رہتی ہے۔

(سوشیلا سے) اچھا تو پھر یہ علاج کیوں ہو رہا ہے۔

سوشیلا۔ "راجکماری، علاج کسی بیماری کا تو نہیں ہے بلکہ صرف اس بات کا ہے کہ مبادا موسم کی خرابی سے مزاج ناساز ہو جائے"

کملا یہ سنکر آنکھ بند کئے پھر دیر تک خاموش لیٹی رہی اور پھر دفعتہً بولی "سوشیلا چترکوٹ تمھیں معلوم ہے کہاں ہے"

سوشیلا۔ "ہاں معلوم کیوں نہیں، سوامی جی اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے، یہ مقام انھیں بہت پسند ہے۔

کملا۔ "ہاں، تو پھر، اس موسم کو کیوں نہ بدل دیا جائے۔ چلو چترکوٹ چلیں، سُنا ہے وہاں کی آب و ہوا بہت اچھی ہے، اور ممکن ہے کہ ........" خاموش ہو گئی۔

سوشیلا۔ "مناسب ہے لیکن دس دن کے اندر جانا اور واپس آنا — مجھے تو اُمید نہیں کہ مہاراج مان جائیں"

یہ سنتے ہی کملا گھبرا کر اُٹھ بیٹھی، شال اُتار کر پھینکدی، اور کمرہ میں اِدھر سے اُدھر بیتابانہ ٹہلنے لگی —— سوشیلا سہمی ہوئی ایک کنارے کھڑی تھی اور وہ سمجھ رہی تھی کہ اسوقت کملا کس اُلجھن میں گرفتار ہے۔

وہ ٹہلتے ٹہلتے دفعتہً میز کے پاس آکر کھڑی ہو گئی اور دیر تک دواؤں کو غور سے دیکھتی رہی۔ ایک شیشی کو ہاتھ میں لیا، دیکھا اور رکھدیا، دوسری کو لیا اور رکھدیا — اس کے چہرہ کا رنگ غیر معمولی طور پر بدل رہا تھا، پیشانی پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں اور آنکھیں جو نقاہت کی وجہ سے یونہی زیادہ نمایاں ہو گئی تھیں، اسوقت ابلی پڑ رہی تھیں۔

—— دوا۔ علاج۔ شفا —— احمق دنیا کی احمقانہ تدبیر، دل کی پھانس کو نہ دیکھ کر یہ پاؤں کے کانٹے نکالنے والے بیوقوف روح کے درد کو درد سمجھکر پیشانی پر صندل لگانے والے کم عقل"

—— وہ یہ کہتی ہوئی پھر ٹہلنے لگی اور دفعتہً ایک جگہ ٹھٹھک کر بولی۔ "سوشیلا، یہ شیشیاں، یہ گلاس، اُٹھا کر پھینکدے یہ چیزیں مجھے بیمار ڈالدیں گی میں اب یہ زہر نہیں پی سکتی"

سوشیلا، جو پہلے ہی سے سہمی ہوئی تھی، یہ سنکر تھر تھر کانپنے لگی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اگر اس حکم کی تعمیل کی تو مہاراج کو کیا جواب دیگی اس لئے اس کے قدم جہاں تھے وہیں جمکر رہگئے — اب کملا کا غصہ اور تیز ہو گیا اور وہ بغیر کسی انتظار کے میز کے پاس گئی اور ایک ایک کر کے تمام دوائیں پاس کی کھڑکی سے نیچے پھینکدیں۔ اور ایک ایسے سکون کے ساتھ جو بعض وقت انتہائی غیظ کی حالت میں پیدا ہو جاتا ہے۔ پاؤں لٹکا کر پلنگ پر بیٹھ گئی"

یہ واقعہ ایسا معمولی نہ تھا کہ چھپا رہتا۔ آن کی آن میں راجہ کو خبر پہونچ گئی اور وہ گھبرایا ہوا خود کملا کے پاس آگیا۔

راجہ — "کیوں کملا، کیا حال ہے، یہ دوائیں کس نے پھینکدیں"

کملا — "میں نے"

راجہ — "کیوں، کیا بات ہوئی"

کملا — "کوئی بات نہیں، مہاراج، میں دوائیں پیتے پیتے گھبرا گئی ہوں اور اگر واقعی میں بیمار ہوں تو مجھے افسوس ہے کہ اسوقت تک ان میں سے کسی دوا نے اپنا کام نہیں کیا"

راجہ — "بہتر ہے، میں علاج بدلدوں گا، لیکن تمھیں غصہ تو نہ کرنا چاہئے تھا، طبیعت اور زیادہ بگڑ جائے گی"

کملا — "مہاراج، علاج کی تبدیلی بالکل بے سود ہوگی اور مجھے معلوم ہے کہ میں یہاں اچھی نہیں ہوسکتی"

راجہ — "پھر تم کہاں اچھی ہوسکتی ہو"

کملا — "چترکوٹ میں"

راجہ — "چترکوٹ! چترکوٹ! وہاں کون علاج کرنے والا ہے"

کملا — "رام چندرجی کے وہ چرن جو بن باس کے وقت وہاں پہونچے تھے اور جن کے نشان اب بھی اس جگہ موجود ہیں"

راجہ جو خود بھی راسخ پرست ہندو تھا یہ سنکر خاموش ہوگیا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد بولا — "لیکن یہ تو دیکھو کہ اب دن کتنے باقی رہگئے ہیں، تم اگر وہاں گئیں بھی تو ٹھہر نہیں سکتیں"

کملا — "میں زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ میں واپس آجاؤنگی"

راجہ (کچھ سوچکر) بہتر ہے اگر تمھاری مرضی یہی ہے تو جاؤ، کیونکہ تمھاری صحت کے لئے میں دنیا کی ہر مصلحت قربان کرنے کے لئے طیار ہوں۔

---

## (۱۰)

چترکوٹ کوہستان بندھیاچل کے اس حصہ کا نام ہے جہاں رام چندرجی نے بن باس کی حالت میں اپنی زندگی کے کچھ دن بسر کئے تھے اور اسی لئے یہ مقام ہندوؤں کے یہاں جاترا کی نہایت مقدس جگہ سمجھا جاتا ہے، تمام سال زائرین کا سلسلۂ آمد و رفت قایم رہتا ہے اور بعض فقراء نے تو اپنا استھان ہی یہاں بنا لیا ہے۔ بعض نے پہاڑ کی چٹانوں پر کٹیاں بنالی ہیں، بعض نے بڑی بڑی چٹانوں کے سایہ میں پناہ لے رکھی ہے، بعض نے کوہستانی چشموں کے پاس جھونپڑیاں ڈال لی ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو یونہی کھلی ہوئی جگہوں میں دھونی رما کر بیٹھ گئے ہیں۔

کملا صبح کو یہاں پہونچی اور اسی وقت سے کسی جستجو میں لگ گئی۔ نہ اب اس میں نقاہت پائی جاتی تھی، نہ کسی بیماری کا نشان، نہ اس کے چہرہ پر زردی تھی نہ اعضا میں اضمحلال۔ وہ پیادہ پا، ناہموار پتھروں پر ہرنی کی طرح دوڑتی پھرتی تھی اور اس طرح جستجو میں مصروف تھی گویا وہ ایک ایک چٹان کو اولٹ کر دیکھ لینے پر تلی ہوئی ہے۔

ظاہر ہے کہ میلوں کے گرد میں پھیلی ہوئی سادھوؤں کی آبادی کا تھوڑی دیر میں جایزہ نہ لے سکتی تھی، صبح سے شام ہوگئی اور آخرکار ایک ایسے استھان پر جو چشمہ کے کنارے ہونے کی وجہ سے بہت دلکش و سکون بخش تھا، وہ تھک کر بیٹھ گئی اور تھوڑی دیر میں اس کی آنکھ لگ گئی۔ اسوقت استھان خالی تھا اور سادھو کسی ضرورت سے دروازہ بند کرکے باہر گیا ہوا تھا۔

سورج غروب ہو رہا تھا، چڑیاں چشمہ سے پانی پی پیکر جھاڑیوں میں بسیرا لینے کے لئے جمع ہو رہی تھیں، ان کی نرم و دلکش آوازوں سے پہاڑی گونج رہی تھی اور سایہ بڑھتے بڑھتے تاریکی میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا کہ دفعۃً کملا کی آنکھ کھلی اور سب سے پہلے جس چیز پر اسکی نگاہ پڑی وہ سوامی جی کی صورت تھی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی، آنکھیں مل مل کر دیکھنے لگی کہ یہ کوئی خواب تو نہیں ہے اور جب اسے یقین ہوگیا تو وہ پھر تھرا کر گرنے لگی۔ سوامی جی نے ہاتھ بڑھا کر اس کو سنبھال لیا اور کہا:۔

"کملا، میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں، تم یہاں کیونکر آئیں"

کملا خاموش، سر جھکائے ہوئے کھڑی تھی اور ایک خفیف سی مگر نہایت سریع لرزش اس کے تمام جسم پر طاری تھی وہ کچھ نہ بولی۔ سوامی جی نے پھر پوچھا، پھر کوئی جواب نہ ملا۔ پورے پندرہ منٹ اسی حال میں گزر گئے اور آخرکار جب سوامی جی نے یہ کہا کہ "کملا، بہت دیر ہوگئی ہے، چلو میں تم کو تمھارے ٹھکانے پہونچا دوں" تو وہ چونکی، جانے کے نام سے اسکے دل پر چوٹ سی لگی اور بولی "ٹھکانے پہونچانے، یا ٹھکانے لگانے، مہاراج میں یہاں سے جانے کے لئے نہیں آئی ہوں" یہ سنتے ہی سوامی جی کی حالت عجیب ہوگئی، چہرہ پر غیر معمولی رنگ دوڑ گیا، ہاتھ پاؤں میں بے چینی سی محسوس ہونے لگی، اعصاب میں بجلی سی دوڑ گئی اور کملا کا ہاتھ پکڑ کر اٹھے اور کہا کہ "اندر آؤ، یہاں سردی ہے اور تمھارے جسم پر ساری کے سوا کچھ نہیں"

---

دونوں اپنی جگہ ایک دنیائے تصور بنے بیٹھے ہیں، اور اگر ان کے اس عالم خیال کی کوئی مرئی تصویر لیجا سکتی تو شاید اس کا کوئی منظر اس خیال سے خالی نہ ہوتا کہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آغوش ہیں۔ کچھ دیر بعد سوامی جی نے اٹھکر چراغ جلاتے ہوئے کہا۔ "کملا تمھارے بٹھانے کے لئے میرے پاس تو کوئی بوریا بھی ثابت موجود نہیں"۔ کملا نے کوئی جواب نہیں دیا اور بدستور اسی عالم محویت میں گردن جھکائے بیٹھی رہی۔

سوامی جی نے چراغ جلا کر کٹی کے ایک کونے سے لوٹتے ہوئے کہا "کملا، تم آج میری مہمان ہو، اور میں حیران ہوں تمھاری کیا سیوا

مجھ سے ہو سکتی ہے"۔۔۔۔ کملا نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔

سوامی جی نے اس کے قریب آکر اس کا شانہ چھو کر کہا۔ "کیوں، کملا، کیا کچھ خفا ہو جو جواب نہیں دیتیں"۔ شانہ پر ہاتھ کا لگنا تھا کہ کملا کی حالت ایسی ہو گئی گویا وہ شاخ بید ہے جس سے تیز ہوا کا جھونکا گزر گیا ہے، سوامی جی نے گھبرا کر پوچھا "یہ کیا حال ہے" لیکن یہ پوچھنا قیامت ہو گیا کیونکہ وہ سنتے ہی بے اختیارانہ ایک جسم بیجان کی طرح ان کی آغوش میں گر پڑی اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک پڑی رہی۔ جس وقت اُس کی آنکھ کھلی تو سوامی جی غائب تھے اور ان کی ایک تحریر سامنے پتھر پر رکھی ہوئی تھی۔

"کملا، میں نے اپنی زندگی میں دو عہد کئے تھے، ایک یہ کہ میں کبھی اس جسمانی لذت سے آشنا نہ ہونگا جس سے تم بیتاب ہو کر میرے پاس آئی تھیں۔ اور دوسرے یہ کہ اگر کبھی مجھ سے ایسی لغزش ہو گئی تو پھر دنیا میں زندہ نہ رہوں گا۔ یاد کرو رتن گڑھ کی وہ صبح جب بجلی سے ڈر کر تم مجھ سے لپٹ گئی تھیں۔ میں کبھی اس لذت کو محو کرنے میں کامیاب نہیں ہوا جو زندگی میں سب سے پہلی بار ایک نوجوان عورت کے جسم کے اتصال سے مجھے حاصل ہوئی تھی، اگر یہ کہوں کہ میرے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی تو یہ کہنا بھی صحیح نہ ہوگا، اگر میں اسے شراب کی بدمستی سے تعبیر کروں تو یہ بھی غلط ہوگا۔ وہ ایک کیفیت تھی ناقابل اظہار، ایک لذت تھی ناقابل بیان۔ تم چلی گئیں اور میں نے کامل دو گھنٹے غور کیا کہ کیا میرا عہد ٹوٹ گیا ہے۔ لیکن آخر کار میرے نفس نے دھوکا دیکر مجھے یہ باور کرایا کہ یہ جو کچھ ہوا صرف اتفاق تھا، قصد و ارادہ نہ میری طرف سے تھا اور نہ شاید تمھاری طرف سے، تاہم میں نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر تم پھر مجھ سے ملیں تو ممکن ہے مجھے اس لذت کی یاد پھر بیتاب کردے۔

میں پچر کوٹ چلا آیا، یہ خیال کر کے کہ تم بھی چند دن میں مجھے بھول جاؤگی اور میں بھی۔۔۔ لیکن شام کو جب ناگہاں میں نے تمھیں یہاں پایا تو مجھے معلوم ہوا کہ نہ تم مجھے بھلا سکی ہو اور نہ میں تمھیں۔۔۔ میں سمجھ گیا کہ میرا نفس جو دھوکا ایکبار مجھے دے چکا ہے اسکی پاداش کا وقت آگیا ہے اور مجھے اس کے لئے طیار ہو جانا چاہئے چنانچہ میں تمھیں اندر لے گیا، یہ سمجھ کر کہ مجھے اپنا سب کچھ تم پر قربان کر دینا ہے اور جسوقت تم میری آغوش میں آکر بیہوش ہو گئیں، تو میں نے اپنی وہ تمام قربانیاں پیش کر دیں، میں کہ اسوقت تک میں نے کبھی کسی عورت کے جسم کو قصداً نہیں چھوا تھا، تم کو اپنے سے اسقدر قریب دیکھ کر بالکل دیوانہ ہو گیا تھا اور نہیں کہہ سکتا کہ میں نے تمھاری آنکھوں، تمھارے لبوں، تمھاری پیشانی، تمھارے ہاتھ، تمھارا سینہ اور تمھارے پاؤں کو کس کس طرح اور کتنی بار چوما، اور آخر کار جب میں اپنے غلبۂ نفس سے تھک کر چور چور ہو گیا تو کتنی دیر تک تم کو اپنے سینہ سے لپٹائے ہوئے پڑا رہا۔

تم یہی چاہتی تھیں نا ؟ -

ظاہر ہے کہ اس کے بعد مجھے دُنیا میں کسی اور لذت کی جستجو نہیں ہو سکتی، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اب میں عہد کے دوسرے حصہ کو پورا نہ کروں۔ جان دینے سے زیادہ سہل دنیا میں کوئی بات نہیں اور شاید اچھا ہوتا اگر میں تمھارے پاس ہی دم توڑتا، لیکن اس خیال سے کہ ممکن ہے تم بعض اُلجھنوں میں گرفتار ہو جاؤ یا میرا خط دیکھنے سے پہلے ہی مبادا خود جان دیدو یہاں سے دور اتنی دور کہ تمھارا وہم و خیال بھی نہیں پہونچ سکتا، اپنا عہد و پیمان پورا کرنے جا رہا ہوں اور تم یقین کرو کہ میں نے اسے پورا کر دیا اور اس دنیا میں اب تم مجھے کبھی نہیں دیکھ سکتیں — تاہم مری ایک التجا ہے، اگر تم نے اسے پورا کیا تو خیر ورنہ تم سے شکوہ و شکایت کرنے اب کون آتا ہے۔

ایک تو یہ کہ تم چترکوٹ سے فوراً رتن گڈھ جاؤ اور اپنے دل پر اس طرح قابو رکھو کہ یہ راز کسی پر ظاہر نہ ہو، دوسرے یہ کہ تم شادی ضرور کرو، لیکن یہ شادی صرف اس لئے ہوگی کہ تم بدنام نہ ہو، تمھارے باپ کی خواہش پوری ہو جائے ورنہ تمھاری روح تو پہلے ہی سے میری تھی، اب تمھارا جسم بھی میرا ہی ہو چکا ہے، اور اُسے میرا ہی رہنا چاہئے۔

---

(۱۱)

اس واقعہ کو ایک ماہ سے زیادہ زمانہ گزر گیا ہے اور راجکماری کملا شادی کے بعد جگدیش پور جا چکی ہے —

راجہ جگدیش پور ایک معمولی دل و دماغ اور نہایت ادنیٰ خصایل کا نوجوان ہے — جس کا کچھ علم تو کملا کو شادی سے پہلے ہی ہو چکا تھا لیکن شادی کے بعد جب وہ یہاں پہونچی تو اور زیادہ پست کنندہ حالات معلوم ہوئے۔ دنیا بھی کہتی تھی اور کملا خود بھی جانتی تھی کہ اس نے شادی صرف دولت کی طمع میں کی ہے لیکن ایک تو اپنے باپ کی بات کا پاس، دوسرے سوامی جی کی وصیت، وہ اس باب میں بالکل خاموش رہی اور اس نے شادی کی تمام رسمیں اس طرح ہو جانے دیں گویا وہ کوئی پتھر کی مورتی ہے۔

جگدیش پور پہونچنے کے بعد کملا کو معلوم ہوا کہ یہ اس کے شوہر کی پہلی شادی نہ تھی، بلکہ یہ شرف اس سے قبل ایک فرانسیسی عورت کو عرصہ ہوا حاصل ہو چکا ہے جو رانی کی حیثیت سے محل میں حکومت کر رہی ہے — یہ ایک کمرہ میں جو اس کے لئے مخصوص تھا، جا کر پڑ رہی اور کامل ایک ہفتہ تک نہ اس نے اپنے شوہر کی صورت دیکھی نہ اُس نے اپنی بیوی کی — وہ لاکھوں کی دولت پا کر اپنی فرانسیسی محبوبہ کے ساتھ ہر وقت نشہ شراب میں بدمست رہتا تھا اور اسے دین و دنیا کا کوئی ہوش نہ تھا۔

آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ محل برقی روشنی سے جگمگا رہا تھا، ڈیوڑھی پر شہنائی بج رہی تھی، اور کملا ہاتھ منہ دھو کر برآمدہ میں نکلی ہی تھی کہ خادمہ آئی اور بولی کہ "مہاراج نے یاد فرمایا ہے"۔ اس نے کچھ دیر تامل کیا، سوچا کہ یہ ایک ہفتہ کے بعد اسے کیوں یاد کیا جا رہا ہے۔

پوچھا۔ "کہاں یاد کیا ہے؟" جواب ملا "باغ کی بارہ دری میں"۔ کملا نے سوال کیا۔ "کوئی اور بھی ہے؟"۔ خادمہ نے کچھ رکتے ہوئے جواب دیا کہ "مجھے معلوم نہیں"۔

کملا جس طرح کھڑی تھی اسی طرح چلنے کے لئے طیار ہوگئی اور متعدد زینے اور کمرے طے کرنے کے بعد جب وہ صحن باغ میں پہونچی تو دیکھا کہ سامنے راجہ بیٹھا ہوا ہے اور اس کے پہلو میں اس کی فرانسیسی بیوی بھی بیٹھی ہوئی ہے۔ پہلے تو وہ ٹھٹھکی لیکن پھر کچھ سوچکر آگے بڑھی اور قریب جا کر کہا کہ "میں حاضر ہوں"۔

راجہ کے سامنے میز پر شراب کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں، اور ایک گلاس شراب سے لبریز اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے غضب آلود نگاہوں سے کملا کو دیکھا اور پھر شراب کا ایک جرعہ لیکر پوچھا کہ "کیا تم شراب نہیں پیتیں"۔

—— "نہیں، مہاراج! مجھے اس کی عادت نہیں ہے"

—— "اگر میں تم کو حکم دوں تو بھی نہیں پیو گی"

—— "یقیناً نہیں"

وہ غصہ سے بیتاب ہوگیا اور ماتھے پر شکنیں ڈالکر زہرخند کے ساتھ بولا کہ:۔

"ہاں، سچ ہے، سادھوؤں کے ہاتھ سے پریم کا جام پینے والیاں، ہمارے ساتھ کیوں شراب پینے لگیں"، ان الفاظ کا کملا کے دل و دماغ پر ایک بجلی کا سا اثر پیدا ہوا اور بے اختیار اس کا جی چاہا کہ بڑھکر اس کا منھ نوچ لے لیکن اس نے انتہائی ضبط سے کام لیا اور وہاں سے واپس آنے لگی۔

راجہ نے کہا۔ "کہاں جاتی ہو، خبردار جو آگے قدم بڑھایا"

کملا پلٹ پڑی اور فوراً بڑھکر گلاس اسکے منھ پر پھینک مارا اور میز اُلٹ کر اس طرح خاموش کھڑی ہانپنے لگی گویا کہ وہ کوئی بپھری ہوئی شیرنی ہے۔ راجہ نے جو اس وقت غصہ سے اندھا تھا، فوراً اپنی جیب سے ریوالور نکالا اور بولا کہ سنبھل جا۔ کملا جس کے لئے اب زندگی کوئی معنی نہ رکھتی تھی، اکڑ کر بولی کہ "نامرد، مجھے ڈراتا ہے"۔ یہ کہکر اس نے اپنی قمیص کا گریبان دونوں ہاتھوں سے پھاڑ کر سینہ آگے کر دیا اور بولی کہ "بڑا راجپوت ہے تو ہاتھ اُٹھا اور فیر کر"—— ظاہر ہے کہ اس طعن کی تاب وہ کیا لاسکتا تھا، چشم زدن میں ریوالور کی نال کملا کے سینے کے سامنے آئی اور ایک دھماکے کی آواز نے اس "بیراگ کے بروگ" کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

---

اس کے دوسرے دن اخباروں میں صرف یہ خبر دیکھنے میں آئی کہ:۔

"راجکماری کملا، کل شام کو موٹر میں جا رہی تھیں کہ دفعتہً کسی درخت سے تصادم ہوا اور پسلیاں ٹوٹ کر فوراً دم نکل گیا"۔

نیاز

# چار مصلح

وہ نقاش تھے۔ وہ مصور تھے۔ وہ معلمِ اخلاق تھے، ماہرِ نفسیات تھے۔ وہ ڈرامہ نگار تھے، ناول نویس تھے۔ وہ بے نظیر شاعر تھے، بے مثل فلسفی تھے۔ وہ حاذق حکیم تھے، کامل طبیب تھے۔ وہ منجم تھے، رمال تھے۔ وہ مذہبی پیغمبر تھے۔ قومی مصلح تھے۔ مگر انسان تھے خدا نہیں تھے۔

ان کی قوتِ تفہیم حیاتِ انسانی کے اسرارِ سربستہ کی عقدہ کشائی کرسکتی تھی۔ وہ اپنی روح کے اعماق میں پہونچکر دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر ان رموز کا پتہ لگالیتے تھے جو ماورائے ادراک ہوں۔ پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کا حل ان کے لئے آسان تھا۔ وہ ستاروں کی حقیقت سمجھتے تھے۔ پرندوں کی زبان جانتے تھے۔ نظامِ شمسی ان کے سامنے بازیچۂ اطفال تھا۔ مرمریں مجسموں سے ہمکلام ہونا ان کے لئے مشکل نہیں تھا۔ وہ قدیم روحوں کو بلاسکتے تھے۔ وہ قیافہ شناس تھے۔ رنگِ رخ سے تاثراتِ قلبی معلوم کرلیتے تھے۔ ذی الحس تھے۔ قوی الفہم تھے۔

انھوں نے بیڑا اٹھایا تھا ہم جنسوں کی اصلاح کا۔ وہ متفق تھے دنیا میں انقلاب پیدا کرنے پر۔ وہ متمنی تھے فرسودہ رسوم وقیود سے آزاد ہوکر ایک جدید نظامِ معاشرت قائم کرنے کے۔ وہ بدل دینا چاہتے تھے ماضی کو حال میں اور حال کو مستقبل میں۔

وہ چاروں جمع ہوئے عظمتِ رفتہ کی یادگار ایک شکستہ آثار گنبد میں جہاں صدیوں سے حیاتِ انسانی نے سانس نہیں لیا تھا۔ وہاں ان کے لئے نہ مرمریں میزیں تھیں نہ آبنوسی کرسیاں۔ نہ ان کے تجربات کے لئے معمل نہ مطالعہ کے لئے کتب خانے نہ پروازِ تخئیل کے لئے شاعرانہ فضا۔ نہ پیچیدہ مسائل پر بحث وتمحیص کے لئے عالمانہ ماحول۔ وہ ان بے ثبات چیزوں سے بالکل بے نیاز تھے مستغنی محض تھے۔ ان کے دماغ ان کے معمل تھے۔ ان کے دل ان کے کتب خانے۔ وہ تمام علوم میں، ہر علم کے تمام شعبوں میں تحصیلِ کمال کرچکے تھے۔

مسلسل سات ہفتہ تک وہ ایک دوسرے کے چہرے پر نظریں جمائے غور کرتے رہے اور اس نتیجہ پر پہونچے۔ کہ تمدنِ عالم میں مدیجی انقلاب پیدا کیا جائے۔ لیکن ابتدا کس پہلو سے ہو؟ ــــ یہ فیصلہ نہ کرسکے۔ انھوں نے پھر سوچنا شروع کیا۔ گیارہ ہفتے گذر گئے۔

آخر ایک نے کہا "املاک میں مساوات نہایت ضروری ہے۔ سرمایہ داری کو دنیا سے نیست و نابود کر دینا چاہئے۔ کسی شے پر قبضۂ انفرادی نہ ہو۔ تمام پیداوار، تمام آمد و خرچ متعلق ہو پوری قوم سے۔ لیکن قومیت کسی ملک کے مخصوص دائرے تک محدود نہ ہو۔ بلکہ قوم نام ہو۔ اقصائے عالم میں بسنے والی تمام نوعِ انسان کی ہئیتِ اجتماعی کا"۔

پندرہ ہفتہ بعد دوسرے مصلح کے رنگ رخ پر اطمینان کے آثار نظر آئے اور اس نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا "مسئلۂ ازدواج قابلِ ترمیم ہے بلکہ لائقِ تنسیخ ہے۔ شادی کا موجودہ مفہوم حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ تعلقاتِ جنسی قائم ہوں لیکن بغیر کسی مخصوص رسم و رواج کے، بغیر کسی مشروط عہد و پیماں کے۔ اصناف کو کامل آزادی ہو۔ کوئی کسی کی زوجہ نہ بنے۔ کوئی کسی کا شوہر نہ ہو۔ نہ ماں اپنے بیٹے کے لئے ناجائز ہو نہ بیٹا اپنی ماں کے لئے حرام سمجھا جائے۔ بھائی کو بہن سے احتراز نہ ہو۔ بہن اپنے بھائی سے اجتناب نہ کرے۔ کسی کو ضبطِ تولید کی ضرورت لاحق نہ ہو۔ کسی کے دل میں افزائشِ نسل کی تمنا نہ رہے نوزائیدہ بچوں کی پرورش صرف حکومت کی طرف سے ہو۔ حکومت ہی انھیں تعلیم دے۔ بادشاہ ان کا مربی ہو۔ اور وہ بادشاہ کے متبنے کہلائیں عزیز و اقارب کا رشتہ قائم نہ ہو۔ صرف باہمی محبت تعلقات کی وسیط بنے"۔

سترہ ہفتہ بعد تیسرے مفکر نے نظر اٹھائی۔ گرد و پیش کی چیزوں پر نگاہ ڈالی۔ اور اطمینان کا سانس لیکر کہا۔ "ہم کو دنیا سے کام کاج کا قلع قمع کر دینا چاہئے۔ ہاتھ پاؤں ہلانے کی ضرورت نہ رہے۔ ہر کام از خود ہو جایا کرے۔ سائنس بہت ترقی کر گئی ہے۔ ایسے جدید ترین آلات اور انکشافاتِ حاضرہ سے امداد لینی چاہئے۔ آہنی انسان ہماری خدمت کریں۔ مشینوں اور برقی قوتوں کے ذریعہ فصل تیار کیجائے بجلی ہمارے خورد و نوش کا انتظام کرے۔ صرف سورج کی شعاعیں اور کہربائی لہریں ہماری معالج ہوں۔ ہمارا کام صرف اس قدر ہو کہ ہم ہوائی جہازوں میں بیٹھ کر فضائے بسیط کی سیر کرتے پھریں۔ مطالعۂ قدرت شغلِ حیات بن جائے اور بس"۔

اکیس ہفتہ بعد چوتھے فلسفی نے اپنے طلسمِ محویت کو توڑا اور آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کسی قدر بلند لہجہ میں کہا "مذہب نام ہے فرسودہ توہمات کے گمراہ کن مجموعہ کا جس کی دورِ حاضرہ میں ضرورت نہیں وہ عقائد جنکی صداقت کا تجزیہ منطقی استدلال کی رو سے غیر ممکن ہو، لائقِ پذیرائی نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح جب تک خدا کے غیر حقیقی وجود کا تصور ذہنِ انسانی پر مسلط رہیگا۔ وہ ہر قسم کی ترقی سے محروم رہینگے۔ لہذا خدا اور مذہبیت کے نقوشِ باطل کو لوحِ قلب سے مٹا دینا چاہئے"۔ وہ عرصۂ دراز تک ایکدوسرے کے نظریہ پر غور کرتے رہے کہ کون سا زیادہ افضل ہے نیز یہ کہ اسے کس طرح دائرۂ عمل میں لایا جائے۔ آخر وہ متفقہ طور پر اس نتیجہ پر پہونچے کہ سب سے پہلے کرۂ ارض سے نوعِ انسان کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ اور غالباً انھوں نے اس تجویز کو دائرۂ عمل میں لانے کے لئے اپنی ہی چار ہستیوں سے ابتدا کی۔ کیونکہ دوسرے دن اسی گنبد میں مردہ حالت میں ملے جہاں صدیوں سے حیاتِ انسانی نے سانس نہیں لیا تھا۔ تاہم کسی کو خبر بھی نہ ہوئی کہ وہاں دنیا کی اصلاح کے لئے چار نظرئے قائم ہوئے اور ہو کر رہ گئے۔

فضل حق قریشی دہلوی

# باب الاستفسار

## مذہب و مذہبیات

(جناب سید احمد صاحب نظر حسینی علم۔ سرائے بوہرہ۔ حیدرآباد دکن)

میں آپ سے ایک مختصر سوال کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں سیکڑوں مذاہب وجود میں آئے اور فنا بھی ہوگئے۔ اقوام عالم نے ہزاروں قوانین بنائے اور مٹا ڈالے۔ ہر قوم نے اپنے اخلاق کا ایک جداگانہ معیار قائم کیا تھا لیکن کسی مذہب نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ دین فطرت ہے اور ہمیں بھی ان کے مطالعہ سے یہی معلوم ہوا کہ ان کے پیش کردہ مذہب کی صورت سے دین فطرت ہونے کی صلاحیت ظاہر نہیں ہوئی البتہ اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دین فطرت ہے اور اس کا غائر مطالعہ کرنے سے اس میں جامعیت اور فطرت کے عین مطابق ہونے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔

اسلام کا یہ دعویٰ بھی کہ وہ آدم سے تا ایندم موجود ہے صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ زمانہ صداقت سے خالی نہیں رہا تھا البتہ اقوام عالم نے غلطی سے مذہب کے خد و خال مٹا کر بزعم خود مذہب کو ایک نئی صورت میں ڈھال دیا۔ اور بعد میں گمراہ ہوگئے۔

وجہ تحریر ہٰذا یہ ہے کہ میں جناب کے خاص خیالات اس مسئلہ پر معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آیا یہ صورت اسلام کی اس وقت پیش نظر ہے آیا وہی اصلی ہے جسے آپ مولویوں کے اسلام کے نام سے تعبیر فرماتے ہیں یا کوئی اور۔ بصورت ثانی کیا اس وقت اسی غلطی کا اعادہ تو نہیں ہو رہا ہے جو گزشتہ اقوام نے کی تھی۔ اور جو بالآخر گمراہی پر منتج ہوئی۔ اس مسئلہ پر بھی غور کرنا ضروری ہے کہ آیا مذہب کو دنیا کا ساتھ دینا چاہئے یا دنیا کو مذہب کا۔ اس لئے انسانی فطرت میں یہ داخل ہے کہ ہمیشہ کامل آزادی چاہتا ہے۔ پھر اخلاق و قانون کی بندش جس کی بنیاد مذہب کے اُصول پر رکھی جاتی ہو ضروری ہے یا نہیں۔ اور ایسی تحدید جو مذہب قائم کرتا ہو انسان کے لئے مفید ہو یا مضر۔ علمائے یورپ و اسلام نے کیا ایسی تحدید کو مضر بتلایا ہو۔ یا کامل آزادی کو ضروری قرار دیا ہو۔ براہ کرم نگار کے ذریعہ ان مسائل پر روشنی ڈالئے تو عنایت ہے۔

(نگار) آپ نے اپنے استفسار کے ذریعہ سے معنًا وکنایۃً چند دعوے پیش کئے ہیں:۔

ایک ـــ یہ کہ تمام مذاہب عالم میں اسلام ہی نے فطری دین ہونے کا دعویٰ کیا اور غائر مطالعہ کرنے سے بھی اس کا یہ دعویٰ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

دوسرا ـــ یہ کہ اسلام کا وجود "آدم سے تا ایندم" دنیا میں ہمیشہ پایا گیا ہے، لیکن اقوام عالم غلطی سے اسکی صورت مسخ کرتے رہے۔

تیسرا ـــ یہ کہ اگر زمانۂ حال کے مولویوں کے بتلائے ہوئے اسلام کو اصلی اسلام نہ سمجھا جائے تو یہ غلطی وگمراہی ہوگی ــ اور

چوتھا یہ کہ ـــ دنیا کو مذہب کا ساتھ دینا چاہئے، مذہب دُنیا کا ساتھ دینے پر مجبور نہیں ہے۔

قبل اس کے کہ میں آپ کے ان دعادی پر کوئی تنقید کروں مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے "دین فطرت" کا کوئی مفہوم متعین کر لیا جائے۔

غالبًا آپ کو اس سے انکار نہ ہوگا کہ "دین فطرت" سے مراد وہی دین ہو سکتا ہے جو "فطرت انسانی" کے اقتضاء کے مطابق واقع ہو یا بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ جس میں فطرتِ انسانی کے اصلاح کی اہلیت پائی جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ "فطرت انسانی" کا اقتضاء کیا ہے اور اس کی اصلاح و ترقی کیا معنی رکھتی ہے۔

اس سلسلہ میں جب آپ تاریخ عالم کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انسان ترقی کی جس منزل سے گزر رہا ہے وہ اسے دفعتًہ حاصل نہیں ہوئی، بلکہ لاکھوں سال کے تدریجی ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ ایک زمانہ تھا جب وہ درندوں اور جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا، اس کے بعد حجری عہد آیا جب پتھر کے آلات واوزار طیار کرکے تمدن کی بنیاد اس نے قائم کی، پھر اسنے اور ترقی کرکے کاشت وزراعت شروع کی، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس نے اپنے ذہن و دماغ سے کام لیکر مشینیں ایجاد کیں جہاز بنائے، ریل طیار کی، بجلی کو اپنے قابو میں کیا اور تمام موجودات عالم پر مالکانہ متصرف ہوگیا۔

اچھا فرض کیجئے کہ مذہب ہمیشہ سے ہر زمانہ میں موجود رہا ہے (جیسا کہ آپ نے دعویٰ کیا ہے) اور کوئی نہ کوئی نبی یا پیغمبر ہر دور میں پایا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ نبی یا مُصلح اپنے ہی دور کے انسانوں میں سے منتخب ہوتا ہوگا ورنہ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ عہد وحشت کے انسانوں کا پیغمبر عہد حجری کا انسان رہا ہو یا عہد حجری کا پیغمبر عہد فلزاتی کے انسان کی طرح ہو۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ مذاہب عالم میں جو تدریجی ترقیاں ہوئی ہیں وہ بھی انسان کے ذہنی ارتقاء کی پابند تھیں جب انسان بالکل وحشی تھا تو اس عہد وحشت کے پیغمبر نے اس کو بُت پرستی سکھائی اس کے بعد جب انسان آہستہ آہستہ متمدن ہوتا گیا تو پیغمبروں کی تعلیم بھی اسی کے ساتھ بدلتی گئی یہاں تک کہ وہ خدا جو کسی وقت صرف پتھر کی مورت تھا زمان ومکان کی قید سے آزاد ہوکر ایک مجرد قوت میں تبدیل ہوگیا۔

اس بیان سے آپ کے چاروں دعووں کی تردید ہوگئی، لیکن بہ خیال مزید وضاحت میں سلسلہ وار آپ کے ہر دعوے کو لیکر بتانا چاہتا ہوں کہ بدقسمتی سے آپ کسی ایک بات میں صحیح نتیجہ پر نہیں پہونچے۔

۱۔ آپ کا یہ کہنا کہ تمام مذاہب عالم میں اسلام ہی نے فطری ہونے کا دعویٰ کیا اور غایر مطالعہ سے بھی اس کا یہ دعویٰ صحیح معلوم ہوتا ہے بالکل بے بنیاد ہے، کیونکہ جو مذہب جس زمانہ میں پیدا ہوا وہ اسی زمانہ کے انسانوں کے عقول و اذہان کے مطابق پیدا ہوا اور اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اُسے فطری نہ کہا جائے، کیونکہ فطرت انسانی زیادہ سے زیادہ جس خیال کو قبول کر سکتی تھی اسی کو مذہب نے پیش کیا، اور اس سے آگے مذہب بڑھ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ مذہب کے مبلغ بھی تو آخر اسی دور کے ہوا کرتے تھے اور وہ اس حد سے آگے کیونکر بڑھ سکتے تھے جس حد تک انسان کی ذہنی ترقی اُن کے دور میں ہو چکی تھی۔

۲۔ آپ کا یہ فرمانا کہ اسلام کا وجود آدم سے تا ایندم دنیا میں ہمیشہ پایا گیا ہے لیکن اقوام عالم غلطی سے اس کی صورت مسخ کرتے رہے، بالکل میری سمجھ سے باہر ہے۔ اگر میں آپ کے اس دعوے کو تسلیم کر لوں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اسلام اول اول بُت پرستی کی شکل میں پیدا ہوا تھا اور بعد کو لوگوں نے اس سے منحرف ہو کر بُت پرستی کی مخالفت شروع کر دی۔۔ اور اگر آپ یہ فرمائیں کہ اسلام نے بُت پرستی کی تعلیم کبھی نہیں دی تو پھر آپ ہی بتائیے کہ انسان کے عہد وحشت میں وہ کس صورت میں پایا جاتا تھا۔ البتہ اگر آپ یہ کہیں کہ اسلام نام ہی اُس مذہب کا ہے جو مختلف زمانوں میں حالات کے لحاظ سے مختلف صورتوں میں نمودار ہوتا رہا تو بیشک یہ ایک حد تک صحیح ہو سکتا ہے لیکن پھر اسی کے ساتھ آپ کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اگر جاہل و وحشی انسان کے ابتدائی دور میں وہ بت پرستی تھا تو انتہائی دور ارتقاء میں انکارِ خدا کی حد تک پہونچ سکتا ہے، اگر عقول انسانی یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کرے۔

۳۔ آپ کا یہ دعویٰ کہ زمانۂ حال کے مولویوں کا بتایا ہوا مذہب عین اسلام ہے اور اس سے ہٹنا غلطی و گمراہی، بہت کچھ بحث و تنقید چاہتا ہے لیکن میں گفتگو کو مختصر کرنے کے لئے آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ زمانۂ حال کے مولوی کا بتایا ہوا مذہب کونسا ہے؟ کیا یہ مذہب وہ ہے جو سنیوں کے مولویوں نے بتایا ہے؟ کیا یہ مذہب وہ ہے جسے شیعہ جماعت کے مجتہدوں نے ظاہر کیا ہے؟ کیا یہ مذہب وہ ہے جس کی تبلیغ وہابی مولوی کیا کرتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس کے جواب میں آپ اپنے ہی مسلک کے مولوی کی نشاندہی کر دیں گے، درانحالیکہ آپ کا وہی مولوی دوسرے مسلک والوں کے نزدیک جو یقیناً خود بھی مسلمان ہیں بالکل گمراہ ہے۔۔ پھر بتائیے کہ وہ شخص جو واقعتاً یہ سمجھنا چاہتا ہے کہ اسلام کا صحیح مفہوم کیا ہے، اس صورت میں کیا کرے گا۔ وہ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کے مذہبی لٹریچر کو دیکھے گا اور جب اسے معلوم ہو گا کہ ہر مسلک دوسرے مسلک کو بُرا کہنے کے لئے کوئی نہ کوئی دلیل ضرور رکھتا ہے، تو لامحالہ وہ سب سے متنفر ہو جائے گا اور یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گا کہ یہ تمام مسالک لغو ہیں۔

اس وقت آپ اسلام کا کوئی مفہوم ایسا متعین نہیں کر سکتے جس پر تمام جماعت اسلامی کو اتفاق ہو اور اس لئے اب آپ ہی بتائیے کہ اسلام کسے کہتے ہیں اور کس مولوی کا بتایا ہوا اسلام قابل اعتبار ہے۔

—— اتنی گفتگو کے بعد آپ کا چوتھا دعوےٰ از خود باطل ہو جاتا ہے، کیونکہ جب تک تمام دنیا کسی ایک مذہب کی پابند نہ ہو جائے یہ کہنا کہ دنیا کو مذہب کا ساتھ دینا ضروری ہے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ بیشمار مذاہب میں سے کسی ایک مذہب کو اگر چن بھی لیا جائے تو بیکار ہے کیونکہ نوع انسانی کا اختلاف دیگر مذاہب کی وجہ سے بہر حال باقی رہیگا اور اس صورت میں مذہب کی پابندی بجائے مفید ہونے کے مضرت رساں ثابت ہوگی اور جنگ کا دروازہ ہر وقت ہر جماعت کے لئے کھلا رہیگا۔

علاوہ اس کے یوں بھی دنیا کو مذہب کا ساتھ دینے پر مجبور سمجھنا بالکل خلاف حقیقت اور فطرت کے منافی ہے۔ کیونکہ مذہب خود ہمیشہ انسانی دماغ کے رجحانات کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے اور اگر وہ انسان کی ترقی تمدن و معاشرت کا ساتھ دینے کا اہل نہیں ہے، تو اس کا عدم و وجود برابر ہے۔

اسلام میں اگر کوئی خصوصیت پائی جاتی ہے تو صرف یہی کہ وہ زمانہ کا ساتھ دینے والا ہے اور اسی لئے اس کو دین فطرت کہہ سکتے ہیں، لیکن اس صورت میں آپ اس کو کسی ایک سطح پر قائم نہیں کر سکتے نہ کوئی خاص مفہوم اس کا متعین کر سکتے ہیں۔ وہ زمانہ کے ساتھ بدلتا رہیگا، انسانی عقول کے ساتھ خود بھی ترقی کرتا رہیگا، اور جس طرح اسوقت وہ اسلاف کی کتابوں میں ڈھونڈھنے سے کہیں نہیں ملسکتا، بالکل اسی طرح وہ مستقبل میں حال کے لٹریچر سے غائب ہو جائے گا۔ کیونکہ اسلام نام ہے محض نوع انسانی کی ترقی و استعلار کا، عروج و ارتقار کا، اور ہر اس سانچہ میں ڈھل جانے کا جو زمانہ کا اقتضا رہے —— اور اگر مولوی واقعی کوئی مفہوم اسلام کا اتنا وسیع پیش کر سکتا ہے تو آپ کیا سارا زمانہ اسکے ماننے کے لئے طیار ہے، ورنہ یوں محض ذکر حور و قصور کی ترغیب اور ہاویۂ جہنم کی تخویف سے تو اب یہ "کارگاہ مینائی" چلتا ہوا نظر آتا نہیں، ایک مذہب کا صحیح فریضہ روح عمل پیدا کرنا ہے، لیکن روح عمل سے مراد عبادت نہیں کہ یہاں نمازیں پڑھو اور وہاں حوریں لو، بلکہ ایک عزم مردانہ کے ساتھ اٹھ کھڑا ہونا مراد ہے، زمین کے سینہ کو چیر کر اسکے اندر چھپی ہوئی سعادت و برکت حاصل کر لینا اور فکر و تدبر سے کائنات پر چھا کر عناصر عالم پر حکمرانی کرنا مقصود ہے —— یہیں اسی دنیا میں، اسی زندگی میں، اسی سرزمین پر —— اور اسی وقت —— پھر اگر اسلام کا واقعی یہی مفہوم ہے اور "انتم الاعلون ان کنتم مومنین" کی تعلیم سے یہی مقصود ہے تو آیندہ کبھی اسکا خیال بھی دل میں نہ لائیے کہ مذہب زمانہ کا ساتھ دینے پر مجبور نہیں اور مولویوں کا بتایا ہوا اسلام صحیح ہے —— لیکن اگر اسلام کا مفہوم یہ نہیں ہے اور "انتم الاعلون" سے یہاں کی ذلت و نکبت اور وہاں کی "اعلیٰ علیین" مراد ہے تو آپ کو آپ کا اسلام مبارک ہو، تنہا جنت میں جا کر مزے اڑائیے اور ہمیں دوزخ ہی میں رہنے دیجئے کہ فردوس کی جامد زندگی سے جہنم کی پُر اضطراب زندگی بدرجہا بہتر ہے۔

# مطبوعات موصولہ

**ایک افسانہ اور چار خاکے** اس کتاب میں ایک فلم ایکٹرس کی زندگی کے اُن جزئیات سے بحث کی گئی ہے جن کا علم دنیا کو بہت کم ہوتا ہے۔ اس فسانہ کے مصنف ہمارے عزیز دوست ادیب جلیل اختر شیرانی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ایک فلم اسٹار کا حال لکھنے کے لئے اختر سے زیادہ موزوں کوئی اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اس موضوع کے لئے دل و دماغ میں جس گرمی کی ضرورت ہے وہ اُن میں بدرجۂ اتم موجود ہے اور مجھے یہ دیکھکر واقعی مسرت ہوئی کہ انھوں نے جزئیات تنفید کے سلسلہ میں اپنی اُن حسرتوں کو چھپانے کی کوشش نہیں کی جن کے بغیر ایک افسانہ نگار کا فسانہ کوئی رنگ پیدا کر ہی نہیں سکتا۔

غالب نے تو صرف ایک شعر میں اس تمنا کا اظہار کرکے بات کو ضرورت سے زیادہ مختصر کردیا لیکن ایک نوجوان فسانہ نگار سے پوچھئے کہ جب وہ دوران تحریر میں اس منزل سے گزرتا ہے کہ:۔

خدا وہ دن کرے جب اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

تو اس کے جذبات کا کیا عالم ہوتا ہے ۔ ہر چند اختر شیرانی نے بظاہر "یہ بھی کہوں" کے ساتھ "وہ بھی" سے گفتگو نہیں کی لیکن معناً جہاں کہیں وہ اس کا اظہار کرگئے ہیں، وہاں وہ بیدل کی زبان میں یکسر "نیمۂ داغ و نیمۂ خاکستر" نظر آتے ہیں۔

کتاب چھوٹے سائز کے ۱۰۹ صفحات پر شایع ہوئی ہے اور قیمت ایک روپیہ (فسانہ کی خوبی کے لحاظ سے نہیں بلکہ تجارتی نقطۂ نظر سے) زاید ہے۔ دفتر فلمستان ٹمپل روڈ لاہور سے خط و کتابت کی جائے۔

**دردِ زندگی** مجموعہ ہے جناب احسان بن دانش کی نظموں کا جو رہنے والے تو کاندھلہ ضلع مظفر نگر کے ہیں لیکن بہ سلسلۂ کسب معاش کچھ زمانہ سے لاہور میں مقیم ہیں ۔ آدمی نوجوان ہیں، ذہین ہیں، رنگین طبع ہیں اور ان کی ہر نظم سے ان کی شاعری کا مستقبل بہت درخشاں نظر آتا ہے۔ میں نے مستقبل کا ذکر اس لئے کیا کہ بہ حالت موجودہ ان کی شاعری عدم توازن تعبیر ناقص، اور زبان و محاورہ کی غلطیوں سے پاک نہیں ہے۔ اور مجھے افسوس ہوگا اگر جناب احسان کے احباب نے تنقید صحیح سے کام لیکر اُن کو اس بیراہ روی سے باز نہ رکھا جس کے آثار اُن کے کلام میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ میں یہاں بعض اشعار پیش کرکے بتانا چاہتا ہوں کہ جناب دانش کے کلام میں کس قسم کی خامیاں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ان کا ایک قطعہ ہے:۔

دوپہر ہونے کو ہے سستا گیا جنگل تمام　　اک کرن شاخوں سے چھنکر آرہی ہے پھول پر

جس طرح اک گاؤں کی دوشیزۂ معصوم پر شہر کے بے غیرت و بے مہر انساں کی نظر

اول تو سنانا کوئی لفظ نہیں ہے۔ سنانا سے سناتا فعل بنایا گیا ہے جو بالکل خلاف محاورہ ہے۔ دوسرے جو تشبیہ استعمال کی گئی ہے وہ بے محل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مشبہ اور مشبہ بہ کے درمیان ادنیٰ سی وجہ شبہ بھی فن کے لحاظ سے کافی سمجھی جاتی ہے لیکن مرکب اور متحرک تشبیہوں میں بہت زیادہ تماثل کی ضرورت ہے۔

شاخوں سے چھنکر کرن کا پھول پر پڑنا حجاب انفعال اور جھجک کو ظاہر کرتا ہے اور شہر کے بے غیرت انسان کی نظر گاؤں کی معصوم دوشیزہ پر بیباک و بیحجاب پڑتی ہے اس لئے تشبیہ کی تعبیر ناقص ہے۔

بعض جگہ انھوں نے لفظ حسین کو فارسی لفظ سمجھکر اضافت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ مثلاً "ذکر حسینؑ" - حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔

کہیں کہیں پنجاب کے زیر اثر انھوں نے ایسے ایسے مصرعے بھی کہہ ڈالے ہیں

تصور نے دنیا بسائی ہوئی ہے

تجلی نے گردن جھکائی ہوئی ہے

ایک جگہ انھوں نے "خورشید کی خمیدہ شعاعیں" بھی نظم کردی ہیں، ممکن ہے کہ آئنسٹین انحناء زمان (Curvature [illegible]ment کی طرح) کسی وقت انحناء شعاع کا بھی قایل ہو جائے، لیکن ابھی تک تو شعاعوں کی خمیدگی کا نظریہ کسی سائنس داں نے بھی پیش نہیں کیا، شاعر کا کیا ذکر ہے۔ ایک شعر ہے۔

سوئے زمیں تھے دیدۂ میگوں جھکے ہوئے سیال میکدے تھے فضا میں رکے ہوئے

اس میں بھی وہ تعبیر و تشبیہ کا نقص ہے "دیدۂ میگوں" اس آنکھ کو کہتے ہیں جس میں شراب کا سا ہلکا رنگ پایا جائے، اس لئے اسکو "سیال میکدہ" کہنا بالکل بے معنی بات ہے اگر "دیدۂ بادہ ریز" کہا جاتا تو خیر ایک حد تک درست بھی ہو سکتا تھا۔

اسی طرح میں کے جگہ پر، سے کی جگہ کی وغیرہ کا استعمال اکثر شعروں میں غلط کیا گیا ہے۔ لیکن باوجود ان تمام خامیوں کے جناب دانش کے کلام میں ندرت و تازگی، جوش و مستی، پاکیزگی و رنگینی کی بھی کمی نہیں ہے اور کتنا اچھا ہوتا اگر ان کا کلام نقایص سے پاک ہوتا۔

ممکن ہے جناب دانش یا اُن کے احباب کو میری یہ تنقید ناگوار ہو، لیکن اگر انھوں نے کسی وقت ٹھنڈے دل سے غور کیا تو غالباً انھیں اعتراف کرنا پڑے گا کہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ یکسر خلوص و صداقت پر مبنی ہے۔

یہ مجموعہ چھوٹی تقطیع کے ۲۰۳ صفحات کو محیط ہے اور ذیشان بکڈپو ہزنگ لاہور سے ۱۲ میں ملسکتا ہے۔

**غالب شکن** یہ ایک خط ہے جو یاسؔ عظیم آبادی ثم یگانہ چنگیزی لکھنوی نے سید مسعود حسن صاحب رضوی ام۔ اے کو لکھا تھا۔ اس خط میں بھی انھوں نے اسی سوقیانہ زبان و خیال سے کام لیا ہے جس نے عرصہ سے غالبؔ کے باب میں اُن کی "تنگیٔ چشمِ حسود" کی ہمیشہ آئینہ داری کی اور کرتی رہیگی کیونکہ ایسے لوگوں کے لئے "نتواں دست بخبر برگ از دست" فیصلہ پہلے ہی ہوچکا ہے۔

یاسؔ و یگانہ بحیثیت شاعر ہونے کے کیا حیثیت رکھتے ہیں، یہ بحث اسوقت موضوع سے بالکل علٰحدہ ہے، لیکن اسمیں کلام نہیں کہ غالبؔ کے مسئلہ میں انھوں نے اپنی جس فطرت کو اسوقت تک پیش کیا ہے وہ اس درجہ دنی و پست ہے کہ شاید ہی دنیائے شاعری میں کوئی دوسری نظیر اس کی مل سکے۔ حال ہی میں جو رباعیات غالب کے متعلق ان کی شائع ہوئی ہیں اُن کی سخیف زبان، اور ان کا بازاری لب و لہجہ ہرگز اس قابل نہیں کہ کوئی سنجیدہ انسان ان کا ذکر بھی کرے اور اسی لئے میں نے نگار میں اس پر ریویو بھی نہیں کیا کیونکہ اس بدطینتی پر روشنی ڈالنے کے لئے جو غالبؔ کے باب میں یاسؔ نے ظاہر کی ہے، صرف انھیں الفاظ کے استعمال کی ضرورت ہے جو خود انھوں نے استعمال کئے ہیں، لیکن یہ مرتبۂ بلند جس کو ملنا تھا ملگیا، کوئی دوسرا کیونکر جرأت کرسکتا ہے۔

عہد بنی امیہ میں جب جناب امیر پر علی الاعلان مساجد میں تبرا بازی کیجاتی تھی تو امیرِ وقت نے ایک مشہور عالم کو بلا کر کہا کہ مسجد جامع میں جاکر علیؓ پر لعن کرے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس سے انکار نہیں کرسکتے تھے کیونکہ خوف جان کا تھا اس لئے وہ مسجد میں گئے اور لوگوں سے مخاطب ہوکر کہا کہ "امیر المومنین فرماتے ہیں کہ میں علی پر لعنت بھیجوں اس لئے میں اُس پر لعنت بھیجتا ہوں۔"

اسی طرح یاسؔ کی ہفوات نگاری کا اگر کسی سنجیدہ انسان سے کوئی جواب ہوسکتا ہے تو زیادہ سے زیادہ اسی طرح کہ یاسؔ کی ان تمام گالیوں میں ضمیر کا مرجع خود انھیں کو قرار دیدے، لیکن میں تو کہتا ہوں کہ اتنی توجہ کرنا بھی یاسؔ ایسے معمولی انسان کو بہت کچھ اہمیت دیدینا ہے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ آج کیوں میں نے اپنا اتنا وقت اس شخص کے اوپر ضایع کیا۔

حیرت تو مجھے ان پبلشروں پر ہے جو اس مزخرف کتابوں کو شایع کردیتے ہیں اور بجر لطف یہ کہ ریویو کے بھی متمنی ہوتے ہیں اس رسالہ کے اخیر میں بھی چند رباعیوں میں گالیوں کی نقل کی گئی ہے جن کو دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ اگر تناسخ واقعی کوئی چیز ہے تو یاسؔ اگلے جنم میں بھی اس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جو تالیاں بجا بجا کر گالیاں دینے میں شہرت رکھتا ہے اور آئندہ بھی ان کو اسی جماعت میں جنم لینا ہے۔

اس رسالہ اور نیز مجموعۂ رباعیات کی اشاعت کا فخر اُردو بک اسٹال لاہور کو حاصل ہوا ہے۔ جن صاحب کو ضرورت ہو وہاں سے طلب کرلیں

--

## طلوع

مجموعہ ہے ضیا صاحب فتح آبادی کے بعض اشعار کا جنھیں قطعات کے نام سے جناب ساغر نظامی نے ساغر بک ڈپو ادبی مرکز میرٹھ سے شایع کیا ہے۔ یہ قطعات صرف چار چار مصرعوں کے ہیں اور رباعیات کی طرح ان کے پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے قوافی رکھتے ہیں گو وزن رباعی کا نہیں ہے۔ ضیا صاحب اور ان کی شاعری سے میں اسوقت تک بد قسمتی سے ناواقف رہا حالانکہ ساغر صاحب کے نزدیک "وہ قطعی الہامی شاعر ہیں اور اس لئے پیغمبروں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں"۔

افسوس ہے کہ میں اُن کی نسل کے متعلق تو کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن جس حد تک ان کی شاعری کا تعلق ہے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ مجھے اس میں کسی ایک جگہ بھی الہام کی جھلک نظر نہیں آئی۔ ساغر صاحب نے جن الفاظ میں ضیا صاحب کا تعارُف کرایا ہے وہ اس درجہ مرعوب کن ہیں کہ اگر پہلے کوئی شخص ان کو پڑھ لے تو پھر احترام کلام کی صورت سوائے اس کے اور کوئی باقی نہیں رہتی کہ اس کو تعویذ بنا کر گلے میں ڈال لیا جائے یا چینی کی قاب پر زعفران سے لکھ لکھ کر تپ دق کے مریضوں کو پلایا جائے، لیکن وہ تو کہئے خیریت یہ ہوئی کہ تفسیر سے پہلے میں نے کلام دیکھ لیا اور اس عذاب سے بچ گیا۔

ساغر صاحب اگر کبھی ملے تو پوچھوں گا کہ ضیا صاحب کو کیوں اتنا بنایا گیا ہے اور اگر یہ واقعی دوست نوازی ہے تو اللہ انکی دوستی سے محفوظ رکھے۔

## بارش اور قرآن

اس وقت ایک جدید تعلیم یافتہ جماعت جو اپنے آپ کو مذہب سے بھی علحدہ نہیں کر سکتی، ایسی پیدا ہوگئی ہے جو علوم و فنون کے تمام نظریوں کو کلام مجید سے ثابت کرنے پر مُصر ہے اور اپنے اس دعوے کے ثبوت میں وہ "ولا رطب ولا یابس الا فی القرآن المبین" کو پیش کرتی ہے۔ اس جماعت کے ایک فرد کوئی صاحب شاکر جبل پوری ہیں، اور انھوں نے اس رسالہ میں یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ بارش کے متعلق جو جدید تحقیق یورپ نے پیش کی ہے اسکا ذکر اب سے بہت پہلے قرآن مجید میں ہو چکا ہے۔ وہ اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں، اس کا ذکر فضول ہے کیونکہ انسان اگر تاویل پر آجائے تو وہ خالق باری اور دستور الصبیان کو بھی تمام علوم و فنون کا مخزن ثابت کر سکتا ہے، چہ جائیکہ کلام پاک جو واقعی مواعظ حکمیہ کا مجموعہ ہے۔

میں نے اس نوع کی کوشش کو کبھی نگاہ استحسان سے نہیں دیکھا، کیونکہ قرآن پاک خالص اخلاقی درس ہدایت پیش کرنے والی چیز ہے اور اس میں علوم و فنون کی جستجو کرنا اس کی توہین ہے۔ علاوہ اس کے علمی نظرئے ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں اور اگر کلام مجید کو انھیں کے ساتھ مطابقت دینے کی کوشش کی گئی تو کل جب وہ نظرئے بدل جائیں گے تو دوسرے طریقہ کھینچ تان کے اختیار کرنے پڑیں گے اور اس طرح قرآن پاک بالکل بچوں کا کھیل ہو جائے گا۔ ممکن ہے اس کے مصنف و پبلشر اس کو اسلامی خدمت سمجھیں، لیکن میری رائے میں یہ اسلام کی تخریب ہے اور کسی طرح اہل علم کے حلقہ میں پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں

دیکھی جاسکتی۔ اس رسالہ کی قیمت ۴ روپے اور مطبع نادری جبل پور سے مل سکتا ہے۔

## سمن پوش اور دوسرے افسانے

مجنوں گورکھپوری کے اُن چھ افسانوں کا مجموعہ ہے جو اس سے قبل رسالۂ جن اور نگار میں شایع ہو چکے ہیں اور جنھیں وہ روحانیات سے نہ صرف متعلق سمجھتے ہیں بلکہ اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

جناب مجنوں اُردو کے مشہور افسانہ نگاروں میں سے ہیں اور ہر چند اُن کے فسانوں میں تشاؤم کی یکسانیت کی وجہ سے کوئی تنوع نہیں پایا جاتا، لیکن میر کی شاعری کی طرح عشق کی ہمت جھیلنے لینے میں وہ ضرور ایک حد تک کامیاب ہو جاتے ہیں۔

اگر ان افسانوں کا تعلق روحانیات سے ظاہر نہ کیا جاتا تو بہتر ہوتا، کیونکہ اس صورت میں ایک شخص کو اس امر پر غور کرنے کی ضرورت نہ ہوتی کہ کیا "روحانیت" اسی قسم کے مقالوں سے ثابت کی جاسکتی ہے نیز یہ کہ جس چیز کو "روحانیت" سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ صرف واہمہ پرستی تو نہیں۔ یہ مجموعہ چھوٹی تقطیع کے ۱۶۶ صفحات کو محیط ہے اور ایک روپیہ میں دفتر ایوان اشاعت گورکھپور سے مل سکتا ہے۔

## اُردو کا پہلا ناول نگار

مسٹر اویس احمد بی۔ اے نے اس عنوان سے ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد کے سالانہ جلسہ میں ایک مضمون پڑھا تھا جو انعام کا مستحق سمجھا گیا اور بعد کو مصنف نے اسے کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ اس میں اُردو کا پہلا ناول نگار مولوی نذیر احمد صاحب کو قرار دیا گیا ہے اور ان کی اس حیثیت کو اُن کی تصانیف سے نمایاں کر کے پورا حق تنقید ادا کیا گیا ہے۔ مسٹر اویس احمد آجکل کے نوجوان ادیبوں میں بہت پاکیزہ ذوق تنقید رکھتے ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں نہایت صاف و سلیس زبان میں لکھتے ہیں۔ یہ کتاب ۱۲ میں، ڈرن بک ڈپو ہیوٹ روڈ سے مل سکتی ہے۔

## جامع اللغات اُردو

پاکٹ سایز اُردو لغت ہے جس میں بیس ہزار سے زیادہ الفاظ اور اُن کے مرکبات کے نہ صرف معنی بتائے گئے ہیں بلکہ یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ ایک لفظ کس زبان کا ہے، مونث ہے یا مذکر واحد ہے یا جمع، لازم ہے یا متعدی۔

میں نے جستہ جستہ اس کو دیکھا اور جس جگہ نگاہ پڑی کوئی غلطی مجھے نظر نہیں آئی۔ البتہ کہیں کہیں فارسی و عربی کے ایسے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں جو عام طور پر اُردو میں مستعمل نہیں ہوتے۔ مثلاً نغول۔ غچک۔ غراب البین وغیرہ۔ بہتر ہوتا اگر ان کے بجائے دوسرے کثیر الاستعمال الفاظ تلاش کر کے درج کئے جاتے۔

کتاب مجلد شایع ہوئی ہے اور کتابت و طباعت بھی بُری نہیں ہے۔ مولوی محمد رفیع صاحب نے اس کی ترتیب میں کافی محنت و کاوش سے کام لیا ہے اور رائے صاحب رام دیال اگروالا الہ آباد نے اس کی اشاعت کر کے زبان اُردو کی قابل قدر

خدمت انجام دی ہے۔ قیمت بھی نہایت مناسب یعنی صرف ایک روپیہ رکھی گئی ہے تاکہ ہر اردو داں شخص آسانی سے اسے حاصل کر سکے۔

**یوسف ہندی قید فرنگ میں**

غالب کے واقعات زندگی میں ایک خاص واقعہ اُن کے مقید ہو جانے کا بھی ہے۔ جس کا ذکر خود انھوں نے بھی کیا ہے۔ جناب محسن بن شبیر حیدرآبادی نے اسی واقعہ کی تفتیش و جستجو کر کے جتنی تفصیل مل سکی، مختصر سی کتاب کی صورت میں پیش کر دی ہے۔ کتاب مجلد شایع کی گئی ہے اور لکھائی چھپائی اچھی ہے۔ نہ قیمت درج ہے نہ ملنے کا پتہ، لیکن غالباً مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد سے مل سکے۔

**تنقیدات عبدالحق**

مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے سکریٹری انجمن ترقی اُردو کتابوں کا مقدمہ لکھنے اور ادبی کتابوں پر تنقید کرنے میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ چنانچہ محمد تراب علی خاں باز حیدرآبادی نے اُن کی بعض تنقیدیں جو ۳۲ مختلف کتابوں پر رسالۂ اُردو میں شائع ہو چکی ہے علحدہ کتابی صورت میں چھاپ دی ہیں، جو طلبۂ ادب کے لئے یقیناً فائدہ سے خالی نہیں، کتابت و طباعت پاکیزہ ہے اور عہ میں کاشانۂ باز بازار گھانسی حیدرآباد دکن سے یہ مجموعہ مل سکتا ہے۔

**سید الانبیاء**

کارلایل کی کتاب "ہیرو اینڈ ہیرو ورشپ" نہایت مشہور کتاب ہے۔ اس میں اسنے آنحضرت کے حالات اور اسلامی تعلیمات پر تنقید کی ہے۔

محمد اعظم خاں صاحب ام۔ اے نے اس کے دوسرے لکچر کا ترجمہ (جو اس موضوع سے متعلق ہے) اُردو میں پیش کیا ہے اور پورے حُسن کے ساتھ، اس کی قیمت عہ ر ہے اور غالباً مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن سے ملسکتا ہے۔

**باز کے سو شعر**

تراب علی خاں باز دکن کے ایک نوجوان شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے سو شعر کا انتخاب نہایت پاکیزہ طباعت و کتابت کے ساتھ اس نام سے شایع کیا ہے۔ اور ۱۲ میں مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن سے مل سکتا ہے۔

**خواب پریشاں**

"مڈسمرس نائٹ ڈریم" شیکسپیر کا نہایت مشہور ڈرامہ ہے۔ اب سے ۳۵ سال قبل (غالباً سب سے پہلے) مولوی امیر احمد صاحب علوی بی۔ اے کاکوروی نے اس کا ترجمہ کیا تھا جو اودھ پنچ میں بالاقساط شائع ہوا۔ اب اس کو علحدہ کتابی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ شیکسپیر کے ڈراموں کا ترجمہ اُردو بہت آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ اگر کسی شخص نے شیکسپیر کے لٹریچر کی روح کو سمجھ لیا تو وہ اسمیں کامیاب ہو گیا اور جس نے صرف الفاظ کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی وہ ناکام رہا۔

میں نے اس ترجمہ کو جستہ جستہ دیکھا اور غالباً خلاف حقیقت نہ ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ ایسا صاف و شگفتہ، اور اصل زبان کے جذبات کا حامل ترجمہ اس وقت تک میری نگاہ سے نہیں گزرا۔

ہمارے ملک کے نوجوان ادیبوں کو جو انگریزی ڈراموں کا ترجمہ کرنے کے شایق ہیں اس کا مطالعہ ضروری ہے۔

یہ کتاب امیر محل کاکوری (لکھنؤ) کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

**بچّوں کا تحفہ** اس کتاب کے دو حصے ہیں اور دونوں میں بچوں کے لئے آسان، مفید و دلکش نظمیں درج کی گئی ہیں ان نظموں کے مصنف محمد شفیع الدین صاحب نیر ہیں جو ماڈرن ہائی اسکول نئی دہلی میں مدرس ہیں۔ جن عنوانات پر نظمیں لکھی گئی ہیں وہ واقعی دلچسپ بھی ہیں اور مفید بھی۔ زبان نہایت سلیس و سادہ ہے اور طرز بیان بہت سلجھا ہوا۔ جابجا تصویریں بھی نہایت پاکیزہ دی گئی ہیں اور طباعت و کتابت بھی نہایت پسندیدہ ہے۔ ہر حصہ کی قیمت آٹھ آٹھ آنے ہے اور مصنف سے مل سکتے ہیں۔

**مصلحانِ تعلیم** اس کتاب میں مغرب کے دس مصلحین تعلیم مثلاً روسو، لاک، اسپنسر، مانٹی سوری وغیرہ کے حالات اور اُن کے نظریات تعلیم سے گفتگو کی گئی ہے۔ اسوقت جبکہ بچوں کی تعلیم کا مسئلہ ہندوستان کے ہر صوبہ میں موضوع بحث بنا ہوا ہے، اس کتاب کی اشاعت بہت برمحل ہے اور ضرورت ہے کہ اس مسئلہ سے دلچسپی لینے والے اس کا مطالعہ کریں یہ کتاب ۱۹۲ صفحات پر مجلد شایع ہوئی ہے اور جناب عمر یافعی صاحب۔ سن برج۔ حیدرآباد دکن سے عہر میں ملسکتی ہے۔ اس کے مولف ابوالمکارم فیض محمد صدیقی بی۔ اے ہیں۔

**روحِ سیاست** ابراہیم لنکن، امریکہ کا بہت مشہور پریسیڈنٹ ہوا ہے۔ اس ڈرامہ میں اس کی زندگی کے جستہ جستہ واقعات پیش کئے گئے ہیں۔ پنجاب کے دو مشہور ڈرامہ نگار نور آلہی و محمد عمر صاحبان اس کے مصنف ہیں اور ۸/ میں اُردو بک اسٹال لاہور سے ملسکتا ہے۔

**حضرت امجد کی شاعری** یہ کتاب حضرت امجد کا کلیات نہیں بلکہ اُن کی شاعری پر تنقید ہے جسے جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی نے کتابی صورت میں پیش کیا ہے۔ جناب امجد حیدرآباد کے بہت مشہور شعراء میں سے ہیں اور اُس اسکول کی یادگار ہیں جس کی ابتدا نظیر اکبرآبادی سے ہوئی اور پھر حالی و اسمٰعیل میرٹھی نے جس کو ترقی دی۔ جناب امجد اخلاقی نظمیں لکھنے میں یدطولیٰ رکھتے ہیں اور گل و بلبل یا حسن و عشق ان کا موضوع کبھی نہیں رہا۔ وہ نہایت سہل و آسان زبان میں واقعات کی تصویر پیش کرتے ہیں اور جزئیات کے استقصار کی پوری سعی فرماتے ہیں۔ اس کتاب میں مصنف نے امجد صاحب کے تمام اصناف شاعری پر بہت قابلانہ تبصرہ کیا ہے اور اس کا مطالعہ

یقیناً دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس کی قیمت ایک روپیہ ہے اور مکتبۂ ابراہیمیہ سے ملسکتی ہے۔

**وفا کی دیوی** ڈراما ہے جسے ہمارے عزیز دوست مولانا کیفی چریاکوٹی نے الف لیلہ کے فسانۂ نورالدین و مریم سے اخذ کرکے بہت کچھ حذف و اضافہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ابتدا میں ایک بسیط مقدمہ ڈراما کی تاریخ پر لکھا گیا ہے جو اسقدر دلچسپ و مفید ہے کہ اگر کتاب میں سوائے اس کے کچھ نہ ہوتا تو بھی اس کی افادیت ظاہر تھی نفس ڈرامہ چونکہ اسٹیج کے لئے لکھا گیا ہے اور اسٹیج بھی اب سے پچاس سال قبل کا جب ہمارے وطن کے مشہور فرد عبداللہ فتحپوری نے ہندوستان میں اول اول تھیٹر قائم کرکے خود ہی چند ڈرامہ مقفی عبارت میں لکھے تھے۔

اس ڈرامہ میں مذاقیہ حصہ بھی کافی ہے اور اس کی شان بھی وہی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ اگر مولانا نے اس کو صرف یہ ثابت کرنے کے لئے نہیں لکھا کہ وہ ایسا بھی لکھ سکتے ہیں، تو پھر کیوں انھوں نے یہ زحمت اختیار کی۔

یہ ڈرامہ مجلد شائع ہوا ہے اور ایک روپیہ میں رائے صاحب لالہ رام دیال اگروالہ الہ آباد سے ملسکتا ہے۔

**غدودوں کے جوہر** ہندوستان کے مشہور ماہر تجدید شباب لفٹنٹ کرنل ڈاکٹر محمد اشرف الحق کا یہ گیارھواں رسالہ ہے جس میں اُنھوں نے بتایا ہے کہ غدود کے جوہر سے کن امراض میں کس طرح فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ ایک جانور کے مختلف اعضا کے کھانے سے کن کن بیماریوں کو دور کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے حال ہی میں دو آپریشن دہلی میں کئے ہیں، سال گزشتہ لکھنؤ میں ایک آپریشن کیا تھا جس کا ذکر نگار میں ہوچکا ہے۔ یہ رسالہ ۲ر میں مصنف موصوف سے قلعۂ گولکنڈہ حیدرآباد دکن کے پتہ پر ملسکتا ہے۔

**Parsis** یہ کتاب پروفیسر محمد طاہر رضوی ام۔اے کی تحقیق و جستجو کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے ایران کے پیمبر قدیم زردشت اور اس کے مذہب کے متعلق اتنی صحیح معلومات یکجا کردی ہیں کہ کسی اور جگہ نظر نہیں آتیں۔ اسکا ترجمہ فارسی میں بھی ہوچکا ہے اور ہمارے ایک کرمفرما مولوی وجاہت حسین صاحب ام۔اے اُردو میں بھی کررہے ہیں جو نگار میں فروری سے شائع ہونا شروع ہوگا۔ یہ کتاب تین روپیہ میں تاراپوروالا اینڈ سنس ہارن بی روڈ بمبئی سے ملسکتی ہے۔

# قائد کی پہچان

مرے سینے میں اے مسلم ہیں اسرار نہاں کیا کیا
بتاتا ہوں تجھے قائد کے ہوتے ہیں نشاں کیا کیا

ابھی دم بھر میں ہر مشکل تری آسان ہو جائے
اگر دنیا میں قائد کی تجھے پہچان ہو جائے

کسے کہتے ہیں قائد رہنمائی کون کرتا ہے
غلام اقوام کی عقدہ کشائی کون کرتا ہے

وہ شیر حریت سینے میں لیکر عزم کامل کو
جب اٹھتا ہے الٹ دیتا ہے اک ٹھوکر سے باطل کو

مقابل اس کے دریا ہو تو اس میں کود جاتا ہے
تہ طوفاں میں رستہ زور بازو سے بناتا ہے

وہ شیدائے شہادت آگ کو گلشن سمجھتا ہے
کنار تیغ کو جبرئیل کا دامن سمجھتا ہے

زمیں پہ رہ کے دم لیتا ہے جنت کی فضاؤں میں
پیام حق سنا دیتا ہے تلواروں کی چھاؤں میں

خلاف مقصد عالی عمل کوئی نہیں کرتا
فریب مصلحت سے ترک حق گوئی نہیں کرتا

رہ حق سے ہٹا سکتے نہیں فرزند و زن اس کو
صداقت سے پھرا سکتے نہیں دار و رسن اس کو

ہے اسکی معدلت سے مطمئن اسود بھی احمر بھی
سزا دیتا ہے وہ چوری کرے گر اس کی دختر بھی

حکومت پھانسی دے تو جیل جانے سے نہیں ڈرتا
رعایت کے لئے حکام کی منت نہیں کرتا

نہیں ہوتا حوادث کے طلاطم میں ہراس اسکو
نہیں کہتا کہ زنداں میں عطا ہو اے کلاس اسکو

رہا کرتی ہے تنویر قناعت سے جبیں روشن
صداقت کی حمایت کر کے پھیلاتا نہیں دامن

طلا و سیم کے تاروں کو وہ نیزے سمجھتا ہے
عقیق و لعل و گوہر کو خذف ریزے سمجھتا ہے

اگرچہ تابع فرماں ہیں چین و ہند و روس اسکے
نہیں کہتا کہ نکلیں شان و شوکت سے جلوس اسکے

سفر کرتا ہے پیدل قوم سے پیسہ نہیں لیتا
اگر ملجائے گنج خسروی تو کھا نہیں لیتا

کسی کو اسکے افلاس و غنا پہ شک نہیں ہوتا
دم رحلت مکاں میں اسکے روغن تک نہیں ہوتا

مکیں رہتی ہے صدیوں تک دل ملت میں یاد اسکی
نہیں ہوتی ہے بعد مرگ کوئی جائیداد اس کی

مخالف بھی کہا کرتے ہیں صادق اور امین اسکو
عدو بھی جانتے ہیں رحمت للعالمین اس کو

کسی کو دیکھ کر تکلیف میں بے چین ہوتا ہے
فلاحِ ابن آدم کیلئے راتوں کو روتا ہے

جلائے روح کا سامان کرتا ہے عبادت سے
دل اپنا صاف کرتا ہے ہوا و حرص و نخوت سے

عبادت کو کبھی سمجھا نہیں روزی رساں اس نے
امامت کو کبھی جانا نہیں گنج گراں اُس نے

قیادت کیلئے اقوام کو لڑوا نہیں دیتا
کبھی بھائی کی گردن بھائی سے کٹوا نہیں دیتا

کسی کی آنکھ کے شہتیر سے مطلب نہیں رکھتا
نظر آتا ہے جب تک اسکو اپنی آنکھ کا تنکا

وہ دوشِ باد پر اڑنے سے پہلے پر بناتا ہے
زباں سے بعد میں کہتا ہے پہلے کر دکھاتا ہے

جو ان اوصاف کا حامل ہے بیشک رہنما ہے وہ
دگرنہ راہزن ہے بندۂ حرص و ہوا ہے وہ

اصغر حسین خان نظیر (لدھیانہ)

---



---

# "طور"

یہیں کی تھی محبت کے سبق کی ابتدا میں نے
یہیں دیکھے تھے سب سے پہلے انداز حیا میں نے
یہیں کی جرأت اظہار حرف مدعا میں نے
یہیں پہلے سنی تھی دل دھڑکنے کی صدا میں نے
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

حیا کے بوجھ سے جب ہر قدم پر لغزشیں ہوتیں
فضا میں منتشر رنگیں بدن کی لرزشیں ہوتیں
رباب دل کے تاروں میں مسلسل جنبشیں ہوتیں
خفائے رازگی پر لطف باہم کوششیں ہوتیں
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

بہے جاتے تھے بیٹھے عشق کے زریں سفینے میں
تمناؤں کا طوفاں کروٹیں لیتا تھا سینے میں
جو چھو لیتا میں انکو وہ نہا جاتا پسینے میں
مئے دو آتشہ کے سے مزے آتے تھے جینے میں
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

بلائے فکر فردا ہم سے کوسوں دور ہوتی تھی
سرور سرمدی سے زندگی معمور ہوتی تھی
ہماری خلوت معصوم رشک طور ہوتی تھی
ملک جھولا جھلاتے تھے غزل خواں حور ہوتی تھی
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

---

نہ اب وہ کھیت باقی ہیں نہ وہ آب رواں باقی
مگر اس عیش رفتہ کا ہے اک دھندلا نشاں باقی

محی الدین مخدوم (عثمانیہ)

# حسنِ فطرت

بہارِ شعر و ترنم ہے زندگی میری
تخیلات میں سیرۃ نمائے فطرت ہوں
میں اپنی نظم کا جب گردگار بنتا ہوں
کبھی ہوں حسن سراپا، کبھی ہوں عشق تمام
چمن چمن، مجھے اذنِ خرام دیتا ہے
مری نظر میں سحر روز مسکراتی ہے

تمام رات میں تنہائیوں کے عالم میں
میں چھیڑتا ہوں کبھی نیم خواب کلیوں کو
کبھی میں لطف اٹھاتا ہوں جوئباروں سے
ہزار جان سے صدقے بہار ہے مجھ پر
ہر ایک گل مجھے جھک کر سلام کرتا ہے
میں ڈوب جاتا ہوں جب شعریت کے طوفاں میں
گلوں کو چوم کے پڑھتا ہوں شعر مستی میں
مرے خیال کی پرواز اے معاذ اللہ
گلے لگاتا ہوں اُس حسنِ مستتر کو میں
مرے نیاز نے پابند کر دیا ہے اُسے
چمن بدوش ہے وہ، اور چمن میں شامل ہو
ہے اُسکا آئینہ ہر جزوِ مظہرِ فطرت
میں دیکھتا ہوں اُسے بحر کی روانی میں
وہ جلوہ ریز ہے ہر سو، ہوا کی موجوں میں
نہ منتظر کوئی میرا، نہ انتظار مجھے
حسین جلوؤں کا ہر وقت مجھ پہ سایا ہے

نثارِ برق و تبسم ہے زندگی میری
تصورات میں صورت کشِ حقیقت ہوں
جمالِ حسن کا آئینہ دار بنتا ہوں
کبھی ہوں صبحِ مسرت، کبھی ہوں غم کی شام
شجر شجر مرے دل کو پیام دیتا ہے
ہوائے صبح مجھے آ کے گدگداتی ہے

تلاش کرتا ہوں حسنِ بہارِ شبنم میں
میں چومتا ہوں، کبھی پر شباب کلیوں کو
کبھی میں کھیلتا ہوں جا کے آبشاروں سے
ہر ایک مظہرِ فطرت نثار ہے مجھ پر
غرض تمام چمن احترام کرتا ہے
دکھائی دیتا ہوں اک محویت کے طوفاں میں
میں جھوم جھوم کے پڑھتا ہوں شعر مستی میں
مری نگاہ کا اعجاز اے معاذ اللہ
جگاتا رہتا ہوں جادوئے بے خبر کو میں
مری نگاہ نے مخصوص کر لیا ہے اسے
وہ کائنات کی محفل میں، شمعِ محفل ہے
ہر اک کرشمہ ہے اُسکا کرشمۂ قدرت
حسین غنچوں کی مدہوش نوجوانی میں
وہ برق کی ہے روش، بادلوں کی موجوں میں
ہے اُس سے ملنے کا ہر وقت افتخار مجھے
مرے خیال پہ ابرِ نشاط چھایا ہے

نظر، نظر میں ہے میری اسی کا کیف و سرور
ادا، ادا میں ہے اسکی مری نظر کا غرور

فطرت واسطی

# حسنِ عمل

میں اس بیگانگیٔ ہوش کے عالم کو کیا سمجھوں
رہینِ جہل و نادانی ہے یہ ذوقِ ہمہ دانی

سکوں کی جستجو اور صومعہ کی تیرہ خلوت میں
جہاں مجروح پائے جاتے ہیں جذباتِ انسانی

صدائے ناقوس کی گر حاملِ رازِ سکوں ہوتی
کبھی قابو نہ پا سکتے تھے اندازِ مسلمانی

تماشہ مدتوں دیکھا ہے موجوں کی حقیقت کا
تلاطم خیز دریا بھی ہے اک جسمِ پریشانی

خدا جانے کہاں کی خاک اڑتی ہے بیاباں میں
کہیں وحشت بھی ہو سکتی ہے اک تمہیدِ لافانی

پیامِ امن کا باعث چمن کی تازگی کیوں ہو
خزاں کے سایۂ ظلمت میں ہے نظمِ گلستانی

دعا سے فائدہ کچھ بھی نہیں رونے سے کیا حاصل
چہ کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

حدودِ زیست سے باہر نکل کر تجربہ لیں بھر لے
کہ ہے اس وسعتِ عالم میں جلووں کی فراوانی

بھری گرمی میں خورشیدِ قیامت جب چمکتا ہے
کنوئیں کی تہ میں جب ڈھونڈھے سے بھی ملتا نہیں پانی

ہوائے آتشیں سطحِ زمیں پر پھیل جاتی ہے
فضا کی لرزشیں! وہ لو کی لپٹیں! شعلہ افشانی

تڑپتی دھوپ، جلتی ریت وہ تپتے ہوئے میداں
ہوا کی شعلہ سامانی — بگولوں کی پریشانی

اسی عالم میں اک مزدور دہقاں ہل چلاتا ہے
وہ اپنی لے میں وحدت کے نرالے گیت گاتا ہے

قدم رکھتا ہوا چلتا ہے اک شانِ مسرت سے
کبھی اپنے سرورِ زندگی سے جھوم جاتا ہے

بہار آتے ہی جس دم اس کی کھیتی لہلہاتی ہے
وہ اپنی کامیابی پر خوشی سے مسکراتا ہے

حقیقت ہے کہ وہ "سازِ عمل" کو چھیڑ کر اپنے
نوائے روح کا پیغام دنیا کو سناتا ہے

"عمل" سے دل کو ہوتا ہے سرورِ دائمی حاصل
"عمل" ہی سازِ فطرت کا ہر اک پردہ بجاتا ہے

"عمل" سے ہو گئی معراجِ انسانی تمدن کو
یہ کیا کم ہے "عمل" انسان کو انساں بناتا ہے

نظامِ بزم قایم ہے "عمل" کی رہنمائی میں
"عمل" کی حکمرانی ہے غرض ساری خدائی میں

شمیم

# رُباعیات اثر لکھنوی

ہے شام کا وقت دم بخود ہے ساحل — کہسار پہ چھایا ہے سکوت کامل
فطرت کی خموشیوں میں گویائی ہے — محفل کو ہے انتظار میر محفل

---

فطرت نے لباس تازہ پھر بدلا ہے — پھر ابر بہار جھوم کر آیا ہے
پھر ہاتھ گریباں کی طرف کھنچتا ہے — پھر میں ہوں، وہی سر ہے، وہی سودا ہے

---

کڑھنا اور زار زار رونا اچھا — ہاں عشق کا اعتبار کھونا اچھ
لیکن کسی کافر کی نگہ سے اسے دل — اب تو نہ کبھی دو چار

---

کہتے ہیں کسے عشق، مجھے کیا معلوم — اک درد ہے دلنشیں
نسبت اگر آغاز سے انجام کو ہے — جز تشنہ لبی اسش

---

دل کو صرف عذاب رہنے تو دو — جولانگہ انقلاب
یہ ٹھوکریں کھا کے راہ پر آئے گا — کچھ دن یوہیں خراب

---

مذہب سے اختلاف کرتے رہئے — قبلے سے انحراف کر
شاید گم گشتہ مدعا مل جائے — اپنے دل کا طواف کر

---

# کیفِ شبستاں

دیکھنا جذبِ محبت کا اثر آج کی رات
میرے شانے پہ ہے اس شوخ کا سر آج کی رات

اور کیا چاہئے اب اے دلِ مجروح تجھے
اس نے دیکھا ہی بہ اندازِ دگر آج کی رات

عارضِ یار پہ وہ رنگِ شفق کی لہریں
وہ مری شوخ نگاہی کا اثر آج کی رات

محوِ گلگشت ہے یہ کون مرے دوش بدوش
کہکشاں بن گئی ہر راہ گزر آج کی رات

پھول کیا خار بھی ہیں آج گلستاں بہ کنار
سنگریزے ہیں نگاہوں میں گہر آج کی رات

پھوٹ نکلا در و دیوار سے سیلابِ نشاط
اللہ اللہ مرا کیفِ نظر آج کی رات

نور ہی نور ہے کس سمت اٹھاؤں آنکھیں
حسن ہی حسن ہے تا حدِ نظر آج کی رات

نغمہ و مے کا یہ طوفانِ طرب کیا کہئے
گھر مرا بن گیا خیام کا گھر آج کی رات

نرگسِ ناز میں وہ نیند کا ہلکا سا خمار
وہ مرے نغمۂ شیریں کا اثر آج کی رات

مذہبِ عشق میں جائز ہے یقیناً جائز!
چوم لوں میں لبِ لعلیں بھی اگر آج کی رات

ے الطاف کا اتنا ہی فسوں کافی ہے
کم ہے اے دوست مرا دردِ جگر آج کی رات

اسرار الحق مجاز (مسلم یونیورسٹی)

# جذباتِ تپش

بتکدوں سے دل لگی مقصود
خندۂ زخم بھی ہے شور آلود

دیدنی فکرِ کعب میں بے سود
نہ کبھی بت خدا تو ہے موجود

کبھی روشن ہے دل کبھی تاریک
کبھی غائب ہو تم، کبھی موجود

کہ چھپا کے نقاب میں تم نے
نقلِ شوق کو کیا محدود

کیوں ہے عالم سیاہ نظروں میں
آتشِ عشق تھی اگر بے دود

خواب پر ہے گمانِ بیداری
غیب کو ہم سمجھ رہے ہیں شہود

کچھ نہیں ہے بجز فریبِ نظر
عالمِ نیست میں ہماری بود

کون سنتا ہے میری عرضِ وفا
نغمہ ساز ہوں مگر مردود

سوز و سازِ تپش فضول عبث
نیست ہے ہستیِ عمل کا وجود

عبداللطیف تپش ایم۔ اے

# غزلیات

## (۱)

ہم اپنے نالۂ سوزاں سے پھونک دیتے قفس — مگر قفس کی محبت سے ہو گئے بے بس
ہمارے سر سے کبھی کا گزر گیا پانی، — برس، بہار کی سرشار رات! خوب برس
اندھیری رات کے پردے میں کون ہے جو ہے — ربابِ روح کے تاروں کو کر رہا ہے مس
چمن میں گا رہی ہیں پھول والیاں مل کر — ٹپک رہا ہے رسیلی جوانیوں کا رَس
جہاں میں بوالہوسی کے یہ کارنامے ہیں — بنا ہے وامق و فرہاد ہر کس و ناکس

مری خرابیوں کی انتہا یہ ہے اختؔر
خود اپنے حال پہ آنے لگا ہے مجھ کو ترس

## (۲)

خواہشِ عیش نہیں دردِ نہانی کی قسم! — بوالہوس کھایا کریں عشرتِ فانی کی قسم
اک غم انگیز حقیقت ہے ہماری ہستی — قصہ خواں! تیری غم انگیز کہانی کی قسم
قلبِ ناشاد میں چھریاں سی چلائیں شب بھر — کسی قتال کے خنجر کی روانی کی قسم
دل کی گہرائیوں میں آگ دبی رکھتا ہوں — چشمِ گریاں سے برستے ہوئے پانی کی قسم
باغِ دنیا کی فضاؤں سے ٹپکتا ہے شباب — گلِ نوخیز کی بھرپور جوانی کی قسم
کبھی مغلوب نہ ہو گی غمِ محرومی سے — مری اُلفت ہے جواں، اپنی جوانی کی قسم

جب سے آئی ہے خدا رکھے جوانی اختؔر
ہم ہر اک بات پہ کھاتے ہیں جوانی کی قسم

اختؔر انصاری دہلوی
بی۔ اے (آنرز)